وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ

(اور ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھکر تولا کرو)

میزان

یعنی مولوی شبلی نعمانی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر پر محققانہ اور منصفانہ ریویو

اور مرزا دبیر کی شاعری پر تفصیلی بحث، اور اُن کی ہر قسم کی سلیس اور صاف نظم کا نمونہ

اور اُن کے محاسنِ سخن اور فصاحت و بلاغتِ کلام کا شرح تذکرہ

عالیجناب مولوی چودھری سید ظہیر احسن صاحب نوقؔ رضوی

رئیس مہابن ضلع متھرا

محمد عبداللطیف پرنٹر کے اہتمام سے

مطبوعہ مطبع صادق علی لاہور میں چھپی

اور جناب مؤلف کتاب نے مہابن سے شائع کی

از شاگردان سربرآوردۂ خوشنویسان ہندوستان عالیجناب منشی علی محمد خاں صاحب رخ آبادی مدظلہ العالی

(محبوب بخش پریس)

فہرست مضامین المیزان

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	تمہید	۱
۲	ناظرین کیواسطے چند ہدایتیں	″
۳	دیباچہ	۱
۴	مرثیہ گوئی کی ابتدا اور ترقی	″
۵	مرثیہ گویوں کا کمال شاعری	″
۶	مرزا دبیر اور میر انیس کی شاعری	۲
۷	مرثیوں میں گراں بہا اخلاقی مضامین	″
۸	معرکۂ کربلا کے واقعات میں حسن اخلاق کے نمونے۔	″
۹	فضائل و مناقب کے مضامین اور اُن کا اثر	۳
۱۰	فضائل اہلبیتؑ کما حقہ ادا کرنیسے شاعری عاجز ہے۔	″
۱۱	شاعری کا اثر خیالات و جذبات پر	۴
۱۲	ایک محقق یورپ کا خیال	″
۱۳	مرثیوں کے دیکھنے اور پڑھنے کی ضرورت	″
۱۴	انیسیوں اور دبیریوں کے گروہ	۵
۱۵	اقسام طرز شاعری اور اُنکی مقبولیت	۵
۱۶	زبان کی درجہ بدرجہ تبدیلیاں	۶
۱۷	ہر زمانے کی زبان قابل قدر ہے	″
۱۸	اختلاف مذاق شاعری	″
۱۹	ہر طرز قابل قدر ہے	۷
۲۰	انیسیوں اور دبیریوں کے گروہوں کی غلطی	۸
۲۱	میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے طرز قابل قدر ہیں	۹
۲۲	دونوں صاحبوں کے یکساں باکمال ہونے کی زبردست دلیل	۱۰
۲۳	مرزا صاحب کا طرز اور اُسکی مقبولیت	۱۱
۲۴	دونوں صاحبوں کے ہاں ہر قسم کا کلام موجود ہے	۱۲
۲۵	انیسیوں اور دبیریوں کا شرمناک تعصب	″
۲۶	موازنہ انیس و دبیر اور اُسکے مولف کا تعصب	۱۳
۲۷	موازنہ کو کس طرز پر لکھنا چاہیے تھا	۱۴
۲۸	موازنہ کی غیر مرد لعزیزی	″

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۹	میر صاحب پر مولف کے اعتراضات	۱۴
۳۰	میر صاحب اور مرزا صاحب کی ترجیح کا مسئلہ	۱۶
۳۱	مفتی صاحب قبلہ و کعبہ کا فیصلہ	″
۳۲	دونوں صاحبوں کا قابل قدر کمال	″
۳۳	آجتک ترجیح کا فیصلہ نہو سکا	۱۷
۳۴	مسئلہ ترجیح کے متعلق فضلائے عصر کے اقوال	۱۸
۳۵	مرزا غالب اور مولوی آزاد کی رائے	″
۳۶	مرزا صاحب کا صاف اور سلیس کلام	۱۹
۳۷	بلینیہ مضامین مرزا صاحب کا حصہ تھے	۲۰
۳۸	اس کتاب کے تالیف کرنے کی علت غائی	″
۳۹	میر صاحب خاندانی شاعر تھے	۲۱
۴۰	مرزا صاحب نے خود شاعری شروع کی	۲۲
۴۱	سب سے پہلے شاعری کس نے شروع کی اور اس کی تحقیق	۲۳
۴۲	ہم مضمون مرثیے اول کسنے کہے اور کسنے جواب لکھا۔	۲۴
۴۳	اس بارہ میں صاحب موازنہ کی پہلی دلیل (میر صاحب چوٹیں کرتے ہیں)	۲۵
۴۴	دوسری دلیل (مرزا صاحب چوٹوں کا جواب نہیں دیتے)	″
۴۵	پہلی دلیل کا جواب۔ میر صاحب کا کسی کی طرف اشارہ نہیں	″
۴۶	دوسری دلیل کا جواب۔ مرزا صاحب چوٹوں کا جواب دیتے ہیں	۲۶
۴۷	میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کا کسی جانب روے سخن نہوگا	۲۹
۴۸	ایک دوسرے کا جواب لکھنا امر مذموم نہیں	″
۴۹	**میر انیس کی خصوصیات شاعری**	۳۱
۵۰	فصاحتِ کلمہ	″
۵۱	فصاحت کی تعریف میں مولف کی ایک غلطی	″
۵۲	فصاحت کلام	۳۲
۵۳	مرزا صاحب پر ایک تہمت	″
۵۴	بحیثیت فصاحت کسی شاعر کا تمام کلام یکساں نہیں ہوتا	۳۳
۵۵	کلام میں مختلف مدارج ہونے کے وجوہ	″
۵۶	پُرگو شعرا کے کلام میں چند غیر فصیح الفاظ ہونا جائے تعجب نہیں	۳۴
۵۷	مرزا صاحب کی پُرگوئی	۳۴
۵۸	مرزا صاحب کی علمیت	″
۵۹	موازنہ کرنے کی مشکلات	″
۶۰	موازنہ کے متعلق مولانا آزاد کی رائے	۳۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۶۱	کسی شاعر کا گھٹا دینا یا بڑھا دینا موازنہ کرنے والے کے ہاتھ میں ہے	۳۷
۶۲	مدارج فصاحت کو کس طرح ظاہر کرنا لازم تھا	″
۶۳	میر انیس کے کلام سے مختلف مدارج فصاحت کی مثالیں	۳۹
۶۴	میر صاحب اور مرزا صاحب کے وہ ہم مضمون اشعار جہاں میر انیس کو فوقیت ہے	۴۰
۶۵	ایضاً۔ جہاں مرزا دبیر کو ترجیح ہے	″
۶۶	مرزا صاحب کے کلام سے الفاظ کی فصاحت بندش کی صفائی کی مثالیں	۴۲
۶۷	**کلام کی اصلی ترتیب** اور مرزا صاحب کے کلام سے اُسکی مثالیں	۵۶
۶۸	**روزمرّہ اور محاورہ**	۶۱
۶۹	پہلے زمانہ کے ارباب کمال کا مذاق	۶۲
۷۰	میر صاحب کا خاندانی طرز	″
۷۱	دونوں صاحبوں کا کلام ہر رنگ کا موجود ہے	″
۷۲	مرزا صاحب کے کلام سے روزمرّہ اور محاورہ کی مثالیں	″
۷۳	**مضامین کی نوعیت سے الفاظ کا استعمال**	۶۷
۷۴	مرزا صاحب کے کلام سے عنوان بالا کی مثالیں	۶۹
۷۵	**بحروں کا انتخاب اور حسن قافیہ و ردیف**	۷۲
۷۶	مولف کی اس بارہ میں ایک عجیب رائے اور اُسپر دلچسپ بحث	″
۷۷	بحروں کا خاص کر لینا	۷۶
۷۸	ردیف کا التزام	۷۷
۷۹	مرزا صاحب کے کلام سے حسن قافیہ و ردیف کی مثالیں	۷۸
۸۰	**تنسیق الصفات**	۷۹
۸۱	تنسیق الصفات کی تعریف بیان کرنے میں مؤلف کی غلطی	″
۸۲	تنسیق الصفات کی مثالیں دینے میں مولف کی فاش غلطی	۸۱
۸۳	میر صاحب کے کلام سے تنسیق الصفات کی صحیح مثالیں	۸۲
۸۴	مرزا صاحب کے کلام سے تنسیق الصفات کی مثالیں	۸۴
۸۵	**بلاغت**	۸۵
۸۶	میر صاحب کے کلام میں فصاحت اور مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت زیادہ ہونے کی ضرب المثل اور مولف کا اسکو بحیثیت معنی غلط قرار دینا	″
۸۷	فصاحت و بلاغت کلام کی تعریف	″

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۸۸	بلاغت و فصاحت میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہونا	۸۶
۸۹	دونوں کا اپنے اپنے افراد سے کس قسم کا تعلق ہے۔	″
۹۰	ضرب المثل کے پہلے حصہ کی تنقیح (مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے) اور اُسکے بحیثیت معنی صحیح ہونے کا ثبوت۔	۸۷
۹۱	بلاغت زیادہ اور فصاحت کم ہونا ممکن ہے	۸۸
۹۲	ابن خلدون کی رائے	۸۹
۹۳	ضرب المثل کے دوسرے حصہ کی تنقیح (میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے) اور اُسکے بحیثیت معنی صحیح ہونے کی دلیل۔	۹۰
۹۴	فصاحت زیادہ اور بلاغت کم ہونا ممکن ہے	″
۹۵	مولف کی غلطی۔ اور ضرب المثل کا بحیثیت معنی صحیح ہونا۔	″
۹۶	جمہور انام کی رائے سے مولف کی مخالفت	۹۱
۹۷	بلاغت کو لفظ سے کچھ تعلق نہیں	۹۲
۹۸	مولف لفظ کو بلیغ کہتے ہیں جو بالکل غلط ہے	″
۹۹	مولف بلاغت الفاظ اور بلاغت معنی کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھتے ہیں۔	۹۳
۱۰۰	بلاغت کے ایک نئے معنی بلحاظ اصطلاح عام	۹۴
۱۰۱	واقعات کا مطابق مقتضائے حال ہونا	۹۵
۱۰۲	جواب روایت دختر شاہ حلب	″
۱۰۳	روایتوں کے بارے میں مولوی آزاد کی رائے۔	۹۶
۱۰۴	ہر قسم کے مضمون کی بلاغت کے جداگانہ طریقے	۹۸
۱۰۵	اشخاص کے لحاظ سے بلاغت کا انداز۔ اور اس کی مثالیں۔	″
۱۰۶	دشمن کی تعریف میں بلاغت کا انداز	۱۱۵
۱۰۷	تسلسل بیان۔ اور اُسکی مثال	۱۱۷
۱۰۸	**بلاغت کی جزئیات اور اُس کی ۱۷ مثالیں**	۱۲۱
۱۰۹	مثال ۱۔ ہند کا اہل حرم کو چادر پیش کرنا اور اُن کا انکار۔	۱۲۳
۱۱۰	مثال ۲۔ دربار میں یزید اور سفیر روم کا مکالمہ	۱۲۵
۱۱۱	مثال ۳۔ حضرت زینبؑ کا صاحبزادوں کی لاشیں بین کرنے کا انداز۔	۱۲۶
۱۱۲	مثال ۴۔ یزید کا دربار میں اپنی سخا کی پر فخر و مباہات کرنا۔	۱۲۸
۱۱۳	مثال ۵۔ حضرت صغراؑ کا جناب علی اصغرؑ سے مخاطب ہو کر کلام کرنا	۱۳۰
۱۱۴	مثال ۶۔ حضرت زینبؑ کا صاحبزادوں کو	۱۳۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	منصب علمداری طلب کرنے سے روکنا	
۱۱۵	مثال ۷۔ حضرت زینبؑ تمام اعزا کو حفاظت امام علیہ السلام کی تاکید کرتی ہیں	۱۳۲
۱۱۶	مثال ۸۔ حضرت صغرا کا رخصت کیوقت حضرت عباسؑ سے منت و زاری کرنا	۱۳۳
۱۱۷	مثال ۹۔ شمر کا بیوہ عباسؑ کی حمایت کرنا	۱۳۵
۱۱۸	مثال ۱۰۔ بیوہ حضرت امام حسنؑ کا اپنے صغیر سن فرزند کو نصرت امام مظلوم پر آمادہ کرنا۔	۱۳۸
۱۱۹	مثال ۱۱۔ ہند کا حضرت زینبؑ کو دیکھ کر رفع شک کے مختلف طریقے اختیار کرنا۔	۱۴۰
۱۲۰	مثال ۱۲۔ ہند کا سر امام پہچانکر پردہ سے باہر نکل آنا اور یزید کی ندامت و پریشانی	۱۴۲
۱۲۱	مثال ۱۳۔ حضرت علی اکبرؑ کی شہادت اور امام حسینؑ کا حضرت زینبؑ کو اس کی خبر کرنا۔	۱۴۴
۱۲۲	مثال ۱۴۔ تقسیم اسلحہ کیوقت حضرت زینبؑ کا امام حسینؑ سے بیٹوں کی سفارش کرنا	۱۴۵
۱۲۳	مثال ۱۵۔ امام حسینؑ کا فوج شام سے علی اصغرؑ کیواسطے پانی طلب کرنا۔	۱۴۶
۱۲۴	مثال ۱۶۔ ہند کا جناب زینبؑ کو قید خانہ میں پہچاننا اور لونڈیوں کا استعجاب	۱۴۷
۱۲۵	مثال ۱۷۔ قاصد کا کربلا سے مدینہ میں آنا اور حضرت ام البنینؑ کے سوالات	۱۴۹
۱۲۶	**استعارات و تشبیہات**	۱۵۰
۱۲۷	تشبیہ سے مشبہ کی رفعت و حسن	۱۵۲
۱۲۸	درازی مو۔ عریانی۔ داغ کف دست	//
۱۲۹	اسیری۔ زخم تازیانہ۔ طوق گلوگیر	۱۵۴
۱۳۰	بیڑیاں۔ ہتکڑی۔ نابینائی	۱۵۵
۱۳۱	امام حسینؑ کا سر مبارک چاہ سے نکلنا	۱۵۶
۱۳۲	پیری۔ ارتعاش اعضا۔ قد کی کجی	//
۱۳۳	تشبیہ سے مشبہ کی تحقیر و ذلت کی مثالیں	۱۵۷
۱۳۴	محسوسات سے تشبیہیں دینا۔ اور اس کی دلچسپ مثالیں۔	۱۵۸
۱۳۵	تشبیہ سے مبالغہ اور اسکی مثالیں	۱۶۰
۱۳۶	ہر قسم کی تشبیہوں کے مختلف اشعار	۱۶۱
۱۳۷	**صنائع بدائع**	۱۶۵
۱۳۸	صنعت ایہام	۱۶۷
۱۳۹	مبالغہ	۱۷۰
۱۴۰	حسن التعلیل	۱۷۷
۱۴۱	صنعت طباق	۱۷۹
۱۴۲	مراعات النظیر۔ ایہام التناسب	۱۸۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴۳	لف ونشر	۱۸۳
۱۴۴	تفصیل	۱۸۴
۱۴۵	مہملہ یعنی بے نقط	۱۸۵
۱۴۶	تلمیح	۱۸۶
۱۴۷	معاد	۱۸۷
۱۴۸	صنعت رجوع	۱۸۸
۱۴۹	صنعت ترصیع	۱۸۹
۱۵۰	تنسیق الصفات	۱۹۰
۱۵۱	سیاقۃ الاعداد	۱۹۲
۱۵۲	ذوقافیتین وذی القوافی	۱۹۳
۱۵۳	جمعیت الفاظ	//
۱۵۴	**انسانی جذبات یا احساسات**	۱۹۶
۱۵۵	مثال ۱۔ حضرت امام حسینؑ کی جناب اصغرؑ سے رخصت۔	۱۹۸
۱۵۶	مثال ۲۔ حضرت علی اکبرؑ کی رخصت اور ماں باپ کی حالت۔	۲۰۸
۱۵۷	مثال ۳۔ امام حسینؑ بہن بیٹی اور بیوی سے رخصت ہوتے ہیں۔	۲۱۴
۱۵۸	مثال ۴۔ امام حسینؑ حضرت عباسؑ کے مرنے کی خبر سنکر رزمگاہ میں جاتے ہیں	۲۲۰
۱۵۹	مثال ۵۔ حضرت علی اکبرؑ حالت نزع میں ہیں امام حسینؑ اُنکے پاس جاتے ہیں۔	۲۲۶
۱۶۰	مثال ۶۔ حضرت علی اکبرؑ کی شہادت۔ امام حسینؑ کی اضطراری حالت۔ باپ بیٹے کی گفتگو۔	۲۳۸
۱۶۱	مثال ۷۔ امام حسینؑ کا نانا کی قبر سے رخصت ہونا	۲۴۹
۱۶۲	مثال ۸۔ حضرت عباسؑ کا فوج میں گھر جانا امام حسینؑ کا اُنکے لیے دعا کرنا۔	۲۵۰
۱۶۳	مثال ۹۔ حضرت قاسمؑ کی وفات۔ امام حسینؑ اور اہل حرم کا اضطراب۔	۲۵۱
۱۶۴	مثال ۱۰۔ امام حسینؑ کی شہادت۔ حضرت زینبؑ کی مضطربانہ حالت۔ شمر سے منت وزاری	۲۵۲
۱۶۵	مثال ۱۱۔ امام حسینؑ کی شہادت۔ حضرت کا شہدا کو مدد کیواسطے بلانا۔	۲۵۴
۱۶۶	مثال ۱۲۔ امام حسینؑ کے گھوڑے کا خیمہ میں آنا اہل حرم کے بین	۲۵۶
۱۶۷	مثال ۱۳۔ شمر وقت غارت بیوہ عباسؑ کو خیمہ سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔	۲۶۰
۱۶۸	مثال ۱۴۔ حضرت زینبؑ کا قبر سید الشہداؑ سے رخصت ہونا۔	۲۶۲
۱۶۹	مثال ۱۵۔ اہل حرم کی وطن کو واپسی اور حضرت زینبؑ کے بین۔	۲۶۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۷۰	مثال ۱۶۔ حضرت اصغرؑ کی فرقت میں اُنکی ماں کے جگر خراش بین	۲۶۸
۱۷۱	**واقعاتِ شام**	۲۷۰
۱۷۲	۱۔ دربار یزید	۲۷۲
۱۷۳	۲۔ زندان شام کی ویرانی۔ اہلبیتؑ کی مصیبت۔ عزیزونکی یاد	۲۸۳
۱۷۴	۳۔ شہر شام کی زینت۔ ہند کی سیر۔ خود بخود دل کی پریشانی۔	۲۸۶
۱۷۵	۴۔ ہند کا حالتِ اضطراب میں یزید سے امام حسینؑ کے حالات پوچھنا۔	۲۹۲
۱۷۶	۵۔ ہند کا زندان شام میں جانا۔ اُسکے درد وقلق کی تصویر۔ لونڈیونکی گفتگو۔	۲۹۵
۱۷۷	۶۔ ہند کا جاہ وجلال۔ ملازموں کی خوشامدانہ تقریر۔	۲۹۹
۱۷۸	۷۔ ہند کا اپنی بیٹی کے ذریعے سے قیدیوں سے قید خانہ میں آنے کی اجازت چاہنا۔ دختر یزید کے تجمل۔ اور جناب سکینہؑ کی خستہ حالی کا مقابلہ	۳۰۰
۱۷۹	۸۔ آمدِ ہند کی خبر سنکر اہلِ حرمؑ کا اضطراب پریشانی وندامت کی تصویر۔	۳۰۱
۱۸۰	۹۔ دختر یزید اور حضرت سکینہؑ کی طفلانہ گفتگو	۳۰۶
۱۸۱	۱۰۔ ہند حضرت سجادؑ کے حالات دریافت کرتی ہے۔	۳۰۸
۱۸۲	۱۱۔ ہند کا قید خانہ میں آنا۔ اہل حرمؑ سے سوال وجواب۔	۳۱۲
۱۸۳	۱۲۔ حضرت سجادؑ اور حضرت زینبؑ اپنا حال چھپاتی ہیں مگر آخر ضبط نہیں ہوتا۔	۳۲۲
۱۸۴	۱۳۔ امام حسینؑ کے صحیح صحیح حالات معلوم ہوجانے پر ہند کی بیقراری۔	۲۲۳
۱۸۵	۱۴۔ حضرت سکینہؑ کی زندان شام میں وفات ماں کے دلخراش نالے۔	۳۲۵
۱۸۶	۱۵۔ اہل حرم کا قید سے چھوٹ کر حضرت سکینہؑ کی قبر پر رخصت کیواسطے آنا۔	۳۲۹
۱۸۷	**مناظر قدرت**	۳۳۲
۱۸۸	مناظر قدرت کی تصویر کھینچنے میں میرانیس کا لاجواب شاعر ہونا۔	//
۱۸۹	صبح کا سماں	//
۱۹۰	رات کا سماں	۳۳۷
۱۹۱	گرمی کا سماں	۳۳۹
۱۹۲	**منظر یعنی سین**	۳۴۲
۱۹۳	مثال ۱۔ نزع کی حالت	۳۴۲
۱۹۴	مثال ۲۔ گرمی کی شدت میں لوگونکی حالت	۳۴۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۹۵	مثال ۳۔ صغیر السن بچہ نزع کی حالت میں	۳۴۶
۱۹۶	مثال ۴۔ فوجوں کی آمد اور جنگ کی تیاری	۳۴۸
۱۹۷	مثال ۵۔ سفر کی طیاری	۳۵۰
۱۹۸	مثال ۶۔ گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت	۳۵۶
۱۹۹	مثال ۷۔ لڑائی کی طیاری	۳۵۸
۲۰۰	مثال ۸۔ بیکسی اور تنہائی	۳۶۱
۲۰۱	مثال ۹۔ فوج کا داخلہ اور طیاری جنگ	۳۷۱
۲۰۲	مثال ۱۰۔ حضرت عباسؑ کا نہر سے مشک بھرنا دشمنوں کا نرغہ۔ انکا مشک بچانا۔ اور مضطربانہ کوشش کی تصویر	۳۷۲
۲۰۳	مثال ۱۱۔ پردہ کا اہتمام	۳۷۳
۲۰۴	مثال ۱۲۔ عونؑ و محمدؑ کی جنگ حضرت زینبؑ کا فضہ سے اُن کا حال دریافت کرنا	۳۷۴
۲۰۵	مثال ۱۳۔ امام حسینؑ کا داخلۂ کربلا۔ رفقا کی شان و شوکت اور نوجوانوں کی سیر و تفریح۔	۳۷۵
۲۰۶	مثال ۱۴۔ تمام رفقا کے بعد امام حسینؑ کی بیکسی۔ دشمنوں کا نرغہ	۳۸۰
۲۰۷	مثال ۱۵۔ شب عاشور مدینہ میں حضرت صغراؑ کے دل کی یکایک بیقراری ضطراب و انتشار	۳۸۷
۲۰۸	مثال ۱۶۔ اہلبیتؑ کے لُٹے ہوئے قافلہ کا مدینہ میں داخلہ	۳۸۸
۲۰۹	**واقعہ نگاری**	۳۹۲
۲۱۰	واقعہ نگاری کے بیان میں مولف کی ایک غلطی	//
۲۱۱	واقعہ نگاری کے متعلق مختلف جزوی واقعات کی چند دلچسپ اور پُر لطف مثالیں۔	۳۹۳
۲۱۲	مثال ۱۔ امام حسینؑ کا داخلۂ کربلا۔ دشمنوں کی روک ٹوک حضرت کی صلح پسندی	۳۹۸
۲۱۳	مثال ۲۔ شمر کا حضرت عباسؑ کو منصب وغیرہ کی ترغیب دینا۔ انکا جواب سخت دینا اور اُسوقت اہل حرم کی حالت۔	۴۰۵
۲۱۴	مثال ۳۔ شمر کا داخل دربار یزید ہو کر شہدائے کربلا کی شجاعت کا ذکر کرنا۔	۴۰۹
۲۱۵	مثال ۴۔ فوج کی آراستگی۔ اور عطائے منصب علمداری کے متعلق واقعات۔	۴۱۴
۲۱۶	مثال ۵۔ عونؑ و محمدؑ کی شمر سے گفتگو اور حضرت زینبؑ کی ناراضی	۴۱۸
۲۱۷	مثال ۶۔ حضرت حرؑ کی شہادت۔ اور حضرت زینبؑ کا اپنے بیٹوں کو اُنکی مثال دیکر شہادت کی ترغیب دینا	۴۲۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۱۸	مثال ۷۔ حضرت علی اکبرؑ کا پھوپی اور ماں سے اجازت جنگ طلب کرنا۔ دونوں کا اضطراب اور سوال و جواب	۴۲۴
۲۱۹	مثال ۸۔ عونؑ و محمدؑ کا زخمی ہو کر خیمہ میں آنا اور حضرت زینبؑ کے بین۔	۴۳۰
۲۲۰	مثال ۹۔ شیریں کا خبر آمد امام حسینؑ پانا اور مہمانی کا سامان کرنا۔	۴۳۴
۲۲۱	مثال ۱۰۔ حضرت شہربانو کی اہلحرم سے رخصت	۴۳۶
۲۲۲	**رزمیہ**	۴۴۳
۲۲۳	مرثیہ گویوں کے رزمیہ مضامین کی خوبیاں	״
۲۲۴	مرثیہ کی رزم کو شاہنامہ اور سکندرنامہ کی رزم پر فضیلت۔	۴۴۴
۲۲۵	مرزا صاحب کے رزمیہ مضامین کی مثالیں	״
۲۲۶	۱۔ سپاہیوں کی آمادگی جنگ (فوج امام حسینؑ)	״
۲۲۷	۲۔ حملہ کا زور و شور۔ فوجوں کی ہل چل	۴۴۵
۲۲۸	۳۔ فوجوں کی ابتری اور ہل چل	۴۴۷
۲۲۹	رجز	۴۴۸
۲۳۰	امام حسینؑ کی زبان سے پہلوانی اور بہادری کے عوض فضیلت و شرف کا اظہار۔	״
۲۳۱	عام رجز کے قاعدہ سے بعض بعض جگہ شجاعت و قوت کا اظہار۔	۴۵۲
۲۳۲	گھوڑے پر سوار ہونا	۴۵۲
۲۳۳	دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنون جنگ	۴۵۳
۲۳۴	**گھوڑا**	۴۵۹
۲۳۵	گھوڑے کا خد و خال۔ اور چہرہ مہرہ	״
۲۳۶	گھوڑے کی سرعت اور چل پھر	۴۶۲
۲۳۷	گھوڑے کی سرعت کے متعلق مرزا صاحب اور میر صاحب کے ایک ہم مضمون شعر کا مقابلہ	۴۶۶
۲۳۸	**تلوار**	״
۲۳۹	تلوار کی تعریف کے متعلق مؤلف کا مرزا صاحب پر اعتراض۔ اور اسکا جواب	۴۶۷
۲۴۰	تلوار کا سراپا	״
۲۴۱	تلوار کا کاٹ	۴۶۹
۲۴۲	تلوار کا میان سے جدا ہونا	۴۸۰
۲۴۳	تلوار کے جوہر	۴۸۱
۲۴۴	رزم کے بیان میں عشقیہ الفاظ کا استعمال	۴۸۳
۲۴۵	رزم کے بیان میں مرزا صاحب کے کلام سے رنگین اشعار	۴۸۴
۲۴۶	**سلام**	۴۸۵
۲۴۷	**رباعیات**	۴۹۳
۲۴۸	**اعتراضات** (یعنی اعتراضات مولف نسّاخ بر میر انیس)	۴۹۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۴۹	اعتراضات کے متعلق ایک مسلّمہ اصول	۴۹۷
۲۵۰	پہلا اعتراض۔ سر بسر اور آدر کا قافیہ۔ اسکا جواب	۴۹۹
۲۵۱	دوسرا اعتراض۔ ایطا مثلاً دو مقام پر شہ مرداں لکھا۔ اسکا جواب	۵۰۰
۲۵۲	اسکے متعلق مؤلف کا غلط اور بے ٹھکانے جواب	۵۰۱
۲۵۳	حروف کا تقطیع میں گر جانا	″
۲۵۴	انشا پردازی کے متعلق مولف کی ایک فاش غلطی	۵۰۲
۲۵۵	تیسرا اعتراض۔ کونین کا عالی۔ اسکا جواب	″
۲۵۶	چوتھا اعتراض۔ رنگ فق سے ہو گیا۔ محاورہ نہیں۔ اسکا جواب۔	۵۰۳
۲۵۷	**اعتراضات مؤلف بر میر انیس**	۵۰۴
۲۵۸	پہلا اعتراض۔ میر صاحب نے صفا بمعنی صاف لکھا۔ اسکا جواب۔ اور صفا بمعنی صاف کی نظیریں۔ ذوق۔ آتش۔ داغ۔ رند۔ حاتم حالی کے کلام سے۔	″
۲۵۹	دوسرا اعتراض۔ پروانگی نظم کیا ہے جو غلط ہے۔ اسکا جواب۔	۵۰۶
۲۶۰	تیسرا اعتراض۔ طیوران جمع الجمع کا استعمال غلط ہے۔ اسکا جواب	″
۲۶۱	جمع الجمع کے استعمال کی مثالیں شعرائے فارس کے کلام سے	″
۲۶۲	ایضاً۔ شعرائے اردو کے کلام سے	۵۰۷
۲۶۳	ایضاً۔ مولوی شبلی صاحب کے کلام سے	۵۰۸
۲۶۴	چوتھا اعتراض۔ حصول بمعنی حاصل نظم کرنا غلط ہے۔ اسکا جواب	″
۲۶۵	حصول بمعنی حاصل کی نظیریں مستند شعرائے اردو کے کلام سے	″
۲۶۶	ایضاً۔ مرثیہ گویوں کے کلام سے	۵۰۹
۲۶۷	لفظ حصول کے علاوہ دیگر مصادر کا استعمال فاعل کے معنوں میں	۵۱۰
۲۶۸	بعض مصادر کا استعمال مفعول کے معنوں میں	۵۱۱
۲۶۹	پانچواں اعتراض۔ لاتعد۔ اور عبدود کا قافیہ غلط ہے۔ اسکا جواب۔	″
۲۷۰	چھٹا اعتراض۔ لفظ فرار بمعنی فرار نظم کرنا اسکا جواب۔	۵۱۲
۲۷۱	اس اعتراض کے متعلق مولف کی ایک صریح غلطی	″
۲۷۲	ساتواں اعتراض۔ لفظ تغیری پر۔ اسکا جواب	۵۱۴
۲۷۳	لفظ تغیری کے استعمال کی مثالیں شعرائے مستند کے کلام سے	″
۲۷۴	آٹھواں اعتراض۔ لفظ خوشی بمعنی خوش اسکا جواب۔	

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۷۵	لفظ خوشی بمعنی خوش کی نظیریں مستند شعرا کے کلام سے	۵۱۵
۲۷۶	**میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ**	۵۱۷
۲۷۷	قوم کا دونونکو مدمقابل تسلیم کرنا اور مولف کا پیچ و تاب	״
۲۷۸	مرزا صاحب اور میر صاحب کا باہم خلوص	۵۱۸
۲۷۹	**فصاحت**	״
۲۸۰	مرزا صاحب پر مولف کا فصاحت کے متعلق اعتراض کرنا۔	״
۲۸۱	**پہلی وجہ۔** ثقیل الفاظ کا استعمال معہ امثلہ اسکا جواب	״
۲۸۲	کسی شاعر کا کلام ایک سانچہ میں ڈھلا ہوا نہیں ہوتا	۵۱۹
۲۸۳	پرانے اور نئے زمانے کے کلام میں فرق ہوتا ہے	״
۲۸۴	مرزا صاحب کے کلام میں دوسرے لوگونکے کلام کا الحاق	۵۲۱
۲۸۵	چند ثقیل الفاظ جو مولف نے مرزا صاحب کے کلام سے پیش کیے ہیں وہ بعینہ میر صاحب کے کلام میں بھی موجود ہیں اور انکی مثالیں۔	״
۲۸۶	چند ثقیل الفاظ میر صاحب کے پرانے مرثیونمیں اور بھی پائے جاتے ہیں۔ انکی نظیریں	״
۲۸۷	**دوسری وجہ۔** مرزا صاحب کے کلام میں بقول مولف صفائی نہونیکی، بندش کی سستی ہے اسکا جواب۔	
۲۸۸	اشعار کی خوبی اور مولف میں مذاق صحیح کی کمی	۵۲۲
۲۸۹	مولف میں مذاق صحیح نہونیکے بارہ میں مولوی اسلم صاحب جیراجپوری کی رائے	۵۲۳
۲۹۰	مرثیوں پر اعتراضات اور انکے متعلق ایک لمبی تمہید	״
۲۹۱	مرزا صاحب کے مرثیونمیں الحاق اور تحریف	۵۲۴
۲۹۲	مرثیہ گویونکو نظر ثانی کا موقع نہ ملنا اور اسکی وجہ	״
۲۹۳	ممبران خاندان دبیر و انیس کی بے توجہی اور تصحیح کلام میں بے پرواہی	۵۲۵
۲۹۴	**بندش کی سستی** کے متعلق اعتراضات اور انکے جوابات۔	۵۲۶
۲۹۵	**پہلا اعتراض۔** اے دبدبۂ نظم الخ۔ اسکا جواب	״
۲۹۶	**دوسرا اعتراض۔** بولا علم خدہ فلک پر الخ اسکا جواب۔	۵۲۷
۲۹۷	**تیسرا اعتراض۔** میں کون ہوں صاحب علم الخ اسکا جواب۔	۵۲۹
۲۹۸	**چوتھا اعتراض۔** مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ الخ اسکا جواب۔	״
۲۹۹	**پانچواں اعتراض۔** مضمون تر و تازہ ہے چستی میں یگانہ الخ اسکا جواب۔	۵۳۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۰۰	چھٹا اعتراض۔ حامی جو سلیمان دو عالم نظر آئے الخ اسکا جواب۔	۵۳۲
۳۰۱	ساتواں اعتراض۔ کب شعلۂ نحس نور کی قندیل کو پہونچے الخ اسکا جواب	۵۳۴
۳۰۲	لقب کے عوض القاب نظم کرنیکے اعتراض کا جواب	۵۳۵
۳۰۳	چند الفاظ جمع جنکو مثل واحد استعمال کرتے ہیں مثلاً القاب۔ اسباب۔ اصول وغیرہم اور ان سب کی نظیریں فارسی اُردو شعرا کے کلام سے۔	״
۳۰۴	آٹھواں اعتراض۔ سرکار ہی ہر مجلس شبیر ہماری اسکا جواب۔	۵۳۷
۳۰۵	نواں اعتراض۔ قابل میں سخن کے ہوں سخن سے مرے قابل۔ اسکا جواب	۵۳۸
۳۰۶	دسواں اعتراض۔ ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی الخ۔ اسکا جواب	۵۴۱
۳۰۷	گیارہواں اعتراض۔ خامہ ہی فروتن مرا افراطِ ادب سے الخ۔ اسکا جواب	۵۴۲
۳۰۸	بارہواں اعتراض۔ شیریں سخنی کا ہنر اکبرؑ سے لیا ہی۔ الخ۔ اسکا جواب	۵۴۳
۳۰۹	تیرہواں اعتراض۔ بیہوش ہی بجلی یہ سمند انکا ہی ہشیار الخ۔ اسکا جواب	۵۴۴
۳۱۰	تیسری وجہ۔ تعقید۔	۵۴۶
۳۱۱	مولوی شبلی کا مرزا صاحب کے مصرعونکے الفاظ تبدیل کردینا اور اسکی چند مثالیں	״
۳۱۲	استعارات و تشبیہات	۵۴۸
۳۱۳	مضمون بندی و خیال آفرینی	״
۳۱۴	بلاغت	۵۵۰
۳۱۵	مولف کے مرزا صاحب پر بلاغت کے متعلق اعتراضات	״
۳۱۶	پہلا اعتراض۔ تم جانو جہاں سے شہ عالی کو لے آؤ۔ اسکا جواب	״
۳۱۷	دوسرا اعتراض۔ ناگہاں بالی سکینہؑ نے مچل کر یہ کہا الخ۔ اسکا جواب	۵۵۱
۳۱۸	اسی قسم کے مضمون کی میر صاحب کے کلام سے تین نظیریں	۵۵۲
۳۱۹	تیسرا اعتراض۔ گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس سے حقیر ہوں الخ۔ اسکا جواب	۵۵۳
۳۲۰	چوتھا اعتراض۔ نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا اسکا جواب	۵۵۴
۳۲۱	پانچواں اعتراض۔ یہ بات سُنکے بنڑی نے گھونگٹ اُلٹ دیا الخ۔ اسکا جواب	״
۳۲۲	اسی اعتراض کا ضمیمہ۔ ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا الخ۔ اسکا جواب	۵۵۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۲۳	شاعری کی اصلی بنیاد اور قوت متخیلہ وقوت ممیزہ کا باہمی تعلق	۵۵۷
۳۲۴	چھٹا اعتراض۔ کہا سجادؑ سے کبرؑا نے یہ اُسدم رو رو الخ۔ اسکا جواب	〃
۳۲۵	ساتواں اعتراض۔ اور مرگئی تو خیر جو اللہ کی رضا الخ۔ اسکا جواب	۵۵۸
۳۲۶	کسی شاعر کا کلام اس قسم کی معمولی مسامحات سے خالی نہیں	〃
۳۲۷	میر صاحب کے کلام سے اس قسم کے مضامین کی چند مثالیں بطور نظیر	۵۵۹
۳۲۸	**میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے اور اشعار**	۵۶۴
۳۲۹	(۱) متحد المضمون مرثیے	〃
۳۳۰	میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیوں کا مقابلہ اور مولف کا تعصب	۵۶۷
۳۳۱	پہلا مقابلہ۔ پردہ کا اہتمام۔ اسپر اعتراض اور اسکا جواب	〃
۳۳۲	پردہ کے اہتمام کے متعلق مرزا صاحب کے بندوں میں مولف کی تحریف	۵۶۸
۳۳۳	پردہ کے اہتمام کے متعلق مرزا صاحب کے دوسرے مرثیہ کے موزوں اور مناسب بند	۵۶۹
۳۳۴	پردہ کے اہتمام کے متعلق مرزا صاحب کے بعض بندوں میں (جن پر مولف معترض ہیں) چار خاص اور دلچسپ بلاغتیں	۵۷۱
۳۳۵	دوسرا مقابلہ۔ وقت رخصت حضرت صغرا کی آزردگی۔ اسپر اعتراض۔ اُسکا جواب	۵۷۲
۳۳۶	تیسرا مقابلہ۔ حضرت صغرا کا علی اصغر سے خطاب۔ اسپر اعتراض۔ اسکا جواب	۵۷۵
۳۳۷	مرزا صاحب کے دوسرے مرثیوں میں سے حضرت صغرا اور حضرت علی اصغر کی رخصت کے نہایت درد انگیز بند جن کا مولف نے بوجہ تعصب انتخاب نہیں کیا۔	۵۷۷
۳۳۸	چھوٹے مسافر کا جواب۔ اور اس لفظ کی نظیریں دوسرے شعرا کے کلام سے	۵۷۹
۳۳۹	حضرت صغرا و اصغر کی رخصت کے متعلق مرزا صاحب کے بندوں میں (بجائے اعتراض کے) جو جو خاص اور دلچسپ نکات بلاغت پائے جاتے ہیں اُنکی مفصل تشریح	〃
۳۴۰	چوتھا مقابلہ۔ ادنی و اعلی کا مقابلہ۔ اسپر اعتراض اور جواب	۵۸۱
۳۴۱	پانچواں مقابلہ۔ قید خانہ کے واقعات اسپر اعتراض اور جواب	۵۸۲
۳۴۲	اس مضمون کے متعلق مرزا صاحب کے دوسرے بند	۵۸۳
۳۴۳	چھٹا مقابلہ۔ علی اصغر کے لیے پانی مانگنا	۵۸۵
۳۴۴	امر دوم کسی مضمون کے ادا کرنے میں مرزا دبیر کی فوقیت	〃
۳۴۵	پہلا مقابلہ حضرت زینب کے بین بیٹوں کی لاش پر	۵۸۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۴۶	دوسرا مقابلہ۔ ایک غلط خبر کی تردید	۵۸۷
۳۴۷	تیسرا مقابلہ۔ جناب امیر مٹیوں سے اپنے قاتل کی سفارش فرماتے ہیں۔	۵۹۰
۳۴۸	چوتھا مقابلہ۔ کربلا میں امام حسینؑ کا حضرت مسلم کی خبر معلوم کرنیکے واسطے تردد	۵۹۱
۳۴۹	پانچواں مقابلہ۔ امام حسینؑ کا حضرت اصغرؑ کیواسطے پانی مانگنا۔	۵۹۲
۳۵۰	چھٹا مقابلہ۔ حضرت زینبؑ کا بیٹوں کے دل سے علم نہ ملنے کی آزردگی رفع کرنا	۵۹۶
۳۵۱	متحد المضمون اشعار	۶۰۰
۳۵۲	(الف) میر انیس کی فوقیت اور مولف کے مذاق کا قصور	//
۳۵۳	پہلا موازنہ۔ مثل تنور گرم تھا الخ۔ اسپر اعتراض اور جواب	//
۳۵۴	دوسرا موازنہ۔ چاہوں تو بیٹھے بیٹھے الخ اسپر اعتراض اور جواب	۶۰۱
۳۵۵	تیسرا موازنہ۔ تھانیزوں کو رعشہ الخ۔ اسپر اعتراض اور جواب	۶۰۲
۳۵۶	چوتھا موازنہ۔ چلا ہاتھ مل کے جلاجل الخ اسپر اعتراض اور جواب	۶۰۳
۳۵۷	پانچواں موازنہ۔ یوں جسم رعشہ دار سے الخ اسپر اعتراض اور جواب	۶۰۵
۳۵۸	(ب) مرزا دبیر کی ترجیح	۶۰۷
۳۵۹	پہلا موازنہ۔ لو آفتاب خانۂ زیں میں سے جلوہ گر	//
۳۶۰	دوسرا موازنہ۔ کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور	//
۳۶۱	تیسرا موازنہ۔ قبضہ تو رہا دست حنا بشہ دیں میں	۶۰۸
۳۶۲	چوتھا موازنہ۔ الٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا	//
۳۶۳	دونوں صاحبوں کے مختلف ہم مضمون اشعار	۶۰۹
۳۶۴	خاتمۃ الطبع	۶۱۰

[illegible]

المیزان

یعنی مولوی شبلی نعمانی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر پر محققانہ و منصفانہ ریویو
اور مرزا دبیر کے ہر قسم کے فصیح و بلیغ اور صاف و سلیس کلام کا نمونہ
اور میر انیس و مرزا دبیر پر اعتراضات کے مدلل و مفصل جوابات

مؤلفہ

عالیجناب مولوی چودھری سید نظیر الحسن صاحب فوق رضوی
رئیس مہابن ضلع متھرا

حافظ عبد اللطیف پرنٹر کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڈھ میں چھپی
اور جناب مؤلف کتاب نے مہابن سے شائع کی

قیمت فی جلد قسم اول عفا ۱۴ قسم دوم عفا ۴ [illegible] جملہ حقوق بذریعہ رجسٹری محفوظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے خار و خسِ بحرِ ثنائے تو سخنہا	گنجینۂ گوہر زمدیحِ تو دہنہا

الحمدُ للہ المُفضِلِ المنعام - والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ نبیّنا سیّد الانام
وآلہ الطیّبین الکرام

HYDERABAD STATE LIBRARY
آصفیہ

تمہید

اس کتاب کے پڑھنے سے قبل امور ذیل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) یہ کتاب مولوی شبلی صاحب کی کتاب موازنہ انیس و دبیر کا لفظ بہ لفظ جواب ہے اگرچہ ہم نے جواب دیتے وقت مولوی صاحب کی پوری عبارت نقل کر دی ہے، لیکن اگر موازنہ کو سامنے رکھ کر پہلے اُنکے مضمون کو پڑھ لیا جائے اور پھر ہماری تحریر دیکھی جائے تو غالباً زیادہ لطف حاصل ہوگا اور انصاف کا موقع ہاتھ آئیگا۔

(۲) مرزا صاحب کے مرثیوں کا جو انتخاب اس کتاب میں کیا گیا ہے اُنکے بعض بعض مصرعوں میں مطبوعہ مرثیوں کے لحاظ سے کچھ تغیر و تبدل نظر آئیگا: اس کی وجہ یہ ہے کہ جلدوں میں اکثر الفاظ غلط اور مُخل طبع ہو گئے ہیں کہیں کے بند کہیں اور کہیں کے مصرعے کہیں لگا دیئے ہیں، لہذا ایسے مقامات پر ہم نے قلمی مرثیوں اور اپنی یاد سے کام لیا ہے یعنی جس طرح مجالس میں اُن مرثیوں کو سُنا ہے اور وہی صحیح معلوم ہوا ہے تو اُسی طرح درج کیا گیا ہے۔

(۳) مرزا صاحب کے بعض بعض مرثیوں میں کچھ بند مکرّر چھپے ہوئے ہیں، اس کتاب میں مختلف عنوانات میں جو جو مرثیے درج کیے ہیں اُن میں ہمنے مکرّرات کو حذف کر دیا ہے؛ لیکن جہاں یہ معلوم ہوا ہے کہ مکرّرات کو حذف کرنے سے سلسلۂ کلام ناقص ہو جائیگا اُن مقامات پر مجبوراً ہم نے بھی اُن بندوں کو مکرّر درج کر دیا ہے۔ ناظرین اس مجبوری کو معاف فرمائیں۔

(۴) صرف ایک یا دو مقام پر بعض بند شروع سے آخر تک مکرّر درج ہیں۔ اُسکا یہ مطلب ہے کہ اُن کو ایک جگہ بلحاظ فصاحت و روانیِ الفاظ اور دوسرے مقام پر بلحاظ بلاغت معانی دکھایا گیا ہے۔

(۵) جن مقامات پر جلدوں اور اُنکے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں بنظر اختصار صرف ہندسوں کو کافی سمجھا ہے۔ مثلاً ۴/۱۲ کا یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ جلد چہارم۔ صفحہ ۱۲۔

(۶) ہماری کتاب پڑھتے وقت ناظرین یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رکھیں کہ گو ہم یہ کتاب مرزا صاحب کے دفع الزام کے واسطے لکھ رہے ہیں، لیکن میر صاحب اعلی اللہ مقامہ کی نسبت جنکا اعتقاد ہم کو مولوی شبلی صاحب سے بہت زیادہ ہے، کوئی خلافِ ادب لفظ نہیں لکھا۔ جن مقامات پر مولوی شبلی صاحب نے مرزا صاحب پر اعتراضات کیے ہیں

اُنھوں نے فلاں مضمون یا فلاں لفظ خلافِ بلاغت و فصاحت لکھا ہے، اُسکے جواب میں ہم نے اُسی قسم کے اشعار میر صاحب مرحوم کے درج کیے ہیں۔ اس سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ میر صاحب پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے۔ بلکہ مرزا صاحب پر جو اعتراض کیا گیا ہے اُسکے رفع کرنے کی غرض سے میر صاحب کے کلام سے استناد کیا ہے، یعنی ازبسکہ میر صاحب نے بھی ایسا لکھا ہے اسلیے صحیح ہے اور یہ لفظ مولوی شبلی صاحب کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا؛ غالباً مولوی صاحب کے ساکت کرنے کے واسطے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ میر صاحب کا کلام بطور سند پیش کیا جائے۔

(۷) ہم کو اُن سوقیانہ الفاظ پر بھی اعتراض اور افسوس ہے جو شبلی صاحب نے مرزا صاحب جیسے عالم و عابد۔ دیندار و خداپرست۔ زاہد و متقی۔ پاک باطن پاک نفس۔ مقدس و واجب التعظیم بزرگ کی نسبت اکثر مواقع پر لکھے ہیں۔ ایک مسلمان اور ذی علم شخص سے یہ امر کسقدر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگانِ قوم اور مداحانِ **اہلِ بیت** علیہم السّلام کا احترام بالکل فراموش کر دے۔ ممکن ہے کہ مولوی صاحب مرزا صاحب کے کلام کی عظمت نہ کریں، لیکن کم سے کم اُن کی ذات بابرکات کا تو ادب و وقار ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔ یہ عنایت اُنھوں نے صرف مرزا صاحب ہی پر نہیں کی بلکہ شعرالعجم میں فارس کے دیندار و متقی شاعروں میں بھی کسی کو امرد پرست کہتے ہیں۔ کسی کو شراب خوار۔ کسی کو رند و اوباش؛ اور اس کی بنیاد صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ اُن کے اشعار سے ایسا پایا جاتا ہے۔

(۸) چونکہ یہ امر مسلّم الثبوت ہے کہ کسی شاعر کا کلام بلحاظ فصاحت و بلاغت۔ شستگی و روانی۔ یکساں نہیں ہوتا، اسلیے اس کلیہ کے مطابق میر صاحب اور مرزا صاحب

کے کلام میں بھی تین مدارج ہیں۔ اوّل جہاں کسی مشترک مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب بڑھ گئے ہیں۔ دوسرے جہاں مرزا صاحب کو فضیلت حاصل ہے۔ تیسرے جہاں دونوں صاحبوں کا کلام بلحاظِ فصاحت و بلاغت وطرزِ بیان یکساں واقع ہوا ہے۔

امر اوّل کو مولوی شبلی صاحب نے اپنی کتاب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے؛ یعنی آخر کتاب موازنہ میں اُنھوں نے وہ متحد المضمون اشعار لکھے ہیں جہاں میر صاحب بڑھ گئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کا انتخاب غلط اور ناقص ثابت ہوا، اسوجہ سے ہمکو مجبوراً اُنکے خیال کی تردید کرنی پڑی ہے۔ کاش مذاقِ صحیح اور وجدانِ سلیم اُن کی رہنمائی کرتا، اور اُن کی پُرزور طبیعت لطافتِ اشعار اور حُسنِ کلام کو بخوبی جانچ سکتی تو میر صاحب کا ایسا نفیس کلام بہت مل سکتا تھا جہاں وہ فی الواقع مرزا صاحب سے بڑھ گئے ہیں۔

امر دوم کو یعنی جہاں مرزا صاحب کے کلام کو ترجیح ہے، ہم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے

امر سوم یعنی جہاں دونوں صاحبوں کا کلام یکساں واقع ہوا ہے۔ یہ مقامات نہایت دلچسپ و دلاویز۔ پُرلطف اور قابلِ دید ہیں؛ جہاں ہر ایک باکمال شاعر کی قابلیت۔ قادر الکلامی۔ زورِ طبیعت۔ اور خصوصیاتِ کلام کا خوب اندازہ ہوتا ہے، اور نکتہ سنج ناظرین معلوم کر سکتے ہیں کہ دونوں بزرگوں نے اپنی دلکش نظموں میں ایک ہی قسم کے واقعہ کو الگ الگ انداز سے ادا کر کے کلام میں کسقدر جوش اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے اس مقام کو مختصراً کچھ لکھا بھی تھا لیکن چونکہ کتاب کا حجم بڑھ گیا تھا اور یہ بحث بہت وسیع اور ایک علیحدہ تالیف کی متقاضی تھی۔ لہذا اس مقام کو بالکل چھوڑ دیا۔

(۹) ایک کتاب حیات دبیر میرے دوست میر افضل حسین صاحب ثابت

لکھنوی بھی لکھ رہے ہیں۔ اُنکا موضوع تو فقط مرزا صاحب کی سوانح عمری تحریر کرنا ہی، مگر سُنا گیا ہی کہ ضمناً دو چار مقامات پر اختصار کے ساتھ اُنھوں نے موازنۂ مولوی شبلی صاحب کا بھی جواب دیا ہی۔ مگر اس امر کا افسوس ہے کہ اُن کی کتاب اور میری کتاب ایک ہی زمانہ میں پریس میں بھیجی گئیں، اسلیے نہ تو میں اُنکی کتاب سے مستفیض ہو سکا نہ اُن کو میری کتاب کے دیکھنے کا موقع ملا۔ شاید کسی مقام پر توارد ہو گیا ہو تو معلوم نہیں۔

(۱۰) چونکہ مجکو کتاب کی صحّت کا بیحد خیال رہتا ہے، اسلیے اس کتاب کی تصحیح میں معمول سے زیادہ جانکاہی۔ محنت اور توجہ سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ اہالیانِ مطبع فیض عام نے اس بات کا اقرار کیا کہ جسقدر توجہ صحتِ کتاب کے متعلق آپ کرتے ہیں شاید ہی کوئی مصنّف کرتا ہو۔ سب سے پہلے میں نے منشی محمد اسمٰعیل صاحب علیگڈھی خوشنویس کاتبِ کتاب ہذا پر سخت تاکید رکھی کہ نہایت غور و توجّہ سے کتابت کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے مہربانی فرما کر خاص توجّہ اور غور سے کتابت کی ہے اور ہر چھوٹی چھوٹی غلطی کو میری ہدایت کے مطابق صحیح اور درست کیا ہے۔ پھر میں نے خود بڑے غور سے چار چار بار کاپیوں کو دیکھا ہے اور اسکے بعد کئی کئی بار پروفوں پر نظر ڈالی ہے۔ میرے دیکھنے کے بعد میرے عنایت فرما ماسٹر گھاسی رام صاحب ملک نے جو علمی قابلیت کے علاوہ مذاقِ شعر و سخن بھی رکھتے ہیں، کئی کئی بار ان کاپیوں اور پروفوں کو نہایت توجّہ اور محنت سے دیکھا ہی۔ پھر کارپردازانِ مطبع فیض عام خصوصاً منشی عبدالکبیر صاحب مالک مطبع نے نہایت جانکاہی سے پتھر پر غلطیوں کی صحّت کی ہے اور جا بجا بیلوں وغیرہ سے اسکے خوشنما بنانے میں معمول سے زیادہ توجّہ

کی ہے، جسکا میں بیحد ممنون ہوں ۔ کام کے دیکھنے کی غرض سے میں خود بار بار مطبع میں گیا ہوں ۔ اتنی کوششوں اور محنتوں کے بعد انشاء اللہ کتاب میں بہت کم غلطیاں رہی ہونگی ۔ لیکن ازبسکہ سہو بشریت لازمی ہے بعض مقامات پر دو چار غلطیاں نظر آتی ہیں لیکن وہ معمولی محض نقطوں وغیرہ کی غلطیاں ہیں جو بادی النظر میں معلوم بھی نہیں ہوتیں اور جن کو قابل ناظرین کتاب خود ہی درست کرلیں گے ۔ اسی وجہ سے میں نے غلطنامہ نہیں لگایا کیونکہ ایسی چھوٹی اور خفیف غلطیوں کے واسطے غلطنامہ محض بیکار اور فضول ہے ۔

اصل یہ ہے کہ کتاب کا صحیح چھپوانا اور صحت میں کوشش کرنا بھی مصنف کے واسطے ایک جانکاہ مصیبت ہے اور میرے خیال میں کوئی شخص پورے طور پر اس کام سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ۔ مولوی شبلی صاحب نے شعر العجم میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "دنیا میں ناممکنات کی ابتک جو فہرست تیار ہوچکی ہے، اس میں ایک نمبر "کتاب کا صحیح چھپنا" بھی اضافہ کرنا چاہیے، یہ مصیبت مدت سے مجکو پیش آتی ہے لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی ۔ کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

دیباچہ

یک سخن در ہر مذاقے می کند کارِ دگر | از نسیمے گُل پریشاں غنچہ خنداں می شود

جب اُردو شاعری نے پہلے پہل دنیائے سخن میں قدم رکھا، شعرا کی طبع آزمائیاں صرف غزل و قصائد کے دائرے تک محدود تھیں، اور حُسن و عشق کے فسانے اور گُل و بلبل کی داستانیں گرمیِ صحبت کا باعث ہوتی تھیں۔ یہانتک کہ ایک زمانہ آیا کہ بعض خوش اعتقاد شعرا نے غزل گوئی کے کوچے سے باہر نکل کر مداحِ اہلبیتؑ کے حلقے میں قدم رکھا۔ ابتدا میں مرثیے اور سلام پُرانے طریقے پر لکھے جاتے تھے جیسا کہ آغازِ ایجاد میں ہوا کرتا ہے، اُن بزرگوں کو ان نظموں سے فقط گریہ و بکا اور حصولِ ثواب مقصود تھا شاعری اور صنائعِ انشا پردازی سے کچھ غرض نہ تھی؛ مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اُن میں بھی جدت۔ صفائی اور فصاحت و بلاغت کی روح پھونکی جانے لگی؛ حتیٰ کہ لکھنؤ کے نازک خیال شعرا نے اس فن کو ترقی کے اُس پایہ پر پہونچا دیا کہ اُس سے زیادہ عروج اب خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ پہلے نامی و گرامی شعرا جنکا نام ابتک اقلیمِ سخن میں گونج رہا ہے خاص خاص اصنافِ

ابتدائے غزل گوئی

ابتدائے مرثیہ گوئی

سخن پر قادر رہے ہیں، کوئی غزل گو تھا کوئی قصیدہ گو، کوئی رزم کا دھنی تھا کوئی بزم کا، کوئی بہاریہ اشعار اچھے لکھتا تھا کسی کو دردانگیز مضامین تحریر کرنے میں یدِطولیٰ حاصل تھا؛ مگر مرثیہ گویوں نے ہر ایک صنف سخن پر اپنی قادرالکلامی کے ایسے بیّن ثبوت دیئے ہیں کہ اُردو شاعری جسقدر اُن کی ذات پر ناز کرے کم ہے۔ مرثیوں کے دیکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اصنافِ سخن میں سے کوئی صنف باقی نہیں رہی جسمیں مداحانِ اہلبیتؑ نے اپنی جادو بیانی کے جوہر نہیں دکھائے۔

مرزا دبیر اور میر انیس کی شاعری

مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر اور میر انیس نے اس فن کو اُس درجے تک پہونچا دیا جس سے آگے ترقی کا رستہ بند ہوگیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف مرثیہ گویوں بلکہ نکتہ سنج شعرا میں یہی دو بزرگوار ہیں جو آسمانِ بلاغت کے مہر و ماہ کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کا ایک ایک مرثیہ بلاغت کا تاجِ سر، اور ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک لفظ پیکرِ فصاحت کی جان ہے۔

اخلاقی مضامین

ان بزرگوں نے اپنے پُرزور کلام سے نہ صرف مذہبی ضرورت کو پورا کیا ہے، بلکہ پند و موعظت۔ عقائد و دینداری۔ عظمت و جلالِ الٰہی۔ نیرنگیِ دہر۔ بے ثباتیِ عالم۔ زہد و اتقا۔ صبر و قناعت وغیرہم کے بیشمار مضامین، اور وہ اعلیٰ اخلاقی اصول، جو دنیا و عقبیٰ دونوں کے لیے مفید، اور تکمیلِ اخلاق کیواسطے ضروری ہیں، ایسے دلکش انداز اور موثر الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ بے اختیار دلوں میں سرایت کر جاتے ہیں۔ خود عظیم الشان معرکۂ کربلا جو مرثیہ گوئی کا موضوع ہے، اُسکے تمام واقعات پر باریک بین نگاہ سے جسقدر غور و خوض کیا جاتا ہے اور اُن کو جس پہلو اور جس انداز سے دیکھا جاتا ہے، حُسنِ اخلاق کے بے شمار نمونے ملتے ہیں، چنانچہ اس بحث کو کسی قدر

تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب حسناتِ محرّم میں بیان کیا ہے۔ یورپ کے منصف مزاج اور جلیل القدر مورّخ آجتک واقعۂ کربلا میں نئے نئے نکات نکال کر امام علیہ السلام کی اعلیٰ درجہ کی مدبّری۔ دانائی۔ عاقبت اندیشی اور مستقل مزاجی کو دنیا کی نگاہوں میں جلوہ گر کر رہے ہیں، اور مرثیوں میں ان سب باتوں کو بہت خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ مولوی حالی فرماتے ہیں کہ "مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق صرف نہیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے، بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیے میں بیان کیے ہیں اُن کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملیگی"[1] فضائل کے اشعار سے دلوں میں بزرگانِ دین کی عقیدت و محبت کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے، اور خاندانِ نبوّت کے ساتھ رشتۂ محبت و اخلاص جو کہ اسلام کی جڑ ہے مضبوط، اور اُس کی سچّی اور حقیقی عظمت و شان کا اعتقاد مستحکم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اہلبیت علیہم السلام کے اصلی مراتب ظاہر کرنے سے شاعری مطلقاً مجبور ہے، کیونکہ اُن کے فضائل و مناقب شاعرانہ مبالغوں کے وسیع دائروں میں بھی نہیں سما سکتے اور وہم و خیال بھی اُن کے ادراک سے عاجز ہے۔ لیکن جہانتک ایک شاعر کے امکان میں ہے مدّاحانِ اہلبیتؑ نے اُن کے بیان کرنے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ بیشمار تاریخی روایات نظم کی ہیں، جن میں ائمہ علیہم السّلام اور اُن کی ذریتِ اطہار کی پاکیزہ اور قابلِ تقلید زندگی کے نمونے دکھا کر، ہزاروں مثالیں صبر و استقلال۔ انسانی ہمدردی۔ ایثار علی النفس۔ پاسِ حق۔ ثابت قدمی۔ عفو و ترحم کی پیشِ نظر کر دی ہیں؛ تاکہ سُننے والے اُنکے

---

[1] مقدمۂ شاعری صفحہ ۱۸۳

طرزِ عمل سے عمدہ سبق حاصل کریں، اور عقائد میں پختگی۔ دماغوں میں روشنی۔ دلوں میں صفائی۔ خیالات میں پاکیزگی اور ارادوں میں بلندی پیدا ہو۔ اخلاقی یا مذہبی مضامین کا نظم میں موجود ہونا ہر قوم کیواسطے ایک بے بہا نعمت سمجھا جاتا ہی، کیونکہ کسی مضمون یا مطلب کو بخوبی ذہن نشین کر دینے اور طبیعت کو متاثر بنا دینے میں، نظم سے زیادہ کسی چیز کو دخل نہیں۔ شاعری ہمیشہ خاص خاص اشیا اور خاص خاص جذبات کا ایک دلچسپ نقشہ کھینچ دیتی ہی، اور اُس کے ذریعہ سے ہماری قوتِ متخیلہ حرکت اور جوش میں آجاتی ہے۔

شاعری کا خیالات و جذبات پر اثر

معرکۂ کارزار میں رجز کے ایک شعر سے بہادروں کے دریاے شجاعت میں بلا کا تلاطم، اور رگِ حمیت میں غضب کا جوش پیدا ہو جاتا ہی۔ اخلاقی و مذہبی مطالب کے بیان کرنے میں برجستہ نظمیں طبعی جذبات کو ایسا اُبھار دیتی ہیں کہ شعر کے سوز و گداز کے ساتھ ہی مضمون کا اثر بھی بجلی کی طرح دل میں اُتر جاتا ہی اور لطیف نظم کا جادو برسوں تک اُس کے مفہوم کو دل و دماغ سے محو نہیں ہونے دیتا۔ یورپ کا ایک محقق کہتا ہی کہ "مشاغلِ دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوتیں سو جاتی ہیں شعر اُن کو جگاتا ہی۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ سے اخلاق پر ہوتا ہی۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت، اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے"۔ چونکہ اُردو شاعری میں کوئی نظم ایسی نہیں ملتی جس میں مرثیوں کی برابر اخلاقی مضامین کا گراں بہا ذخیرہ موجود ہو، اس لیے ضرورت ہی کہ لوگ اس کلام کو دیکھیں۔ پڑھیں۔ سمجھیں۔ تاکہ علاوہ حصولِ ثواب کے، ان نظموں کے طفیل دینداری اور حسنِ اخلاق

اخلاقی مضامین کی ضرورت

کے مضامین کا ذخیرہ دلوں میں جمع کرنے کا موقع ملے، اور وہ اعلیٰ مطالب نظر سے گذر جائیں جو قوم و ملت کے عقائد و دینداری۔ رسوم و معاشرت۔ تہذیب و تمدن۔ ادب و اخلاق سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

مرثیہ گویوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کا طرزِ سخن جُدا جُدا، اور اظہارِ کمال میں اُنکی رفتار الگ الگ ہی؛ اور چونکہ ہر شخص کو کوئی خاص رنگ مرغوب ہوا کرتا ہی، اسلیے اُن کے قدردانوں کے بھی دو گروہ ہو گئے ہیں؛ ایک گروہ حُسنِ بیان اور سلاست و روانی پر گرویدہ ہی، تو دوسرا مضمون آفرینی و نازک خیالی اور صنائع و بدائع پر مفتون نظر آتا ہی؛ دونوں طرز کمال سے خالی نہیں، البتہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اسلیے پسند میں اختلاف ہی۔ لیکن زبان کی سادگی اور صفائی پر ایسا محو ہو جانا کہ مضمون آفریں شعرا کے کلام کی قدر نہ کرنا، یا فصیح و بلیغ شعرا کی نازک خیالیوں پر گرویدہ ہو کر سلاست پسند سخن آفرینوں پر زبانِ طعن دراز کرنا انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہے۔

اصل یہ ہی کہ شاعری کی ہر قسم اور ہر طرز اپنے اپنے مقام پر قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی گئی ہی۔ یہ وہ جوہرِ اعلیٰ ہی جس کے نور کی شعاعیں ہر وقت اور ہر زمانے میں مطبوعِ خلق اور محبوبِ عالم رہی ہیں، اور اُس کی ہر شان میں شانِ دلربائی پائی گئی ہی۔ کسی قوم کسی مُلک کسی زمانے میں اُس کی مقبولیتِ عام میں کمی نہیں ہوئی؛ مگر اس کا مزاج ہمیشہ رنگ بدلتا آیا ہی۔ یا یوں کہیے کہ جسقدر زمانے کا رنگ بدلتا گیا اُس کی دلفریبیاں بھی اپنی جلوہ آرائیوں میں تراش خراش نکالتی رہیں۔ شاعر کی معراجِ کمال یہی ہی کہ اپنے کلام کو عام پسند بنائے، اور پسندِ عام کا خلعت

زبان کی تبدیلیاں

اُسی وقت مل سکتا ہے جب عام پسندی کا لحاظ رہے اور شعر و سخن کی عمارت زبانِ رائج الوقت کی بنیاد پر قائم کی جائے۔ زبان کی نسبت ہر شخص کو معلوم ہے کہ لٹریچر کی دنیا میں وقتاً فوقتاً انقلاباتِ عظیم پیدا ہوتے رہتے ہیں؛ ایک صدی بلکہ اس سے بھی کم میں ایک مُلک کی زبان کو اُس کی قدرتی ترقی کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے؛ اور اُسکے اصطلاحات و محاورات میں کیسا قابلِ لحاظ اور قابلِ احساس فرق آجاتا ہے۔ پس جبکہ خود زبان ہی محلِ تغیرات ہے، اور دن بدن ترقی کے قدم آگے بڑھاتی رہتی ہے، تو شاعری جو اُسکی پروردۂ آغوش ہے اُس میں بھی نمایاں تغیرات پیدا ہونا لازمی بات ہے؛ کیونکہ زمانے کی رفتار اور زمانے کی تقلید شعرا کو اپنا پابند بنا لیتی ہے، اور اُنہیں زمانے کے مقتضیات کے مطابق زبان میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ جس نسبت سے زبان کو تغیر ہوتا رہتا ہے اُسی نسبت سے شاعری کا پلّہ بھی اونچا ہوتا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک سن رسیدہ شاعر کے ابتدائی اور آخری حصۂ عمر کے کلام میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو جاتا ہے۔

ہر زمانے کی زبان قابلِ قدر ہے

چونکہ زمانے کی حالت کا بدلنا، اور زبان کا درجہ بدرجہ عروج قوتِ بشری کے احاطۂ اختیار سے باہر ہے، اور پسندِ عام اُسی کا ایک ضمیمہ ہے، لہذا کسی نکتہ سنج اور سخن شناس کا یہ کام نہیں ہے کہ ایک زمانے کی زبان کو دوسرے زمانے کی زبان کے مقابل میں کم وقعت خیال کرے۔ کبھی سعدی۔ و حافظ و خسرو کا دور دورہ تھا، تو کبھی نظیری و ظہوری و عرفی و طالب و اسیر کی عملداری تھی؛ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ہر شخص فارسی شاعری کا رکنِ رکین نہ تھا، باوجودیکہ زبان و طرزِ ادا۔ اور خیالات و جذبات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اختلافِ مذاقِ شاعری

رائج الوقت زبان کے علاوہ شعرا کو مختلف مذاق کی متابعت بھی لازمی ہوتی ہے،

کیونکہ اُن کا فرض ہی کہ اپنے قدر دانانِ سخن کے مذاق کا لحاظ رکھیں۔ اگر زمانے کی طبیعت کے خلاف چلتے تو نہ خواجہ حافظ بلبلِ شیراز ہوتے، نہ فردوسیِ طوسی پیغمبرِ سخن، اور نہ ظہوری و عرفی و غالب کے سر پر نازک خیالی کا تاج رکھا جاتا۔ اب کہ انقلابِ دہر نے اُس زمانے کا ورق اُلٹ دیا، اور زمانے کے ساتھ ہی ہمارے مذاق نے پلٹا کھایا، نگاہیں جدید تراش خراش کی جستجو کرنے لگیں۔ لیکن جوہر شناسانِ سخن کے جوشِ قدر دانی نے ہر رنگ کا کلام ابتک محفوظ رکھا ہی، جسپر نگاہ ڈالنے سے بعض بعض کلام ہمارے موجودہ مذاق سے ملتے ہوئے، اور اکثر ہمارے حدِ مذاق سے دُور جا پڑے ہیں۔ ہمارا یہ کہنا کس قدر بیجا ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں اور وہ بہت کچھ ہیں، حقیقت میں ایسا خیال کرنا غلط فہمی اور سمجھ کی کوتاہی ہی، اپنے زمانے میں وہ بھی سب کچھ تھے اور یہ بھی سب کچھ تھے۔ آج جن لوگوں کے کلام سے ہماری طبیعت کو لگاؤ نہیں یہ نہ کہنا چاہیے کہ وہ ہماری طبیعت کے موافق نہیں کہہ سکے، بلکہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ اُس زمانے کا مذاق اور تھا اور ہمارا مذاق اور ہی۔ ہر اُستادِ فن اپنے زمانے کے مذاق کو پہچانتا تھا اور اُس میں کامل تھا، اسلیے وہ آج بھی اُسی قدر و منزلت کا مستحق ہی جس عزت و وقار کا مستحق اپنے زمانے میں تھا۔" ایران میں زمانۂ حال کے شعرا ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کے طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں، جسکا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں۔ لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گرانمائگی میں کچھ فرق نہیں آتا جنکو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔"

۲ یادگار غالب

زبان کی تبدیلی تو برسوں بعد اپنا اثر دکھاتی ہے اور وہ اثر تقریباً تمام ملک میں یکساں ہوتا ہے، لیکن کسی ملک کے ہر خطّے بلکہ ہر خطّے میں طبقے طبقے کا مذاق ایک ہی وقت میں جُداگانہ ہوسکتا ہے، حتّٰی کہ ایک ہی شہر میں شاعری کے متعلق مختلف مذاق کے آدمی ہوتے ہیں، اس ضرورت سے ہر طبقے کے شاعر کو بلحاظ اپنے قدردانوں کے ایک جداگانہ طرزِ کلام اپنے حصولِ شہرت کے لیے اختیار کرنا پڑتا ہے "سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہے وہ سوسائٹی کا دباؤ اور اُس کا مذاق ہے"+ اگر یہ بات نہ ہوتی تو زمانے میں صرف ایک طرزِ کلام کا سکّہ بیٹھ جاتا، اور اُس کے خلاف جو روش اختیار کی جاتی نظروں سے گر جاتی؛ حالانکہ آج دیکھا جاتا ہے کہ ہر شاعر کے کلام میں ایک جُدا شان اور نیا طرز جلوہ گر ہے اور ہر طرز اپنے اپنے زمانے میں مقبول رہا ہے۔

اسی اختلافِ طبائع نے انیس کو انیس اور دبیر کو دبیر بنا دیا، سخن فہموں کے دو گروہ ہوگئے اور اُنھوں نے زباندانی کے میدان میں دو شہسوار کھڑے کر دیئے۔ اگر زمانے کا ایک ہی مذاق ہوتا تو میر صاحب کے مقابل میں مرزا صاحب، اور مرزا صاحب کے مقابل میں میر صاحب کہاں سے آتے۔ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش آخر اسی لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اُستاد ذوق اور مرزا غالب، میر تقی اور مرزا سودا، اسی گلشنِ ہند کے نونہال ہیں، ان سب کی طرزوں میں جو تفاوت تھا اور زمانہ نے ہر طرز کی جیسی کچھ قدردانی کی ان سب باتوں سے کون واقف نہیں؛ یہ سب ہمارے ملک کے اختلافِ طبائع کی روشن نظیریں ہیں۔ اس لحاظ سے

+ یادگارِ غالب

ہماری رائے میں انیسیوں اور دبیریوں کے دو حریف گروہ ایک نازیبا بلکہ شرمناک جنگ و جدل میں مبتلا ہو کر ... فاش غلطی کر رہے ہیں۔ انیسیے مرزا دبیر کو اسوجہ سے نہیں مانتے کہ اُن کے خیال میں مرزا صاحب صفائیِ کلام۔ حُسن بیان۔ روزمرہ لطفِ محاورہ۔ اور روانیِ زبان کے کوچوں سے نابلد تھے، اور دبیریوں کے دلوں میں میر انیس کی اس سبب سے عظمت نہیں کہ اُن کے گمان میں میر صاحب شوکتِ الفاظ۔ بلند پروازی۔ تازگیِ مضامین۔ جدّت طرازی۔ اور بینیہ مضامین سے قطعاً مجبور نظر آتے ہیں۔ مگر بامعانِ نظر دیکھا جائے تو ایسے قادر الکلام اور یکتائے عصر بزرگوں کی شان میں، جنھوں نے مرثیہ گوئی بلکہ فصاحت و بلاغت کے پیکرِ بے جان میں ایک نئی روح پھونک دی ہو، یہ خیال نہ صرف سوءِ ادب ہے، بلکہ خود جواہرِ سخن کی ناقدردانی، اور اپنی سخن فہمی اور جوہر شناسی کا خون کرنا ہے۔ گویا انیسیوں کے نزدیک ایجادِ مضامین اور نازک خیالی، جس نے ظہوری و عرفی کو اقلیمِ بلاغت کا تاجدار بنا دیا، اور جو مرزا صاحب کے خصوصیاتِ کلام میں سے ہے کوئی قابلِ قدر چیز نہیں؛ اور دبیریوں کے خیال میں صفائیِ کلام۔ اور لطفِ زبان جن میں میر صاحب یکتا اور لاجواب تھے، معمولی بات ہے حقیقت میں متعصب طبیعتیں جو طرفداری کا جامہ پہن لیتی ہیں اُنکی نگاہوں میں اپنے مخالف کے محاسن بھی عیب بنکر جلوہ گر ہوتے ہیں ؎

ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے است ۔ گُل است سعدی و در چشمِ دشمناں خارست

یہ صحیح ہے کہ دونوں کے اکثر کلام کا طرز جُدا جُدا تھا، لیکن ہر انداز اپنی اپنی جگہ پر دلپذیر اور قابلِ قدر و تحسین ہے؛ اسی لیے منصف مزاج لوگ جو کمال کے قدردان اور حُسنِ کلام کے جوہر شناس ہیں، ہر رنگ کو غور کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

دونوں صاحبوں نے کمال بالکمال ہونے کی زبردست دلیل

اگر اپنے اپنے مقام پر ان دونوں کے کلام میں کوئی خاص دلربائی اور دلکشی نہ ہوتی تو یقیناً ایک کا فروغ دوسرے کی ناموری کو دبا دیتا، اور آج شہرت کے آسمان پر صرف میر انیس یا فقط مرزا دبیر کا نیّرِ کمال درخشاں نظر آتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کا دوسرے کی شہرت کو بالکل نیست و نابود کر دینا تو الگ رہا، آجتک ملک یہ ہی فیصلہ نہ کر سکا کہ ان دونوں میں افضلیت کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے۔ اگر ان دونوں میں کسی کی شہرت عارضی اور بلا سبب ہوتی تو بہت جلد فنا ہو جاتی۔ اکثر لوگ اپنے اپنے زمانوں میں چند روزہ عارضی ناموری حاصل کر لیتے ہیں، مگر چونکہ اُن کے کلام میں کوئی خاص دلاویزی نہیں ہوتی، اسلیے بہت جلد اُن کے کلام بلکہ ناموں پر بھی گمنامی کے پردے پڑ جاتے ہیں؛ مثلاً "سعدی کے زمانے میں اُسکے اکثر ہمعصر امامی ہروی کو اُس پر ترجیح دیتے تھے مگر بہت عرصہ نہ گذرا کہ سعدی کا نام اور اُس کا کلام اطرافِ عالم میں منتشر ہو گیا اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا"[۲]، اسی طرح میر انیس کے زمانے میں علاوہ مرزا دبیر کے اور بھی اکثر جلیل القدر مداحانِ اہلبیتؑ میر صاحب کے معاصر تھے، منجملہ اُن کے ایک صاحب میر مداری تھے، جن کی شہرت اور ناموری کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوگا کہ اُن کی نسبت خود میر صاحب فرماتے تھے "جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اُسوقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے ایک تو میر مداری جو پار میں رہتے تھے، دوسرے مرزا سلامت علی دبیر مرحوم"[+] لیکن آج باہر کے لوگ تو درکنار لکھنؤ میں بھی کوئی میر مداری سے واقف نہیں، اور نہ کہیں اُن کا کلام نظر آتا ہے۔ اسی طرح اور بھی چند حضرات کا نام لیا جاتا ہے جو اُسوقت

---

۲ یادگار غالب، + واقعات انیس صفحہ ۲۷،

نامی وگرامی اور مقبولِ خاص و عام ہوگئے، مگر آج اُن کو کوئی بھی نہیں جانتا اور میر انیس کے ساتھ ساتھ فقط مرزا دبیر ہی کا نام زبانوں پر جاری ہے۔

مرزا صاحب کا طرزِ خاص

مرزا صاحب نے مضمون آفرینی اور موشگافیوں کا جو رنگ اختیار کیا تھا، یہ طرز بجائے خود ایسا دقیق اور سنگلاخ تھا کہ اُسکو ایسی خوبی کے ساتھ طے کر جانا اُنہیں کے زورِ قلم کا کام تھا؛ یہی وجہ ہی کہ وہی اس طرز کے موجد ہوئے، اُنہیں کے دم سے اُس نے نشو و نما پایا، اور اُنہیں کے ساتھ اُسکا خاتمہ ہوگیا۔ ع۔ خلعتے بود کہ بر قامتِ او دوختہ شد

میر صاحب نے جس رنگ کو پسند فرمایا وہ مذاقِ عام کے مطابق تھا، اس لیے مذاقِ عام نے جیسی چاہیے اُس کی سرپرستی کی؛ اس کے خلاف مرزا صاحب کا اکثر طرزِ سخن خاص پسند تھا؛ بظاہر سمجھ میں آتا ہی کہ اُن کے قدردانوں کا گروہ مختصر ہونا چاہیے کیونکہ خواص کی جماعت ہمیشہ محدود و مختصر ہوتی ہے، لیکن یہ اُنکے کلام کا حیرت انگیز اعجاز تھا کہ اُس نے مذاقِ عام کے خلاف ہوکر بھی تمام دلوں پر اپنا سکّہ بٹھالیا، اور اپنے بیشمار قدردان پیدا کرکے رفتہ رفتہ اتنا عروج حاصل کرلیا کہ آج مرزا صاحب کا نام بھی شہرت کے آسمان پر میر صاحب کے پہلو بہ پہلو چمک رہا ہی، اور اُنکے معاندین بھی اُن سے اکتسابِ فیوض پر مجبور ہوئے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اُنکے معتقدین کی جماعت میر صاحب کے ہواخواہوں سے شمار میں افزوں ہی، اور اس جماعت میں کثرت سے وہ اربابِ فضل و کمال ہیں جو بجائے خود اُستادِ زمانہ اور مختلف کتبِ منقولات و معقولات کے مصنّف و مؤلّف ہیں۔ پس ہر اُستاد کا یکساں طور پر ہر دلعزیز ہونا ظاہر کرتا ہی کہ ملک میں دونوں طرز مقبول ہوئے، اور یہ اُسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ کلام میں کوئی خاص دلفریبی نہو۔

دونوں صاحبوں کے ہاں ہر قسم کا کلام موجود ہے

لیکن اگر اس سے بھی قطعِ نظر کر لی جائے تو ہر ایک طرز اور ہر ایک قسم کا کلام دونوں صاحبوں کے مرثیوں میں بافراط موجود ہے۔ جس سادگیِ زباں اور لطف روزمرّہ کے انیسے شائق ہیں، اگر تلاش کی نگاہوں سے دیکھیں تو یہ جواہرِ بے بہا مرزا دبیر کے کلام میں بھی بکثرت موجود ہیں؛ چنانچہ مختلف موقعوں پر ہم اس کی بہت سی مثالیں درج کرینگے۔ دبیریئے اگر غور سے جستجو کریں تو مضامین کے انبار میر انیس کے خرمنِ سخن میں بھی پا سکتے ہیں۔ "میر (تقی) کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں اسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے"† تو کیا انیسیوں اور دبیریوں کو مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں اپنی اپنی پسند کا اتنا منتخب کلام بھی نہ مل سکیگا کہ اُسکو دیکھ کر دونوں کی اُستادی اور فضل و کمال کا تھوڑا بہت اعتقاد اُنکے دلوں میں پیدا ہو جائے، اور یہ حالت باقی نہ رہے کہ ایک کی مجلس میں دوسرے فریق کے لوگ شرکت کرنا جرمِ عظیم خیال کرتے ہیں، اور اگر کبھی اتفاقاً شریک بھی ہو جاتے ہیں تو خاموش بُت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ باکمال شاعروں کا دلکش اور جادو اثر کلام اُن کے دلوں میں گھر نہیں کر لیتا، کیونکہ کسی شے کی خوبی اور نفاست موافق و مخالف سب کو اپنا شیدا بنا لیتی ہے؛ موسیقی کے فرحت بخش نغموں سے توجہ نہ کرنے والے بھی حظ اُٹھاتے ہیں، اور پھولوں کی جانفزا نکہت صحنِ چمن سے مُنہ پھیر کر گذرنے والوں کے دماغ کو بھی معطر کر دیتی ہے؛ لیکن جوشِ عصبیت دلوں پر مُہرِ انکار اور زبانوں پر قفلِ

انیسیوں اور دبیریوں کا مشترک تعصب

† یادگار غالب مولوی حالی صفحہ ۱۰۶

خموشی لگا دیتا ہی۔ فلاسفہ کا قول ہی کہ ہر شے اپنی مختلف کیفیتوں میں خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہی، پس انسان وہی ہی کہ جس پیرائے میں خوبصورتی جلوہ دکھائے اُس سے کیفیت اُٹھائے۔

موازنۂ انیس و دبیر اور اُسکے مؤلف کا تعصب

ان دنوں مولوی شبلی صاحب نے ایک کتاب موازنۂ انیس و دبیر کے نام سے لکھی ہے۔ مولوی صاحب کے باکمال اور دقیق النظر مورّخ ہونے کا ایک حد تک ہم کو بھی اقرار ہی، لیکن افسوس ہی کہ اُنھوں نے مرزا دبیر کی مخالفت کے جوش میں اُن کے عدیم النظیر کمالات کو گھٹانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا؛ بلکہ بعض مقامات پر حق پسندی اور انصاف سے جو محاکمہ کرنے والوں کا فرض ہے، چشم پوشی کرکے اُن کی خوبیوں کو غلط بیانی کے تاریک پردے میں چھپانے کی بھی کوشش کی گئی ہی۔ بعض مقامات پر فرضی اور بے بنیاد اور غلط الزامات لگائے ہیں، بعض جگہ غلط شعر لکھ کر اور بعض جگہ چند اشعار یا بند حذف کرکے اعتراض قائم کر دیا ہی، بعض موقعوں پر دوسروں کے اشعار اُن کی جانب منسوب کرکے اعتراض کیا ہے، چنانچہ ہم نے ان سب باتوں کو مختلف موقعوں پر اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ مرزا دبیر کے ہوا خواہ تو کیا کوئی انصاف پسند انسان اُن کی دلشکن تحریر کو ٹھنڈے دل سے دیکھ نہیں سکتا، اور ناممکن ہی کہ کوئی بے لاگ شخص جو کسی صاحب کی طرفداری میں ہمہ تن محو نہ ہو اُسکو بغیر دل پر چوٹ کھائے پڑھ سکے۔ میر صاحب کے باکمال ہونے کا اعتقاد شاید میری برابر لائق مؤلف کو نہ ہوگا، مگر میں اسقدر بیدرد نہیں ہوں کہ مرزا صاحب جیسے یگانۂ عصر بزرگ کی اُن لاجواب مضمون آفرینیوں کی طرف سے آنکھ بند کر لوں جنھوں نے آج دنیائے سخن میں اپنی شہرت کا ڈنکہ بجا رکھا ہی۔

میر انیس نے اپنے عام پسند انداز میں پورا کمال حاصل کر لیا تھا، اس لیے وہ اپنے طرز میں یکتا سمجھے جاتے ہیں۔ پس بہتر تھا کہ لائق مؤلف اُن کے محاسنِ سخن پر قلم فرسائی کرنے ہی پر اقتصار کرتے، اور اُن کے کلام کے وہ جواہر پبلک کے سامنے پیش کرتے جو ایک فصیح و بلیغ شاعر کے واسطے مایۂ ناز، اور سخن فہموں کے لیے باعثِ انبساط ہو سکتے ہیں؛ ایسی حالت میں اُن کی تالیف کو ہر شخص دلچسپی اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتا، اور نہ صرف انیسیوں بلکہ منصف مزاج دبیریوں کے لیے بھی باعثِ مسرت ہوتی؛ لیکن اسکے ساتھ ہی بلاضرورت مرزا صاحب کے فرضی اور اتہامی معائب کا بیان کر کے اُنھوں نے اپنی بیش بہا کتاب کو نہ صرف دبیریوں بلکہ مہذب اور شائستہ انیسیوں میں بھی ہر دل عزیز ہونے سے محروم رکھا جس کا سب سے زیادہ ہم کو افسوس ہے۔

یہ امر کہ لائق مؤلف کو میر صاحب کے کلام سے خاص اُنس ہو کسی طرح ناموزوں نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن ساتھ ہی یہ خیال کہ وہ مرزا صاحب کے کلام کو قابلِ قدر خیال نہ کریں، ضرور قابلِ گرفت ہے۔ جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ دبیریوں کو جن میں بڑے بڑے فاضل اور یگانۂ عصر بزرگ شامل ہیں، نافہم اور غیر سخن سنج سمجھے ہوئے ہیں۔

سب سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ قابل مؤلف نے جہاں میر صاحب کی بجا مدح سرائی حد سے زیادہ کی ہے، وہیں باایں ہمہ حسنِ اعتقاد اُن پر سرقے کے الزام بھی بکثرت لگائے ہیں، اور بہت سی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اُنکے نفیس کلام میں نکالی ہیں؛ اگرچہ ہم اپنے اعتقاد میں جو مؤلف سے بہت زیادہ ہے، میر صاحب کو ان الزامات سے پاک سمجھتے ہیں، لیکن اُنکے خیال کے مطابق اگر خدانخواستہ وہ غلطیاں اُنکے کلام

میں مان لی جائیں تو اُن کا عظیم الشان رتبہ ایک مبتدی شاعر سے بھی گھٹ جاتا ہے؛ حالانکہ ایسا نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کتاب میں مختصراً اُن اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو مؤلف نے نہایت بیدردی سے میر صاحب جیسے باکمال پر لگائے ہیں؛ اور میرے معزز دوست سید فضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے اپنی کتاب حیاتِ دبیر میں اُن کی شرح و بسط کے ساتھ تردید کی ہے۔ میر صاحب نکاتِ شاعری کو ایسا سمجھتے تھے کہ کم شاعر سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً اُن کے روزمرّے اور محاورے پر اعتراض کرنا تو نہایت ہی مضحکہ انگیز خیال ہے؛ اُن کی بلکہ اُن کے گھرانے کی زبان اردوئے معلّٰی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی، اور اُنکے ہر لفظ اور ہر محاورہ کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ لیکن قابل مولف معترض ہیں کہ میر صاحب نے اس مصرع میں ع - کمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباسؑ - لفظ کمتی جو استعمال کیا ہے وہ انفار اوارا ذل کی زبان ہے، حالانکہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ محلاتِ شاہی میں بولا جاتا تھا؛ گو ارا ذل بھی استعمال کرتے ہوں مگر میر صاحب نے ایک خاتونِ معظم کی زبان سے محلاتِ شاہی کا لفظ استعمال کیا ہے؛ مبتذل اور سوقیانہ الفاظ وہی ہیں جو فقط ارا ذل میں بولے جاتے ہوں اور خواص میں مستعمل نہوں، لیکن جو الفاظ خواص کے محاورے میں مروّج ہوں اور اُن کی تقلید سے ارا ذل بھی بولتے ہوں، وہ ہرگز ارا ذل کے الفاظ نہیں سمجھے جائیں گے، اس لیے اُن کا استعمال یقیناً جائز اور روا ہے؛ بلکہ مولانا حالی نے تو اس دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ "جو محاورے یا الفاظ صرف عوام النّاس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص اُنکو کبھی نہیں بولتے اُن کو بھی استعمال کرنا چاہیے ورنہ زبان کا دائرہ نہایت تنگ

مبتذل الفاظ کا معیار

ہو جائیگا۔ اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جائے گا[1]
مگر مؤلف اس بارہ میں معذور سمجھے جانے کے لائق ہیں، کیونکہ اہلِ زبان کے سوا
دوسرے لوگوں کا محاورہ شناسی کے کوچوں سے نابلد ہونا جائے تعجب
نہیں۔

میر صاحب اور مرزا صاحب کی ترجیح کا مسئلہ

دیباچہ میں سب سے پہلے قابل مؤلف نے اس امر پر بہت پیچ و تاب کھایا ہے کہ
بدمذاق زمانے نے ابتک میر انیس و مرزا دبیر کی ترجیح کا مسئلہ کیوں نہ حل کر دیا، اور
ابتک کیوں یہ معاملہ غیر منفصل رہا۔ ہم اُن کو بتانا چاہتے ہیں کہ تمام ارباب کمال اور
اصحاب ذوق کا یہی سچا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ اُردو شاعری میں بے مثل و لاجواب
تھے، اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا محض ایک قسم کا تعصب ہے نہ واقعیت و حقیقت۔

مفتی صاحب قبلہ و کعبہ کا فیصلہ

اس بارے میں جناب مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ و کعبہ کا قابل قبول فیصلہ یہ ہے کہ
مرزا صاحب کا کلام دقیق و ملیح، اور میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے۔ دونوں کا
ذائقہ علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، کیونکہ
بعض طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض طبائع شیرینی پر مائل ہیں۔ ممکن ہے کہ قابل
مؤلف بھی اُس خاص طبیعت کے انسان ہوں جو محض شیرینی پر جان دیتے ہیں، لیکن یہ تو
بڑا ظلم ہے کہ وہ تمام دنیا کو بھی نمکِ سخن سے محروم رکھ کر حلاوت پسندی کا پابند
کرنا چاہتے ہیں؛ اور چاہتے ہیں کہ جو چیز اُن کو پسند ہے وہی تمام طبیعتوں کو بھی
مرغوب ہو جائے۔

دونوں صاحبوں کا قابل تذکرہ کمال

ایک طرف تو مرزا صاحب کی یہ حیرت انگیز قابلیت ہے کہ وہ بذاتِ خود

[1] یادگار غالب صفحہ ۱۱۵۔

شرفِ مرثیہ گوئی حاصل کرکے میر انیس جیسے بزرگ کے مقابلے میں جنکا خاندان پشتہا پشت سے شاعر تھا، نامور ہوئے؛ اور نہ صرف نامور ہوئے بلکہ لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان میں اُن کی حیات میں اکثر اہلِ علم اور شعراے باکمال مرزا صاحب کو تمام معاصرین پر فضیلت دیتے تھے، اور اُن کے نزدیک گویا مرزا صاحب سے بہتر کوئی شاعر دنیا میں نہ تھا۔ جیسا کہ خود واقعاتِ انیس سے ظاہر ہے[1]؛ دوسری طرف میر صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مرزا صاحب جیسے نازک خیال۔ نکتہ سنج۔ ذی علم۔ اور باکمال شاعر کے مدِ مقابل مانے گئے، حتیٰ کہ منصف مزاج اور سخن فہم لوگ باوجود اسقدر غور و خوض کے آجتک فیصلہ نہ کرسکے کہ دونوں میں سے ترجیح کا سہرہ کس کے سر باندھا جائے، اور نہ آیندہ کرسکیں گے۔ خود لائق مؤلف ایک حد تک ہمارے دعوے کے مؤید ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "مدت ہاے دراز کے غور و فکر۔ کدو کاوش۔ بحث و تکرار کے بعد بھی فیصلہ نہو سکا کہ ترجیح کا مسند نشیں کس کو کیا جائے"، اس کا سبب بالکل ظاہر ہے، اور وہ یہ کہ دونوں کا اکثر طرزِ سخن جُدا تھا، اور ہر ایک بجاے خود اُستاد کامل الفن تھا؛ لیکن وہ اس کی وجہ قوم کی بدمذاقی قرار دیتے ہیں جس سے ہم متفق نہیں، کیونکہ جب سے میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ گوئی کے کوچے میں قدم رکھا اُس زمانے سے ابتک کچھ کم سو برس کا زمانہ گذر گیا ہوگا، پس سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طویل زمانے تک ذی علم مؤلف کے سوا تمام اربابِ کمال بدمذاق اور نافہم تھے، حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ جس میں ایسے ایسے علما۔ فضلا۔ نکتہ سنج اور دقیقہ رس بزرگ گذر گئے ہیں جن کی ذات پر دنیا آجتک ناز کرتی ہے اور اب زمانہ باوجودِ گردشِ لیل و نہار اُن کا مثل پیدا

آجتک ترجیح فیصلہ نہو سکا

[1] دیکھو نوٹ واقعاتِ انیس صفحہ ۶۱

فضلائے عصر کے اقوال

نہیں کرسکتا۔ مثلاً افضل الفضلا مولوی حامد حسین صاحب مرحوم نے جب اُن کا یہ شعر سُنا، ؎

طے ہر قدم پہ ایک مہینہ کی راہ ہی رویت ہلالِ نعل کی اسپر گواہ ہی

تو فرمایا یہ مضمون تو فارسی میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ سُنا گیا ہی کہ منشی امیر مینائی مرحوم۔ مولوی عبدالحی مرحوم۔ مولوی فیض الحسن مرحوم۔ مولوی غلام حسنین صاحب کنتوری۔ مولوی علی حسن صاحب جائسی وغیرہم سب یہی کہتے تھے کہ دونوں آفتاب ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ منشی مظفر علیخاں اسیر نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ دونوں اُستاد ہیں۔ شاعرِ عدیم المثال منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی، جن کے فضل و کمال کا شہرہ تمام ہند میں پھیلا ہوا ہے، اور جو مرثیہ گوئی میں مرزا صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، اُن کی نسبت فرماتے ہیں ؎

عطا کی مرثیہ میں اُس کی اصلاح	کہ جس کی بزم ہی خورشید مصباح
مسیحائے سخن اعجاز گستر	دبیرِ پاک دیں۔ مقبولِ داور

منجملہ اُن بدقسمت بدمذاقوں کے جو ترجیح کا فیصلہ نہ کرسکے مرزا غالب بھی تھے جنکی رائے مولوی حالی یادگار غالب میں اس طرح لکھتے ہیں "اُن کا (مرزا غالب) قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہی نہ آیندہ ہوگا"۔ مولانا آزاد تذکرۂ آبِ حیات میں لکھتے ہیں "اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں"۔ ان اقوال سے معلوم ہوا کہ مرزا غالب جو شعرا متاخرین میں نہایت ممتاز شاعر، اور بے مثال سخن فہم اور نکتہ سنج سمجھے جاتے ہیں، اور

مرزا غالب کی رائے

مولوی آزاد صاحب کی رائے

؎ معراج المضامین صفحہ ۷ ؎ آب حیات صفحہ ۷۵

مولوی آزاد جو حُسنِ کلام کے بہت بڑے جوہر شناس تھے، اور دیگر یگانۂ دہر اور یکتائے عصر بزرگوار جن کا ذکر اوپر کیا گیا، یہ سب بھی ترجیح کا فیصلہ نہ کر سکے، بلکہ مرزا دبیر کو میر انیس کا ہم پایہ اور حریفِ مقابل تسلیم کرتے تھے۔ اسکے مقابل میں مولوی شبلی صاحب کا ایک دوسرا فقرہ ملاحظہ ہو "بدمذاقی کی نوبت یہانتک پہونچی کہ وہ (میر انیس) اور مرزا دبیر حریفِ مقابل قرار دیئے گئے"۔ چونکہ مرزا غالب کا مقتدر شعرا میں شمار ہوتا ہے اس لیے اُن کی عظمت کے لحاظ سے مؤلف کو اُن کا نام بدمذاقوں کی فہرست میں سرے پر درج کرنا چاہیے۔ مگر ہم کو اُن لوگوں کے فیصلے پر اتفاق کلّی ہے، اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان منصف مزاج لوگوں کی شان سے بعید تھا کہ بلا وجہ کسی شخص کو بزمِ ترجیح کا مسند نشین بنا دیتے۔ مولوی آزاد صاحب تذکرۂ آبحیات میں انیسیوں اور دبیریوں کا ایک مناظرہ لکھتے ہیں جس میں دونوں فریق اپنے اپنے اُستادوں کی فضیلت میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ مناظرے کے خاتمے پر مولانا آزاد نے رائے دی ہے، وہ لکھتے ہیں "غرض جھگڑالو دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نہ کر سکتی تھی البتہ مجبوری دونوں کے گلے تھکا کر آوازیں بند کر دیتی تھی، اور منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی دونوں اچھے دونوں اچھے، کبھی کہتی وہ آفتاب ہیں یہ ماہ، اور کبھی کہتی یہ آفتاب ہیں وہ ماہ"[1]

انیسیوں اور دبیریوں کے مناظرہ اور مولانا آزاد کی رائے

خیال بندی اور مضمون آفرینی کے علاوہ جہاں جہاں مرزا صاحب نے زبان کی سلاست۔ صفائی اور روزمرہ پر توجہ فرمائی ہے، وہاں بھی ثابت کر دیا ہے کہ ہم اس رنگ میں بھی کسی سے کم نہیں، چنانچہ ہم اس قسم کا کلام اپنے موقعے پر درج کرینگے۔

مرزا صاحب کی صرف اور سلیس کلام

[1] آب حیات صفحہ ۵۰۰

مرزا صاحب کو میر صاحب کے رنگ پر چلنے سے جو لوگ عاجز سمجھتے ہیں یہ اُن کی ناواقفی ہی۔ اُن کے خوانِ سخن پر ہر رنگ کا کھانا موجود ہی؛ مضمون آفرینی پسند کرنیوالے مضامین کی بلند پروازی۔ اور الفاظ کی شان و شکوہ دیکھ کر وجد کرتے ہیں؛ اور سلاست زبان، صفائیِ بیان۔ اور لطفِ محاورہ کے شیدا صاف اور سلیس اشعار سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ خصوصاً درد انگیز اور پُر تاثیر مضامین لکھنے میں تو اُن کا جواب نہیں؛ اس بارے میں ہم مولانا آزاد کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی جو اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ مرزا صاحب شوکتِ الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ اُس میں جابجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے۔ الم ناک اور دلگداز انداز۔ جو مرثیے کی اصلی غرض ہی ان وصفوں میں بادشاہ تھے"[1] سچ یہ ہی کہ وہ کون چیز ہی جو اس ہمہ داں اور قادر الکلام شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی، صرف چشمِ بینا اور نظرِ انصاف کی ضرورت ہے۔

مرزا صاحب کے مضامین کا حصہ

ہم کو قابل مؤلف سے کوئی مناظرہ منظور نہیں ہے، مگر اس ناچیز تالیف سے ہمارا یہ منشا ہی کہ ناظرین پر عموماً اور مولف پر خصوصاً اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیں کہ مرزا صاحب کی شان اُس سے بہت زیادہ بلند ہی جسقدر وہ خیال کرتے ہیں یا اُن کی تالیف سے عیاں ہی۔ اسلیے ہم تہذیب کے ساتھ اُن اعتراضات کو بھی رفع کرینگے جو لائق مؤلف کے زعم میں مرزا صاحب کے کلام پر وارد ہوتے ہیں؛ لیکن اس بات کی کوشش کرینگے کہ ہماری منصفانہ تحریر میں مناظرے کی جھلک نظر نہ آجائے۔

اس کتاب کے تالیف کرنے کی علت غائی

[1] آبحیات صفحہ ۵۰۲

اس کے علاوہ ہر عنوان کے متعلق مرزا صاحب کے کلام سے اُسی قسم کے دلاویز نمونے دکھائیں گے جیسے مؤلف نے میر انیس کے فصیح کلام سے انتخاب کرکے پیش کیے ہیں؛ اور جن پر اُنکے تعصب نے قصداً گمنامی کا پردہ ڈال دیا تھا؛ مگر اس امر میں ہم اُنکو کچھ الزام نہیں دیتے، کیونکہ جوشِ مخالفت میں اپنے مخالف کے محاسن سے چشم پوشی کرلینا عوام کی طبیعت کا ایک لازمی خاصہ ہی اور ذی علم مؤلف کا بھی باایں ہمہ دعوے ثقاہت اس کلیہ سے مستثنےٰ ہونا قانونِ قدرت کے خلاف ہی؛ گو یہ ضرور کہا جائے گا کہ اُن کا بایں علم و فضل عاداتِ عوام کی اس شد و مد کے ساتھ پیروی کرنا کسی قدر تعجب خیز امر ہی۔ مگر ازبسکہ ہماری طبیعت میں کسی طرح کا تعصّب یا بیجا طرفداری کا لگاؤ نہیں، اس لیے ہماری نگاہ میر صاحب اور مرزا صاحب کے محاسنِ کلام پر یکساں پڑتی ہی

ع۔ متاعِ نیکِ ہر دکاں کہ باشد۔

اب ہم ذی علم مؤلف کی بیش بہا تالیف پر سلسلہ وار مفصّل و مشرّح ریویو لکھتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ منصف مزاج ناظرین چشم توجہ سے ملاحظہ فرمائینگے۔

تمہید کے بعد لائق مؤلف نے اُردو مرثیہ گوئی کا مختصر تذکرہ کیا ہی، جسپر ہم کو کچھ ریمارک کرنا نہیں ہی بلکہ بجائے اسکے ہم اُن کی محنت اور کاوش کی داد دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسکے بعد اُنھوں نے صفحہ ۱۶ میں میر انیس کے متعلق جو باتیں کہنے کی ہیں وہ درج کی ہیں جسپر ہم کچھ خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

میر صاحب خاندانی شاعر تھے

نمبر (۲) میں وہ لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی۔ ہمکو اس سے بالکل اتفاق ہی۔ حقیقت میں وہ خاندانی شاعر تھے اور اُن کا یہ دعوے کہ ع

پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں۔ راستی پر مبنی ہے۔ وہ جس گھر میں پیدا ہوئے شعرا قدیم کا خاندان تھا[1]، جس میں ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے شعر و سخن کے چرچے اور سخن سنجیوں کے مشغلے رہا کرتے تھے، خود اُن کے والد اور دونوں بھائی ممتاز شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مرزا صاحب کے والد نہ شاعر تھے نہ ذاکر، اگرچہ اُن کے خاندان میں بھی شاعری قدیم الایام سے ہے، چنانچہ اُنکے اجداد میں مرزا اہلی[2] شیرازی صاحب مثنوی سحر حلال۔ اور ملا محمد رفیع شیرازی متخلص بہ رفیع اور مرزا ہاشم[3] شیرازی۔ شعرا مسلم الثبوت میں سے گزرے ہیں، لیکن اُنکے زمانہ مشق سخن میں خاندان میں کوئی شاعر نہ تھا کہ باہمی بحث و تکرار سے طبیعت کو جولانی ہو یا کسی قسم کی مدد مل سکے؛ شفیق اُستاد سے بھی یار لوگوں نے بگڑوا دی تھی؛ پس اُنھوں نے خود اپنی استعداد علمی۔ قوت دماغی ذاتی زور طبیعت اور غواصی فکر سے شاعری کے کوچہ میں قدم رکھا، تمام دنیا کو اپنی فصیح البیانی کا گرویدہ بنالیا، اور میر صاحب جیسے خاندانی شاعر کے مقابل میں نمونہ آفریں شعرا کی بزم میں صدر نشینی کی عزت حاصل کرلی۔ یہ وہ حیرت انگیز کامیابی ہے جس کی ہر منصف مزاج شخص کو قدر کرنی چاہیے اور جو حقیقت میں مرزا صاحب کی

از صاحب موصوف شاعری ترقی کی

[1] میر صاحب کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے۔ امامی ہروی کی اولاد میں تھے جو ایک پرانے شاعر با کمال اور فاضل سخن تھے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُنکے خاندان میں شاعری کسقدر پرانے زمانے سے میراث چلی آتی ہے ۱۲ [2] مرزا اہلی شیرازی فصحا نامدار اور بلغا روزگار سے تھے۔ اور شعر گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مثنوی سحر حلال کہ ذو بحرین اور ذو قافیتین مع التجنیس ہے ان کی طبعزاد سے مشہور و معروف ہے۔ فقیہ ربانی شہید ثالث قاضی سید نور اللہ صاحب شوستری نور اللہ مرقدہ نے کتاب مجالس المومنین کی بارہویں مجلس میں جہاں اکابر شعرا عجم کا ذکر کیا ہے ان کا ذکر خیر نہایت صفت و ثنا کے ساتھ لکھا ہے۔ دیوان غزلیات بھی انسے یادگار ہے ۱۲ [3] مرزا ہاشم شیرازی فن انشا پردازی اور حسن تحریر مراسلات و مکاتبات منشیانہ میں وحید عصر۔ منشی کامل۔ اور نثار ماہر تھے ۱۲

شاعری کی خصوصیات میں داخل ہونے کے قابل ہی۔

نمبر (۴) میں قابل مولف ایک نہایت مہتم بالشان مسئلے کی جانب توجہ فرماتے ہیں اور حقیقت میں یہ مسئلہ ہی بھی قابل غور؛ اس مسئلے میں اس امر کی تحقیق کی گئی ہی کہ اوّل سب سے پہلے کس نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا اور یہ کہ خاص خاص مرثیے جو دونوں کے ہاں قریب المعنیٰ پائے جاتے ہیں، اوّل کسنے کہے اور کسنے اُن کا جواب لکھا۔

دونوں مسئلوں کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ باوجود بہت سی جد وجہد کے مجکو کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن امرِ اوّل کا حل کرنا جسقدر دشوار ہی اُسی قدر غیر ضروری بھی ہی؛ دونوں صاحبوں کے محاسنِ کلام سے بحث کرنا آپ کا اصلِ مقصود ہی خواہ کسی نے شاعری پہلے شروع کی ہو۔ اس مسئلے کے حل کرنے میں ہم کو بھی کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور کوئی قابلِ اطمینان واقعہ نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ فسانۂ عجائب کے دیکھنے سے اسقدر معلوم ہوتا ہی کہ اُس میں جہاں لکھنؤ کے دیگر کاملینِ فن کا ذکر ہی، وہیں شعراء نامی کی فہرست میں علاوہ میاں دلگیر میر ضمیر۔ میر خلیق۔ مرزا فصیح وغیرہم کے مرزا دبیر کا نام بھی ملتا ہی[1] لیکن میر انیس کا ذکر نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فسانہ عجائب کی تصنیف کیوقت، یعنی نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں مرزا صاحب اپنی شاعری کو اُس پایہ پر پہونچا چکے تھے کہ میاں دلگیر میر ضمیر۔ میر خلیق وغیرہم نامور مرثیہ گویوں کے ساتھ اُن کا نام بھی لیا گیا،

غالباً اُس زمانے میں میر انیس کی شاعری ابتدائی حالت میں ہوگی جسکو قابلِ ذکر نہ سمجھا گیا

---

[1] فسانہ عجائب کی اصل عبارت یہ ہی۔ مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین۔ کمر دہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا۔ بارِ احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔

اور اُس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اُنھوں نے شاید مرزا دبیر کے بعد اُسکو شروع کیا ہوگا۔ اگر اس میں یہ شبہ کیا جائے کہ میر صاحب فسانۂ عجائب کی تصنیف کیوقت فیض آباد میں رہا کرتے تھے اس وجہ سے شعرائے لکھنؤ کے ضمن میں اُن کا تذکرہ نہ کیا گیا ہوگا تو یہ امر بھی خلافِ واقعہ ہے۔ کیونکہ جب نواب آصف الدولہ[1] نے لکھنؤ کو مستقل دارالسلطنت قرار دیا تو میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں جاری ہو چکی تھی[2] اور میر خلیق اور میر انیس تو اکثر وہاں رہتے تھے اور مجلسوں میں مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ علاوہ بریں اگر یہ سبب ہوتا تو میر خلیق کا کیوں ذکر کیا جاتا۔ اس واقعہ سے خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید مرزا صاحب نے پہلے میدانِ شاعری میں قدم رکھا ہو۔ اسکے سوا اور کوئی واقعہ ہم کو نہیں ملا، اسی سے جو کچھ چاہو قیاس کر لو۔ اگر ہم کو کوئی ایسا ہی چھوٹا سا واقعہ میر صاحب کے متعلق بھی مل جاتا تو اُسکو بھی یہاں درج کر دیتے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اب دوسرا مسئلہ یہ باقی رہ گیا کہ خاص خاص مرثیے جو دونوں کے ہاں قریب المعنیٰ ہیں اوّل کسنے کہے۔ اس مسئلے نے حقیقت میں مؤلف کو بڑی مشکل میں ڈال دیا، کیونکہ واقعات سے تو اس کا حل ہونا ممکن نہ تھا اس لئے قیاسی باتوں کی بنا پر مجبوراً جودتِ طبع کے کرشمے دکھلانے پڑے ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق سب سے پہلے جو خیال اُنکے دماغ میں آیا وہی اصلی اور سچا خیال تھا، "یعنی یہ کہ زمانے کی تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے"

ہم مضمون کسنے اوّل کسنے کہا اور کسنے جواب دیا

[1] سال تخت نشینی نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ ہجری۔ سال تخت نشینی نصیر الدین حیدر جنکے زمانے میں فسانۂ عجائب ختم ہوا ۱۲۴۳ھ ہجری۔ [2] واقعات انیس صفحہ ۲۳۔

اگر وہ اسی فقرہ پر اپنی گہری تحقیقات کو ختم کر دیتے تو بہتر تھا، مگر اُنھوں نے عجب طرح کا مغالطہ دیکر اس مسئلے کے تصفیے کے واسطے نئی ترکیب سے استدلال کیا ہی جس کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہی۔ اُن کے استدلال کی بنیاد دو دلیلوں پر ہی۔

(۱) یہ کہ میر صاحب جابجا اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُنکے حریف اُنکے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں مثلاً ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار ٭ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو — وغیرہ وغیرہ

پس اُن کا قیاس ہی کہ مرزا صاحب ہی اُنکے خرمنِ کلام سے خوشہ چینی کرتے ہونگے ورنہ میر صاحب ہرگز ایسی خلافِ واقعہ بات نہ لکھتے۔

(۲) یہ کہ ان چوٹوں کو سُنکر مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہی، بلکہ صرف تبرّی کرتے ہیں کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں۔ مثلاً ؎

شکرِ خدا کہ سرقے کی حد سے بعید ہوں ہر مرثیے میں موجدِ طرزِ جدید ہوں

اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ میر انیس، مرزا صاحب کے مقابلے کا قصد نہیں کرتے تھے ورنہ مرزا صاحب ضرور اسکا اشارہ کرتے۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھا جاے تو دونوں قیاس نہایت ضعیف ہیں اور کسی طرح اس قابل نہیں کہ ان کی بنا پر مرزا صاحب جیسے یکتاے عصر پر ایسا غلط الزام لگایا جائے۔

(۱) امر اوّل کا جواب یہ ہی کہ اگر میر صاحب نے جابجا اس بات کا اشارہ کیا ہی کہ حریف اُنکے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، تو ممکن ہی کہ یہ ایک شاعرانہ تعلّی ہو؛ ہر شاعر اکثر اوقات ایسے اشعار لکھا کرتا ہی کہ میرے مضامین دوسرے شعرا کو نفع پہونچاتے ہیں، اور یہ شعرا کا

ایک طرزِ کلام ہی جسکو اکثر اوقات واقعیت سے کچھ تعلق نہیں ہوا کرتا۔ مثلاً محمد فضل سرخوش لکھتے ہیں ؎

پست فطرت گر بر دمضمونِ ما رسوا شود　　دزد را خصمے بتر از گوہر شہوار نیست

غنی کشمیری

زمضموں دزدیِ یاراں نمی باشد غمے مارا　　چناں بستیم مضموں را کہ نتواند کسے بُردن

شوکت

تصرف چوں کند دشمن بآبِ رنگِ اشعارم　　نگارین گردد انگشتے کہ بگذارد بگفتارم

غرض اُردو فارسی کے کسی شاعر کا کلام ایسی تعلیوں سے خالی نظر نہیں آتا۔ ہر شاعر کے ہاں ایسے دس بیس اشعار ملتے ہیں۔ ممکن ہی کہ میر صاحب نے بھی اسی قسم کی شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہو، اور حقیقت میں اُن کا کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہو۔ ہمارے قول کی تائید مصنّفِ واقعاتِ انیس بھی کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "مرثیہ یا سلاموں میں کہیں کہیں شاعرانہ شوخی یا سخن گسترانہ اشارات پائے جاتے ہیں اور یہ معمولی طریقِ شعرا ہی درصل کسی جانب روئے سخن نہیں"[1]

دوسری دلیل کا جواب مرزا صاحب چوٹوں کا جواب نہیں دیتے

(۲) رہی آپ کی دوسری دلیل، یعنی ان چوٹوں کو سُنکر مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہی کہ آپ کا یہ قول صحیح نہیں کہ مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے، بلکہ وہ بھی میر صاحب کی طرح جابجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ حریف اُنکے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً

---

[1] واقعات انیس صفحہ ۴۰

رباعی

ہی سُست کہ چُست پر کلام اپنا ہے — لاریب خطا پوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں — اُن مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے

دیگر

سرقہ مضموں کا زبوں ہوتا ہے — یعنی علمِ نظم نگوں ہوتا ہے
پر اُن میں جو مندرج ہی حالِ شہدا — اس سے مرے مرثیوں کا خوں ہوتا ہے

ایک موقع پر اس مرثیہ میں ع - اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے - فرماتے ہیں ؎

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی — ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی

یہ شعر اُس مرثیہ - اے دبدبۂ نظم الخ - میں ہی جسکو ذی علم مؤلف نے اوّل سے آخر تک بغور دیکھ کر آخرِ کتاب میں اعتراضات کے تیروں کا آماجگاہ بنایا ہی، بلکہ خود اس شعر کو بھی اعتراضات کے عنوان میں صفحہ ۲۴۴ پر نقل کیا ہی. اسلئے وہ یہ تو عذر نہیں کر سکتے کہ اُن کی نگاہ سے نہیں گذرا، پھر افسوس کے ساتھ سوا اسکے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے شعر کو قصداً چھپا ڈالا جو اس مرثیہ میں صاف موجود ہی - اور جسکو خود اُنھوں نے اپنی کتاب میں بھی درج کیا ہے

پھر مرزا صاحب ایک رباعی میں فرماتے ہیں -

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں — گونجیں گے ڈکاریں گے جہاں بند کروں
خلّاقیِ مضموں کا ہی دعویٰ سب کو — کھُل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

لاریب توارد سے بری کوئی کہاں ہے — افراطِ توارد ہو تو سرقے کا گماں ہے

؎ جلد بستم رباعیات — ؎ جلد اوّل - صفحہ ۲۱۰

جو مصرعِ موزوں مرا مشہورِ جہاں ہے　　البتہ توارد ہو تو حیرت کا مکاں ہے

سرقہ ہی کہ تالیف ہی مضمونِ کہن کی
یہ سب ہے زکوٰۃ اپنے زرِ نقدِ سخن کی

گو دزدِ سخن سرقہ کرے میرے بیاں سے　　ملکِ سخنِ تازہ میں لوں تیغِ زباں سے

شاکر ہو دبیرِ آلِ نبیؐ کی ہے یہ تائید　　تازہ ہی تمامی سخن اور تازہ ہے تمہید
دزدانِ مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید　　تو مجتہدِ نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

ہر باغ ہے گلچیں مرے مضموں کے چمن کا　　ہر بحر ہے قطرہ مرے دریائے سخن کا[۴]

یہ سب اشعار مرزا صاحب کی نہیں مطبوعہ جلدوں میں موجود ہیں۔ نہیں معلوم لائق مولف کی نظر سے کس طرح رہ گئے باوجودیکہ تمام جلدیں اُن کی نظر سے گذری ہیں۔ مؤلف کی اس قسم کی بہت سی یک طرفہ کارروائیوں کی یہ سب سے پہلی مثال ہی اس کے علاوہ اور نظیریں وقتاً فوقتاً آگے نظر سے گذریں گی۔

مولف کی بے جا کارروائیوں کی پہلی مثال

مولف نے جو شعر مرزا صاحب کا بتری کے بیان میں لکھا ہے اُس سے بھی ضمناً اسی قسم کا اشارہ پایا جاتا ہے جو ان شعروں میں ہی۔ یعنی خدا کا شکر ہی کہ میں تو سرقہ کی حد سے بعید ہوں لیکن میرے معاصر اُس سے قریب ہیں، اور جہاں حریف دوسروں کے مضامین سے تمتع حاصل کرتے ہیں، میں ہر مرثیے میں جدّت سے

[۴] جلد ۱۳ - صفحہ ۱۸۸

کام لیا کرتا ہوں۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ مرزا صاحب بھی برابر کا جواب دیتے ہیں۔

دونوں صاحب اور مرزا صاحب کے سخن ہو گیا

لیکن ہماری اب بھی وہی رائے ہے کہ جس طرح میر صاحب کا روئے سخن کسی طرف نہ ہو گا اسی طرح مرزا صاحب کے اشعار میں بھی محض سخن گسترانہ اشارات معلوم ہوتے ہیں اور دراصل اُن کا بھی روئے سخن کسی جانب نہ ہو گا۔ اور فی الحقیقت دونوں صاحبوں کی ثقاہت۔ متانت اور تہذیب کا یہی مقتضیٰ بھی ہے کہ وہ ایسی عامیانہ چوٹوں سے بری رہیں۔ جو لوگ اُن کے اس قسم کے اشعار میں کوئی اور معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا ان اخلاقِ مجسّم بزرگوں کی شان و وقار سے اجنبی ہیں۔

ایک دوسرے کا جواب لکھنا

رہا ایک دوسرے کا جواب لکھنا، یہ تو شعرا کیا ہی کرتے ہیں، لیکن یہ خیال کہ ہمیشہ مرزا صاحب ہی جواب لکھا کرتے تھے دعوے بے دلیل اور صریح ہٹ دھرمی ہے۔ ہماری رائے میں جس زمانے میں ان نامور شاعروں کی معرکہ آرائیوں کا بازار گرم تھا، پُرزور طبیعتیں جولانیوں پر آئی ہوئی تھیں، اُسوقت جب ان میں سے کسی کا جدید مرثیہ نکلتا ہو گا، خاص شہرت ہو جاتی ہو گی؛ پس لامحالہ دوسرے صاحب کسی دوسری مجلس میں اُس کا جواب پڑھکر حریف کے رنگ کو پھیکا کر کے اپنے لئے داد و تحسین کا خلعت حاصل کرتے ہونگے۔ یہ امر نہ مرزا صاحب کیواسطے خاص ہو گا نہ میر صاحب کے لئے، بلکہ دونوں صاحب ایک دوسرے کا جواب لکھ کر اپنی جادو بیانی کا ثبوت دیتے ہونگے۔ یہ بات نہ قابل اعتراض ہے نہ کسی شاعر کی سُبکی کا باعث۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ کسی شاعر کے طرزِ ادا سے بچ کر،

ایک ہی مضمون کو، کوئی لطیف اضافہ یا تبدیلی کرکے، دوسرے انداز اور نئے پیرایہ میں فصاحت وبلاغت کے ساتھ اس طرح ادا کرنا کہ مضمون کی خوبی یا متانت یا وضاحت زیادہ ہوجائے، نہایت مشکل اور شعرا کے زورِ طبیعت اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ اور ایسا شاعر درحقیقت اُس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے پس اگر دونوں صاحب ایسا کرتے ہوں تو کوئی حرج، یا قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔ اُردو فارسی کے تمام اگلے شاعروں نے ایسا کیا ہے، جس کی مثالیں بخوفِ طوالت قلم انداز کی جاتی ہیں۔

میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

اس میں شک نہیں کہ میر انیس مرحوم اعلی اللہ مقامہ بھی سرتاجِ شعرائے ہند تھے، لیکن قابل مؤلف نے اس عنوان میں جو خصوصیات اُن کیواسطے ثابت کی ہیں اُنہیں ہم اُنکے جلیل القدر معاصر مرزا دبیر مرحوم کو بھی شریک سمجھتے ہیں، کیونکہ ان دونوں یکتائے عصر شاعروں کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے ایسے بے بہا نمونے پائے جاتے ہیں جو دوسرے شعرا کے کلام میں ڈھونڈے بھی نہیں ملتے

فصاحت کلمہ

آگے چل کر مؤلف لکھتے ہیں کہ "علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ (۱) لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس (غیر مانوس) نہوں۔ قواعدِ صرفی کے خلاف نہو،[1] (۲) الفاظ سادگی، آسانی، کثیر الاستعمالی کے ساتھ ہی

[1] اس مقام پر قابل مؤلف سے اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ آپ فصاحت کی جو تعریف لکھتے ہیں یہ خود فصاحت کی نہیں، بلکہ کلمۂ فصیح کی تعریف ہے۔ فصاحت کا اطلاق تو کلمہ۔ کلام متکلم تینوں پر ہوتا ہے پس آپ کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا کہ علمائے علم ادب نے کلمۂ فصیح کی یہ تعریف کی ہے کہ اس میں حروف آئیں ان میں تنافر نہوا الخ۔ چنانچہ آپ کی تسلی کے واسطے کتب علم معانی سے چند اقوال بطور سند لکھتے ہیں جن سے کلمۂ فصیح اور فصاحت کی تعریف علیحدہ علیحدہ معلوم ہو جائے گی۔ کلمۂ فصیح کی تعریف۔ مطول میں ہے۔ فالفصاحۃ فی المفرد خلوصہ من تنافر الحروف۔ والغرابۃ۔ ومخالفۃ القیاس اللغوی۔ فصاحت کی تعریف یہ ہے۔ راغب مفردات میں لکھتے ہیں۔ الفصح خلوص الشی مما یشوبہ۔ یعنی کسی چیز کا اُس کی آمیزش سے خالی ہونا یقال فصح الرجل اذا جادت لغتہ۔ دروس البلاغت میں ہے۔ الفصاحۃ فی اللغۃ تنبئ عن البیان والظہور۔ یقال افصح الصبی فی منطقہ اذا بان وظہر کلامہ۔ ان تصریحات کے بعد آپ خود غور کر لیں کہ جو تعریف آپ نے لکھی ہے وہ خود فصاحت کی ہے یا کلمۂ فصیح کی۔

مبتذل اور سوقی بھی نہوں۔ ابتذال کا معیار مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاقِ صحیح خود بتادیتا ہی کہ یہ لفظ مبتذل۔ پست۔ اور سوقیانہ ہی" پھر وہ فصاحتِ کلام کی تعریف لکھتے ہیں کہ "جب ایسے الفاظ مل جائیں جو سادہ۔ آسان۔ کثیر الاستعمال اور غیر مبتذل ہوں تو یہ بھی ضرور ہی کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں اُنکی ساخت ہیئت۔ نشست۔ سُبکی اور گرانی کے ساتھ اُن کو خاص تناسب و توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہیگی۔ جب کسی مصرعہ (مصرع) یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن، اور توافق پایا جاتا ہی، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہی اور یہی چیز ہی جسکو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلاویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں"

فصاحتِ کلام

اسی بحث میں اُنھوں نے لکھا ہی کہ "مرزا صاحب کا یہ مشہور مصرع ہی۔ ع۔ زیرِ قدم اولدہ فردوسِ بریں ہی۔ اس کے تمام الفاظ بجائے خود فصیح ہیں لیکن انکے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوا ہی وہ بھدّا اور گراں ہی" نہیں معلوم یہ مصرع مرزا صاحب کی کس جلد میں مؤلف کی نظر سے گذرا ہی ان بیسوں جلدوں میں تو اسکا پتہ نہیں ملتا، اکثر قلمی مرثیے نظر سے گذرے اُن میں بھی نہیں دیکھا گیا، پھر مؤلف نے کس یقین پر اسکو مرزا صاحب کا مصرع خیال کرلیا، یہ مصرع ہرگز مرزا صاحب کا نہیں بلکہ حکیم قدیر شاگرد مرزا صاحب کا ہی۔

اس کے بعد لائق مؤلف نے میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام سے مشترک مضامین کے چند اشعار انتخاب کیے ہیں اور دونوں کے تقابل کے بعد ظاہر کیا ہی کہ میر صاحب ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لائے ہیں اور مرزا صاحب کے ہاں غریب اور ثقیل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس موقع پر بجائے اسکے کہ ہم اسکا کچھ

جواب لکھیں، موازنہ کے متعلق ایک مفصل مضمون لکھتے ہیں جو ناظرین کے واسطے غالباً دلچسپ اور مفید ہوگا اور اس سے مؤلف کے موازنہ کی حقیقت بھی بخوبی واضح اور عیاں ہو جائے گی۔

یکساں نہیں ہوتا

یہ ایک مسلم الثبوت بات ہی کہ کسی شاعر کا تمام کلام بالکل ایک ہی سانچہ میں ڈھلا ہوا نہیں ہوتا۔ گو یہ ضرور ہی کہ اُس کا مذاق اور طرزِ سخن اُسکے ہر صنفِ کلام میں جلوہ دکھاتا رہتا ہی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ جلوہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتا ہی۔

کلام میں مختلف مدارج ہونے کی وجوہ

پہلی وجہ

شعرا کے کلام میں مختلف مدارج ہونے کے چند وجوہ ہیں۔ **اوّل** یہ کہ بعض کلام ابتداے مشق کا ہوتا ہی، بعض شباب کے زمانے کا، اور بعض آخرِ عمر کا منجھا ہوا؛ جسقدر مشقِ سخن عمر اور تجربہ کے لحاظ سے رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہی، اُسیقدر کلام کا رتبہ بھی درجہ بدرجہ رفیع اور بلند ہوتا جاتا ہی؛ اور بتدریج طرزِ ادا میں خوش اسلوبی اور زبان کی صفائی میں ترقی پیدا ہوتی جاتی ہی۔ مگر یہ کلام باہم ایسا خلط ملط ہو جاتا ہی کہ ہر زمانے کا کلام علیحدہ علیحدہ چھانٹنا ناممکن ہی۔ اسی وجہ سے اساتذہ کے دواوین میں غایت درجہ کا استوار، اور حد سے زیادہ کمزور کلام نظر آتا ہی۔

دوسری وجہ

دوسرے یہ کہ موقع اور محل کے لحاظ سے بھی کلام میں مختلف مدارج پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی کلام اپنی طبیعت کی اُپج اور اُمنگ سے جوش اور ولولہ کی حالت میں بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہی، کوئی کسی کی فرمائش۔ اصرار اور دباؤ سے لکھنا پڑتا ہی، ظاہر ہی کہ جو کلام بغیر اقتضاے طبعی اور ولولۂ باطنی کے لکھا جائیگا پُر زور اور پُر اثر نہوگا؛ کسی مضمون سے مصنّف کو خاص طور پر لگاؤ اور تعلق ہوتا ہی، اور کوئی مضمون محض اپنی شاعری کی تکمیل کی غرض سے طبیعت کو مجبور کرکے لکھتا ہی، دونوں کلاموں میں آمد اور

آورد کا فرق بیّن طور پر نظر آجاتا ہی۔ بعض[۳] اشعار کسی خاص ضرورت یا فرمائش سے عجلت میں کہنے پڑتے ہیں جن پر معمولی غور و فکر سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ بعض[۴] فرمائشی کلام ایسا ہوتا ہی کہ کسی دوست نے جن خاص رعایتوں کی فرمائش کر دی ہی وہ مجبوراً برتنا پڑتی ہیں۔ یہ وجوہ ہیں جو ہر شاعر کے کلام میں مختلف مدارج پیدا کر دیتے ہیں۔

پُرگو شعرا کے کلام میں چند غیر فصیح الفاظ کا ہونا کچھ عجب نہیں

رہا کسی کلام میں چند غیر فصیح اور معمولی الفاظ کا موجود ہونا، اس کی نسبت ہمارا خیال ہی اور مؤلف بھی ہمارے ہمخیال ہیں کہ جس قدر قادر الکلام اور پُرگو شعرا گذرے ہیں اُن سب کے کلام میں اکثر غیر فصیح اور معمولی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر مؤلف نے لکھا ہی کہ "فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں، ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں نہایت کثرت سے موجود ہیں"۔ میر انیس کو بھی اسی قادر الکلامی اور پُرگوئی کے عذر پر مؤلف اس جرم سے بری رکھنا چاہتے ہیں۔ پس اسی کلّیہ کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرزا دبیر تمام شعرا سے زیادہ پُرگو اور تمام اہلِ کمال کے مرجع تھے۔ ہزاروں دوست ہزاروں شاگرد طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔ عام مرثیہ گو صرف چند حالات کے مرثیے لکھتے ہیں، انھوں نے حمد۔ نعت۔ منقبت۔ مدحِ مجتہدین، مدحِ شاہِ اودھ، حالاتِ حضرت حبیبؑ ابن مظاہر۔ جناب زہیر قین۔ چہاردہ معصومین علیہم السلام۔ مختار، ولادتِ حضرت امام حسینؑ، حضرت عباسؑ حضرت علی اکبرؑ وغیرہ میں بکثرت مرثیے لکھے؛ کربلا میں قبلِ غدر مجتہدین شہید

مرزا صاحب کی پُرگوئی

۳ موازنہ صفحہ ۲۳۰۔

ہوئے اس حال میں ایک مرثیہ تصنیف کر دیا، ایک شخص نے تعزیہ داری پر اعتراض کیا اس کے جواب میں ایک مرثیہ لکھڈالا۔ سیکڑوں روایتیں اور حدیثیں مرثیوں میں نظم کیں، سیکڑوں مرثیے دوسرے لوگوں کا تخلص ڈال کر اُن کو دیدیئے۔ یہ بیس مطبوعہ جلدیں کلام کا دسواں حصہ بھی نہیں، انکے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے مرثیے اُستادی معظمی مرزا اوج صاحب قبلہ مدظلہ اور بعض تلامذہ کے پاس موجود ہیں جنکا ایک مصرع بھی نہیں چھپا۔ پس جس شخص نے اُردو شعرا میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہوں اور جسکو مختلف واقعات اور گوناگوں حالات بیان کرنے کی ضرورت سے ہر قسم اور ہر طرز اور ہر درجے کے الفاظ کہنے پڑے ہوں اُسکے کلام کے لاکھوں اشعار میں اگر چند غیر فصیح الفاظ بھی پائے جاتے ہوں تو جاے تعجب نہیں۔ ایسی معمولی فروگذاشتوں سے دنیا میں کسی عربی۔ فارسی اُردو کے شاعر کا کلام پاک نہیں ہوسکتا، اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی اُستادی میں فرق آسکتا ہی۔ ؎

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست	در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

مرزا صاحب کی عیب

البتہ ہم کو اسپر فخر ہی کہ وہ الفاظ جنسے کسی شاعر کی کم علمی عیاں ہوتی ہی۔ مرزا صاحب کے یہاں کسی معمولی عیب ہیں کو تو کیا قابل مؤلف کو بھی نظر نہیں آئے ورنہ وہ اُن کو ضرور پیش کرتے۔ مرزا صاحب علوم و فنون متداولہ کے ایک عالم متبحر، اور نہایت وسیع الخیال شاعر تھے؛ چنانچہ خود اُن کے کلام سے عالمانہ اوصاف اور شاعرانہ قابلیتوں کا اظہار ہوتا ہی۔

موازنہ کرنے کی مشکلات

اب ہم دو کلاموں میں موازنہ کرنے کی مشکلات کا بیان، اور اس امر میں جو جو غلطیاں

پہلی مشکل

اور ناانصافیاں ہونا ممکن ہیں اُن کی تشریح کرتے ہیں - یہ امر ظاہر ہی کہ مرثیہ گویوں کی تصنیف مثل مثنوی کے کوئی ایک نسخہ نہیں ہی، وہی معمولی مضامین ہیں جنکو مختلف مقامات پر دوسرے الفاظ اور دوسرے رنگ میں بیان کیا گیا ہی - ایک ہی مضمون کی بندش بعض مقامات پر اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہی، اور بعض مقامات پر معمولی درجے کی - پس دو شاعروں میں سے جسکا چاہیں ہم مضمون کلام اعلیٰ اور ادنیٰ پایہ کا بہت تھوڑی توجہ سے مل سکتا ہے، بلکہ ایک ہی شاعر کے ہمضمون کلام کو جو مختلف اوقات میں لکھا گیا ہی مقابلہ کیا جائے تو ضرور فضیلت کا تاج اُن میں سے ایک ہی کے سر پر رکھا جائیگا چہ جائیکہ دوسرے شاعر کے کلام سے موازنہ کیا جائے - مثلاً یہ دونوں مصرعے میر صاحب ہی کے ہیں، ع - تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں - اور - ع - بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں حالانکہ دونوں مصرعوں کی بندش اور برجستگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے -

دوسری مشکل

اس کے علاوہ ایک شاعر کا کوئی مضمون ایجاد کرنا اور دوسرے کا اُسکو ترقی دیدینا بھی منصفانہ موازنہ کرنے میں ہارج ہوتا ہی - یہ امر خصوصیاتِ شاعری میں سے ہی کہ شاعر مضمون سے مضمون اور بات سے بات نکالتا ہی؛ پس جب کوئی شاعر کسی پہلے مضمون کو دیکھ کر کوئی بات نکالتا، اور اُسکو دوسرے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہی، اُس کی یہی کوشش ہوتی ہی کہ اِس مضمون کو ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کروں کہ اگلی بندش سے سبقت لیجائے اور نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے اعلیٰ اور ارفع ہو - اگر اِس کوشش میں کامیابی ہوئی تو بہتر، ورنہ اُس خیال ہی کو چھوڑ دیتا ہی اور خود موازنہ کر لیتا ہی کہ پہلا کلام کس پایہ کا تھا اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ کس حیثیت کا ہی، پھر مدِ مقابل سے دیدہ و دانستہ کیوں کمزور رہوں - یہ تو دوسرے کے مقابلے کا ذکر ہی، خود ہی طبیعت چاہتی ہی کہ جس بات کو میں ایکبار لکھ چکا ہوں اُسکو دوسرے

وقت لکھوں تو پہلے سے کچھ برتری ضرور ہو۔ پس جب کوئی دو ہمضمون کلام نظر سے گذریں، اور اُن کا زمانۂ تصنیف نہ معلوم ہو تو ممکن ہی کہ اُن دونوں میں جو ادنیٰ قسم کا ہی اُسکا مصنف مضمون کا موجد ہو، اور جو اعلیٰ درجہ کا ہی اُسکے مصنف نے پہلے شاعر کے کلام کو دیکھ کر ترقی دیدی ہو، پھر ایسے کلام کے موازنہ میں وجہ ترجیح کمزور ہو جاتی ہی؛ اسلیے کہ اگر دوسرا مصنف مضمون کے ترقی دینے کا شرف رکھتا ہی تو پہلے کو ایجاد کا فخر حاصل ہی کیونکہ الفضلُ للمتقدّم۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہی کہ توارد ہو جاتا ہی اس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا البتہ ایک معقول بات ہی مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہی۔ مرزا دبیر۔ اور میر انیس کے کلام میں محاکمہ کرنے کے متعلق مولانا آزاد صاحب تذکرۂ آبحیات میں بالکل بجا لکھتے ہیں کہ "ان کے کلام میں محاکمہ کرنے کا لطف جب ہے کہ ہر اُستاد کے چار چار پانچ پانچ سو مرثیے بجائے خود پڑھو اور پھر مجلسوں میں سُنکر دیکھو کہ ہر ایک کا کلام اہلِ مجلس پر کسقدر کامیاب یا ناکام رہا ہے اسکے مزا نہیں"۔

پس جبکہ یہ امر ثابت ہو چکا کہ کسی شاعر کا تمام کلام ایک درجہ کا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے تو موازنہ کرنے والے کے ہاتھ میں اس بات کا بڑا موقع ہی کہ جسکو چاہے بڑھا دے اور جسکو چاہے گھٹا دے، خصوصاً جبکہ وہ انصاف اور حق پسندی سے کام نہ لے کیونکہ ایک شاعر کا اعلیٰ درجہ کا، اور دوسرے شاعر کا ادنیٰ درجہ کا کلام مقابل میں لے آنا کوئی بڑی لیاقت یا غور کی بات نہیں ہی؛ جیساکہ قابل مؤلف نے اس عنوان کے آخر میں میر صاحب کے بہترین کلام، اور مرزا صاحب کے چند معمولی اشعار کا انتخاب کرکے دونوں میں مقابلہ کیا ہی۔

ایک امرِ عجیب اور بھی قابلِ غور ہی۔ مؤلف کو اس مقام (بحث فصاحت) پر اس امر کا

توارد میں ترجیح دینا معقول بات ہی

مولوی آزاد کی رائے

کسی شاعر کا گھٹا دینا یا بڑھا دینا موازنہ کرنیوالے کے اختیار میں ہی

راجح فصاحت کو سب صحیح ظاہر کرنا چاہیے تھا

بیان کرنا مقصود تھا کہ ایک ہی مضمون یا مطلب کے واسطے مختلف اقسام کے الفاظ بیان کیے جائیں تو اُن میں بلحاظِ فصاحت بہت تفاوت و اختلاف ہو جاتا ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہونگے۔ بعض فصیح تر۔ بعض فصیح ترین۔ پس ان مدارجِ فصاحت کے اظہار کے واسطے اُن کو مختلف مدارج کے، ہمضمون اشعار لکھنے کی ضرورت تھی خواہ وہ فقط میر انیس کے ہوں، یا مرزا دبیر کے، یا دونوں کے۔ چنانچہ اسکے عمدہ اور بہتر طریقے دو تھے (۱) یہ کہ میر صاحب ہی کے کلام سے دونوں قسم (ادنیٰ اور اعلیٰ) کے ہمضمون اشعار انتخاب کر لیے جاتے، جن میں اُنھوں نے کہیں فصیح الفاظ استعمال کیے ہیں، کہیں فصیح تر، کہیں فصیح ترین (۲) یا یہ کہ ایک مقام پر میر صاحب کا اعلیٰ اور مرزا صاحب کا ادنیٰ، اور دوسرے مقام پر مرزا صاحب کا اعلیٰ اور میر صاحب کا ادنیٰ قسم کا کلام لکھ کر مدارجِ فصاحت کا اظہار کر دیا جاتا، تاکہ اُن کا مطلب بھی بخوبی پورا ہو جاتا اور کسی کو شکایت بھی باقی نہ رہتی، اور ہم کو بھی کہیں نہ کہیں اُن کی منصف مزاجی اور حق پسندی کا قائل ہو جانا پڑتا۔ مگر اُنھوں نے اسکا سب سے بُرا پہلو اختیار کیا، یعنی اس موقع پر بھی اپنی رائے میں مرزا صاحب کے ادنیٰ قسم کے اشعار تلاش کر کے اُس کے مقابلہ میں میر صاحب کے بہتر اشعار نہایت توجہ اور غور سے انتخاب کیے ہیں تاکہ مدارجِ فصاحت کا بھی اظہار ہو جائے اور مرزا صاحب کے کلام کی تنقیص سے اُن کا دل بھی تسکین پائے، اور وہ اصول کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے جسکو اُنھوں نے شروع سے آخر تک ہر مقام پر نصب العین رکھا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کو تینوں قسموں کے اشعار نہیں مِل سکے تو یہ بات بھی نہیں، چنانچہ ہم اُن بہتر طریقوں کی مثالیں لکھتے ہیں جن پر مؤلف نے قصداً توجہ نہیں کی۔

(۱) میر انیس کے کلام سے ادنیٰ اور اعلیٰ قسم کی مثالیں، جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلافِ مراتب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

میر انیس۔ تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں
ایضاً۔ بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں۔

میر انیس۔ آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پُتلی کو خبر ہو
ایضاً۔ آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہو

میر انیس۔ روباہ ہیں سب میں اسدِ حق کا ولد ہوں
ایضاً
روباہ ہیں، میں پسرِ شیرِ خدا ہوں (یا) ہشیار کہ میں شیرِ الٰہی کا پسر ہوں

میر انیس
پے کر کے اسپ کو ہوا حضرت پہ حملہ ور حیدرؑ نے بہرِ دفعِ ضرر سر پہ لی سپر
ایضاً
مرحب ہوا علیؑ ولی پر جو حملہ ور حضرت نے اپنے فرقِ مبارک پہ لی سپر

میر انیس۔ بس اک یہی تو ہیگا وسیلہ نجات کا
ایضاً۔ رونا ہی وسیلہ ہے شفاعت کا ہماری

میر انیس۔ دیکھیں یہ ہما فرق پہ لہراتا ہے کس کے
ایضاً۔ دیکھیں یہ ہما سایہ فگن ہوتا ہے کس پر

میر انیس
سونپا ہے تمہیں میں نے دل و جانِ نبیؐ کو لیویگی بہن تم سے حسینؑ ابنِ علیؑ کو

۔ حصہ چہارم صفحہ ۱۰۰ ۔ ۲ ۔ ۱ ۔ ۲

ایضاً

تم سے بڑی امید ہے زہرا کی جائی کو　　بھیا! تمھیں سے لگی بہن اپنے بھائی کو

(میر انیس)

بھیجا ہمارے واسطے خالق نے ہل اتیٰ　　کافی سند کیواسطے ہے لفظِ قُل کفا

زیبا ہمارے تن پہ ہی تشریفِ انما　　ہم کو کیا خدا نے سرافرازِ لافتا

(ایضاً)

حق نے کیا عطا پہ عطا ہل اتیٰ کسے　　کہتی ہی خلق بادشہِ قُل کفا کسے

کونین میں مِلا شرفِ انما کسے　　حاصل ہوا ہی مرتبۂ لافتا کسے

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے ہم مضمون اشعار مِل سکتے ہیں اسوقت یہی چند اشعار جو ذہن میں آئے درج کر دیئے گئے۔

(۲) میر صاحب اور میرزا صاحب کے وہ ہم مضمون اشعار جہاں میر انیس کو فوقیت ہے، یہ اشعار مؤلف نے اپنے موازنہ صفحہ ۲۲ میں درج کیے ہیں اور ہم کو تلاش کی زحمت سے بچادیا۔ اگرچہ اس انتخاب میں ہم کو بعض اشعار کی نسبت اختلاف ہی، لیکن ہماری طبیعت میں مؤلف کی طرح نکتہ چینی کا مادّہ نہیں! اس لیے ہم ان تمام اشعار ہی میں میر صاحب کی فضیلت مانے لیتے ہیں۔

(۳) مرزا صاحب اور میر صاحب کے وہ ہم مضمون اشعار جن میں مرزا دبیر کو ترجیح حاصل ہے۔

میر انیس۔ پہونچے نہ صبا اُس کے کبھی گرد کے دنبال
مرزا دبیر۔ جولاں جو ہوا پیکِ صبا رہ گیا پیچھے

میر انیس۔ حق نے کیا عطا یہ عطا ہل اتی کسے
مرزا دبیر۔ حیدرؑ کو اس عطا نے شہِ ہل اتی کیا

میر انیس

جس سے خدا خوشی ہو علیؑ کی وہ حرب ہے — افضل عبادتِ دو جہاں سے یہ ضرب ہے

مرزا دبیر

حق نے کہا ہے حربِ علیؑ میری حرب ہے — افضل عبادتِ دو جہاں سے یہ ضرب ہے

میر انیس۔ قائم ہیں دونوں پاؤں پر جبرئیل پر
مرزا دبیر۔ ہیں شیرِ حق کے پاؤں پر جبرئیل پر

میر انیس۔ آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو
مرزا دبیر۔ آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ مردم کو خبر ہو

میر انیس

زیبا ہمارے تن پہ ہے تشریفِ انّما — ہم کو کیا خدا نے سرافرازِ لافتا

مرزا دبیر

خورشیدِ انورِ فلکِ انّما ہیں یہ — اغیار لاف زن ہیں، شہِ لافتا ہیں یہ

میر انیس

سینے پہ مرے زانوئے قاتل نہ گراں ہو — خنجر کے تلے نام ترا وردِ زباں ہو

مرزا دبیر

حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلّاد رہے — لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

۲/۲۴ ۲

اس کے بعد مؤلف نے میر صاحب کے کلامِ بلاغت نظام سے چند منتخب بند اور مختلف اشعار پیش کیے ہیں۔ اُن کی خوبی اور لطافت میں کچھ شک نہیں، لیکن اگر وہ تلاش کرتے تو مرزا صاحب کے وسیع ذخیرۂ کلام میں بھی ایسے بیشمار بند مل جاتے جنکو الفاظ کی فصاحت۔ بندش کی صفائی۔ نشست کی خوبی کا بہترین نمونہ ماننا پڑتا؛ مگر یا تو اُنھوں نے اُن کے دلکش و دلاویز کلام کی طرف سے آنکھ بند کرلی یا دیدہ و دانستہ تلاش کی زحمت گوارا نہیں کی؛ کیونکہ مرزا صاحب کا ایسا ہی دلچسپ اور فصیح کلام درجِ کتاب کرنا اُنکے مقصود کے خلاف تھا۔ مگر یہ جواہرِ بے بہا اُن کو نظر کیوں آتے، اُنھوں نے تو مرزا صاحب کا کلام سرسری طور پر محض اعتراضات تلاش کرنے کی نیت سے کہیں کہیں دیکھ لیا ہی۔ اگر خوش نیتی اور حسنِ اعتقاد سے دیکھتے تو اُس میں سب کچھ مل جاتا۔ بہرحال اس موقع پر ہم مرزا صاحب کے نفیس کلام سے چند بند اور مختلف اشعار بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

ہیبت و جلال

خیبر شکن کے لال کی آمد ہی صف شکن
گرتی ہی فوج فوج پہ، پڑتا ہے رنپہ رن
سیفِ خدا کی تیغ کا سایہ ہے تیغ زن
غلطاں کہیں قدم ہیں، کہیں سر، کہیں بدن

نے حوصلہ نہ بُغضِ امامِ مبیں رہا
اب دل میں بھاگنے کے سوا کچھ نہیں رہا

کر کیٹ پیتروں کو بدلکر بڑھے، کہ ہاں
شیر و دلیرو! غازی و تازی کی لو عناں
مرتے ہیں مردِ نام پہ، نامرد بہرِ ناں
سنبھلے ہوئے، کہ سامنے ہی ہاشمی جواں

لینا نہ موہنہ پہ ڈھال کہ ہستی حباب ہے
دینا نہ آبرو کہ یہ موتی کی آب ہے

رجز امام حسینؑ

حضرت نے غافلوں سے کہا ہوشیار ہو
ہاں قاتلانِ آلِ عبا! ہوشیار ہو
کانوں میں کہہ رہی ہے قضا ہوشیار ہو
نزدیک ہے عذابِ خدا ہوشیار ہو

سیرِ جناں ہے بادۂ حبِّ حسینؑ میں
اک نشۂ حلال ہے یہ نشاتین میں

میں جان ہوں رسولؐ کی ہیں انس و جاں گواہ
مالک ہوں سب زمینوں کا ہے آسماں گواہ
مظلومیت میں ایک ہوں، دونوں جہاں گواہ
ہفتم سے پانی بند ہے، آبِ رواں گواہ

جاری ہے کیا زبانوں پہ؟ یہ کس کی نہر ہے؟
مالِ یزید ہے، کہ مری ماں کا مہر ہے؟

مانا، یزید صاحبِ دولت ہے، ہم نہیں
پر وہ وہی ہے، اور شرافت میں ہم ہمیں
ہوتی ہے آسماں کے مقابل کہیں زمیں
وہ تخت کا مکیں ہے، تو ہم عرش کے مکیں

ممکن ہے زور و زر سے یہ رتبہ کسی کا ہو
چاہے جسے خدا وہ نواسا نبیؐ کا ہو

فوج اُسکے پاس بھی ہے، پہ فوجِ خدا کہاں
صاحبِ علمِ ہزار، پہ عباسؑ سا کہاں
بیٹے بہت، پہ اکبرِ گلگوں قبا کہاں
لاکھوں میں ایک ثانیِ خیر الوریٰ کہاں

بھائی یزید کا کوئی مثلِ حسنؑ بھی ہے
زینبؑ سی عابدہ کوئی اُسکی بہن بھی ہے

فرش اُسکا جبرئیل کا پر ہو، نہ ہوئے گا
عرشِ بریں پہ اُسکا گذر ہو، نہ ہوئے گا
سلطانِ دیں وہ بانیِ شر ہو، نہ ہوئے گا
دنیا اگر ادھر کی اُدھر ہو، نہ ہوئے گا

پرچے غلط سناتے ہیں مخبر پلید کے
وحیِ خدا بھی آئی ہے گھر میں یزید کے

یہ جد یہ کد، یہ سعی یہ کوشش، یہ اہتمام
اسپر مٹے ہو بس، کہ مٹے پنجتنؑ کا نام

یہ صف کشی، یہ مورچہ بندی، یہ قتلِ عام
ناحق، عبث، نشان مرا قائم ہے تا قیام

حاشا کبھی جو آلِ رسولؐ امم مٹیں
قرآں مٹے کسی کے مٹائے تو ہم مٹیں

تلوار

جس مورچے میں لیلی تیغِ دوسر گئی
ہر صف میں خاک اُڑا کے ادھر سے اُدھر گئی

چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
پر یہ نہا نہا کے لہو میں، نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی، کبھی پیچھے کو پھر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی، وہ مضر پڑی

سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھیے یہ جنکے سر پڑی

اُٹھی، گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

اِک دم میں برابر، ادھر آئی اُدھر آئی
ہر سو ہوا محشر، ادھر آئی اُدھر آئی

یاں دم لیا، واں سر، ادھر آئی اُدھر آئی
ڈر کر صفِ لشکر، ادھر آئی اُدھر آئی

جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی

آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی

جب باگ ہلی، آمدِ محشر نظر آئی
لشکر میں قیامت ادھر آئی اُدھر آئی
چمکا جو علم، چار طرف یہ خبر آئی
لو کاہکشاں آج زمیں پر اُتر آئی

جب ہاتھ میں تلوار کا پرتو نظر آیا
خورشید کے پنجے میں مہِ نو نظر آیا

امام حسینؑ کی فوج کا حال

سب نوعروسِ شوقِ شہادت سے ہمکنار
دنیا سے بے خبر رہِ عقبیٰ سے ہوشیار
حوروں کا اشتیاق شہادت کا انتظار
گہ مدحِ پنجتنؑ تو کبھی ذکرِ کردگار

تسبیح کا یہ ورد تھا اُن کی صفات میں
سررشتۂ عبادتِ خالق ہی ہات میں

کہتا تھا تیغ تول کے اِک صاحبِ یقیں
یہ فوج شام کی نہیں، یا آج ہم نہیں
کہتے تھے دل بڑھانے کو انصارِ شاہِ دیں
مردوں کی بس یہ بات ہے، واللہ آفریں

نیّت تو ہے بخیر، اب انجام نیک ہو
پھر موت زندگی ہے اگر نام نیک ہو

عمّامہ رکھ کے ہاتھوں پہ کرتا تھا اک دعا
یارب! تصدّق آلِ پیمبرؐ کی پیاس کا
یہ صبر دے، کہ لب نہ کریں پیاس کا گِلا
ہمّت وہ بخش، سرشہِ دیں پر کریں فدا

ہم ہوں، رکابِ شاہ ہو، جنّت کی سیر ہو
دنیا بخیر ہو چکی، عقبےٰ بخیر ہو

سب ماہرو تھے شاہ پہ ہالہ کیے ہوئے
مرنے پہ دل دیئے ہوئے، باگیں لیے ہوئے

اور جامِ عشقِ ساقیِ کوثر پیے ہوئے
لبہائے شکوہ روزِ ازل سے سیے ہوئے

آ آ کے معرکے میں برابر کھڑے ہوئے
نو لاکھ کے حضور بہتّر کھڑے ہوئے

وہ تن پہ زیبِ اسلحہ، وہ صف کشی کی شان
وہ حیدری جوان، وہ پیغمبری نشان
وہ سامنے فرات، وہ سوکھی ہوئی زباں
وہ حق کے میہمان، قضا اُن کی میہماں

شہ کے محب، حبیبِ رسولِ زمن کے تھے
بلبل تھے اس چمن کے تو پھول اُس چمن کے تھے

سراپا، حضرت عباسؑ

واہ کیا چہرۂ پُر نور ہے، اللہ اللہ!
چشمِ خورشیدِ فلک کو نہیں یارائے نگاہ
چشمِ بد دور عجب شکل ہے ماشاء اللہ
واہ کیا حُسن ہے، کیا نور ہے، کیا رتبہ و جاہ

سیرِ آئینۂ رخ، لطف یہ دکھلاتی ہے
اسد اللہؑ کی تصویر نظر آتی ہے

حُسن وہ حُسن، کہ ہیں سبطِ نبیؐ جس پہ فدا
نور وہ نور، کہ غش طور پہ موسیٰؑ بھی ہوا
چہرہ وہ چہرہ، کہ ہے جس کی ثنا صلِّ علیٰ
شان وہ شان، کہ یوسفؑ کو جہاں آئے حیا

قد ہے وہ قد، کہ فقط نورِ خدا ہے جس میں
قلب وہ قلب، کہ حق جلوہ نما ہے جس میں

طائرِ رنگِ رخ فوج اُڑا جاتا ہے
خونِ تن ہیبتِ آمد سے گھٹا جاتا ہے
قبضۂ تیغ بھی ہاتوں سے چھُٹا جاتا ہے
خود بخود سر طرفِ خاک جھکا جاتا ہے

عقل معدوم ہر اک صاحبِ شمشیر کی ہے

آمد آمد سوے روباہ عجب شیر کی ہے

نامِ نامی ہے حسینؑ ابنِ علیؑ صلِّ علےٰ
اور لقب بیوطن، و بیکس و شاہِ شہدا
مخزنِ صبر و رضا، معدنِ الطاف و عطا
مرجعِ رحمتِ حق، مبدءِ افضالِ خدا

سورۂ نور سے بھی نور دو چند اُن کا ہے
رتبہ تکبیر کے نعرے سے بلند اُن کا ہے

شرفِ کلکِ قضا، گلشنِ قدرت کی بہار
زینتِ لوح و قلم، عرشِ الٰہی کا وقار
راکبِ دوشِ نبیؐ، مہرِ نبوت کا سوار
مصحفِ ناطق، و تفسیرِ کلامِ غفّار

فخر وہ شکل، نہ کیوں چاند پہ وہ چند کرے
جسپہ یہ پیرِ فلک تاروں کو اسپند کرے

حضرت عباسؑ گھوڑے سے گرتے ہیں

گھوڑے سے گرے جب تو برادر کو پکارا
کام آیا یہ خادم یہ نمک خوار تمھارا
سُنتے ہی نہ حضرت کو رہا ضبط کا یارا
بس ہائے اخی کہہ کے گریباں کیا پارا

کانپا جو بدن، حیدرِ صفدر نے سنبھالا
غش کھا کے گرے تھے کہ جو اکبرؑ نے سنبھالا

سر پیٹتے روتے ہوئے میداں کو چلے شاہ
بابا کی کمر تھام کے اکبرؑ ہوئے ہمراہ
عباسؑ کا لاشہ جو نظر آگیا ناگاہ
بھائی سے بغلگیر ہوئے سرورِ ذیجاہ

کچھ کہنے نہ پائے کہ مسافر ہوئے عباسؑ
مُنہ دیکھتے ہی دیکھتے آخر ہوئے عباسؑ

بولے شہِ مظلوم یہ شانے کو ہلا کر
اُٹھتے نہیں، کیا سو گئے عباسؑ دلاور

ہمراہ تھے ہم بھی، نہ توقف کیا دم بھر
اللہ، یہ جلدی ہوئی اے جانِ برادر

پایا جو مکاں سر و تو نیند آگئی تم کو
ہاں شیر تھے، دریا کی ہوا بھا گئی تم کو

ڈیوڑھی پہ علم غرق بخوں آیا کہ محشر
ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لچک کر

پھر تو کوئی غش تھا کوئی حیراں کوئی ششدر
ڈیوڑھی پہ حرم پیٹتے تھے، لونڈیاں باہر

سردار بھی بیہوش تھا، اور اہلِ حرم بھی
منہ ڈھانپ کے روتا تھا پھریرے سے علم بھی

مناجات امام حسینؑ

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ
غیرِ اصغرؑ نہ رہا نورِ نگاہِ شبیرؑ

تھی فقط روحِ علیؑ پشت و پناہِ شبیرؑ
حق سے کہتے تھے کہ تو رہیو گواہِ شبیرؑ

سر فدا کر کے شریکِ شہدا ہوتا ہوں
آج میں تیری امانت سے ادا ہوتا ہوں

مطلع ثانی

ظہر تک سب رفقا شاہ کے مقتول ہوئے
تھے وہ مقبولِ خدا اور بھی مقبول ہوئے

یک قلم صرفِ خزاں فاطمہؑ کے پھول ہوئے
رو بہ قبلہ شہِ دیں شکر میں مشغول ہوئے

رو کے کہتے تھے کہ اکبرؑ نہیں عباسؑ نہیں
اب امانت کوئی خالق کی مرے پاس نہیں

اب نہ قاسمؑ مرا باقی ہے نہ اکبرؑ باقی
نہ علمدار سلامت ہے، نہ لشکر باقی

بھانجے ہیں نہ بھتیجے، نہ برادر باقی
اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغرؑ باقی

قتل اصغرؑ ہو، مرا سر بھی جُدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبیرؑ ادا ہو جائے

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا
ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے البتہ جُدا
اے خوشا حال، کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلاّد رہے
لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

قاصدِ حضرت صغرؑا کا کربلا میں پہونچنا

روانہ نہرِ لبن کو جو شیر خوار ہوا
زباں دکھانے پہ گردن سے تیر پار ہوا
تڑپ کے ہاتوں پہ حضرت سے ہمکنار ہوا
خزاں ہوا جو وہ گُل تو گلے کا ہار ہوا

ادھر تو شاہ کو یہ صدمۂ جگر پہونچا
اُدھر مدینے سے صُغرؑا کا نامہ بر پہونچا

لہو میں غرق کھڑے تھے کمر جُھکائے ہوئے
پسر کی ننّی سی میّت گلے لگائے ہوئے
لہو بھرا ہوا دامن اُسے اُڑھائے ہوئے
کفن کی فکر میں خیمے کو مُنہ پھرائے ہوئے

یہ حال دیکھ کے قاصد کی آس ٹوٹ گئی
ہوا یہ رعشہ کہ فوراً مہار چھوٹ گئی

اُتر کے ناقے سے آداب وہ بجا لایا
مگر حسینؑ تھے خاموش کچھ نہ فرمایا
وہ نوحہ کرتا ہوا اور متّصل آیا
نگاہِ یاس سے مُنہ دیکھ کر یہ چلّایا

قرار دو مجھے میں بے قرار ہوتا ہوں
حسینؑ جانکے تم پر نثار ہوتا ہوں

کہو بقیۂ اولادِ مرتضیٰؑ ہو تم
امیرِ لشکرِ اللہ و مصطفیٰؐ ہو تم
غریبِ کوفہ و مظلومِ کربلا ہو تم ؟
بتاؤ قاسمِؑ ناشاد کے چچا ہو تم ؟

جواب دو پدرِ نامرادِ اکبرؑ ہو
میں صدقے، حضرتِ عباسؑ کے برادر ہو

بہن ہے آپ کی زینبؑ سکینہؑ دختر ہے
وطن میں بھی کوئی بیٹی علیل و ششدر ہے
حضور کا کوئی ننّا سا لال اصغرؑ ہے
ہراول آپ کے لشکر کا حرِؑ صفدر ہے

زہیرؑ اور حبیبؑ آپ کے مصاحب ہیں
جناب عونؑ و محمدؑ کے ماموں صاحب ہیں

حسینؑ بھر کے دمِ سرد بولے اے غمخوار
امیر کون ہے، میں تو ہوں بیکس و ناچار
کہاں ہیں قاسمؑ و اکبرؑ کہاں علم بردار
خدا کے بندے تھے وہ سب ہوئے خدا پہ نثار

سپاہِ ظلم نے، تنہا سمجھ کے گھیرا ہے
ہزار تیغیں ہیں، اور ایک حلق میرا ہے

سُنا تھا تو نے کہاں شہرہ میرے اکبرؑ کا
ابھی ابھی وہ مرقع مٹا پیمبرؐ کا
سُنا تھا دبدبہ کس جا خدا کے لشکر کا
ابھی ابھی ہوا یاں خاتمہ بہتّر کا

جو شیر خوار کی تجکو تلاش ہے بھائی
یہ دیکھ لے مرے ہاتوں پہ لاش ہے بھائی

گویا ہوئی یہ دخترِ پیغمبرِؐ زمن
اے عیب پوشِ خلق خداوندِ ذوالمنن
تو نے کیا ہے رات کو بندوں کا پیرہن
لیکن ترے حسینؑ و حسنؑ ہیں برہنہ تن

کیسی یہ عید آئی کہ رنج و الم ہوا
فاقے کے دُکھ میں پیاروں کو کُرتوں کا غم ہوا

کُرتے کہاں ہیں، اُن کو جو دوں گی دمِ سحر
زینت سے سب کے بچّے پھرینگے ادھر اُدھر

ننگے رہے برس کے برس دن مرے پسر
رہ جائینگے مسوس کے دلکو مرے جگر

اطفالِ خاص و عام بغلگیر ہوئیں گے
یہ ناامید ماں کے گلے مِل کے روئیں گے

تو جانتا ہی یاں ہے نہ خیاط نے لباس
بالکل تری کنیز کو ہے ہر طرف سے یاس

بہلا دیا ہے میں نے کہ بچّے نہوں اُداس
اب ہوں خیالِ وعدہ خلافی سے بیحواس

صدّیقہ نام رکھا ہے تو نے بتولؑ کا
جھوٹا نہ کیجیو مجھے صدقہ رسولؐ کا

عزیزوں کی فرقت میں حضرت صغراؑ کے مدینے میں بین

پیدا ہوئے اصغرؑ تو پیامِ سفر آیا
بھیّا کو چھٹی بھر تو گلے خوب لگایا

افسوس کہ جھولے میں بہن نے نہ جھلایا
بچھڑے تو کبھی خواب میں بھی مُنہ نہ دکھایا

داخل شہِ دیں اب بھی نہ گھر میں ہوئے نانی!
اصغرؑ چھ مہینے کے سفر میں ہوئے نانی!

اب میں نہیں غم کھاتی ہوں، کھاتا ہی مجھے غم
یہ تپ مری رگ رگ کا لہو پیتی ہے ہر دم

مُنہ زرد ہی، لب خشک ہیں، جی سُست، کمر خم
یہ حال ہی، اور شوقِ لقائے شہِ عالم!

پروانہ بدن کی ہی، نہ دل کی، نہ جگر کی،
آنکھیں رہیں باقی، کہ زیارت ہو پدر کی

جو اپنے تھے وہ ہو گئے چھٹتے ہی پرائے
ماں باپ نے تو خیر، مرے پیار بھلائے
ڈیوڑھی پہ کھڑی رہتی ہوں میں آس لگائے
یہ دیکھیے، بھیا علی اکبرؑ بھی نہ آئے!

تن شمع صفت جلتا ہے، اور بدمزگی ہے
لو بھائی کے ملنے کی مگر دل سے لگی ہے

نانی نے دلاسا دیا لے لے کے بلائیں
پُرزہ کوئی لکھ بھیجیں، تمھیں بھی نہ بلائیں
واری گئی، جیتے رہیں وہ چاہیں جب آئیں
لو چلتی ہے، ان روزوں میں تشریف نہ لائیں

اغلب ہے کہ اس دھوپ میں آرام لیا ہو
اللہ کرے، خیمہ ترائی میں کیا ہو

ناگاہ مدینے میں قیامت کی شب آئی
صغراؑ کے لیے سخت ہلاکت کی شب آئی
گذرا جو نواں روز، شہادت کی شب آئی
نانی کو پکاری، یہ کس آفت کی شب آئی!

بے نور ستارے بھی ہیں، اور چرخِ بریں بھی
آئے لو، در و دیوار بھی ہلتے ہیں، زمیں بھی!

للہ، نواسی کے کلیجے کو سنبھالو
اس رات سے میں ڈرتی ہوں، چھاتی سے لگا لو
عباسؑ چچا جان کی ماں کو بھی بلا لو
قرآن مرے پڑھنے کا ہاتوں پہ اٹھا لو

مر جاؤں گی اس شب کی اندھیری سے دہل کر
روضہ پہ نبیؐ کے رہو، اس رات کو چل کر

کیا جانے، مسافر مرے اس وقت کہاں ہیں
پانی بھی ملا ہے انہیں، یا تشنہ دہاں ہیں
اُترے ہیں کہیں، یا اس اندھیری میں رواں ہیں
اللہ غریبوں کا نگہباں، وہ جہاں ہیں

روشن رہیں دنیا میں چراغ آلِ عبا کے

دل میرا بجھا جاتا ہی جھونکوں سے ہوا کے

کیوں آج پرندے نہیں لیتے ہیں بسیرا؟
کیا انکے سلیمانؑ کو دشمن نے ہے گھیرا؟

ان طائروں کے اُڑنے سے ہوش اُڑتا ہی میرا
دیکھیں ہمیں دکھلاتا ہے کیا کل یہ اندھیرا

بالکل غضب و قہرِ الٰہی کی ہے آمد
کیا جانیے کس گھر پہ تباہی کی ہے آمد

جو لوگ کہتے ہیں کہ مرزا دبیر کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے بالکل عاجز ہیں وہ ان اشعار کو بغور دیکھیں کہ علاوہ صفائی، سادگی۔ اور روانی کے کیسے مناسب اور موزوں الفاظ میں پریشانی اور گھبراہٹ کا سماں باندھ دیا ہی کہ ہر لفظ اور ہر مضمون اضطراب و غم کی مجسّم تصویر ہے۔

اب لکھتا ہی یوں راقمِ حالِ شہِ والا
پردیسیوں کا نامہ و پیغام نہ پہونچا

تشویش میں سب چاند محرّم کا بھی گذرا
اک لڑکی نے آکر کہا اک روز، کہ صغرا[۴]

کیا روتی ہے دل شاد ہو، بابا ترا آیا
بیمار! مبارک ہو، مسیحا ترا آیا

یہ مژدہ سُنا جب، کہ سفر سے پدر آئے
سجدہ کیا، بولی مرے ارمان بر آئے

خالی ہوا دل غم سے، مگر اشک بھر آئے
پھر پوچھا، کہاں تک شہِ جن و بشر آئے؟

ہی خیر رفیقانِ شہِ عرش نشیں کی؟
کچھ دُھوم سے آتی ہی سواری شہِ دیں کی؟

۴ دیکھو موازنہ صفحہ ۲۳۷،

کب ہوئیگا داخل یہاں فرزندِ یداللہ؟
ہیں اکبرؑ و عباسؑ بھی ہمراہ شہنشاہ؟
وہ لڑکی یہ کہنے لگی، بنتِ شہِ ذیجاہ!
جو ساتھ سدھارے ہیں وہ سب ہونگے ہمراہ

عرصہ نہیں، اب گھر میں حسینؑ آتے ہیں صغراؑ
لینے کے لیے اہلِ وطن جاتے ہیں صغراؑ

امِ سلمہؑ ہنستی ہوئی آئیں پھر اُس جا
بولیں کہ حسینؑ آئے مبارک تمہیں صغراؑ
میں کہتی نہ تھی؟ آنے کو ہیں سیّدِ والا
آیا کہ نہ آیا؟ وہ شہِ یثرب و بطحا

تم گھٹتی تھیں ناحق یہاں دوری کے الم میں
اب تم میں نہیں اُٹھنے کی طاقت ہی کہ ہم میں؟

کہنے لگی صغراؑ کہ بجا سب ہے یہ تقریر
آتے ہیں تمہاری ہی دعا سے شہِ دلگیر
یہ کیا ہے کہ سُنکر خبرِ آمدِ شبیرؑ
کچھ حال مرے دل کا ہوا جاتا ہی تغیر!

بے وجہ یہ حالت نہیں اسدم مرے جی کی
اللہ کرے خیر حسینؑ ابنِ علیؑ کی

نانی نے دلاسا دیا، بے جا ہی یہ زاری
کچھ خوہی تمہیں پڑ گئی ہی رونے کی واری
ہی قاعدہ بے حد جو خوشی ہوتی ہی طاری
اُسوقت بھی اشک آنکھوں سے ہو جاتے ہیں جاری

کیوں اشک نہ شادی کے بہیں دیدۂ تر سے
تھوڑی یہ خوشی ہی کہ حسینؑ آئے سفر سے

صغراؑ نے یہ نانی سے کہا بھر کے دمِ سرد
رونا یہ خوشی کا ہی، تو پھر دل میں ہے کیوں درد؟
چہرہ مرا اسوقت ہوا جاتا ہے کیوں زرد؟
میں روتی ہوں، اور آج ہیں خوش سارے زن و مرد

تم لاکھ کہو، میں نہ یقیں مانوں گی نانی!

جب گھر میں پدر آئینگے تب جانونگی نانی!

کل صبح یہ نمازیِ خیر النسا کہاں
یہ کربلا کہاں، یہ صفِ اتقیا کہاں
شورِ اذانِ اکبرِ گلگوں قبا کہاں
کل صبح یہ موذنِ فوجِ خدا کہاں

مغرب کیوقت لوٹ ہی اور یہ خیام ہیں
مابینِ ظہر و عصر بہت تمام ہیں

پژمردگی سے پھولوں کی رنگت بدل گئی — ولہ — نکہت صبا کے ساتھ چمن سے نکل گئی
کہتا تھا فرس ڈھونڈ تو لے کوئی کہاں ہوں — ولہ — آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے نہاں ہوں
رُک رُک کے قدم رکھتی تھی ہر سر پہ ادب سے — ولہ — جھک جھک کے مثالِ شرفا ملتی تھی سب سے
کھل کھل کے پھول، نافونکی صورت مہکتے تھے — ولہ — ذکرِ خدا میں مرغِ خوش الحاں چہکتے تھے
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں نکال لو — ولہ — جبتک امامؑ آئیں انہیں دیکھ بھال لو
آرام کرینگے وہیں، افضالِ خدا سے — ولہ — نیند آتی ہے شیروں کو ترائی کی ہوا سے
ہرگز صفتِ اسپِ ہنرمند نہ ہوگی — ولہ — اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہ ہوگی
سب کے گلے سے ملتی تھی، لیکن رُکی ہوئی — ولہ — جوہر یہ تھے کہ بوجہ سے تھی خود جھکی ہوئی
ظاہر تھی کبھی اور کبھی آنکھوں سے نہاں تھی — ولہ — قدرت تھی خدا کی، کبھی یاں تھی کبھی واں تھی
غیرت کوئی سیکھے پسرِ شاہِ نجف سے — ولہ — منہ پھیرے ہوئے سوتے ہیں دریا کی طرف سے
بعد از حسینؑ اہلِ حرم ننگے سر پھرے — ولہ — لوٹے گئے، اسیر ہوئے، دربدر پھرے
منزل کڑی ہے اس سفرِ ناگزیر کی — ولہ — مالک کے ہاتھ شرم ہی وقتِ اخیر کی
حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلاد رہے — ولہ — لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے

تن تن کے صاف سینونکی ڈھالیں سنبھال لیں	ولہ	آدھی سروہیاں کمروں سے نکال لیں
اللہ رے وغا! آنکھ نے دیکھی نہ چمک بھی	ولہ	پُتلی تو سناں لیگئی جھپکی نہ پلک بھی
قدرت کے آفتاب چمکتے نظر پڑے	ولہ	باغِ نبیؐ کے پھول مہکتے نظر پڑے

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا۔ جملوں کی اصلی ترتیب کا بحالِ خود قائم رہنا نظم میں دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ ہر فصیح سے فصیح شاعر کو اجزائے کلام کی تقدیم و تاخیر کرنی پڑتی ہے، کیونکہ جب اصلی ترتیب بحر کے محدود دائرے میں قائم نہیں رہ سکتی تو الفاظ کو مقدم و مؤخر کرکے وزن درست کرلیا جاتا ہے۔ فصیح و بلیغ اور قادر الکلام شاعر حتی الامکان ترتیب کی پابندی کا خیال رکھا کرتے ہیں، اور ایسے اشعار نہایت موثر، دلاویز، اور برجستہ ہوتے ہیں۔ ترتیب الفاظ میں کوئی خفیف سی تبدیلی ناگوار بھی نہیں ہوتی، لیکن جو ترتیب ناموزوں حد تک بگڑ جاتی ہے فوراً طبیعت میں ایک انقباض پیدا کردیتی ہے اور شعر بھی اپنی برجستگی اور صفائی سے گر جاتا ہے۔ مؤلف نے میر صاحب کے فصیح کلام سے چند مثالیں نقل کی ہیں جن میں اُنھوں نے حتی الامکان ترتیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اب ہم مرزا صاحب کے کلام سے چند اشعار درج کرتے ہیں۔ ان میں بھی یہ صفت خوبی اور صفائی کے ساتھ پائی جاتی ہے ؎

جبکہ مسلمؑ کے پسر گھر میں قضا کے آئے	برجِ عقرب میں قمر شیرِ خدا کے آئے
دامِ آفت میں ہما خیرِ نساؑ کے آئے	ہائے بجھنے کو چراغ آلِ عبا کے آئے

پھر نہ یثرب میں وہ یثرب کے ستارے پہونچے
قید خانے سے چھٹے گور کنارے پہونچے

بعدِ مدت جو ہوئیں بیڑیاں پاؤں سے جُدا
پائے نازک کا ورم بن گیا زنجیرِ قضا
ہاتھ چھوڑا جو رسن نے، تو اجل نے پکڑا
راستہ بھولے مدینے کا ملی راہِ قضا

آگے تقدیر کے رستے میں نہ تدبیر چلی
طوق سے ننّے گلے نکلے تو شمشیر چلی

مطلع ثانی

نہر پر حضرتِ مسلمؑ کے خلف آتے ہیں
خلد کو جاتے ہیں مقتل کی طرف آتے ہیں
لال ہونے کے لیے، درِ نجف آتے ہیں
ڈوبنے کو قمرِ برجِ شرف آتے ہیں

فاطمہؑ قبر سے کھولے ہوئے سر آتی ہے
جس طرف دیکھتے ہیں موت نظر آتی ہے

قتل کرنے کو عجب ظلم سے لاتا ہے عدو
ہاتھ میں چھوٹے کا گیسو ہے بڑے کا بازو
ہر قدم خشک ہوا جاتا ہے پیاسوں کا لہو
نرگسی آنکھوں کو حسرت سے ہے گردش ہر سو

کھینچتا ہے جو عدو نامِ علیؑ لیتے ہیں
جب گھرکتا ہے تو چپ ہو کے یہ رو دیتے ہیں

نہ ٹھہر سکتے ہیں، نے جلد چلا جاتا ہے
چپ رہا جاتا ہے، نے عذر کیا جاتا ہے
دھیان مرنے کا لبِ نہر جو آجاتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے بہا جاتا ہے

ماں نہیں، باپ نہیں، اکبرؑ و عباسؑ نہیں
پاس وہ ہے جسے ایمان کا کچھ پاس نہیں

تنہا شبِ فرقت میں بکا کرتی تھی صغراؑ
دن آمدِ اکبرؑ کے گنا کرتی تھی صغراؑ
جینے کی، نہ صحت کی دعا کرتی تھی صغراؑ
زہراؑ کی لحد سے یہ کہا کرتی تھی صغراؑ

بیمار کو، بے کس کو، مسیحا سے ملا دو
صدقے گئی دادی مجھے بابا سے ملا دو

طولِ شبِ فرقت سے میں گھبراتی ہوں دادی
ہمسائیوں کو ڈر کے میں چلاتی ہوں دادی!

گھر دیکھ کے سنسان، ڈری جاتی ہوں دادی!
غمخوار کوئی اپنا نہیں پاتی ہوں دادی!

ہمجولیوں کے گھر سے صدا بھی نہیں آتی
بابا بھی نہیں آتے، قضا بھی نہیں آتی

وہ دن گئے جو راہ کے کرتی تھی نظارے
پھروں کوئی جب نام مرا لے کے پکارے

اب آنکھ بھی کھل سکتی نہیں ضعف کے مارے
تب کھول کے آنکھیں کروں دو ایک اشارے

سر بالشِ بستر سے مرا اٹھ نہیں سکتا
اب ہاتھ سے صغرا کے عصا اٹھ نہیں سکتا

حضرت امام حسینؑ کی مناجات

حق سے کہتے تھے، ترا شکر کروں کیا میں ادا
ماں تو دی فاطمہؑ سی، باپ دیا حیدرؑ سا

واہ کس گھر میں مجھے تو نے کیا ہے پیدا
نانا ایسا دیا، سب پڑھتے ہیں کلمہ جسکا

آج یہ رتبہ والا بھی عطا کرتا ہے
آج اس بندے کو شاہِ شہدا کرتا ہے

مجکو یہ صبر تھا، عباسؑ کو دیکھوں بیدم!
لاش قاسمؑ کی ہو پامال نہو مجکو الم!

قتل اکبرؑ سا پسر ہو نہ کروں چشم کو نم!
مجھ میں یہ حوصلہ کب تھا، یہ ترا فضل و کرم

بندہ پرور! عجب اس بندے پہ اکرام کیا
صبر تو آپ دیا اور مرا نام کیا

بیٹوں کی لاش پر حضرت زینبؑ کے بین

پیارو! وہاں چلے ہو جہاں کا نشان نہیں
رہبر نہیں، رفیق نہیں، کارواں نہیں،
بچے ہو، ساتھ باپ نہیں اور ماں نہیں
زخموں سے چور چور ہو، تاب و تواں نہیں

منزلِ تلک غضب کی ہے تنہائی راہ میں
بھائی سے ہوشیار رہے بھائی راہ میں

پوچھے درِ بہشت پہ گر خازنِ جناں
تم کون ہو؟ کہاں سے ہوا ہے گذر یہاں؟
ہاں افصح العرب کے نواسو! نثار ماں
اُس دم کہیں نہ پیاس سے لکنت کرے زباں

کہنا۔ کہ ہم شبیہِ پیمبرؐ کے بھائی ہیں
شبیرؑ کے غلام ہیں، اور کربلائی ہیں

حضرت علی اکبرؑ کی شجاعت پر اعدا کی حیرت

سب کہنے لگے، دیکھیے جرات کا تماشا
اللہ رے پیاسے کی شجاعت کا تماشا!
اس زور کو ہم دیکھیں، کہ صورت کا تماشا
بالکل ہے یہ اللہ کی قدرت کا تماشا

ہوں اُنسے مقابل، یہ ہمیں حوصلہ کب تھا
دو روز کے پیاسے جو نہوتے تو غضب تھا

حضرت صغرا امام حسینؑ سے عرض کرتی ہیں

سر قدموں پہ نیور اُدیا، ٹوپی بھی اُتاری
پھر باندھے لرزتے ہوئے ہاتھ، اور یہ پکاری
بابا مجھے چھوڑو نہ یہاں، تم پہ میں واری
بیٹی نہیں، میں آج سے لونڈی ہوں تمہاری

مُنہ ہاتھ دُھلاؤں گی میں صغرؑ کا تمہارے
گہوارہ جھلاؤں گی میں صغرؑ کا تمہارے

کیوں لے نہیں چلتے ہو، خطا لونڈی کی کیا ہے
پھر جائے مقدر ہی تو بات اس کی جدا ہے

کچھ بڑھ کے سکینہؑ کو نہیں میں نے کہا ہے
اماں کا اس آزار میں بھی کام کیا ہے

گو تپ نے کسی وقت کا آنا نہیں چھوڑا
پر جھولے میں اصغرؑ کا جھلانا نہیں چھوڑا

صغراؑ نے ادھر اور اُدھر یاس سے دیکھا
کہنے لگی، تم میری سفارش کرو بھیّا!

پھر جھولے سے اصغرؑ کو اُٹھا لائی وہ دُکھیا
سب کنبہ ہے بابا کی طرف، اور میں تنہا

صغراؑ کو تو سمجھاتے ہیں بابا کی طرف سے
کچھ باپ سے کہتے نہیں صغراؑ کی طرف سے

حضرت امام حسینؑ حضرت عباسؑ کی شان و شوکت دیکھ کر فرماتے ہیں ؎

تھے آگے آگے فوج کے عباسؑ نامور
بیساختہ یہ کہتے تھے سلطانِ بحر و بر

لہرا رہا تھا سر پہ پھریرا اِدھر اُدھر
شوکت پہ میرے بھائی کی کوئی کرے نظر

نانا جہاد کو جو وطن سے نکلتے تھے
لیکر علم یونہیں مرے بابا بھی چلتے تھے

ایک ایسے ہی موقع پر حضرت زینبؑ فرماتی ہیں ؎

زینبؑ پکاری شاہِ نجف یاد آتے ہیں
کس شان سے علم لیے عباسؑ جاتے ہیں

عمر سعد اپنی فوج کو اعزّائے امام علیہ السلام کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر جانبازی کی ترغیب دیتا ہے ؎

مشہور ہی ہر شہر میں شمشیرِ دو پیکر
طفلی میں یہ تھی طاقتِ دامادِ پیمبرؐ

یہ تحفۂ باری ہے سوئے حیدرِ صفدر
دو اُنگلیوں سے چاک کیا کلّہ اژدر

سُنتے ہیں، کہ غُل نعرۂ تکبیر کے اُٹھے
جھولے سے جو اُٹھے تو اُسے چیر کے اُٹھے

جنگِ جمل و بدر و اُحد کر گئے یہ سر
خندق میں جو لی میان سے شمشیرِ دو پیکر

صفین و سلاسل کی صفیں ہو گئیں ابتر
جبریل نے روکا تو قلم کر دیئے شہپر

پردے حسد و کبر کے بھی پھاڑ کے نکلے
خیبر سے جو نکلے تو علم گاڑ کے نکلے

شاہِ شہدا بھی ہیں، اُسی شاہ کے دلدار
ابنِ حسنؑ و اکبرؑ و عباسؑ علمدار

طاقت وہی بازو میں، وہی ہاتھ میں تلوار
اُس فوج میں یہ تین بہادر ہیں نمودار

کچھ رشتہ میں ہیں، اور کچھ اصحاب نبیؐ کے
بیٹے ہیں، بھتیجے ہیں، نواسے ہیں علیؑ کے

اس قسم کے اور بھی ہزاروں اشعار ہیں جنکو بخوفِ طوالت ترک کیا گیا؛ آگے مختلف عنوانات میں جو اشعار نقل کیے جائیں گے اُن میں دیگر محاسن کے علاوہ یہ خصوصیت بھی نمایاں ہو گی۔

روزمرّہ اور محاورہ جو الفاظ اور ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوں اُن کو روزمرّہ کہتے ہیں، اور اہلِ زبان کی بول چال اور اسلوبِ بیان ہی کا نام محاورہ ہی۔ روزمرّہ کی پابندی تمام اقسامِ کلام مثل تحریر و تقریر نظم و نثر میں نہایت ضروری ہی۔ جسقدر کسی کلام میں روزمرہ کا لحاظ کیا جائیگا اُسیقدر فصاحت کے معیار پر پورا اُتریگا اور مقبولِ طبائع خاص و عام ہو گا۔ بغیر محاورہ کے کوئی کلام فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ پایہ پر پہونچ سکتا ہے، لیکن اگر روزمرّہ کی پابندی نہو گی تو درجۂ فصاحت سے گر جائیگا

لکھنؤ کو حسن شناسانِ سخن نے زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہی، اور میر صاحب و مرزا صاحب زباندانی میں اہلِ لکھنؤ کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان دونوں صاحبوں سے بڑھ کر اور کون شخص روزمرّہ اور محاورہ لکھنے کا دعویٰ کر سکتا ہی۔ دونوں بزرگوار اسمیں یکتائے عصر مانے گئے ہیں۔ ہاں فرق یہ ہی کہ پہلے زمانے کے فاضل اربابِ کمال کے کان شعرائے عجم کی نازک خیالیوں اور رنگیں بیانیوں سے بھرے ہوئے تھے، زبانیں فصحائے فارس کے پُرتکلّف اور پُرمضمون اشعار کے مزے اُٹھائے ہوئے تھیں، اسلیے اُن لوگوں کو وہی کلام محظوظ کر سکتا تھا جسکو علاوہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، اور تشبیہوں کی لطافت اور استعاروں کی نزاکت کے شوکتِ الفاظ نے بلند اور شاندار بنا دیا ہو، اسوجہ سے زمانے کا رنگ اور شائقین کی طبیعتوں کا مذاق پہچان کر مرزا صاحب مرحوم نے تشبیہات، استعارات، اور مضامین آفرینی پر زیادہ توجہ فرما کر وہ وہ نادر اشعار نظم کیے کہ اربابِ مذاق کے دلوں پر اُن کی بلاغت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ میر صاحب مرحوم کا خاندانی طرز چونکہ اس کے خلاف تھا، اور اُن کے آبا و اجداد لطفِ زبان، محاورہ کی صفائی، اور کلام کی سادگی میں شہرت حاصل کر چکے تھے، اسلیے اُنھوں نے اپنے خاندانی طرز ہی میں سخن سنجیاں شروع کیں؛ اور باوجودیکہ یہ رنگ اُس زمانے کے خلاف تھا مگر اُنھوں نے اپنی سحر بیانی کی قوت سے اس طرز میں بھی وہ عالیشان مرتبہ حاصل کر لیا کہ مرزا صاحب کی طرح آج اُن کا نامِ نامی بھی نہایت عظمت کے ساتھ زبانوں پر جاری ہی، اور بقولِ مؤلف باوجودِ امتدادِ ایّام آجتک یہ فیصلہ نہو سکا کہ دونوں بزرگوں میں سے ترجیح کا مسند نشیں کس کو کیا جائے اور نہ آیندہ کبھی فیصلہ ہو سکے گا۔ جو لوگ مضمون آفرینی میں مرزا صاحب کو یکتا، اور زباندانی میں میر صاحب کو کامل

پہلے زمانے کے اربابِ کمال کا مذاق

میر صاحب کا خاندانی طرز

دونوں صاحبوں کا کلام ہر طرح کا موجود ہے

سمجھتے ہیں، اُن کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں باکمال شاعر دوسرے رنگ میں کچھ کہنے سے عاجز تھے، یا اُن کے کلام میں دوسرا انداز پایا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً مرزا صاحب نے نازک خیالی میں جو کچھ حیرت انگیز کمالات دکھائے ہیں اُن کا ذکر تو اپنے موقع پر آئیگا، مگر اس مقام پر ہم اُن کے دلاویز کلام سے بطور نمونہ وہ اشعار انتخاب کرتے ہیں جن میں ایسی صفائی اور روانی کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال کیا ہے کہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ ؎

روزمرہ اور محاورہ کی مثالیں

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبرؑ کا ہیں بابا تیار یہ نہ جانا ہے مرے دم سے لگی اک بیمار	بھیا اصغرؑ کو لیے ہو گئیں اماں بھی سوار رو کے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو، ٹھہرو، مجھے آ لینے دو
بھیا اصغرؑ کو کلیجے سے لگا لینے دو

خدمت میں واری آپ کی کس روز کی کمی
ولہ
کس رات لوری دینے میں دم بھر زباں تھمی

ان مخلتوں کا دھیان ذرا تم کو کچھ نہیں
سمجھو تو سارے حق ہیں نہ سمجھو تو کچھ نہیں

زینبؑ کو بھی ہوش آگیا کی شہ سے یہ گفتار
ولہ
سب جانتے ہیں میں نے ہی پالا ہے یہ دلدار
بھابی نے کیا آج خیال اس کا نہ زنہار
اک دودھ پلا کر ہوئیں اکبرؑ کی یہ مختار

مجھ سے بھی نہیں مشورہ کچھ اس میں لیا ہے
فرمانِ شہادت علی اکبرؑ کو دیا ہے

۲ مطلع۔ اے باغِ طبع رنگِ بہارِ سخن دکھا۔ مرثیہ غیر مطبوعہ۔

میں نے اسے ابتک نظرِ بد سے بچایا
کھانا بھی اُسے اوٹ میں دامن کے کھلایا
الحمد کو دم کر لیا پانی جو پلایا
ثمرہ مگر اس پالنے کا آج یہ پایا

اپنا جسے سمجھا تھا وہ بیگانہ ہوا ہے
قسمت کا نہیں پھیر تو صدقے گئی کیا ہے

اکبرؑ کے سُنانے کو یہ کہتی تھی زباں سے
دلہ
اے عونؑ و محمدؑ تمھیں لاؤں میں کہاں سے
جو کام کیا پونچھ کے مجھ سوختہ جاں سے
اب قدر ہوئی پیاروں کی جب چھُٹ گئے ماں سے

کیا جان کے دم بھرتی تھی ہمشکلِ نبیؐ کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

پھر بولیں یہ بانوؑ کے قریب آکے برقّت
لو بھائی یہ ملبوس یہ اکبرؑ کی امانت
بچپن کے بھی کرتے ہیں، جوانی کی بھی خلعت
اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت

تم والدہ اُن کی ہو، پدر، سرورِ دیں ہیں
یہ آج کھُلا ہم کوئی اکبرؑ کے نہیں ہیں

پھر رونے لگی بیٹھ کے واں زینبِؑ ناچار
ہمشکلِ نبیؐ لپٹے یہ کہتے ہوئے اِک بار
میری پھوپی امّاں، مری مالک، مری مختار
میں تو ہوں غلام آپ کا کیوں آپ ہیں بیزار

ہم چاہتے ہیں تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ، اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو
دم رُکتا ہی باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو

ماں بیٹھی ہے وہ، جاؤ گلے اُس کو لگا لو
بانوؑ کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو

میں پیار نہیں کرتی، میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ، میں تمہاری پھوپی اماں نہیں ہوتی

دوڑی وفورِ طیش سے خود زینبِ حزیں
کیا مشورہ تھا شمر سے؟ وہ بولے کچھ نہیں

ولہ

فرمایا میں تو آنے کو تھی ننگے سر وہیں
فرمایا خوب! لوگوں میں چرچا ہے پھر یونہیں

شمرِ لعیں نے صلح جو ٹھہرائی ہوئے گی
مرضی تمہاری تھوڑی بہت پائی ہوئے گی

ہے ہے مجھے تو اور ہی وسواس اب ہوا
عباسؑ کو علم جو ملا کیا غضب ہوا؟

شاید علم نہ ملنے کا تم کو تعب ہوا
گذرا جو ناگوار خلافِ ادب ہوا

آئے کوئی بلا نہ پدر کی کمائی پر
صدقے ہوئے تھے تم مرے عباسؑ بھائی پر

زینبؑ تو بیاں کرتی تھی یہ ہند سے رو کر
کہتی تھی، بہن! آتا ہے رونا مجھے تجھ پر

ولہ

تھی پاس سکینہؑ کے کھڑی ہند کی دختر
کرتا ہے پھٹا، سی نہیں دیتیں تجھے مادر

ہم غیروں کے دل پر ترے نالوں کا اثر ہے
اللہ، تری ماں کا بھی کیا سخت جگر ہے

یاد آتا ہے بیمار بہن کا مجھے کہنا
تم سے بھی کہا تھا کہ جدا اس سے نہ رہنا

ولہ

دشوار ہے پردیس کی ایذاؤں کا سہنا
یاں آ کے بُرا ہو گیا ہے ہے مرا لہنا

بابا نے نہ پوچھا تو چچا نے بھی نہ پوچھا

حضرت زینبؑ فرماتی ہیں

حضرت سکینہؑ فرماتی ہیں

یہ اور غضب ہے کہ قضا نے بھی نہ پوچھا

بانوئے حزیں پردہ اُلٹ کر یہ پکاری — ولہ — تکلیف نہ کر اے مری بی بی مری پیاری
تھرّاتے ہوئے پاؤں سے آنے کے میں واری — جا گھر کو، تجھے صبر دے اب ایزدِ باری

حضرت شہربانو جناب صغرا سے فرماتی ہیں

اب ننھا سا سجادہ بقیعہ میں بچھا کر
زہراؑ کے مسافر کے لیے حق سے دعا کر

تب پڑے کے عقب سے بڑھائے چچا نے ہات — ولہ — واں سے بڑھی یہ کہہ کے وہ سرمایۂ حیات
بس بس نہ بے نصیبوں پہ فرماؤ التفات — اللہ آج شب کو نہ پوچھی ہماری بات

کیا دونوں وقت ملتے غضب کی عطش ہوئی
اماں سے پوچھیے تو میں کے بار غش ہوئی

اُمِ سلمہؑ ہنستی ہوئی آئیں پھر اُس جا — ولہ — بولیں کہ حسینؑ آئے، مبارک تمہیں صغراؑ
میں کہتی نہ تھی آنے کو ہیں سیّدِ والا — آیا کہ نہ آیا وہ شہِ یثرب و بطحا

تم گھلتی تھیں ناحق یہاں دوری کے الم میں
اب تم میں نہیں اُٹھنے کی طاقت ہی کہ ہم میں

جسنے چلنے کو کہا سب سے کہا بسم اللہ — ولہ — مجھسے جھوٹوں بھی نہ پوچھا میں گنہگار تھی آہ

کیوں سبک سمجھے نہ ہر ایک مجھ آزاری کو — ولہ — طول سا طول کھچا ہے مری بیماری کو

حضرت سکینہؑ کی زبان سے

فوج یہ پانی خوشی سے جو نہیں دیتی ہے — ولہ — پانی اس طرح کا پیاسوں کی بلا لیتی ہے

سب کی نظروں میں سبک میں جگر افگار ہوئی — ولہ — اک فقط مشک تمہیں دے کے گنہگار ہوئی

بیگانے بھی اس دُکھ میں کنارا نہیں کرتے — ولہ — تم ہو کے جگر، پاس ہمارا نہیں کرتے

لو جاؤ گھر پدر ہے شہادت کے دھیان میں	ولہ	مرتے کے ساتھ مر نہیں جاتے جہان میں
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں سنبھال لو	ولہ	جبتک امام آئیں انہیں دیکھ بھال لو
کہا بانو نے میں صدقے گئی، کچھ ماں کی خطا	ولہ	مجھ پہ غصے ہوئیں اور باپ سے کچھ بس نہ چلا
وہ بولی میں صدقے گئی، سچ کہتے ہو یہ بات؟	ولہ	لو بھائی، بھلا سر پہ تو زینب کے رکھو ہات
دکھلائے ہنر شعلہ فشانی کے ہزاروں	ولہ	دوزخ پہ گھڑے پڑ گئے پانی کے ہزاروں
اونچی جو ہوئی کفر بھی پھر ہو گیا نیچا	ولہ	اعدا کے بڑے بول کا سر ہو گیا نیچا
یاں نام سُنکے خوف سے سب تھرتھراتے ہیں	ولہ	اُن کا جگر سراہیے جو لڑکے آتے ہیں
جیتے تھے جسکو دیکھ کے، وہ قتل اب ہوا	ولہ	اللہ سب کی خیر کرے کیا غضب ہوا
یوں بہر شہ دیں جو سر اسیمہ رواں ہو	ولہ	تم ہو نہو عباسؑ علمدار کی ماں ہو
دھڑکوں میں یہاں ننھا سا دل اُنکا پھٹے گا	ولہ	شب خیر سے گذریگی تو کل دن کٹے گا
آپ کی جان سے دور آئے اگر میری قضا	ولہ	ہرج کیجیے نہ کہیں میرے لیے منزل کا
تو غم سے گھلی جاتی ہی کیونکر نہ حزیں ہوں	ولہ	آخر کو میں نانی ہوں کوئی غیر نہیں ہوں

ہندی کی زبان سے

جناب ام کلثوم حضرت صغرا کے

مضامین کی نوعیت سے الفاظ کا استعمال انسان کا قلب جو جذبات اور تاثیرات کا قبول کرنے والا ہی، اگر کسی اثر سے متاثر ہو کر شاعر کی زبان کا شریک ہو جائے، تو مناسب اور موزوں الفاظ کا ذخیرہ فراہم ہو جاتا ہی۔ ایک دردرسیدہ کو کسی دردناک واقعہ کے بیان کرتے وقت الفاظ میں سوز و گداز کی حالت پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں، اور ایک

شجاع کو میدانِ جنگ میں شاندار الفاظ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک واعظ کو، جسکا دل عظمت و جلالِ الٰہی سے متاثر ہو، دوسروں کا دل ہلا دینا آسان ہے۔ اب شاعر کو، جسکا کام ہر واقعہ اور حالت کی بجنسہٖ تصویر کھینچنا ہے، ان سب لوگوں کی شبیہ بننا پڑتا ہے۔ وہ کبھی بہادروں کے دلیرانہ خیالات کو ظاہر کرنے میں شجاعانہ جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے، اور کبھی درد و غم کا نقشہ اُتارتے وقت اپنے دل میں غم و الم کی خراش پیدا کرکے الفاظ میں سوز و قلق کا رنگ بھر دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قسم کے جذبات و تاثیرات کا حال ہے۔ جب کسی نظم کے الفاظ سامعین کے دلوں میں مطلوبہ جذبات پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، وہ خود شاعر کے دل کی بے اثری کے سبب سے ہے۔

الفاظ کا مناسب استعمال

ہر شخص کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کے کلام میں اس صفت کا لحاظ نہایت خوبی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ یہ اُن کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہے کہ اُن کے عالمانہ دماغ میں ہر قسم کے الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ جمع رہتا تھا، اور جہاں جہاں جیسا موقع ہوتا مناسب طور پر اُن کا استعمال کرتے تھے اور یہی اُن کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے۔ جہاں درد و الم کی دلسوز داستانیں نظم کی ہیں وہاں ایسے درد انگیز الفاظ ڈھونڈ کر لائے ہیں کہ قلب پاش پاش ہو جاتا ہے۔ جس موقع پر اہلبیتؑ کے مصائب اور زندانِ شام کی ایذا کا بیان ہے اُس کے جملے ایسے مؤثر اور جگر خراش ہیں کہ تیر و نشتر کی مانند دلوں پر اثر کر جاتے ہیں۔ جس جگہ رجز کے فخریہ اشعار لکھتے ہیں اُنکے ایک ایک لفظ سے جلالت شان، اور عظمت ٹپکتی ہے؛ جہاں رزمیہ اشعار میں شمشیر شرربار کی روانی کا بیان ہے وہاں شاندار اور پُرشوکت الفاظ نے ایک خاص رفعت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ

ہم نمونہ کے طور پر ہر موقع کے چند اشعار لکھتے ہیں جن سے ناظرین کو اس باکمال شاعر کے زورِ طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ رزمیہ فخر کے اشعار لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

یہ جان لو جس وقت کھچے گی مری تلوار
تیغوں میں نہ دم ہونگے، نہ سر ہونگے نہ سردار
اک حملے میں کر دونگا پرے فوج کے بیکار
جز گرد نہ پیدل نظر آئیں گے نہ اسوار
سر کوبیِ افواجِ بد اعمال کروں گا
چیونٹی کی طرح مورچے پامال کروں گا

انسان تو کیا جن بھی نہیں ہم سے لڑے ہیں
سر کے نہیں جس جا یہ قدم رنمیں گڑے ہیں
نام اپنی دلیری کے دلیروں میں بڑے ہیں
اس ضرب کے سکے عربستاں میں پڑے ہیں
کس کس پہ چلی تیغِ ظفرناک ہماری
ہر شہر میں ہر ملک میں ہے دھاک ہماری

کمزور ہیں رستم سے پہلواں مرے آگے
مجبور ہیں سہراب و نریماں مرے آگے
نابود ہے فرعون کا ساماں مرے آگے
رکھتے نہیں کچھ جان بنی جاں مرے آگے
بیہوش ہو جس صاحبِ شمشیر کو ٹوکوں
روباہ بنے ڈر کے، اگر شیر کو ٹوکوں

ہم دل میں جب در آئینگے فوجِ شریر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ بر نا و پیر کے
ٹکڑے کرینگے خنجر و شمشیر و تیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ کے
اک اک کی موت آج حسامِ دوسرے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

آئے غرورِ جنگ ہو اب جس دلیر کو	روکے تو کوئی شیرِ الٰہی کے شیر کو
لو سیل کو، اور برقِ شرر بار کو روکو	رہوار کو روکو مری تلوار کو روکو
دیکھیں تو بھلا آئیں تو نو لاکھ سمٹ کر	ہاں کہدیں جو ماموں تو صفیں رکھدیں اُلٹ کر
غصّے سے سرخ ہوگیا یاقوتِ رُخ کا لون	شیرِ خدا کے شیر جو بپھریں سنبھالے کون
کیا تختِ سلطنت ہے امیرِ پلید کا	دل پر رکھیں تو ملک اُلٹ دیں یزید کا

دیگر رزمیہ اشعار کی شان و شوکت ملاحظہ ہو ؎

لاکھوں کا ایک حملے میں مُنہ پھیر دیتے ہیں	کس طرح اُن سے طبل و علم چھین لیتے ہیں
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں سنبھال لو	جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو
ناگاہ بجے بُوق و دف و بربط و قرنا	باجوں کی صداؤں سے ہلا گنبدِ خضرا
تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں	آدھی سر و میان کمروں سے نکال لیں
مردوں کو تیغ چاہیے میدان چاہیے	شیروں کو برچھیوں کا نیستان چاہیے
وہ بولے کہ ہم پانی کا قطرہ بھی نہ دینگے	یہ بولے کہ ہم زور سے تلوار کے لینگے
لو آؤ بڑھو نیزہ سنبھالو تو میں جانوں	کاندھے سے بھلا مشک اُٹھالو تو میں جانوں
کس طرح خلل رتبۂ سادات میں آتا	سر جاتا ہی پر فرق نہیں بات میں آتا

دیکھو جس طرح ایک بہادر اور پُرہیبت شخص بحالتِ غیظ و غضب کسی شخص کو مرعوب بنا دیتا ہی اسی طرح ان پُرزور الفاظ کے صوت و لہجہ سے شوکت و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

امام حسینؑ روضۂ جناب رسالت مآبؐ سے رخصت ہوتے ہیں

جب کوچ کی شب قبرِ نبیؐ پر گئے شبیرؑ
رخصت کو مع آلِ پیمبرؐ گئے شبیرؑ
قندیلیں جو روشن کیں تو غش کر گئے شبیرؑ
زینبؑ نے یہ جانا کہ یہیں مر گئے شبیرؑ

تھی غش میں ندا، ہم اسی حسرت میں مرینگے
اب روشنی اس قبر پہ کاہے کو کرینگے

اے نانا کے روضے، مرا گھر ہوتا ہے ویراں
اے قبرِ حسینؑ آج کی شب ہے ترا مہماں
کل صبح مری منزلِ آخر کا ہے ساماں
کل روح مرے نانا کی ہوئیگی پریشاں

اے قبر میں دکھ پاؤں گا پردیس میں جا کر
تو شق ہو تو نانا سے لپٹ جاؤں میں آکر

اے قبر میں کیسا ترے صاحب کا ہوں پیارا
سجدے میں مجھے پشت سے اپنی نہ اتارا
اب خنجرِ جلاد ہے اور سینہ ہمارا
سنیو کہ مجاور ترا پیاسا گیا مارا

تیری تو ملاقات کی یہ رات ہے باقی
پھر خنجرِ گردن کی ملاقات ہے باقی

پانی ہے وہ شے، پیتے ہیں سب مومن و کافر
پر قحط اسی پانی کا ہوگا مری خاطر
دنیا سے کفن لیتے ہیں عقبیٰ کے مسافر
لیکن نہ کفن پائے گا تیرا یہ مجاور

کس شخص کو مدفن پسِ مردن نہ ملیگا
اے قبرِ پیمبرؐ ہمیں مدفن نہ ملے گا

ٹ ان بیتوں کے دونوں مصرعوں میں صنعتِ ردالعجز علی الصدر مع التکرار ہے۔ یعنی جو لفظ کہ بیت کے عجز (آخر مصرع ثانی) یا حشو میں واقع ہو وہی صدر (شروع مصرع اول) یا حشو میں بھی واقع ہو۔ جیسے یہ شعر ؎

شمارِ غمِ او ندانم از انکہ — بروں شد غم او ز حدِ شمار

ٹ ردالعجز علی الصدر مع التکرار کی مثال

کیسے پُر درد و الم الفاظ ہیں۔ کیا کوئی فصیح سے فصیح شاعر اس سے زیادہ جگر خراش لفظوں میں حسرت و غم اور جذباتِ صادقہ کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ ان اشعار میں وہ درد بھرا ہے کہ ایک ایک لفظ پر آنکھیں خون کے آنسو بہانا چاہتی ہیں۔

بحروں کا انتخاب اور حُسنِ قافیہ و ردیف شعر کی دلاویزی، اور اُس کی تاثیر دوبالا کر دینے کیواسطے شگفتہ بحروں کو بہت دخل ہے۔ اگر بحر موزوں اور دلفریب نہو تو اچھے سے اچھے مضامین اور فصیح سے فصیح الفاظ بھی دلوں پر اثر پیدا نہیں کر سکتے۔ مگر اس بحث میں قابل مؤلف ایک عجیب و غریب خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ "شعر کی دلاویزی کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ ہر مضمون کے مناسب بحریں اختیار کی جائیں۔ شاہنامہ کی بحر رزم کے لیے مخصوص تھی۔ فردوسی نے عشقیہ واقعات کو بھی اسی بحر میں ادا کرنا چاہا اس وجہ سے اُس کی یوسف زلیخا مقبول عام نہوئی"۔

مؤلف کا ایک عجیب راے

اقسامِ کلام یعنی رباعی مثنوی وغیرہا کے واسطے تو عروضیوں نے چند اوزان خاص کر لیے ہیں، چنانچہ رباعی کا وزن مختص بحر ہزج ہے اور پھر اس میں نو قسم کے زِحاف جاری کر کے ۲۴ اوزان استخراج کیے گئے ہیں، اسی طرح مثنوی کے واسطے ۷ وزن مخصوص سمجھے جاتے ہیں، لیکن یہ آج معلوم ہوا کہ مضامین کے لحاظ سے بھی بحریں مخصوص ہو گئی ہیں۔ مثلاً رزم لکھو تو فلاں بحر میں۔ بزم لکھو تو فلاں بحر میں۔ عشقیہ واقعات لکھو تو فلاں بحر میں۔ پند و موعظت لکھو تو فلاں بحر میں۔ ورنہ کلام کو مقبولیت حاصل نہو گی۔ یہ مؤلف کا خود ایجاد خیال ہے۔ واضعانِ بحور نے کہیں اس کی تصریح نہیں کی۔ شاہنامہ کی بحر کو رزم کے واسطے مخصوص سمجھنا ایک قسم کا دھوکہ کھانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فردوسی کی جادو بیانی اور روانیِ طبع نے شاہنامے کی رزم کو اس قدر شاندار اور پُر شوکت

بنا دیا ہے، اس میں بحر وغیرہ کا کچھ اثر نہیں؛ لیکن لوگوں کو یہ مغالطہ ہو گیا کہ اس میں بحر بھی کچھ مدد دے رہی ہے، یا شاید بحر متقارب مثمن رزم کے ساتھ خاص ہے جس نے فردوسی کے کلام کو ایسا بلند رتبہ بنا دیا۔

پس لائق مؤلف کے کلیہ کے مطابق اگر شاہنامہ کی بحر میں، علاوہ رزم کے، دوسرے مضامین مثل مضامینِ عشقیہ۔ یا مضامینِ پند و موعظت وغیرہ لکھے جائیں تو کتاب عام پسند نہو گی، جیسا کہ بقول اُنکے یوسف زلیخائے فردوسی اس وجہ سے مقبول نہ ہوئی کہ اُس میں رزم کی بحر میں عشقیہ مضامین لکھے گئے ہیں۔ لیکن اُردو میں میر حسن کی مثنوی جس میں یوسف زلیخا، فردوسی کی طرح عشقیہ واقعات نظم کیے گئے ہیں اسی شاہنامے کی رزمیہ بحر میں ہے، باایں ہمہ ہندوستان میں جو شہرت اور مقبولیت اُس نے حاصل کی ہے وہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح سعدی نے بوستاں میں اسی شاہنامہ کی بحر میں پند و موعظت کے مضامین لکھے لیکن اُن کی کتاب بیحد مقبول ہوئی، حالانکہ مؤلف کے کلیہ کے مطابق اُس کو بھی مقبول نہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھی رزم کی مخصوص بحر میں لکھی گئی ہے، پس جو وجہ یوسف زلیخائے فردوسی کے غیر مقبول ہونے کی ہے وہی بوستاں میں بھی موجود ہے۔ اگر رزم کی مخصوص بحر میں عشقیہ مضامین لکھنے سے کتاب غیر مقبول ہو جاتی ہے، تو اس مخصوص بحر میں پند و موعظت کے مضامین بھی غیر مقبول ہونے چاہییں، حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ جو قادر الکلام اور مشّاق شاعر ہیں وہ ہر مضمون کو ہر بحر میں ادا کر کے طبیعت کے زور، زباں کی پاکیزگی اور الفاظ کی شستگی سے اپنے کلام کو پُر زور اور پُر اثر بنا دیتے ہیں۔

پس یہ قیاسی بات ہے کہ یوسف زلیخائے فردوسی، شاہنامہ کی بحر میں ہونے کی

وجہ سے مقبول نہ ہوئی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہی کہ ہر مضمون سے ہر شاعر کو ایک خاص لگاؤ ہوا کرتا ہی؛ مثلاً پند و موعظت میں سعدی شیرازی بے مثل و یکتا تھے، تصوف اور معرفت کے مضامین سے مولوی روم کو مناسبت تھی، اسی طرح بعض لوگوں کی رائے میں فردوسی کو فقط جنگ و جدل اور طعن و ضرب کے بیان سے خاص لگاؤ تھا عشقیہ مضامین سے اُس کی طبیعت کو مناسبت نہ تھی، اسلیے اُسکا جادو نگار قلم ان مضامین کے بیان میں کوئی ندرت یا دلفریبی پیدا کرنے سے عاجز رہا۔ ایک محقق کی بھی یہی رائے ہے کہ "شاہنامے میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی، یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی یوسف زلیخا اسقدر مقبول نہیں ہوئی جسقدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے[1]" ہماری رائے میں بھی اُس کے مقبول نہونے کی یہی وجہ ہی نہ کہ شاہنامے کی بحر میں ہونا۔ چنانچہ قابل مؤلف اس مقام پر تو یوسف زلیخاے فردوسی کے مقبول نہ ہونے کی یہ وجہ لکھتے ہیں کہ شاہنامے کی بحر میں لکھی گئی ہی، لیکن اس سے قبل اسی صفحہ کی ابتدائی سطور میں وہ بھی اپنے اس بیان کے خلاف اور ہمارے قول کے مطابق، اس کے مقبول نہ ہونے کی دوسری وجہ لکھتے ہیں کہ "رزم بزم۔ وعظ و پند۔ ہر ایک کے لیے جُدا جُدا الفاظ ہیں۔ جو شعرا اس فرقِ مراتب سے واقف نہیں، یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ اُن پر اس قدر چڑھ گیا ہی کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہی۔ یہی نکتہ ہی کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی" اس کے سوا یوسف زلیخا رفردوسی کے مقبول

[1] حیات سعدی مولوی حالی صفحہ ۱۰۸

نہ ہونے کے اور بھی کئی اسباب ہیں۔

پہلا سبب

اوّل۔ یہ کہ اُس نے یوسف و زلیخا آخرِ عمر میں لکھی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے اُس کے شاہنامے کی پُرزور اور دلفریب نظم نے تمام دلوں پر اپنا سکّہ جمالیا تھا، اور دنیائے سخن کی ہوا کو اس قابل نہیں رکھا تھا کہ اُس میں کوئی دوسری آواز گونج سکے۔

دوسرا سبب

دوسرا یہ کہ یوسف زلیخا نے ایسا مناسب وقت نہ پایا جو اُس کی شہرت کیواسطے موافق اور سازگار ہوتا۔ شاہنامہ جس زمانہ میں لکھا گیا ہے بادشاہِ وقت کی قدردانی کا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صدہا داستانیں لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوگئیں، لیکن یوسف و زلیخا کی تصنیف سے پہلے فردوسی بادشاہ کے معتوبین میں سے تھا، محمود نے اُس کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے پامال کردینے کا حکم دیدیا تھا؛ فردوسی سراسیمگی اور پریشانی کی حالت میں کبھی ہرات۔ کبھی طوس۔ کبھی طبرستان۔ کبھی قہستان میں پڑا پھرتا تھا۔ یہ حالتیں کب اجازت دیتی تھیں کہ کوئی اُس کے کلام کو شہرت دینے اور سخن فہموں کے کانوں تک پہونچانے کی کوشش کرتا۔

تیسرا سبب

تیسرا یہ کہ فردوسی نے جس حالت میں یوسف و زلیخا کو نظم کیا وہ شاعرانہ جوش اور ولولہ کا زمانہ نہ تھا، کیونکہ محمود کی ناقدردانی نے اُسکو پژمردہ دل اور پریشان خاطر بنا دیا تھا؛ اور قلم کا زور۔ دماغ کی قوت۔ اور دل کی اُمنگ رخصت ہو چکی تھی۔ یوسف و زلیخا لکھنے سے اُسکا مقصود اپنی شاعری کے کمال۔ سیف زبانی کے نمونے۔ اور جادو بیانی کے جوہر دکھانا نہ تھا، بلکہ ہجومِ مصائب میں اپنا غم غلط کرنا۔ اور اپنے دردِ دل کا اظہار اور تضیعِ عمر کی شکایت کرنا تھا۔ چنانچہ یوسف و زلیخا کے شروع میں وہ اپنے وقت کے

رائگاں جانے، اور رستم کی قوت وشوکت، اور ایرانیوں کی جنگ وجدل کے کارنامے دکھانے پر متاسف ہی۔ وہ لکھتا ہے۔ ؎

نگویم کنوں نامہاے دروغ — سخن را ز گفتار ندہم فروغ
نگارم کنوں تخمِ رنج وگناہ — کہ آمد سفیدی بجاے سیاہ
دلم سیر گشت از فریدونِ گرد — مرا زاں چہ، کو تختِ ضحاک بُرد
گرفتم دل از مُلکتِ کیقباد — ہماں تختِ کاوُس کے برد باد
ندانم چہ خواہد بدایں جز عذاب — زکیخسرو وجنگِ افراسیاب
بریں می سزد گر بخندد خرد — زمن خود کجا کے پسندد خرد
کہ یک نیمہ از عمرِ خود کم کنم — جہانے پُر از نامِ رستم کنم
کنوں گر مرا روزِ چندیں بقاست — دگر نسپرم جز ہمہ راہِ راست
نگویم دگر داستانِ ملوک — دلم سیر شد ز آستانِ ملوک
کہ آں داستانہا دروغ است پاک — دو صد زاں نیرزد بجز مشتِ خاک

شاید اسی وجہ سے لوگوں کو فردوسی جیسے عدیم المثال شاعر کی نسبت خیال پیدا ہوگیا ہو کہ اُس سے بزم نہیں نبھ سکی۔

اس کے علاوہ کسی کتاب کا مقبول اور ہر دلعزیز ہونا وقت اور اتفاق پر بھی منحصر ہی اس میں بحر کو کیا دخل۔ حسنِ قبول اور فیضِ تاثیر عطیۂ الٰہی ہے۔

اگر آپ کوئی قاعدہ مقرر فرما دیتے کہ کس کس مضمون کیواسطے کون کونسی بحر خاص ہے تو شعرا ہمیشہ آپ کے زیرِ بارِ احسان رہتے اور اُن کو اپنی تصانیف کے مقبول عام بنانے کا بہت اچھا راز معلوم ہو جاتا۔ جن تین چار بحروں کا قابل مؤلف نے ذکر کیا ہی

بحروں کا خاص کیا ہونا

ان بحروں کو میر صاحب اور مرزا صاحب نے یکساں طور پر خاص کر لیا تھا۔ بیشک میر صاحب سے پہلے مرثیے اکثر بڑی بڑی بحروں میں لکھے جاتے تھے یا نہایت چھوٹی بحروں میں، لیکن اُن کی شاعری سے بہت قبل یہ بحریں متروک ہو چکی تھیں۔ چنانچہ میر ضمیر جنھوں نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا اُن کے سیکڑوں مرثیے انہیں بحروں میں موجود ہیں جو بقول مؤلف میر صاحب نے خاص کر لی تھیں۔ اُن کی جلد اوّل میں ایک بھی مرثیہ اُن پُرانی بحروں کا نظر نہیں آتا جو مؤلف نے لکھی ہیں۔ ہاں البتہ یہ پُرانی بحریں مرزا سودا سے قبل اور اُن کے زمانے تک مروّج تھیں، کیونکہ اُس زمانے میں مرثیوں کو سوز میں پڑھنے کا رواج تھا، اور سوز میں راگ راگنیوں کے اختلاف اور اُتار چڑھاؤ کے سبب سے مرثیے مختلف بحروں میں پُر لطف معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میاں افسردہ۔ گدا۔ احسان کے بہت سے مرثیے ان بحروں میں موجود ہیں مگر ان کے بعد تو مدت سے پُرانے مرثیہ گویوں کے کلام میں بھی اُن کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔

ردیف کا التزام

یہی حال ردیف کے التزام کا بھی سمجھ لینا چاہیے۔ میر صاحب کی طرح مرزا صاحب نے بھی بیشتر ردیف کا التزام رکھا ہے۔ اور ان دونوں صاحبوں پر کیا منحصر ہے ردیف کا التزام تو میر ضمیر۔ میر خلیق۔ منشی دلگیر اور دوسرے پُرانے مرثیہ گویوں نے بھی نہایت خوبی کے ساتھ رکھا ہے شاذ و نادر نہو تو یہ اور بات ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ میر صاحب اور مرزا صاحب نے جہاں خود فنِ مرثیہ گوئی کو بامِ ترقی پر پہونچا دیا ہے ساتھ ہی اسکے متعلق ہر بات کو عجیب و غریب خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ردیف کو بھی ایسی صفائی سے لکھتے ہیں کہ مطلق آورد کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

دونوں صاحبوں کے ہاں حُسنِ قافیہ و ردیف کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

مؤلف نے میر صاحب مرحوم کے کلام سے چند لطیف نظیریں نقل کر دی ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی مثالوں کو دیکھنے کے لیے غالباً ناظرین کی مشتاق نگاہیں بیتاب ہونگی اسلیے اُن کے کلام سے حُسنِ قافیہ و ردیف کی چند مثالیں اس موقع پر درج کرتے ہیں۔ ان اشعار میں اکثر قافیے معمولہ[1] واقع ہوئے ہیں جو متاخرین کے نزدیک داخلِ صنعت ہے ؎

حسن قافیہ و ردیف کی مثالیں

کیا ہاتھ ہی، کیا سینہ ہی کیا چہرہ ہی کیا سر		اے صلِّ علےٰ نور کا مجمع ہے سراسر
کی شرم نہ محبوبِ خدا سے نہ خدا سے	ولہ	لے دیکھ تو روتے ہیں پیمبرؐ کے نواسے
ہو کیوں نہ وہ بی بی شرفِ مادرِ عیساؑ	ولہ	فرزند ہی عباسؑ سا وارث ہی علیؑ سا
دوزخ جدا و شعلۂ قہرِ خدا جدا	ولہ	رہوار کے جلو سے نہ تھی ایک جا جُدا
خود و سر و دل و جگر و دست و پا جدا		سب تیغ کے قدم پہ پڑے تھے جُدا جُدا
گردن سے سر لیا، کبھی قالب سے دم لیا	ولہ	بس دم لیا تو تیغِ دو دم نے یہ دم لیا
ہر نقدِ عمل اب زرِ بیعانہ بنے گا	ولہ	بے اسکے کبھی خلد کا سودا نہ بنے گا
اکبرؑ کی نہ شادی کا لیا کام بہن سے	ولہ	اسوقت یہی کام لو نا کام بہن سے
ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا ہی یہ خدا نے	ولہ	رسّی میں بندھیں زینبؑ و کلثومؑ کے شانے
کیا غم ہی جو نو لاکھ جواں تم ہو قلم بند	ولہ	ہم نیچے کھینچیں تو ابھی سب کا ہو دم بند

[1] اگر ایک لفظ کے دو ٹکڑے کرکے ایک جُز کو قافیہ، اور دوسرے کو ردیف میں داخل کریں یعنی ایک ہی کلمہ میں قافیہ اور ردیف پیدا کریں تو اسکو قافیۂ معمول کہتے ہیں جیسے کمال کا یہ شعر ہی ؎ زہی زنبل تر کردہ لالہ را پردہ ؛ بر آسماں زدہ عکسِ رخت سراپردہ ۔ اس غزل میں سرا رجفا۔ قفا۔ قافیہ اور پردہ ردیف ہے۔ مگر سراپردہ جو ایک لفظ ہی اسکے دو ٹکڑے کیے ہیں۔ سرا۔ اور پردہ۔ پہلے جز کو قافیہ۔ اور دوسرے کو ردیف قرار دیا۔

زہرا کے مہر میں نہیں دریا، نہیں سہی — ولہ — قابل نہیں میں پانے کے، اچھا نہیں سہی
عصیاں سے میں نہیں ہوں مبرا نہیں سہی — پر مجرموں نے بھی تو یہ ایذا نہیں سہی

بدمست ہو کس نیند میں، ہشیار ہو جاگو — ولہ — کوثر کے طلبگار رہو، نار سے بھاگو
نزدیک تمہارے ہوں سزاوارِ جفا، گو — پر امتِ محبوبِ خدا کا ہوں دعا گو

سمجھو ہمیں ایجادِ دو عالم کا نتیجہ — ولہ — چاہیں تو ہمیں کوثر و تسنیم اسی جا
نانا ہیں محمدؐ مرے نانی ہیں خدیجہؑ — شبیر جسے حق نے دیئے اُسکا ہوں بھتیجا

اربابِ سخن میرے دعا گو ہیں سراپا — ولہ — لو مرثیہ تو ایک ہے اور دو ہیں سراپا
ہر بند کو کھولا بھی لیا نقدِ بقا بھی — ولہ — جنبش نہ ہوئی تن کو یہ آیا بھی گیا بھی

آزار رسیدہ یہ نکوئی نہ کرے گا — ولہ — جو میں نے کیا تم سے وہ کوئی نکرے گا
اِک دن اسی طرح سے یہ دنیا تمام ہے — ولہ — پر شاہِ کربلا کی عزا نا تمام ہے

اس نہر کا ہم آبرو اصلا نہ ہو زمزم — ولہ — اک قطرۂ ناچیز کا پیمانہ ہو زمزم
پیشِ نظر عزیزوں کا تو خوں بہا کرے — ولہ — وہ جز رضائے حق نہ طلب خوں بہا کرے

گرمیِ شوقِ جنگ سے دم بھر نہ کل پڑی — ولہ — گویا زباں نیام کے مُنہ سے نکل پڑی
تھا شہر شہر شہرۂ حیدرؑ جہان میں — ولہ — حیدرؑ، نبیؐ کے علم کا ہے درجہان میں

وہ کون ہے جس نے کہ کیا فاقے پہ فاقا — ولہ — پر فاقے کے غم سے دیا سائل کو افاقا
یوں ضربِ تیغ سے سرِ دشمن روانہ تھا — ولہ — گویا بدن سے اپنے کبھی آشنا نہ تھا
یہ فوج ہے کیا چیز یہ سردار ہیں کیا مال — ولہ — لوں باگ جو گھوڑے کی تو کر دوں ابھی پامال

تنسیق الصفات اس صنعت کی تعریف جو تمام کتابوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ "کسی موصوف کا صفاتِ متوالیہ کے ساتھ ذکر کریں[1]" جیسے حضرت امام رضا علیہ السلام کی

[1] حدائق البلاغت صفحہ ۱۰۲

منقبت میں قاآنی کے یہ اشعار ؎

نہالِ باغِ علیّین - بہارِ مرغزارِ دین	نسیمِ روضۂ یاسین - شمیمِ دوحۂ طاہا
نظامِ عالمِ اکبر - قوامِ شرعِ پیغمبرؐ	فروغِ دیدۂ حیدرؑ - سرورِ سینۂ زہراؑ

یا امیر خسرو کا یہ شعر ؎

کجا خیزد چو تو سروِ جواں - و نازک - و نوبر	شکر گفتار - و شیریں کار - و گلرخسار - و مہ پیکر

یا کسی شاعر کا یہ شعر ؎

تیری شمشیر سرِ خصم پہ ہے میداں میں	صاعقہ - برقِ بلا - قہرِ خداوندِ تعال

مگر مؤلف علامہ اس صنعت کی تعریف فقط یہ لکھتے ہیں "جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے" یہ عجیب و غریب تعریف قابلِ مولف کی ایجاد ہے۔ حالانکہ ایک وزن کے الفاظ جمع ہو جانے کو صنعتِ موازنہ[1] (از اقسامِ سجع)، اور ایک قسم کے الفاظ جمع ہونے کو صنعتِ مراعات النظیر کہتے ہیں۔ اسکے بعد اُنھوں نے تنسیق الصفات کی پانچ مثالیں درج کی ہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ تنسیق الصفات کی جو جدید تعریف اُنھوں نے ایجاد کرکے لکھی ہے اُسکے لحاظ سے سوا ایک مثال کے اور کوئی مثال اس عنوان کے تحت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہم اُن کی پانچوں مثالوں پر علیحدہ علیحدہ ریمارک کرتے ہیں ؎

[1] اس میں نظم کے دو مصرعوں کے تمام الفاظ بر سبیل تقابل وزن میں متحد اور روی میں مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے عبدالواسع جبلی کا یہ شعر ؎ آرائشِ آفاق شد رخسارِ بزمِ آرائے تو ✤ آسائشِ عشاق شد دیدارِ روح افزائے تو۔ یہاں وزن سے مراد عروضیوں کا وزن ہے، جس میں حرکات کا یکساں ہونا ضرور نہیں۔ پس انکے نزدیک میکنم اور فاعلن کا ایک وزن ہے، نہ صرفیوں کا وزن جنکے نزدیک توافقِ حرکات واجب ہے۔ جیسے نصر بر وزن فعل۔

وہ رضا جو مؤلف کی تعریف کے مطابق تنسیق الصفات ہیں نہ

کوفہ میں یہی معرکہ دن بھر نظر آیا	شمر آیا۔ سناں آیا۔ حُر آیا۔ عمر آیا
سمٹا جما اُڑا ادھر آیا اُدھر گیا	چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا

شمر آیا۔ سناں آیا۔ حُر آیا۔ عمر آیا، یا سمٹا۔ جما۔ چمکا۔ پھرا وغیرہ ان الفاظ کو کسی موصوف کی صفت ہونے کی قابلیت نہیں، اسلیے ان دونوں شعروں پر صنعتِ تنسیق الصفات جس کی تعریف تمام کتابوں میں تحریر ہے، صادق نہیں آتی۔ اور نہ یہ مؤلف کی ایجاد کردہ تعریف کے مطابق تنسیق الصفات کی مثالیں ہو سکتے ہیں، کیونکہ نہ تمام الفاظ ایک وزن کے ہیں نہ ایک قسم کے، پھر نہ معلوم یہ دو مثالیں کس غرض سے لکھی ہیں ؎

متقدمین کی تعریف تنسیق الصفات مؤلف کی تعریف نہیں۔

موجود بھی ہر غول میں، اور سب سے جُدا بھی	دم خم بھی، لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اِک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی	امرت بھی۔ ہلاہل بھی۔ مسیحا بھی قضا بھی
چلتی تھی عجب رنگ سے شمشیرِ قضا رنگ	ہر ہاتھ میں دکھلاتی تھی اعدا کو نیا رنگ
چم خم کا جدا رنگ تھا، کس بل کا جُدا رنگ	لب سرخ۔ دہن صاف۔ بدن گول ہر اِک رنگ

ان میں سے بعض مصرعے متقدمین کی تعریف کے مطابق تنسیق الصفات کی مثال ہو سکتے ہیں۔ لیکن مؤلف کی ایجاد کردہ تعریف کے لحاظ سے کوئی مصرع بھی تنسیق الصفات کے تحت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کسی مصرع کے الفاظ بھی ہموزن یا ایک قسم کے نہیں ؎

دونوں کا مثال تنسیق الصفات

دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اُسکی بُری تھی　　برچھی تھی۔ کٹاری تھی۔ سروہی تھی۔ چھُری تھی

یہ شعر متقدمین کی تعریف کے مطابق بھی تنسیق الصفات کی مثال ہو سکتا ہے، کیونکہ دوسرے مصرع کے الفاظ میں تلوار کی صفت ہونے کی قابلیت موجود ہے۔ اور مؤلف کی ایجاد کردہ تعریف کے لحاظ سے بھی اسکو تنسیق الصفات کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ الفاظ گو ہم وزن نہیں لیکن ایک قسم کے ضرور ہیں۔ تمام مثالیں ختم ہو چکیں لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ ایک وزن کی کوئی بھی مثال نظر نہ آئی جس کا ذکر مؤلف نے عنوان میں کیا ہے۔

ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ذی علم مؤلف نے جو عنوان (تنسیق الصفات) لکھا اُس کی تو تعریف غلط لکھی۔ اور جو تعریف لکھی اُس کی صحیح صحیح مثالیں نہ دیں۔

دیکھیے میر صاحب مرحوم کے یہ لاجواب اشعار صنعتِ تنسیق الصفات میں ہیں کاش آپ اسی قسم کے دلچسپ اشعار انتخاب کر کے ناظرین کو محظوظ فرماتے۔

منقبتِ جناب امیر علیہ السلام ؎

بازوے نبیؐ۔ دستِ خدا۔ نفسِ پیمبرؐ	طیب۔ وزکی۔ وطاہر۔ وپاکیزہ۔ واطہر
لشکر شکن۔ وبت شکن وفاتحِ خیبر	سرتاجِ عجم۔ میرِ عرب۔ حیدرِ صفدر

منقبت امام حسینؑ

اُس مہر کو تو دیکھو یہ ذرّے ہیں جسکے سب	سرتاجِ آسمان و زمیں۔ نورِ عرشِ رب
ابرِ کرم۔ خدیوِ عجم۔ خسروِ عرب	عالی ہمم۔ امامِ امم۔ شاہِ تشنہ لب

آنکھ ؎

احسان بھی۔ حیا بھی۔ مروّت بھی۔ قہر بھی
بینا بھی۔ نکتہ سنج بھی۔ دانائے دہر بھی

خود موت بھی۔ حیات بھی۔ امرت بھی زہر بھی
تسنیم بھی بہشت بھی۔ کوثر بھی نہر بھی

آہو شکار و تیر۔ کماندار و شیر گیر
خوں ریز۔ و جاں فریب و دلاویز۔ و بے نظیر

ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
قبضے[1] میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر

ذرّہ نواز۔ و رند نما۔ صاحب امتیاز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز

طنّاز و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
بیدار و داغ دیدہ و خونبار۔ و غم طراز

گھوڑا ؎

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام
جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام

خوش رو و خوش جمال و ادا فہم و تیز گام
گلپوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام

اس صنعت کی بیشمار نادر و نفیس نظیریں مرزا صاحب کے کلام میں بھی ملتی ہیں اُنمیں سے چند مثالیں نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ؎

تنسیق الصفات کی مثالیں

نامِ نامی ہے حسینؑ ابنِ علیؑ صلِّ علےٰ
مخزنِ صبر و رضا۔ معدنِ الطاف و عطا

اور لقب بیوطن۔ و بیکس و شاہِ شہدا
مرجعِ رحمتِ حق۔ مبدءِ افضالِ خدا

[1] یہ مصرعہ صنعتِ تنسیق الصفات سے باہر ہے۔

سورۂ نور سے بھی نور دوچند اُسکا ہے
رتبہ تکبیر کے نعرے سے بلند اُسکا ہے

شرفِ کلکِ قضا۔ گلشنِ قدرت کی بہار راکبِ دوشِ نبیؐ۔ مُہرِ نبوّت کا سوار		زینتِ لوح و قلم۔ عرشِ الٰہی کا وقار مصحفِ ناطق۔ و تفسیرِ کلامِ غفّار

فخر وہ شکل نہ کیوں چاند پہ وہ چند کرے
جسپہ یہ پیرِ فلک تاروں کو اسپند کرے

وہ کون رسولِؐ جزو کُل۔ خطبۂ ایماں محبوبِ خدائے دوجہاں۔ قالبِ فرقاں	ولہ	سرتاجِ فصیحانِ عرب۔ آیۂ عرفاں استادِ دبستانِ ازل۔ نائبِ یزداں
میزانِ خدا۔ مفتیِ دیں۔ قاضیِ فردا خورشیدِ نجف۔ بدرِ حرم۔ رونقِ بطحا	ولہ	سلطانِ ازل۔ شاہِ ابد۔ عروۂ وثقا اقبالِ عرب۔ اوجِ حرم۔ خسروِ دنیا

بیعت کو سند ہاتھ سے، قرآں کو قلم سے
خطبے کو شرف نام سے، منبر کو قدم سے

گُل پیرہن و گلبدن و گُل رخ و گلفام خوش قامت و خوشتر و خوش آغاز و خوش انجام	ولہ	شمشاد قد۔ و غنچہ دہان و سمن اندام حُسنِ چمنِ شرع۔ بہارِ گُلِ اسلام
منظور جو اُس تیغ کو اکبرؑ کی رضا تھی	ولہ	گہ ابر تھی۔ گہ برق تھی۔ گہ سیلِ فنا تھی
بجلی کی جست۔ شیر کی آمد۔ ہوا کا شور	ولہ	قدرت کا کھیل۔ قہر کی طاقت۔ بلا کا زور
وہ تیغ تھی کہ قدرتِ پروردگار تھی	ولہ	گلچیں تھی، باغباں تھی، خزاں تھی، بہار تھی

در نعت جناب امیرؑ

☆ ان تینوں ٹیپوں میں صنعتِ تنسیق الصفات نہیں ہے۔ ان کو صرف سلسلۂ مضمون قائم رکھنے اور لطفِ کلام معلوم ہونیکی غرض سے تحریر کر دیا گیا۔ اصل عنوان سے ان کو تعلق نہیں ہے۔

باقی تنسیق الصفات کی دلچسپ مثالیں صنائع بدائع کی بحث میں دیکھو۔

بلاغت

قابل مؤلف نے اس موقع پر اُس خیال کو ظاہر کیا ہی جو ایک عرصہ سے میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام کے موازنہ میں زبانوں پر بطورِ ضرب المثل جاری ہی، یعنی میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہی اور مرزا صاحب میں بلاغت۔ مگر وہ اس جملہ کو مہمل اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ ضرب المثل واقعیت اور حقیقت کے لحاظ سے غلط سمجھی جائے تو کچھ مضائقہ نہیں؛ کیونکہ میر صاحب میں فقط فصاحت، اور مرزا صاحب میں فقط بلاغت سمجھنا بے معنی اور خلافِ واقعہ بات ہی؛ لیکن مؤلف نے اسکو بلحاظِ معنی جو غلط اور مہمل لکھا ہی وہ ہرگز صحیح نہیں۔ اُن کی رائے کا خلاصہ یہ ہی کہ یہ فقرہ اِس وجہ سے بے معنی ہی کہ جب بلاغت کی پہلی شرط یہ ہی کہ کلام فصیح ہو، پھر فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماعِ نقیضین ہی۔ افسوس ہی کہ لائق مؤلف نے اس موقع پر تعمقِ نظر سے کام نہیں لیا۔ چونکہ یہ ایک دقیق اور علمی بحث ہی، اسلیے اس کے حل کرنے میں کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہی، تاکہ بخوبی ناظرین کے ذہن نشین ہو جائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ فصاحت و بلاغت کی تعریف کیا ہی، اور ان دونوں کا اپنے اپنے افراد سے کیا تعلق ہی۔

فصاحتِ کلام

فصاحتِ کلام کے یہ معنی ہیں کہ کلام الفاظِ ثقیلہ و غریبہ سے پاک ہو، یعنی جس میں تمام الفاظ فصیح و شیریں و معتاد ہوں۔ اور یہ الفاظ ایسی خوبی کے ساتھ ترتیب و تالیف

کیے گئے ہوں کہ کلام حد سے زیادہ دلاویز و دلفریب معلوم ہو اور حُسنِ تالیف سے مزین، اور تعقیدِ لفظی و معنوی تخییل و اصطلاح و ادّعائے ناپسندیدہ سے مبرّا ہو۔

بلاغتِ کلام یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق، اور استعاراتِ[1] باقرائن، کنایاتِ بلیغ، مجازہائے پسندیدہ۔ تشبیہاتِ نادرہ غیر مبتذلہ سے آراستہ ہو۔ بشروطِ فصاحت، کیونکہ فصاحت بلاغت کا ایک جزو ہے۔ پس فصاحت کا تعلق الفاظِ با معنی سے ہے اور اُس میں الفاظ اور بندشِ الفاظ کے حُسن و قبح سے بحث ہوتی ہے، اور بلاغت کا اصلی تعلق معانیِ الفاظ سے ہے، یعنی اسمیں معنی کی خوبی و نفاست کی نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

بلاغت و فصاحت میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ بلاغت اخصّ مطلق ہے اور فصاحت اعمّ مطلق۔ یعنی ہر بلیغ فصیح ہے (گو یہ ضرور نہیں کہ ایک کلام میں جس پایہ کی بلاغت ہو اُسی پایہ کی فصاحت بھی ہو کیونکہ ممکن ہے کہ کلامِ بلیغ کا ہر کلمہ فصیح تر نہو) لیکن ہر فصیح کا بلیغ ہونا لازم نہیں ہے، بلکہ بعض فصیح بلیغ ہے اور بعض نہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں کا اپنے اپنے افراد کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یعنی ان میں تشکیک[2] ہے یا تواطؤ ظاہر ہے کہ دونوں میں تشکیک ہے۔ یعنی فصاحت و بلاغت

---

[1] بلاغتِ کلام کی تعریف میں صرف مطابقت اور فصاحت داخل ہے، اور استعارات و کنایات وغیرہ کلام کیواسطے عارضی، اور حدِ بلاغت سے خارج ہیں، البتہ کلام میں بعد رعایتِ مطابقت و فصاحت، ایک حُسن پیدا کردیتے ہیں ۱۲

[2] منطقیوں کی اصطلاح میں اگر کلّی اپنے تمام افراد پر یکساں طور پر صادق آئے تو اُسکو متواطی کہتے ہیں۔ جیسے لفظ انسان کہ اسکا اطلاق ہر انسان پر یکساں ہوتا ہے، کیونکہ تمام انسان انسانیت میں برابر ہیں۔ اور اگر ایسا نہو یعنی اُس کلّی کا اطلاق بعض افراد پر زیادہ اور بعض پر کم ہو تو اُسے مشکک کہتے ہیں۔ جیسے لفظ وجود۔ یا ہستی۔ کہ اسکا اطلاق ذاتِ الٰہی پر اتم و اقوی ہے بہ نسبت دیگر موجوداتِ عالم کے۔ ۱۲ مؤلف

جن دونوں کا مفہوم کلی ہے اُنکے تمام افراد مساوی نہونگے۔ مثلاً فصیح کے افراد بیس قسم کے کلام ہوں تو لفظ فصیح اُن سب پر یکساں طور پر صادق نہ آئیگا۔ کیونکہ کوئی کلام فصیح ہوگا۔ کوئی فصیح تر چنانچہ اطلاقِ افصح جو مقابلِ فصیح ہے مثبتِ تشکیک ہے۔ یہی بلاغت کا بھی حال ہے، کوئی بلیغ ہوگا کوئی بلیغ تر۔ چنانچہ کسی کو بلیغ کسی کو ابلغ کہنا زبان زدِ خلق ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دونونکے افراد میں وصفِ فصاحت و بلاغت کی کمی بیشی ممکن ہے۔ علماے علمِ معانی وبیان نے بھی اس امر کو بہ صراحت ظاہر کر دیا ہے[1]

ان دونوں کی تعریف، اور اُن کا اپنے اپنے افراد کے ساتھ جو کچھ تعلق ہے، اُسکے معلوم ہوجانے کے بعد ضرب المثل کے معنی پر غور کیجیے۔ مرزا صاحب کی نسبت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اُن میں بلاغت زیادہ ہے، اسکے یہ معنی ہوئے کہ اُن میں ہیں تو بلاغت اور فصاحت دونوں، مگر بلاغت زیادہ ہے (فصاحت کم) نہ یہ کہ فصاحت بالکل نہیں، جیسا کہ آپ نے خیال کیا ہے اور اسی بنا پر کہدیا کہ لوگ فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیتے ہیں، یعنی یہ کہتے ہیں کہ بلاغت ہے فصاحت نہیں۔ بلاغت زیادہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اُن کا کلام مقتضاے حال کے مطابق ہوتا ہے، لیکن ضرب المثل والوں کی راے میں، جس پایہ کی بلاغت ہوتی ہے اُسکے مناسب و مطابق فصیح الفاظ نظر نہیں آتے، یا الفاظِ فصیح کو حُسنِ ترتیب کے ساتھ ترکیب نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اُن میں بلاغت جسکا تعلق معانی سے ہے زیادہ ہے، لیکن فصاحت جسکا تعلق الفاظ سے ہے اُس سے کم درجہ کی ہے۔ اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ کے تمام فقرات کی بآسانی رد ہوجاتی ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں کہ (بلاغت کی

[1] مختصر المعانی میں بلاغت کے موقع پر لکھا ہے۔ وبینہما ای بین الطرفین مراتب کثیرۃ متفاوتۃ بعضہا اعلی من بعض بحسب تفاوت المقامات ورعایۃ الاعتبارات والبعد من اسباب الاخلال بالفصاحۃ انتہی۔ یہ تصریحاً تشکیکِ بلاغت پر دال ہے اور تلویحاً مثبتِ تشکیکِ فصاحت ہے۔

پہلی شرط یہ ہی کہ کلام فصیح ہو اسلیے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماعِ نقیضین ہی) یہ آپنے کس طرح جانا کہ ضرب المثل والے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دیتے ہیں وہ بھی مانتے ہیں کہ جہاں بلاغت ہوگی فصاحت بھی ہوگی کیونکہ فصاحتِ الفاظ کلامِ بلیغ کے واسطے لازمی ہی، لہذا بلاغت کے ساتھ اسکا اجتماع ضروری ہی مگر یہ لازم نہیں کہ دونوں ایک ہی حیثیت اور شان کی ہوں۔ فصاحت و بلاغت کو باہم حریف سمجھنا تو اُسوقت خیال کیا جاتا جب ضرب المثل والے یہ کہتے کہ مرزا صاحب میں فقط بلاغت ہی فصاحت نہیں۔ ضرب المثل کے لفظ زیادہ سے خود معلوم ہوتا ہی کہ وہ لوگ فصاحت کے معدوم ہونے کے قائل نہیں، بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ بلاغت زیادہ ہی اور فصاحت بھی ہی مگر کم۔ پس جب ضرب المثل کے الفاظ سے فصاحت و بلاغت کا اجتماع ثابت ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان دونوں کو حریف نہیں قرار دیتے، اور جب حریف نہ رہے تو ایک کلمے میں اُنکے جمع ہونے سے اجتماعِ نقیضین لازم نہ آیا۔

پھر آپ فرماتے ہیں (مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فصاحت بھی زیادہ ہی کیونکہ کلام اُسوقت تک بلیغ نہیں ہوسکتا جب تک اُس کے تمام الفاظ مفردات و مرکبات فصیح نہوں، اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہوگی تو بلاغت میں بھی کمی ہوگی)

یہ بالکل صحیح نہیں کہ اگر بلاغت زیادہ ہی تو فصاحت بھی زیادہ ہی۔ ممکن ہی کہ بلاغت جسکا تعلق مطالب و مضامین سے ہے زیادہ ہو، لیکن فصاحت جسکا تعلق الفاظ سے ہی اُس سے کچھ کم ہو۔ بلاغت کی شرط مطلق فصاحت ہی نہ زیادتیِ فصاحت اور نہ بلاغت کی زیادتی فصاحت کی زیادتی پر موقوف و منحصر ہی جو یہ شبہ پیش آئے کہ جو کلام زیادہ بلیغ ہوگا وہ لزوماً فصیح بھی زیادہ ہوگا، کیونکہ ممکن ہی کہ ایک کلامِ فصیح میں جو دوسرے

بلاغت زیادہ اور فصاحت کم ہونا ممکن ہی

کلامِ افصح سے کم رتبہ ہو رعایت مقتضائے حال کے زیادہ ہو لہذا وہ بلیغ زیادہ ہوگا اور فصاحت میں افصح سے کم ہوگا۔ مثلاً شاعر ایسا مضمون نظم کرے جو مقتضائے حال کے مطابق ہو، لیکن الفاظ شیریں تر اور فصیح تر نہوں، تو کہا جائیگا کہ کلام بلیغ تو ہی مگر جس درجہ کا بلیغ ہی اُس درجہ کا فصیح نہیں، جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے بات تو اچھی سوچی ہی مگر طرزِ ادا بہت ناقص ہے، یعنی اچھی طرح ادا نہ کرسکا۔ اربابِ معانی و بیان نے صرف اسقدر بیان کیا ہی کہ کلامِ بلیغ کو فصیح ہونا بھی لازمی ہی۔ لیکن اس سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک فصیح تر کلمات کا استعمال نہو کلام بلیغ ہو ہی نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ کلام میں وہ فصاحت موجود ہو جو بلیغ ہونے کے لیے کافی ہی مگر اُس سے فصیح تر بھی ممکن ہو۔ کلمات کی فصاحت محدود نہیں ہی بلکہ وہ درجہ بدرجہ فصیح اور افصح ہوتے چلے جاتے ہیں؛ یہانتک کہ اُن کا پہلا زینہ حیوانات کی زبان سے اونچا اور آخری زینہ حدِ اعجاز پر جاکر ٹھہرتا ہے۔ ان دونوں کے وسط میں بہت سے تدریجی مراتبِ فصاحت پیدا ہوتے ہیں جو اربابِ نظر پر مخفی نہیں۔ پس یہ کہنا کہ اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہوگی تو بلاغت میں بھی کمی ہوگی ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ لیکن اگر الفاظ بالکل ہی فصیح نہ ہوں تو بلاغت صرف کم ہی نہ ہوجائے گی بلکہ جاتی رہے گی۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ کسی کلام میں بلاغت کا زیادہ اور فصاحت کا کم ہونا ممکن ہی اور اس میں کچھ نقص پیدا نہیں ہوتا۔

ابن خلدون کی رائے

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی اور الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ۔ پانی کو چاہے سونے کے پیالہ میں بھرلو اور چاہو چاندی کے پیالہ میں اور چاہو مٹی کے پیالہ میں۔ پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اُس کی قدر بڑھ جاتی ہی اور مٹی کے پیالے میں کم ہوجاتی ہی۔ اسی طرح معانی کی قدر

ایک فصیح و ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے" اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا نفیس اور اعلیٰ ہونا اور اُسکے واسطے مناسب الفاظ فراہم نہونا ممکن ہے پس ایسی حالت میں بلاغت یعنی معنی کی نفاست و خوبی زیادہ پائی جائیگی لیکن فصاحت یعنی الفاظ کی پاکیزگی اُس سے کچھ کم ہو سکیگی۔ اسلیے کہا جائیگا کہ اس کلام میں بلاغت زیادہ ہے لیکن فصاحت اُس درجہ سے کچھ کم ہے۔ اسلیے ضرب المثل والوں کا یہ قول کہ بلاغت زیادہ ہے فصاحت کم، صحیح ہے۔

ضرب المثل کا دوسرا حصہ کی صحت اور اسکے معنی کی تصحیح و توضیح

رہا ضرب المثل کا دوسرا حصہ یعنی میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے (بلاغت کم) یہ تو بالکل صاف ہے۔ یعنی میر صاحب کے کلام میں الفاظ نہایت فصیح و شیریں اور مرغوبِ طبع ہوتے ہیں، بندشِ الفاظ بھی نہایت صفائی اور خوبی کے ساتھ کرتے ہیں، اسلیے اُن میں (بہ نسبت بلاغت کے) فصاحت زیادہ ہے اور یہ بالکل جائز ہے۔ مثلاً ایک شاعر اپنے کلام میں موزوں اور فصیح الفاظ کا استعمال کرے، اُن کی مناسب طور پر بندش بھی کر دے لیکن جوانب و مراعاتِ مقام کا لحاظ نہ رکھا ہو تو کہیں گے کہ کلام فصیح تو ہے مگر بلیغ نہیں۔ جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے جو مطلب بیان کیا وہ تو معمولی تھا مگر طرزِ بیان اور طریقۂ ادا بہت خوب تھا۔

فصاحت زیادہ اور بلاغت کم ہونا ممکن ہے

صاحب مختصر المعانی لکھتے ہیں لیس کل فصیح بلیغاً لجواز ان یکون کلام فصیح غیر مطابق لمقتضی الحال (ہر فصیح کلام کا بلیغ ہونا لازم نہیں کیونکہ جائز ہے کہ کوئی کلام فصیح تو ہو مگر مقتضائے حال کے مطابق نہو) پس جب فصاحت کے واسطے بلاغت کا بالکل نہونا بھی جائز ہے تو اُس کی کمی تو بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگی۔ اسلیے یہ کہنا کہ میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے (بلاغت کم) درست ہے لہٰذا یہ ضرب المثل جو میر صاحب اور مرزا صاحب کے موازنہ میں زبان زدِ خلق ہے اور جسکو قابل مولف مہمل اور غلط بتاتے ہیں بحیثیتِ معنی بہت صحیح اور درست ہے۔ لیکن ہماری رائے

ضرب المثل بحیثیت معنی صحیح ہے

میں بلحاظِ واقعیت وحقیقت علی العموم صحیح نہیں، کیونکہ میر انیس اور مرزا دبیر میں نہ فصاحت کی کمی ہی نہ بلاغت کی، جس طرح ملکِ فصاحت میں دونوں کی شہرت کا پرچم جلوہ فگن ہی اسی طرح اقلیمِ بلاغت میں اُنکے آوازۂ کمال کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں۔

مولف کی رائے

ہم کو اس امر کا خاص طور پر افسوس ہی کہ جمہورِ انام کا فیصلہ ہمیشہ لائق مولف کی رائے کے خلاف رہتا ہی، یا انہیں کی جدّت پسند طبیعت کا خاصّہ ہی کہ ہر مسئلہ میں سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے اُنھوں نے دیباچہ میں طے کر دیا تھا کہ شاعری میں میر انیس کا پایہ مرزا دبیر سے بہت بڑھا ہوا ہی۔ حالانکہ بقول اُنکے "جمہورِ انام نے مدتہائے دراز کی غور وفکر، کدو کاوش، بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ کیا کہ ترجیح کا مسند نشیں کسکو کیا جائے"۔ بلاغت کے موقعوں پر بھی وہ اکثر اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ "مرزا صاحب بلاغت کے کوچوں سے نابلد ہیں" اور "بلاغت اُن سے چھو بھی نہیں گئی" حالانکہ تمام قوم کا متفقہ فیصلہ ہی کہ "مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہی" اور یہ فیصلہ اسقدر شہرت رکھتا ہی کہ بقولِ مؤلف بطورِ ضرب المثل مشہور ہو گیا ہی۔ چونکہ مولوی شبلی صاحب لکھ چکے ہیں کہ "مرزا صاحب سے بلاغت چھو بھی نہیں گئی" اور "اُن کے کسی قسم کے کلام میں یہ وصف (بلاغت) پایا نہیں جاتا"[1] اس لیے کسی قسم کے الفاظ پڑھ کر ذہن میں آتا تھا کہ شاید اُن کو مرزا صاحب کے کلام میں ایک مثال بھی بلاغت کی نظر نہ آئیگی، لیکن اسکو توفیقِ جبری کہا جائے یا مرزا صاحب کے کلام کی کرامت، کہ آخر کتابِ موازنہ میں، اُس مرثیہ پر رائے دیتے وقت جس میں حضرت امام حسینؑ جناب علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگتے ہیں، قائل مؤلف مرزا صاحب کے کلام کی بلاغت کے کھلم کھلا قائل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

پہلی نظیر

دوسری نظیر

[1] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۶۰۔

"مرزا صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے آجتک کسی سے نہو سکا" دو مقاموں پر اسقدر مختلف المعنی کلام دیکھ کر یقین نہیں آسکتا کہ ان متضاد خیالوں کا ظاہر کرنے والا ایک ہی شخص ہے۔ یہ حالت قابلِ افسوس ہے کہ انصاف کی طرح حافظہ نے بھی اُن کا ساتھ نہیں دیا۔

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ سوا ان چند درد انگیز بند اور ایک سین دکھلانے کے مرزا صاحب کا سارا ذخیرۂ کلام یعنی ڈیڑھ لاکھ اشعار بلاغت سے اسقدر معرّا ہیں کہ اُن میں یہ وصف نام کو بھی نہیں۔ تعجب ہے کہ ایک شخص ایک موقع پر تو ایسا سماں دکھادے جسکا مثل آجتک کسی سے نہو سکے لیکن اسکے علاوہ اپنی تمام عمر کی شاعری میں اور موقعوں پر (بقول مولف) کسی واقعہ کی تصویر دکھانے سے قطعی عاجز ہو۔

اسی بحث میں مولف ایک موقع پر لکھتے ہیں "بلاغتِ الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے" اس فقرہ میں اُنھوں نے بلاغت کا تعلق الفاظ سے ابتدائی درجہ میں تسلیم کرلیا ہے۔ پھر آگے موازنہ کے صفحہ ۶۰ پر جہاں وہ میر صاحب کے اس مصرع کی بلاغت کا اظہار کرتے ہیں ع اک ذرا غور سے دیکھو تو یہ سر کِسکا ہے، لکھا ہے کہ ذرا کا لفظ اور زیادہ بلیغ ہے۔ اس فقرہ میں اُنھوں نے لفظ کو بلیغ تحریر فرمایا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ علمائے علم معانی نے تصریح کردی ہے کہ بلاغت کلمہ کی صفت نہیں ہوتی بلکہ صرف کلام و متکلم کی صفت ہوتی ہے۔ کلمہ کی صفت نہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اسکو لفظ سے تعلق نہیں، کیونکہ ایک لفظ میں مقتضائے حال کی مطابقت نہیں ہوتی۔ البتہ بلاغت، کلام کی (جو الفاظ سے مرکّب ہوتا ہے) صفت ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے معنی کی جہت سے

بلاغت کا لفظ سے کچھ تعلق نہیں

مولف لفظ کو بلیغ کہتے ہیں

۲ مرزا صاحب کے کلام سے بلاغت کی مثالیں جزئیاتِ بلاغت کی بحث میں دیکھو۔

مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے فصاحت کا تعلق الفاظ سے ہے اور بلاغت کا معانی سے۔ صاحب شجرۃ الامانی لکھتے ہیں "لفظِ فصیح اطلاق کنند بر کلمہ و کلام۔ و متکلم۔ ہر سہ۔ و اطلاقِ بلیغ بر کلام۔ و متکلم۔ صحیح بود و بر کلمہ غیر صحیح" اسی طرح کتبِ عربیہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے[1] ان تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ یعنی لفظ کو بلیغ کہنا غلط ہے۔

بلاغتِ الفاظ

اسی بحث میں وہ لکھتے ہیں "میر انیس کے کلام میں بلاغتِ الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجہ کی ہے لیکن یہ اُن کے کلام کا اصلی معیار نہیں۔ اُن کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ اُن کی رائے میں الفاظ کی بلاغت بحیثیتِ لفظ و صوت، اور معانی کی بلاغت بحیثیتِ مضمون، دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بلاغتِ الفاظ بدون لحاظِ بلاغتِ معانی کیونکر پیدا ہوگی[2] اور نہ یہ عقل میں آتا ہے کہ معانی کی بلاغت کا جوہر بغیر الفاظ کی مدد کے کیونکر کھل سکتا ہے۔ فلسفیانِ عرب۔ حکمائے قدیم اور محققینِ یورپ و امریکہ کا ایک بڑا طبقہ کہتا ہے کہ بلا الفاظ انسان کا فکر کرنا ہی محال ہے منطق جو فکرِ انسانی کو بذریعہ دلائل صداقت تک پہونچانے کا آلہ ہے وہ بھی الفاظ سے معرّا نہو سکا چہ جائیکہ فنِ بلاغت و فصاحت جو کلام یا الفاظ کے اوصاف سے ہے

---

[1] مطول میں ہے۔ الفصاحۃ یوصف بہا المفرد یقال کلمۃ فصیحۃ۔ والکلام یقال کلام فصیح۔ والمتکلم یقال کاتب و شاعر فصیح۔ والبلاغۃ یوصف بہا الاخیران اے الکلام والمتکلم فقط دون المفرد۔ یقال کلام بلیغ و رجل بلیغ۔ ولم یسمع کلمۃ بلیغۃ۔ ۱۲ مطول صفحہ ۱۱۔

[2] مختصر المعانی میں ہے۔ البلاغۃ عبارۃ عن مطابقۃ الکلام الفصیح لمقتضی الحال۔ وظاہر ان اعتبار المطابقۃ وعدمہا انما یکون باعتبار المعانی والاغراض التی یصاغ لہا الکلام، لا باعتبار الالفاظ المفردۃ والکلم المجردۃ۔ ۱۲

اس سے خالی ہو۔ اگر بفرضِ محال صرف معانی کا وجود جو بغیر الفاظ کے ہو دماغِ انسانی میں پایا جائے تو بھی اُس کا مفہوم بغیر الفاظ کے دوسروں کے دلوں میں ڈالنا ناممکن ہے۔

قابل مولف کو جب بلاغت کے معنوں اور اُس کی تعریف ہی سے یہ اجنبیت ہے تو اُن کے اس قول سے کہ "مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت نہیں ہے" ہم کو ناخوش ہونیکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

بلاغت کے ایک اور خود ساختہ معنی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید جمہور کا یہ مقولہ کہ مرزا صاحب کا کلام بلیغ ہے، اس لحاظ سے ہوگا کہ اُن کے کلام میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی ہوتی ہے، اور وہ استعارات وتشبیہات وکنایات سے مزین ہوتا ہے۔ اور میر صاحب کے کلام کو اس لحاظ سے فصیح کہتے ہونگے کہ اُس میں سادگی اور صفائی نظر آتی ہے۔ غالباً مرزا صاحب کے کلام کو بلیغ کہنا بلحاظ معنیِ مصطلحِ علمِ معانی نہ ہوگا یعنی رعایتِ مقتضائے حال ومقام کیونکہ اکثر لوگ اگر اُن سے دریافت کیا جائے تو بلاغتِ اصطلاحی کے معنی اور اس کی تعریف بھی نہ جانتے ہونگے۔

ہماری رائے میں بھی یہ خیال قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ بلاغتِ اصطلاحی کے معنی جاننے کے بعد کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میر صاحب میں بلاغت کم ہے پس یہاں اگر بلاغت سے شوکتِ الفاظ وغیرہ مراد سمجھی جائے تو شاید اس معنی کے لحاظ سے مولف کو بھی مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت زیادہ ہونے سے انکار نہوگا۔ کاش اگر وہ لفظِ بلاغت کے یہ معنی سمجھ کر اس ضرب المثل کو صحیح خیال کر لیتے تو ہم کو بھی اُن سے جھگڑا کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور یہ امر اُن کے اُصول اور اعتقاد کے خلاف بھی نہ ہوتا؛ کیونکہ یہ بات اُن کو بھی تسلیم ہے کہ مرزا صاحب کے کلام

میں الفاظ کی شوکت۔ مضامین کی بلند پروازی۔ اور خیالات کی جدّت انتہا درجہ کی پائی جاتی ہی۔ لیکن وہ اس ضرب المثل کے لفظِ بلاغت کو اصطلاحی معنوں میں لیجا کر پریشانی میں پڑ گئے اور پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا۔

واقعات کا مطابق مقتضائے حال ہونا

اس کے بعد قابل مؤلف نے لکھا ہی کہ "بلاغت کا کمال یہ ہی کہ واقعاتِ کربلا کو جو مرثیہ گویوں کا موضوعِ شاعری ہی اس طرح بیان کیا جائے کہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہو اور واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے"۔ پھر اُنھوں نے مرزا صاحب مرحوم کے کلام سے دخترِ شاہِ حلب کی روایت پیش کرکے لکھا ہی کہ "یہ روایت بالکل بلاغت اور مقتضائے حال کے خلاف ہی"۔ اگرچہ رسومِ عرب اور رسومِ ہند میں بہت کچھ تفاوت ہی اور وہاں کے اکثر دستور اس ملک سے علیحدہ ہیں، مثلاً عورت اور شوہر کے تعلقات میں جن باتوں کو یہاں ناجائز اور خلافِ شرم وحیا سمجھا جاتا ہی وہاں اُن کو جائز اور روا رکھا گیا ہی؛ لیکن چونکہ مرثیہ گویوں نے تمام واقعات کو رسومِ عرب کے موافق نہیں، بلکہ رسم و رواجِ ہند کے مطابق نظم کیا ہی، اس لیے بلحاظِ رسومِ ہند اس روایت میں بین کے چند الفاظ کسی قدر نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ اصل روایت کے متعلق تو کچھ بحث کی ضرورت ہی نہیں ہی۔ کیونکہ یہ تاریخی بات ہی جس کی تنقیح سے قابل مؤلف کو کچھ غرض نہیں، رہا دخترِ شاہِ حلب کا اظہارِ غم، وہ بھی مقتضائے فطرت ہی، کیونکہ ایک مقتدر خاندان میں منسوب ہوجانے کے بعد منسوب شوہر کا اس بیکسی اور ظلم سے قتل ہوجانا ایسا دلخراش واقعہ ہی کہ اگر منسوبہ لڑکی نے زیادہ اظہارِ حزن و ملال کیا ہو تو جائے تعجب نہیں۔ البتہ چند الفاظ جنکا بین کے موقع پر استعمال کیا گیا ہی وہ بلحاظِ رسومِ ہند مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ہر زمانہ کی شاعری

جواب روایت دخترِ شاہِ حلب

سوسائٹی اور مذاقِ عام کی تابع ہوا کرتی ہے۔ مرثیہ گویوں کو اپنا کلام ہر خیال اور ہر مذاق کے لوگوں کے کانوں میں پہونچانا، اور ہر طبیعت کو محظوظ کرنا پڑتا ہے، اور علتِ غائی اور مقصودِ اصلی اُن کا رونا رُلانا ہے۔ اس مقصود کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور اس کی پابندی کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے خلافِ مزاج اور خلافِ عادت بعض واقعات مجبوراً ایسے بھی نظم کرنے پڑتے ہیں جنکو ایک سنجیدہ اور گہری نگاہ ڈالنے والا شخص حدِ اعتدال اور جادۂ معقولیت سے متجاوز سمجھے گا؛ اور یہ وہ مجبوریاں ہیں جن سے کوئی مرثیہ گو حتیٰ کہ میر صاحب مرحوم بھی باوجود اسقدر احتیاط اور فطرت وجذباتِ انسانی کی نکتہ شناسی کے محفوظ نہیں رہ سکے چنانچہ میر انیس اور دوسرے مرثیہ گویوں کے ایسے اشعار جن میں ایک رات کی بیاہی جناب کبرا کی اپنے شوہر حضرت قاسمؑ سے رخصت، اور پھر اُن کی لاش پر اُن کا نام لیکر بین اور ماتم کرنے کے حالات درج ہیں، اہلِ ہند کے قانونِ شرم وحیا سے کسی قدر متجاوز ہیں، اور بلحاظِ رسوم ہند عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مرثیہ گو جسکا مقصودِ اصلی گریہ وزاری کرانا۔ اور مضامینِ مصائب سے دلوں کو متاثر کرنا۔ اور ہر قسم اور ہر مذاق کے لوگوں کی طبیعت اور پسند کے موافق اپنے کلام کا اندازہ رکھنا ہے، ان معمولی مسامحات سے بچ نہیں سکتا۔

اس قسم کے اعتراضوں کے جواب میں جو کچھ مولانا آزاد صاحب نے لکھا ہے، وہ اس اعتراض کے فیصلے کے لیے ہی کافی ہوگا، اس لیے ہم اُن کی عبارت کو بجنسہ نقل کر دینے کے بعد اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ اعتراض حریفوں کا درست ہے کہ بعض ضعیف روایتیں اور دلخراش مضامین ایسے نظم ہو گئے ہیں جو مناسب نہ تھے، لیکن انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدِ نظر رکھ کر اُسپر متوجہ ہوتا ہے

روایتوں کے بارے میں مولانا آزاد کی رائے

تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ انہیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا جہاں ہزار ہا آدمی دوست اور دشمن جمع ہوتا تھا، تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطفِ سخن اور ایجادِ مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رولانا اور سب کے مُنہ سے تحسین کا نکلنا، اس شوق کے جذبہ اور فکرِ ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں۔ نکتہ چینی ایک چھوٹی سی بات ہے، جہاں چاہا دو حرف لکھ دیئے۔ جب انسان تمام عمر اسی میں کھپا دے تب معلوم ہوتا ہے کہ کتنا کہا اور کیسا کہا"[1]

اس کے بعد لائق مؤلف لکھتے ہیں کہ مرثیوں میں جو مضامین قدرِ مشترک کے طور پر ہیں وہ یہ ہیں۔ آمادگیِ سفر۔ راہ کی تکالیف۔ اور صعوبتیں الخ۔ چنانچہ سفر کی طیاری کے متعلق بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ سفر کے وقت جو جو واقعات اور حالات پیش آتے ہیں اُن کی تصویر کھینچی جائے۔ سفر کی آمادگی۔ سواریوں کی تقسیم۔ زادِ سفر کا انتظام، دوست احباب کے وداعی جذبات۔ بہائی بہنوں اور عزیزوں کی گریہ وزاری وغیرہ وغیرہ۔

(۲) دو حریفوں کی لڑائی میں یہ واقعات بیان کیے جائیں۔ دونوں کے سراپا۔ ڈیل ڈول۔ اسلحۂ جنگ کے سجنے کا نقشہ۔ دونوں نے فنِ جنگ میں کیا کیا ہنر دکھائے وغیرہ وغیرہ۔

مگر مولف نے اس موقع پر مثالیں اسوجہ سے قلم انداز کر دی ہیں کہ آگے چلکر واقعہ نگاری اور اظہارِ جذبات وغیرہ کے عنوانوں میں جو مثالیں آئیں گی وہی بلاغت کے لیے بھی کافی ہونگی۔ لہذا ہم بھی مرزا دبیر صاحب کے کلام سے ان واقعات کی مثالیں یہاں قلم انداز کرتے ہیں۔ ناظرین ہماری کتاب میں بھی ان مثالوں کو اُسی موقع پر ملاحظہ فرمائیں

---

[1] آبِ حیات صفحہ ۵۰۲

جہاں مؤلف نے میر صاحب کے کلام سے اس قسم کی مثالیں تحریر کی ہیں۔

(۳) پھر لائق مولف لکھتے ہیں کہ "واقعات کے بیان میں جس رتبہ اور درجہ، اور جس سنّ و سال کے لوگوں کا ذکر آئے اُسی قسم کے طرزِ خیال اور طریقِ ادا کو ملحوظ رکھا جائے بوڑھے۔ بچّے۔ جوان۔ مرد عورت۔ کنواری۔ بیوہ۔ آقا غلام۔ نوکر چاکر۔ غرض جس کی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اُس کی زبان اور طرزِ خیال کی تمام خصوصیتوں کو قائم رکھا جائے"۔ اس کے بعد میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے کلام سے ان موقعوں کی بہت سی نادر مثالیں درج کی ہیں جو میر صاحب مرحوم نے نہایت خوبی سے نظم فرمائی ہیں۔ لہذا اس موقع پر ہم بھی مرزا صاحب کے فصیح و بلیغ کلام سے چند نفیس نظیریں پیش کیے دیتے ہیں۔

مثلاً حضرت امام حسینؑ کے سفر کے وقت حضرت عباسؑ کی والدہ امام علیہ السّلام کو سفر سے روکتی ہیں۔ ؎

حضرت سے کہا مادرِ عباسؑ نے اُس دم
جیسے گئے اب، جیسے گئے بعدِ محرّم
واری گئی گر قصد ہے کوفے کا مصمّم
دیکھو تو میں واری، کہ ہے کیا گرمی کا عالم

رخصت کرو قاسمؑ کو نہ ہم شکلِ نبیؐ کو
صدقے گئی تم بھیج دو عباسؑ علیؑ کو

امِّ سلمہؓ بھی یہی رو رو کے پکاری
ضربت سرِ حیدرؑ پہ لگی تھی وہیں کاری
کوفے میں تو جانا ہی مناسب نہیں واری
آخر وہی کوفہ ہے، وہی خلق ہے ساری

بن جائیگا سب کام یہیں حق کی مدد سے
صدقے گئی تم جاؤ نہ نانا کی لحد سے

یا مثلاً جب امام حسینؑ اپنی صاحبزادی حضرت صغرٰؑ کو سفر میں لیجانے سے انکار کرتے ہیں تو وہ حضرت علی اکبرؑ سے سفارش کی خواستگار ہیں۔ ؎

آئے علی اکبرؑ تو پکاری وہ دل افگار
پیاری تھی سکینہؑ چلی ہمراہِ علمدار
دعوے ہی ہمیں تم پہ گواہ اس کا ہی غفار
لیچلتے ہو بھیا ہمیں یا کرتے ہو انکار؟

گر بابی سکینہؑ علی اصغرؑ کی بہن ہے
صغرٰؑ کو یہ ہے فخر کہ اکبرؑ کی بہن ہے

یا مثلاً جب حضرت صغرٰؑ کو سفر میں ساتھ جانے سے مایوسی ہوئی تو وہ حالتِ اضطراب میں اپنے بزرگوں کی شکایت کرتی ہیں کہ سب کو دوسرے بہن بھائیوں سے الفت ہی مگر اُن کی محبت کسی کے دل میں نہیں۔ ؎

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبرؑ کا ہیں بابا طیّار
بھیّا اصغرؑ کو لیے ہوگئیں امّاں بھی سوار
یہ نہ جانا ہے مرے دم سے لگی اِک بیمار
روکے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو ٹھہرو، مجھے آلینے دو
بھیّا اصغرؑ کو کلیجے سے لگا لینے دو

مجکو الفت ہی تمھاری تمھیں اُلفت ہی نہیں
ساتھ دوڑوں جو سواری کے سو طاقت ہی نہیں
اماں لیں گود میں، ایسی مری قسمت ہی نہیں
پیار آجائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں

لونڈیاں ساتھ چلیں آج عزیزوں کی طرح
میں جو بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح

پھر اپنے مرض کی شدت یاد دلا کر کہتی ہیں کہ اس نازک حالت میں مجکو تنہا چھوڑ جانا کسقدر نامناسب ہے ایسی حالت میں تو غیر بھی پاس سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے۔ ؎

ایک بیک میرے مقدّر کا بگڑنا دیکھو
پاؤں پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
بات کرنے میں ذرا سانس اُکھڑنا دیکھو
حال یہ، اُس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہے بیٹی کو اسوقت میں بابا چھوڑیں

ہائے اب میں ہوں یہ تنہائی ہے اور سونا گھر
نہ خبر مجکو تمھاری، نہ تمھیں میری خبر
دل کے بہلانے کو تم سب کے ہیں بھیّا اصغرؑ
خالی جھولے سے میں ٹکراؤں گی یاں اپنا سر

الفتیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی
ہائے اللہ! مری موت کو کیوں دیر ہوئی

درد سر۔ سوزشِ دل۔ رنجِ بخار ایک طرف
اور یہ ہجرِ شہِ عرش وقار ایک طرف
سو علاج ایک طرف، آپ کا پیار ایک طرف
لاکھ چین ایک طرف، شہ کا کنار ایک طرف

گر قضا ہے تو فراقِ شہِ ابرار سے ہے
گر شفا ہے تو اسی شربتِ دیدار سے ہے

دوسرے مرثیہ میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ حضرت صغراؑ سے رخصت ہو کر چلے ہیں تو کچھ دیر کے بعد وہ پھر بیقرار ہو کر محملوں کے پیچھے دوڑی آئیں اُسوقت حضرت شہر بانوؑ کس مادرانہ محبت کے انداز سے اُن کو رخصت کرتی ہیں

بانوئے حزیں پردہ اُلٹ کر یہ پکاری
تکلیف نہ کر اے مری بی بی مری پیاری
تھرّاتے ہوئے پاؤں سے آنکھے میں وارے
جا گھر کو، تجھے صبر دے اب ایزدِ باری

اب ننھا سا سجّادہ بقیعہ میں بچھا کر
زہراؑ کے مسافر کے لیے حق سے دعا کر

یا مثلاً حضرت علی اصغرؑ کے پیاس سے جاں بلب ہونیکے وقت، اُن کی ماں کی مضطربانہ حالت کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے ؎

بالوں کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے
بچے کی نبض دیکھ کے، ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے، نہ پانی کے ملنے کی آس ہے
پھرتی ہے آس پاس، یہ جینے سے یاس ہے

کہتی ہے کیا کروں میں دُہائی حسینؑ کی
پتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی

اب کس کی بامراد بڑھاؤں گی ہنسلیاں
ہے ہے، کرخت ہوگئیں یہ نرم اُنگلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پتلیاں
لے لیکے اُلٹی سانس گراتے ہیں بجلیاں

باقی حواس پیاس سے معصوم کے نہیں
مُنہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

مگر جب امام حسینؑ کے آنے سے اُن کو افاقہ ہوگیا تو ماں کس طرح اپنی مسرت کا اظہار کرتی ہیں۔ مستورات کی طرزِ گفتگو اور اظہارِ خیالات پر بھی غور کرو ؎

ہاتوں پہ لے چلے جو اُسے شاہِ اتقیا
بالوں پکاری لونڈی کو صاحب جلا لیا
سیدانیوں کے پاؤں پہ پھر سر کو رکھ دیا
بولی خدا نے سب کی دعا سے کرم کیا

لب پر تبسم آنکھوں سے شہ کے نظارے ہیں
ہم تم کو کوئی نہیں، انہیں بابا ہی پیارے ہیں

یا مثلاً امام حسینؑ کی رخصت کے وقت جناب زینبؑ فرماتی ہیں ؎

اماں ہیں میرے سر پہ، نہ سایا ہے باپ کا
بھائی! فقط بہن کو بھروسا ہے آپ کا

یا مثلاً جب امام حسینؑ کربلا میں پہونچے تو حضرت زینبؑ اُس مقام کی وحشت

اور گرمی سے گھبرا کر فرماتی ہیں ؎

زینبؑ حسینؑ کے لیے ہو ہو کے بیقرار
کہتی تھی ڈھال روک لو مُنہ پر، بہن نثار

گرمی غضب ہی، باگ اُٹھائے ہوئے چلو
اکبرؑ کو بھی سپر میں چھپائے ہوئے چلو

یا مثلاً جب امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو علم دیا ہی تو حضرت زینبؑ خوش ہو کر اُن کی شان و شوکت کی ثنا کرتے ہوئے دونوں بھائیوں کو دعا دیتی ہیں ؎

زینبؑ پکاری شاہِ نجف یاد آتے ہیں
کس شان سے علم لیے عباسؑ جاتے ہیں

یارب، نشان والے کا نام و نشاں رہے
یہ شمس بے زوال، یہ گُل بے خزاں رہے
لشکر رہے، حسینؑ رہے، یہ نشاں رہے
اس حاملِ علم پہ علیؑ کی اماں رہے

روشن رہے قمر شہِ بدر و حُنین کا
وہ خاک میں ملے جو ہو دشمن حسینؑ کا

یا مثلاً حضرت زینبؑ اپنے صاحبزادوں پر خفا ہوتی ہیں کہ اُنھوں نے حصولِ شہادت میں کیوں اسقدر تاخیر کی، تو اُن کی محبت آمیز خفگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہی ؎

کس دن کے لیے سیکھا ہی نیزوں کا ہلانا
گر آج ہی بھالا کسی شامی پہ نہ تانا
کیا بھول گئے تیر کا تو دے پہ لگانا
ماموں کے حریفوں کا کرو آج نشانا

چو رنگ لگاتے تھے ہر اک روز وطن میں
اِک دو کو بھی چو رنگ نہ تم نے کیا رن میں

کیا پوچھوں میں اکبرؑ کو بلا کر کہ یہ کیا ہے
شاگردوں کو اپنے یہی تعلیم کیا ہے

بابا کو تمھارے لکھوں، کیا قہر کی جا ہے
صاحب کے پسر جیتے ہیں حُرؑ قتل ہوا ہے

اولاد سے گر چرخ یونہی شاد کرے گا
کاہے کو کوئی خواہشِ اولاد کرے گا

یا مثلاً جب یزید کی بیوی ہند زندانِ شام میں اہلِ حرم کے دیکھنے کو روانہ ہوئی ہے تو لونڈیوں اور پیش خدمتوں کی خوشامدانہ تقریر کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

منّت ہے خواصوں کی کہ چادر کو سنبھالو
یہ رستہ ہے، چہرہ کو برقع میں چھپا لو
وہ کہتی ہے اب ذکر نہ پردے کا نکالو
چادر کے عوض خاک مرے چہرے پہ ڈالو

کیونکر نہ زمانہ اُسے ان حالوں سے دیکھے
جو خواب میں زہراؑ کو کھلے بالوں سے دیکھے

پھر لونڈیاں باضطراب قید خانہ کی طرف جاتی ہیں اور خوف کے مارے پلٹ کر ہند کو وہاں جانے سے اس طرح منع کرتی ہیں ؎

باندھے ہوئے دامن کو کنیزیں کئی ہشیار
بڑھ بڑھ کے خبر دیتی ہیں زندان کی ہر بار
کہتی ہیں کہ اے بی بی قیامت کے ہیں آثار
ہی ہی موے بے موت یہ زنداں کے گرفتار

در بند ہے، دم رُکتا ہے، بیہوش پڑے ہیں
تلواریں نکالے ہوئے دربان کھڑے ہیں

بیرونِ خرابہ کئی سر نیزوں پہ ہیں آہ
کوئی ہے ستارہ، کوئی خورشید، کوئی ماہ
روتی ہیں جو بیویں تو وہ تھرّاتے ہیں واللہ
گھر پھر چلو، تم دیکھو نہ یہ صدمۂ جانکاہ

جب ہائے حسینا کوئی مظلومہ کہے گی
اے توبہ! تمھیں سننے کی کب تاب رہے گی

ان بندوں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ لونڈیاں کسی حیلہ اور ترکیب سے ہند کو قید خانہ میں جانے سے روکنا چاہتی ہیں۔ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے کئی تدبیریں کیں۔ پہلے تو یہ کہا کہ بی بی قید خانہ میں تو قیامت کے آثار ہیں، در بند ہے، جانے سے دم رُکتا ہے، دروازہ پر خوفناک تلواریں لیے ہوئے دربان پہرہ دے رہے ہیں، پھر یہ کہ قید خانے کے باہر بہت سے سر نیزوں پر لٹکے ہوئے ہیں، بھلا یہ عبرت ناک سین تم سے دیکھا جائیگا؟ پھر یہ کہ عورتیں دلخراش بین کر رہی ہیں۔ یہ آہ و زاری سُننے کی تم کو کب تاب ہوگی!

مگر ہند نہیں مانتی اور زنداں کی طرف برابر قدم اُٹھائے چلی جاتی ہے۔ نہ پردے کا خیال ہے نہ عزت و حشمت کا دھیان۔ جب قید خانے کے قریب پہونچی تو لونڈیوں نے زیادہ اصرار کیا کہ اب قید خانہ قریب آگیا، دربان دروازہ پر موجود ہیں، اب بے پردہ رہنا بالکل غضب ہے۔ چنانچہ اس خوشامدانہ تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

پہونچی درِ زنداں کے برابر جو سواری	تب ہند کے قدموں پہ گریں لونڈیاں ساری
بولیں کہ ردا اوڑھ لو، ہم آپ پہ واری	کل ہم پہ نہ حاکم کا غضب ہو کہیں طاری

دربان تمھیں دیکھ کے کیا دلمیں کہیں گے
ہمچشموں کے بی بی پہ سدا طعنے رہیں گے

یہ مجمع زنداں کے قریب پہونچا تو حضرت علی اکبرؑ کے سر کے شکوہ اور تجمل کو دیکھ کر لونڈیاں دنگ رہ گئیں اور حیرت ناک لہجہ میں کنیزانہ ادب کے ساتھ دریافت کرتی ہیں ؎

کوئی سرِ اکبرؑ پہ نظر کرکے پکاری	بی بی! یہ پیمبرؐ تو نہیں؟ میں ترے واری
ہمشکلِ نبیؐ کہتی ہے خلقت اسے ساری	آگے تو مدینے میں سکونت تھی تمھاری

پہچانو تو، ہمشکلِ نبیؐ ہے، کہ نبیؐ ہے؟
یہ اور کوئی ہے کہ رسولِؐ عربی ہے؟

دیکھو ان اشعار میں کنیزوں کی ناواقفیت، اور جہالت کی، جو اُن کی فطرت میں داخل ہے، کس بلاغت کے ساتھ تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ باوجودیکہ خود کہتی ہیں کہ لوگ حضرت علی اکبرؑ کو ہمشکلِ نبیؐ کہتے ہیں نہ نبیؐ اس پر بھی اُن کو لوگوں کے کہنے کا یقین نہیں اور ہند سے دریافت کرتی ہیں کہ یہ ہمشکلِ نبیؐ ہے یا خود رسولِ عربی؟ یعنی اس بے خبر فرقے کو یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ کس زمانے میں تھے اور کب رحلت فرمائی۔ یہ شام کے جاہل لوگوں کے خیالات کا حقیقت میں اصلی اور سچا نقشہ ہے جسکی تاریخیں بھی شاہد ہیں۔

جب ہند قید خانے کے دروازے پر پہونچی تو دربانوں سے دروازہ کھولنے کو کہا اُسوقت ؎

دربان پکارے کہ ہے انکار ہمیں کیا
پر آپ کی تکلیف کا ہے دھیان سراپا

کل دیکھیو بُلوا کے محل میں انہیں دن کو
اِک رسّی میں ہم باندھ کے لے آئینگے ان کو

غور کرو دربانوں کی خوشامدانہ فطرت کا کس طرح اظہار کیا ہے اور اسی ضمن میں یہ تحقیرانہ فقرہ کسقدر دلخراش ہے کہ آپ قید خانے میں جانے کی کیوں تکلیف اُٹھاتی ہیں۔ کل انکو محل ہی میں دیکھ لینا، ہم سب کو ایک رسّی میں باندھکر حضور میں پیش کر دینگے۔

مگر جب ہند نے نہ مانا تو دربانوں نے اس خیال سے کہ بادشاہِ وقت کی بی بی کا کسی مرد سے سامنا نہو، لونڈیوں سے فرمائش کی ؎

	جو مرد ہو باہر اُسے زنداں سے نکالو بچّوں کو بھی گودی سے اسیروں کی اُٹھالو	

پردہ کے اہتمام میں خوشامدانہ مبالغہ کی کسقدر انتہا ہی "بچّوں کو بھی گودی سے اسیروں کی اُٹھالو" دنیوی بادشاہوں کے محلات میں جو نمائشی اہتمام ہوتا ہی اُس کی کیسی صحیح اور سچّی تصویر ہے۔

مرزا صاحب کی طرح میر صاحب نے بھی ایک ایسے ہی موقع پر پردہ کے اہتمام، اور دربانوں کی تحقیرانہ فرمائش کا سماں باندھا ہی۔ یعنی دربانوں نے اس خیال سے کہ قید خانہ میں امام زین العابدینؑ بھی ہیں اور وہ نامحرم ہیں، اہلِ حرم کی طرف مخاطب ہو کر کہا ہے۔ ؎

یا تو بیمار کی آنکھیں اُسرا بند کریں		یا ہم آکر کسی حجرہ میں جُدا بند کریں

ترکیب کی ساخت، الفاظ کی روانی۔ اور بحر کی چستی نے میر صاحب کے شعر کو بلند کر دیا ہی، لیکن معنی کی بلاغت مرزا صاحب کے پُر مضمون شعر میں نہایت خوبی کے ساتھ پائی جاتی ہی۔ چنانچہ تحقیر و تذلیل کا دلخراش پیرایہ بھی اُسی میں زیادہ ہی، کیونکہ امام زین العابدینؑ کی آنکھیں بند کرنے، یا اُن کو کسی حجرہ میں جُدا بند کرنے کی بہ نسبت، زنداں ہی سے باہر نکال دینے کی فرمائش میں تحقیر کا پہلو زیادہ پایا جاتا ہی۔ اس کے علاوہ پردہ کے اہتمام میں دربانوں کا جھوٹا اور نمائشی مبالغہ بھی مرزا صاحب کے شعر میں موجود ہی جو میر صاحب کے ہاں بالکل نہیں، کیونکہ اُنھوں نے پردہ کے اہتمام کا یہ پہلو رکھا ہی کہ دربانوں نے حضرت زین العابدینؑ کو جو بالغ اور نامحرم ہیں حاکمِ وقت کی بیوی کے سامنے سے ہٹانا چاہا ہی جو ایک معمولی بات ہی نہ اس میں کوئی خوشامد ہی نہ مبالغہ، کیونکہ بالغ مردوں کو

عورتوں کے سامنے سے علیحدہ کرہی دیا کرتے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب نے یہ اظہار کیا ہی کہ دربان نہ صرف مردوں کو علیحدہ کرتے ہیں بلکہ اُنھوں نے بچّوں کو بھی گودیوں سے اُٹھا لینا چاہا ہی۔ جو انتہا درجہ کی جھوٹی خوشامد اور حد سے زیادہ نمائشی مبالغہ ہے اور صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُنکے جادو نگار قلم نے پردہ کے اہتمام میں دربانوں کی خوشامدانہ فطرت کی کیسی سچّی اور اصلی تصویر کھینچدی ہی۔

یا مثلاً حضرت قاسمؑ میدانِ جنگ کو جاتے ہیں تو جناب سکینہؑ دامن تھام کر روکتی ہیں، چنانچہ اُن کے صغرسن کے لحاظ سے روکنے اور منع کرنے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہی۔ ؎

بنتِ شبیرؑ نے رونے سے جو فرصت پائی	کہا قاسمؑ سے کہ ہر جاتے ہو دولھا بھائی؟
نیگ مہدی کا بھی دو کنگنے کی بھی بندھوائی	چلو گھر میں، کہ ہی بیہوش مری ماں جائی

آہ و زاری کا بھی کچھ دھیان نہیں لاتے ہو
چھوڑ کر تم مری خواہر کو کہاں جاتے ہو؟

عقد کی صبح دُلہن کو کوئی رُلواتا ہے؟	ساس کے گھر سے کوئی روٹھ کے یوں جاتا ہی
کوئی اس طرح عزیزوں پہ غضب ڈھاتا ہی	اماں روتی ہیں، یہ بھائی تمھیں خوش آتا ہی؟

کیا ہوا گو کہ بلند آہ نہیں ہوتی ہے
چلکے تم دیکھ لو، گھونگٹ میں دُلہن روتی ہے

یا مثلاً جب ہند قید خانے میں آئی ہی تو اُس کی بیٹی بھی ہمراہ تھی۔ وہ جناب سکینہؑ کو اپنا ہمسن پاکر اُنکے پاس گئی، اُسوقت دونوں کی طفلانہ طرزِ گفتگو، اور اظہارِ خیالات کو کس انداز سے ادا کیا ہی۔ چھوٹے بچّے جب اپنے ہم عمروں سے ملتے ہیں تو ایسے موقعوں پر

آپس میں جس قسم کی گفتگو کیا کرتے ہیں اُس کی بعینہ تصویر کھینچ دی ہے۔ اسکے ساتھ ہی زبان کی صفائی پر بھی غور کرو۔ ؎

زینبؑ تو بیاں کرتی تھی یہ ہند سے رو کر
تھی پاس سکینہؑ کے کھڑی ہند کی دختر
کہتی تھی بہن آتا ہے رونا مجھے تجھ پر
کُرتا ہی پھٹا سی نہیں دیتیں تمھیں مادر

ہم غیروں کے دل پر ترے نالوں کا اثر ہے
اللہ، تری ماں کا بھی کیا سخت جگر ہے!!

بھنیا! مری ماں تو مجھے کرتی ہے بہت پیار
پوشاک بھی اک دن میں بدلتی ہے کئی بار
ماں تیری عجب ہے، جو ہے اس دُکھ کی روادار
کنگھی بھی ترے بالوں میں کرتی نہیں زنہار

صورت تو ہے واللہ بہت آپ کی پیاری
تم ماں کی بہت پیاری ہو یا باپ کی پیاری؟

تب اک نفسِ سرد سکینہؑ نے بھرا آہ
فرمایا میں کیا حال سے اپنے کروں آگاہ
تم ماں کی ہو پیاری تو مبارک کرے اللہ
ہم دُکھ میں ہیں کیا چاہیئے ہم کو حشم و جاہ

تم خلعتِ زر پہنو کہ آرام ہے تم کو
کُرتا جو پھٹا ہے مرا کیا کام ہے تم کو

ماں باپ کو اپنے تو کبھی ہم بھی تھے پیارے
بابا تھے، برادر تھے، چچا بھی تھے ہمارے
سارے یہ مرے چاہنے والے گئے مارے
تم خوش ہو کہ ماں باپ سلامت ہیں تمھارے

راحت سے ہمیں کام نہ سونے سے غرض ہے
زنداں کے گرفتاروں کو رونے سے غرض ہے

کُرتا ہی نہیں چاک جگر بھی ہے مرا چاک
گھر لُٹ گیا، اسباب جلا، چھن گئی پوشاک

بابا نہیں، جو گرد مرے مُنہ سے کرے پاک
ماں اپنے ہی دُکھ میں ہے، مری غور کرے خاک

تم ہم سے نہ بولو کہ دل افگار ہیں بی بی
ہم سب ترے بابا کے گنہگار ہیں بی بی

دل ہند کی بیٹی کا اُمنڈ آیا یہ سُن کر
اور باندھ کے ہاتوں کو کہا، چل تو مرے گھر
پوشاک پہناؤں میں ضیافت کروں خواہر
وہ بولی یہی گھر ہے ہمارے لیے بہتر

زندان میں رہنے دے ہمیں یا دیدہ پر میں
کیا جاؤں پھٹے کرتے سے بہنیا ترے گھر میں

یا مثلاً حضرت عباسؑ جب فوج میں گھر گئے تو جناب سکینہؑ اس خیال سے کہ وہی اُن کی شہادت کا باعث ہوئیں، سراسیمہ ہو کر اظہارِ ملال کرتی ہیں اور بچپن کے انداز سے اُن کو میدانِ جنگ سے بُلا لینے کی تدبیر بتاتی ہیں ؎

شرما کے یہ کہنے لگی وہ نازوں کی پالی
ہَے ہَے یہ بَلا میں نے چچا جان پہ ڈالی
قربان ہوئی نہر پہ میں بھیجنے والی
اللہ نہ ٹوٹے کمرِ سیّدِ عالی

جس وقت بلائیں میں چچا جان کی لونگی
یہ بالیاں کانوں کی تری راہ میں دونگی

ہے ہے کہیں اس ظلم و ستم کا ہے ٹھکانا
سقّے پہ سُنا ہے کہیں تلوار اُٹھانا
کوئی بھی روا رکھتا ہے سیّد کا ستانا
جائز ہے کسی پیاسے سے پانی کا چھپانا

ہفتم سے غذا کھائی ہے نے پانی پیا ہے
بیرحموں نے کس دُکھ میں ہمیں ڈال دیا ہے

اچھی مری اماں، مرے سقّہ کو بلاؤ
کہدو کہ سکینہؑ ہوئی آخر ادھر آؤ

اب پانی نہیں چاہیے تابوت منگاؤ
کاندھے سے رکھو مشک جنازہ کو اُٹھاؤ

ملنے مری میّت کے گلے آئینگے عباسؑ
یہ سُنتے ہی گھبرا کے چلے آئینگے عباسؑ

یا مثلاً جب دشمنوں نے جھوٹی خبر اُڑائی کہ حضرت عباسؑ ہم سے مِل گئے اور یہ خبر بچّوں نے بھی سُنی، تو اُنکے طفلانہ خیالات اور بچپنے کی گفتگو کو کس پیرائے میں ادا کیا ہے۔ ؎

سُنکر یہ سخن حضرتِ عبّاسؑ کا دلدار
لپٹا شہِ مظلوم کی گردن سے بس اکبار
پھر بیٹھ کے زانو پہ یہ کرنے لگا گفتار
اے اماں، نہ بابا سے تم اب بولیو زنہار

ہم آج سے بابا شہِ والا کو کہیں گے
وہ جائیں کہیں، ہم تو چچا پاس رہیں گے

گھبرا کے سکینہؑ نے کہا اے شہِ ذیشاں
بتلاؤ تو، کیوں چھوڑتے ہیں ہمکو چچا جاں؟
کیا کچھ مری سقّائی سے آزردہ ہیں اس آں
میں اُن کو منا لاتی ہوں جا کر سوے میداں

میں رونے لگونگی تو کہاں جائینگے عبّاسؑ
اُنگلی جو پکڑ لونگی چلے آئیں گے عبّاسؑ

پھر جب حضرت عبّاسؑ کی بیوی نے اُن کو امام حسینؑ کی طرف سے جنگ کرتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو کر اہلِ حرم سے اس طرح بیان کرتی ہیں ؎

دیکھو تو کہ یہ زخم ہیں کس شوق سے کھاتے
اور مشک سکینہؑ کی ہیں تیرونسے بچاتے
پایا ہی جو پانی تو ہیں ہنستے ہوئے آتے
اسوقت ستمگر نہیں کچھ دھوم مچاتے

اک دوش پہ مشکیزہ ہی اور اک پہ نشاں ہی

خلعت وہ مدینے کی حکومت کا کہاں ہے

اب جا کے یہ مژدہ کوئی پیاسوں کو سناؤ
معصوم سکینہؑ ہی کہاں، اُس کو بلاؤ

اے بی ہوا آغوش میں بچوں کو لے آؤ
عموں کی سواری کا تماشا تو دکھاؤ

پانی مرے والی نے جو تدبیر سے پایا
یہ پیاسی سکینہؑ ہی کی تقدیر سے پایا

جناب حسنینؑ ماں سے لباسِ عید مانگتے ہیں۔ اُن کی طفلانہ ہٹ کی تصویر ہے

بیٹوں نے عرض کی کہ بجائے فلک جناب
پر بے لباس عید کو ہو گا بہت حجاب

ہم خادموں پہ آپ کی شفقت ہی بیحساب
اب تو جہاں سے جانو، مہیا کرو شتاب

دعوے ہیں فدویوں کو تمھارے بڑے بڑے
لینگے اسی گھڑی نئے کپڑے کھڑے کھڑے

اماں! لباسِ عید منگا دو ابھی ابھی
کیا جائیں ہم، کہیں سے منگا دو ابھی ابھی

تیار ہوں تو لا کے دکھا دو ابھی ابھی
رکھ کر سرہانے سوئیں گے لا دو ابھی ابھی

سرتاجِ اوصیائے سلف کے پسر ہیں ہم
آ پہونچی سر پہ عید بھی اور ننگے سر ہیں ہم

یا مثلاً جب حضرت علی اکبرؑ نے ماں باپ سے اجازت لیکر میدانِ جنگ کا قصد ظاہر کیا اور یہ خبر حضرت زینبؑ کو بھی مل گئی تو اُن کو ملال ہوا کہ بغیر میری مرضی کے ماں باپ نے رخصت دیدی ہے۔ اُسوقت اُن کی حالت اور گفتگو لکھی ہے۔

اکبرؑ کے سُنانے کو یہ کہتی تھی زباں سے
جو کام کیا، پونچھ کے مجھ سوختہ جاں سے

اے عونؑ و محمدؑ تمھیں لاؤں میں کہاں سے
اب قدر ہوئی پیاروں کی جب چھٹ گئے ماں سے

کیا جان کے دم بھرتی تھی ہمشکلِ نبیؐ کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

پھر بانوؑ کے پاس آ کے یہ فرمایا بہ رقّت
لو بھابی یہ ملبوس، یہ اکبرؑ کی امانت
بچپن کے بھی کُرتے ہیں، جوانی کے بھی خلعت
اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت

تم والدہ ان کی ہو، پدر سر دردیں ہیں
یہ آج کھُلا ہم کوئی اکبرؑ کے نہیں ہیں

پھر رونے لگی بیٹھ کے واں زینبؑ ناچار
ہمشکلِ نبیؐ لپٹے یہ کہتے ہوئے اکبار
میری پھوپی اماں، مری مالک مری مختار
میں تو ہوں غلام آپ کا کیوں آپ ہیں بیزار

ہم چاہتے ہیں۔ تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ، اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو
دم رُکتا ہے باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو
ماں بیٹھی ہے وہ، جاؤ گلے اُس کو لگا لو
بانوؑ کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو

میں پیار نہیں کرتی، میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ میں تمھاری پھوپی اماں نہیں ہوتی

جیتی رہیں بھابی وہ ہیں حقدار تمھاری
میں کاہے کو ہونے لگی مختار تمھاری
جاؤ نہ، سواری تو ہے تیار تمھاری
اٹھارہ برس کی ہوں پرستار تمھاری

کس سے کہوں، کیا خونِ جگر پیتی ہوں ہے ہے
دل پر تو چھری چل گئی اور جیتی ہوں ہے ہے

حضرت علی اکبرؑ کو جناب زینبؑ نے پالا تھا اور وہ اُن کو اپنے بچّوں سے زیادہ

چاہتی تھیں۔ چونکہ اُن کو یقین تھا کہ پھوپی سے اجازت ملنا بہت مشکل ہے، اس لیے پہلے ماں باپ سے اجازت حاصل کی تاکہ پھر پھوپی سے اجازت حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ مگر حضرت زینبؑ کو پہلے ہی سے علم ہوگیا اور ناراض ہوئیں کہ سب نے بغیر میری اجازت کے کیوں رخصت دیدی۔ اُن کی طعن آمیز تقریر کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

یا مثلاً جب وقتِ سفر حضرتِ زینبؑ کے صاحبزادے اپنے والد سے جنگ کا اجازت نامہ لکھواتے رہ گئے اور قافلہ روانہ ہوگیا تو حضرت زینبؑ کو تردد اور قلق ہوا کہ لڑکے کیوں ہمراہ نہ آئے۔ اتنے میں بچوں نے آکر سلام کیا۔ ماں اظہارِ ناخوشی فرماتی ہیں۔ ؎

بدلی میں چمکتے ہوئے دو چاند برابر پہونچے جو قریبِ شترِ دخترِ حیدرؑ	گھوڑوں کو لگائے ہوئے پوئی سوئے لشکر کی عرض، ہم آداب بجا لاتے ہیں مادر

غصے میں بھری بیٹھی تھی روٹھی زینبؑ
چلائی کہ ماں کاہے کو ہونے لگی زینبؑ

کیا کام تھا، کیوں آئے یہاں کس لیے آئے جاؤ وہیں سائے میں پدر تم کو بٹھائے	کچھ اب تو بہت باپ سے اخلاص بڑھائے یاں چلتی ہی لوں پھول سا منہ تو نہ جائے

گرمی کے سفر کا تمھیں اندیشہ ہی غم ہے
سچ بھی ہی کہ سن اصغرِ شش ماہہ سے کم ہے

یا مثلاً جب جناب سکینہؑ کو پیاس سے غش آگیا تو حضرت عباسؑ کی بیوی نے اپنے چھوٹے بچہ کو اُن کے بلانے کے لیے بھیجا، وہ جاکر کس طرز و طریقہ سے باپ کو اپنی ماں کا پیام

پہونچاتا ہے ؎

عبّاسؑ کی نعلین پہ سر اُس نے جھکایا
کی عرض کہ بابا چلو، اماں نے بُلایا
غازی نے کہا، شور یہ کیوں سب نے مچایا
بولا وہ تڑپ کر کہ سکینہؑ کو غش آیا

سانس اُلٹے بہن لیتی ہے، گردن بھی ڈھلی ہے
قرآں کی ہوا دینے سے کچھ آنکھ کھلی ہے

شہزادی کے تلوے کبھی سہلاتی ہیں اماں
بہنیا کی برابر کبھی غش کھاتی ہیں اماں
نبض اُن کی کبھی دیکھ کے گھبراتی ہیں اماں
آ آ کے درِ خیمہ پہ پھر جاتی ہیں اماں

پیغام دیا ہے یہ تمھیں غصّے میں آکر
کیوں مجکو سبک کرتے ہو پردیس میں لاکر

لی خوب سکینہؑ کی خبر رنج و محن میں
کہہ آئے تھے کیا والدہ صاحب سے وطن میں؟
اب نام لہو کا نہیں پیاسی کے بدن میں
سقّائی کا وقت آیا ہے، کیا کرتے ہو نہیں؟

ہے ہے یہ تغافل تو کچھ اچھا نہیں صاحب
مرتی ہے بھتیجی، تمھیں پروا نہیں صاحب

جب حضرت عبّاسؑ خیمہ میں آئے تو اُن کی بیوی کس طرح اظہار ناراضی کرتی ہیں ؎

عبّاسؑ کی زوجہ نے کہا پیٹ کے سر کو
اسوقت بھی کیوں آئے سکینہؑ کی خبر کو
اللہ، یہ صاحب نے کیا سخت جگر کو
ہے ہے میں خجالت سے نکل جاؤں کدھر کو

دیکھو جگرِ شاہِ مدینہ کا تڑپنا
زہراؑ کا تڑپنا ہے سکینہؑ کا تڑپنا

یا مثلاً جب جنابِ سکینہؑ نے سُنا کہ چچا مشک بھر کر آرہے ہیں تو وہ غصہ کے

کاندھے پر چڑھ کر اُن کو دیکھتی ہیں اُسوقت اُن کی باتوں کو کس انداز سے ادا کیا ہے ؎

نادان نے قبلے کی طرف ٹوپی اُتاری
فضہ سے کہا کاندھے پہ بٹھلائے میں واری
دریا سے چچا جان کی آتی ہے سواری
دیکھیں تو کہاں دوش پہ ہے مشک ہماری

ارمان ہے جو جو وہ قدم گھر کو اُٹھائیں
ہم اپنے چچا جان کی لیں بلائیں سے بلائیں

یا مثلاً حضرت اُمّ سلمہؑ جناب صغراؑ کو سمجھا رہی ہیں ؎

اُمّ سلمہ کہتی تھی ہے ہے میں کدھر جاؤں
پردیس سے شبیرؑ کو کس طرح سے لے آؤں
صغراؑ ترا یہ حال ہے کس طرح نہ سمجھاؤں
اے بیٹی تو فاقہ کرے اور کھانے کو میں کھاؤں

تو غم سے گھلی جاتی ہے کیونکر نہ حزیں ہوں
آخر کو میں نانی ہوں کوئی غیر نہیں ہوں

اس کے بعد مؤلف نے بلاغت کے ایک نازک موقع کی بحث کی ہے "یعنی جہاں حریفِ مخالف کا ذکر کرنا ہوتا ہے۔ دشمن کو اگر حقیر و ذلیل ثابت کیا جائے تو مقابلہ میں فتحمندی کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے اور شان و شوکت دکھائی جائے تو مذہبی خیال کے خلاف ہوتا ہے۔ ایسے مشکل موقع پر میر صاحب جس طرح ان دو مشکلوں سے عہدہ برا ہوتے ہیں اور مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھتے ہیں اُسکا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہوگا"۔ اسکے بعد میر صاحب کے کلام سے چند لطیف مثالیں لکھی ہیں۔ لہذا اس موقع پر ہم بھی مرزا صاحب کے کلام سے بالکل اُسی انداز کی دو ایک مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں ؎

لکھا ہے اک شجاع بڑھا فوجِ شام سے
لرزاں تھی روح سام کی جسکی حسام سے

پرویز کو گریز نہ تھی، اُس کے دام سے
گردانِ روم کان پکڑتے تھے نام سے

جز عیبِ کفر محض ہنر وہ دلیر تھا
منہ پر جہلم پڑی تھی کہ برقع میں شیر تھا

اک پرتلہ گلے میں زری کا پڑا ہوا
قبضہ طلائی تیغِ رواں پر جڑا ہوا
نقرہ سمند، شیروں سے کُشتی لڑا ہوا
نیزہ وہ جس کی زد پہ نہ رستم کھڑا ہوا

چار آئینے سے شہرِ بدن تھا حصار میں
اندھیر اُس کی ڈھال سے تھا روزگار میں

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

پہلو میں ابنِ سعد کے تھا ایک نابکار
بدشکل، وبدلیاقت، وبدوضع، وبدشعار
اژدر خصال۔ دیونژاد وسیاہ کار
مکار وپرفریب۔ وستمگار۔ وبادہ خوار

تن میں زرہ تھی، خود سرِ بے شکوہ پر
وہ زین پر مکیں تھا کہ اژدر تھا کوہ پر

ایک اور موقع پر ؎

دو اور یلِ روم بڑھے جھوم کے اکبار
یاجوج کے دمساز، یلِ زال کے غمخوار
وہ گھوڑوں پہ یا پریوں پہ آسیب تھے اسوار
تلوار بلا۔ نیزہ غضب۔ ڈھال شبِ تار

مغفر جو سرِ نحس پہ مغرور دھرے تھے
اُلٹے ہوئے دو لوہے کے تنور دھرے تھے

ایک اور موقع پر ؎

وہ قلعۂ خیبر تھا تو یہ دستِ خدا تھا
وہ دودِ جہنم، تو یہ جنت کی ہوا تھا

وہ قہر میں طوفان، تو یہ خاکِ شفا تھا	وہ زور میں حاکم تھا، تو یہ حکمِ قضا تھا

یہ حق کا خلیل، اور بتِ آذر تھا وہ ناری
حیدر تھا یہ صفدر، اگر اژدر تھا وہ ناری

تسلسل بیان

پھر مولف لکھتے ہیں کہ "واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری اُصول یہ ہی کہ تسلسل ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اسی ضمن میں اُنھوں نے ناواقفیت سے مرزا صاحب پر اعتراض کیا ہی کہ اُنکے کلام میں ایک واقعے سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مؤلف نے مرزا صاحب کا نادر کلام دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی یا وہ اُن کی حاسدانہ نگاہ میں اُسقدر وقیع ثابت نہیں ہوا جسقدر عظمت کا وہ مستحق ہی۔ اگر کوئی مرثیہ اُن کو ایسا ملا ہو جس میں تسلسل قائم نہ ہو تو یہ غالباً اُن ذاکرین کی عنایت ہوگی جو اپنی مرضی کے مطابق مرثیہ میں کمی بیشی کر دیتے ہیں، یا کہیں کے بند کہیں لگا دیتے ہیں، یا ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے کلام میں داخل کر دیتے ہیں۔ بہر حال ہم مؤلف کو اس کوتاہ نظری پر معذور سمجھ کر مرزا صاحب کے کلام سے جناب حرؑ ہی کے مرثیے میں دکھانا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے کس خوبی کے ساتھ تسلسلِ بیان کا خیال رکھا ہے۔ اور اسی ایک مثال سے معلوم ہو سکتا ہی کہ مؤلف نے اپنے دعوے میں کسقدر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

مرزا صاحب کے کلام سے تسلسل بیان کی مثال

سلسلۂ بیان اس طرح شروع ہوتا ہی کہ جب شبِ عاشور ختم ہوئی تو صبح نے دنیا کو اپنا پُر نور چہرہ دکھایا اور آفتابِ درخشاں کی ضیا بار کرنیں اُفقِ مشرق سے طالع ہوئیں اُسوقت ؎

صبحِ شبِ عاشور میں تھے حشر کے آثار
سجّادہ نشیں تھا پسرِ احمدِ مختار

باندھے ہوئے صف خیمہ کی ڈیوڑھی پہ سب انصار
مشغولِ نمازِ سحری تھے وہ وفادار

بھائی کے حضور آتے موئی جاتی تھی زینبؑ
جوں جوں یہ سحر ہوتی تھی گھبراتی تھی زینبؑ

ادھر لشکرِ اسلام طاعتِ الٰہی میں سرگرم تھا اُدھر اعدائے دیں بھی خواب سے چونکے۔ عمرِ سعد نے سردارانِ فوج سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج کا معرکہ بڑا قیامت خیز اور ہولناک ہے، آج اُن دلیرانِ عرب سے مقابلہ ہے جن کی شجاعت کا غلغلہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ حضرت علیؑ کی خداداد جرات کیسی شہرۂ آفاق ہے۔ چنانچہ ؎

شاہِ شہدا بھی ہیں اُسی شاہ کے دلدار
طاقت وہی بازو میں، وہی ہاتھ میں تلوار

ابنِ حسنؑ و اکبرؑ و عباسِ علمدار
اُس فوج میں یہ تین بہادر ہیں نمودار

کچھ رشتہ میں ہیں، اور کچھ اصحاب نبیؐ کے
بیٹے ہیں، بھتیجے ہیں، نواسے ہیں علیؑ کے

اگر اس معرکہ کو سر کر لیا تو انعام و اکرام سے مالا مال ہو جاؤ گے۔ اتنے میں صفوں سے طبلِ جنگ کی صدائیں بلند ہوئیں ؎

ناگاہ بجے بوق و دف و بربط و قرنا
باجوں کی صداؤں سے ہلا گنبدِ خضرا

ادھر جانبازانِ لشکرِ اسلام کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک جری جوشِ شجاعت میں بھرا، اور سرفروشی پر تُلا ہوا فرزندِ رسول اللہؐ پر فدا ہونے کے واسطے مستعد تھا۔ دینداری اور خدا پرستی چہروں سے عیاں تھی ؎

فاقوں میں شہِ دیں کی طرح صابر و شاکر
یکساں صفتِ آئینہ تھے باطن و ظاہر

اعزّا و اقربا سب سے زیادہ لڑائی کے واسطے بیتاب تھے۔ چنانچہ حضرت عباسؑ شیرِ خدا کی آن بان سے ٹہل رہے ہیں اور ہر مرتبہ دریا کی طرف نظر کرکے فرماتے ہیں ؎

آرام کرینگے وہیں افضالِ خدا سے	نیند آتی ہے شیروں کو ترائی کی ہوا سے

حضرت علی اکبرؑ بشکلِ پیمبرؐ اسلحۂ جنگ سے سجے سجائے حسنِ خداداد کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ اُن کی صفت حدِ بیان سے باہر ہے، کون ہے جو ہمشبیہِ رسولِ خداؐ کی شکل و شمائل سے واقف نہیں۔ کیونکہ ؎

آفاق میں تھا شہرہ حسنِ علی اکبرؑ	سرتاجِ حسینانِ جہاں، شکلِ پیمبرؐ
زلفوں میں وہی پیچ وہی روئے منوّر	قامت میں وہی حسن، وہی جسمِ مطہّر

اتنے میں جناب امام علیہ السلام اہلِ حرم کو رخصت کرکے خیمے سے برآمد ہوئے تمام لشکر جنگ و جدل کیواسطے بیتاب اور ہر قلب اُلفتِ امام ہمام کے ولولوں سے لبریز تھا۔ اُدھر قضا و قدر نے حرؑ کے دل میں ولائے اہلبیتؑ کا جوش پیدا کر دیا، اور تقدیر نے آنکھوں کے سامنے سے غفلت کے پردے اُٹھا دیئے، چنانچہ اُسی جوش و خروش میں ابن سعد کے پاس آئے مگر تیور بدلے ہوئے تھے۔ اب اس موقع پر عمر ابنِ سعد اور حرؑ کی مخاصمانہ گفتگو اور سوال و جواب کا بیان کرنا تھا، اسکے لیے ربطِ کلام کا یہ طریقہ نکالا کہ عمر سعد نے حرؑ سے کہا کہ دونوں طرف کی فوجیں صف بستہ ہیں، جا پہلے تو ہی میدانِ وغا میں سبقت کر، حرؑ نے انکار کیا۔ اس طرح دونوں میں تکرار اور رد و کد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقع کے اشعار یہ ہیں۔ ؎

حرؑ نے کہا ہم کو کسی سرہنگ سے لڑوا	مظلوم کو، سیّد کو جو مارا تو لیا کیا
ہم سے تو نہوگا، یہ ہمارا نہیں شیوا	بولا پسرِ سعد یہ تقریر ہے بیجا

معلوم ہوا جی کو چُراتا ہے ابھی سے
اے تو سہی یہ کام میں لوں آج تجھی سے

مگر حرؑ نے پھر جرات کے ساتھ انکار کیا اور کہا کہ میرے سامنے ایسے کلمات نہ کہہ کیونکہ مجکو ان الفاظ کے سُننے کی تاب نہیں، اسی طرح دونوں میں دیر تک رد و قدح ہوتی رہی۔ اب اس واقعہ کے بیان کرنے کا موقع آیا کہ حرؑ نے امام حسینؑ کی طرف رُخ کیا اور اُن سے جا کر مل گئے۔ اسکو یوں ادا کیا کہ عمر بن سعد حرؑ سے کہتا ہے خبردار جو تو نے اُدھر کا قصد کیا۔ حرؑ جواب دیتے ہیں ؎

تسلیم کروں گا شہ مرداں کے پسر کو
لے روک تو لے مجکو، میں جاتا ہوں اُدھر کو

اس کے بعد یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حرؑ نے فریاد کی اور حضرت امام علیہ السلام خود استقبال کو چند قدم آگے بڑھے۔ اس کی تقریب یوں پیدا کی کہ حضرت زینبؑ کے صاحبزادوں نے جب حرؑ کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا تو سمجھے کہ وہ باغیانہ جنگ و جدل کی غرض سے آتا ہے اُنھوں نے تلواریں کھینچ کر راستہ میں روکا حرؑ نے صدا دی کہ میں تو آپ کا جاں نثار خادم ہوں اور ساتھ ہی فریاد کی کہ یا حضرت دو بہادر صاحبزادے مجکو آپ کی خدمت میں نہیں آنے دیتے۔ اے مولا میری فریاد کو پہونچو۔ حضرت نے بھانجوں سے کہا کہ آنے دو یہ ہمارا ناصر و مددگار بنکر مخلصانہ آتا ہے اور یہ فرما کر خود استقبال کو بڑھے۔ حضرت حرؑ نے اپنے قصور کی معافی چاہی آپ نے گلے سے لپٹا لیا اور معافی دی۔ اسکے بعد جناب حرؑ کے اذنِ جنگ طلب کرنے کا نہایت خوبی اور پُر اثر طریقے سے ذکر کیا ہے۔ قابل مؤلف غور فرمائیں کہ اس مرثیہ میں کہاں بیان کا

سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کہاں زائد یا بھرتی کے الفاظ بھرنے پڑے ہیں۔ کہاں معلوم ہوتا ہی کہ زبردستی ایک واقعہ کا دوسرے سے پیوند لگایا ہی۔ تمام مرثیہ پڑھو خاصکر وہ مقامات جہاں ایک واقعہ ختم ہوکر دوسرا واقعہ شروع ہوا ہی۔ خود معلوم ہو جائیگا کہ مختلف واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہی۔ ممکن ہی کہ مولف کو یہ قابلِ قدر انداز پسند نہ آئے۔ لیکن منصف مزاج ناظرین کا فیصلہ اُن کو قائل کر دیگا۔

بلاغت کی جزئیات

اب مولف نے بلاغت کی جزئیات شروع کی ہیں۔ لہذا ہم بھی شبدیز قلم کو اسی میدان میں جولاں کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہی کہ ہمارے پاس بھی اسقدر کافی سامان موجود ہے کہ ہم ہر پہلو سے اُن کو دنداں شکن جواب دے سکیں۔ اُنھوں نے میر صاحب کے کلام سے جزئیاتِ بلاغت کی جو مثالیں تحریر کی ہیں اُن کی خوبی اور نفاست میں کسی کو کلام نہیں لیکن اگر وہ دیدۂ بصیرت سے ڈھونڈتے تو مرزا صاحب کے کلام میں بھی اسالیبِ بلاغت کی بہت سی نادر مثالیں مل سکتی تھیں۔ مگر خیر لائق مولف کی خاطر ہم ہی چند مثالیں بطور نمونہ لکھتے ہیں۔

لیکن قبل اسکے کہ ہم مرزا صاحب کے کلام سے جزئیاتِ بلاغت کی مثالیں لکھیں پہلے اُس افترا اور بُہتان کو ظاہر کرتے ہیں جو مؤلف نے مرزا صاحب پر لگایا ہے وہ میر صاحب کے کلام سے جزئیاتِ بلاغت کی پہلی مثال (صفحہ ۵۶) میں جہاں امام حسینؑ کی زبان سے اس مصرع کی بلاغت کا اظہار کرتے ہیں ع مولا نے سر جھکا کے کہا میں

حسینؑ ہوں، تو اُسی موقع پر لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کو مرزا صاحب نے اس طرح باندھا ہے

ع فرمایا میں حسینؑ علیہ السّلام ہوں۔ میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مصرع ہرگز مرزا صاحب کا نہیں ہے اور نہ ایسا مہمل مصرع اُن کا ہو سکتا ہے۔ میں نے تو مرزا صاحب کی بیسوں جلدیں اور بہت سے قلمی مرثیے دیکھ ڈالے کہیں یہ مصرع نظر سے نہیں گذرا۔ نہ کہیں اسکے ہم مضمون کوئی مصرع دیکھا گیا۔ یہ محض تہمت و افترا ہے۔ اگر مرزا صاحب کے کلام میں کہیں یہ مصرع اُن کی نظر سے گذرا ہو تو اس کو یقیناً ملحقات سے سمجھنا چاہیے۔

مرزا صاحب نے تو جہاں جہاں اس قسم کے موقع پیش آئے ہیں، اس مضمون کو نہایت بلاغت اور خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ مثلاً ایک مرثیہ میں قیس کی روایت نظم کی ہے کہ اُنھوں نے حضرت امام حسینؑ کو نہ پہچانا اور اظہارِ اسمِ مبارک پر اصرار کیا تو آپ نے جو کچھ اور جس طرح جواب دیا اُسکو مرزا صاحب نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

مجروحِ تیغ و خنجر و تیر و سنین ہوں	اے عاشقِ حسینؑ میں ہی تو حسینؑ ہوں

ایک زائر سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

مظلوم ہوں ناچار ہوں اور تشنہ جگر ہوں	تو زائرِ حیدرؑ ہے میں حیدرؑ کا پسر ہوں

جب اُس نے کہا کہ کیا آپ حضرت عباسؑ ہیں تو اسکے جواب میں فرمایا ؎

ارشاد کیا شاہ نے با دیدۂ پُرخوں	عباسؑ نہیں، میں تو حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

ایک موقع پر فرماتے ہیں ؎

پھر رو کے یہ کہا کہ میں سیّد ہوں قوم کا	نانا محمدؐ عربی فخرِ انبیا
بابا علیؑ ہے والدہ ہے اشرفُ النّسا	قرآن ہے کتاب، مدینہ وطن مرا

مرزا صاحب پر افترا

امام حسینؑ نے اسم مبارک کس طرح بتائے ہیں مرزا صاحب کے کلام سے اسکی شہادتیں

ڈرتے ہیں یہ نبیؐ سے نہ خالق ہی ڈرتے ہیں
مہماں انہیں کا ہوں جو مجھے قتل کرتے ہیں

زغفر جن نے نہ پہچانا تو اُس سے فرماتے ہیں ؎

حضرت نے کہا ہوں میں وہی بیکس و تنہا | مظلوم حسینؑ ابن علیؑ دلبرِ زہراؑ

ایک روایت میں یہودی آپ کا اسمِ مبارک دریافت کرتا ہے اور آپ بتاتے ہیں ؎

واللہ ابنِ فاتحِ بدر و حنین ہوں | میں بیکس و غریب و مسافر حسینؑ ہوں

غرض اسی طرح ہر مرثیے میں جہاں جہاں اس قسم کے موقعے آئے ہیں مرزا صاحب نے اظہار کیا ہی کہ حضرت نے اپنا نام عجز و انکسار سے لیا ہی، کہیں اپنے اسمِ مبارک کیساتھ علیہ السلام یا کوئی اور کلمہ تفاخر و مباہات کا استعمال نہیں فرمایا۔ نہیں معلوم قابل مولف نے یہ مصرع کیوں ایسے یکتائے عصر شاعر کے نام سے درجِ کتاب کر دیا۔ اب ہم جزئیاتِ بلاغت کی مثالیں شروع کرتے ہیں۔

مثال ۱۔ جب اہل حرم اسیر ہو کر دربارِ شام میں پہونچے اور ہند کو جو یزید کی بیوی اور اہلبیتؑ کی جاں نثار تھی، معلوم ہوا کہ یہ عترتِ رسول اللہؐ ہیں، وہ درد و قلق میں بیساختہ محل سے نکل آئی اور اپنی نیازمندی کا اظہار کر کے سب سے پہلے حضرت زینبؑ کی خدمت میں ایک چادر پیش کی۔ حضرت زینبؑ کی غیرتِ خاندانی گوارا نہیں کرتی کہ ہند کے ہدیہ کو قبول کر لیں، اسکے علاوہ پیارے بھائی کی بے کفنی کا خیال بھی ردا اوڑھنے سے مانع ہوتا ہی، مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال ہی کہ ہدیہ کو سختی کے ساتھ رد کر دینا علاوہ دلشکنی کے خلافِ مروت بھی ہی۔ ان سب متضاد باتوں کو

ملحوظ رکھ کر جناب زینبؑ نے کس خوبی سے ہدیہ کو رد کر دیا۔ مرزا صاحب اس مطلب کو کس بلاغت سے ادا فرماتے ہیں جس میں ہر پہلو کو مدِ نظر رکھا ہے۔ ؎

زینبؑ کو پھر وہ آپ اُڑھانے لگی ردا
زینبؑ عرق عرق ہوئی، بولی ٹھہر ذرا

بھائی کے سر سے پونچھ لوں مرضی ہی انکی کیا
چادر کے لینے سے کہیں بھائی نہوں خفا

واجب متابعت ہی شہِ مشرقین کی
مشہور ہے جہان میں غیرت حسینؑ کی

اے ہند منہ چھپانے سے اب فائدہ ہی کیا
سب اہلِ شہر دیکھ چکے مجکو بے ردا

رہنے دے سر برہنہ مجھے بھی تو ہے بجا
زہراؑ کا سر ہی بیٹے کے غم میں ابھی کھلا

اوڑھوں میں کیا ردا کہ جگر پاش پاش ہی
دو گز کفن کی بھائی کی خاطر تلاش ہی

اب ہند جناب شہر بانوؑ کی طرف مخاطب ہوتی ہی۔ وہ بھی انہیں امور کا لحاظ کر کے دوسرے پیرایہ میں انکار کرتی ہیں مگر کس خوبی کے ساتھ ؎

بانوؑ سے پھر یہ ہند نے رو کر کیا سخن
تم تو سر اپنا ڈھانپ لو از بہرِ پنجتنؑ

بانوؑ پکاری مجھ سے یہ کب ہوگا اے بہن
میرا تو چھ مہینے کا بچہ ہی بے کفن

اصغرؑ کو جب تلک نہ کفن میں نہاؤنگی
چادر سے اپنے منہ کو نہ ہرگز چھپاؤنگی

"اے بہن" کی فصاحت پر لحاظ کرو۔ باوجود پریشانی اور مصیبت کے اپنے دشمن کی بیوی مگر اپنی عقیدتمند اور خیر خواہ عورت کی اس سے زیادہ کیا خاطر داری ہو سکتی ہی۔ ان اشعار میں اہلحرم کے اخلاق و تحمل کا ایک ادنیٰ نمونہ دکھایا گیا ہی۔

مثال ۲۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب اہلِ حرم یزید کے دربار میں پہونچے تو وہاں سفیرِ روم بھی موجود تھا اُسکو یہ عجیب و غریب حالات دیکھ کر نہایت تعجب ہوا۔ وہ یزید سے متحیر ہو کر پوچھتا ہے۔ ؎

مسکن تھا اس قتیل کا کس سرزمین پر
تھا اور دین پر کہ محمدؐ کے دین پر

زنجیر پہنے کانپتا ہے جو یہ ناتواں
یہ ننھی لڑکی جس کے گلے میں ہے ریسماں

کیا نام اس مریض کا ہے، جلد کر بیاں
اسکا تو ہے وہ سن کہ ہو کافر بھی مہرباں

رانڈوں سے انتقام تو لیتا ہے، حیف ہے
آزار ننھے بچوں کو دیتا ہے، حیف ہے!

مذہب پہ اُس سے جنگ ہوئی یا کہ ملک پر
کیا تارک الصلوٰۃ تھا کاٹا جو اسکا سر

کیا منحرف تھا قبلے سے ٹوٹا جو اسکا گھر
زینبؑ سے ضبط ہو نہ سکا بولی پیٹ کر

حق پر مرا ہے، فرقۂ باطل سے پوچھ لے
سجدہ میں سر کو کاٹا ہے، قاتل سے پوچھ لے

سفیر کو یقین ہو گیا کہ ضرور یہ کوئی صاحبِ اقتدار اور دیندار شخص تھا۔ اُس نے پھر یزید سے پوچھا کہ اسکا حسب و نسب بتا، تاکہ شاہِ روم پر اظہار کروں اُسوقت ؎

بولا شقی بلند نہ کر شور و شین کو
کہدیجیو یزید نے مارا حسینؑ کو

اُسنے کہا جو سیّدِ بطحا ہے وہ حسینؑ
تیرے رسولؐ کا جو نواسا ہے وہ حسینؑ

ماں جس کی فخرِ مریمؑ دعوا ہے وہ حسینؑ
مشکل کشا علیؑ کا جو بیٹا ہے وہ حسینؑ

جسپر نبیؐ نے اپنے پسر کو فدا کیا؟
خالق نے جسکو بچۂ آہو عطا کیا؟

ان تمام اشعار میں سفیرِ روم کا یزید کو طنز و تعریض کرنا کس بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہی۔ طنز کا سب سے بڑا نکتہ یہ ہی کہ وہ یزید سے صاف طور پر یہ نہیں کہتا کہ تو نے ناحق امام حسینؑ کو، جو اسلام کے ممتاز رکن، اور تیرے نبیؐ کے نواسے تھے، قتل کر ڈالا ایسی صورت میں بلاغت کا زور گھٹ جاتا، بلکہ وہ تجاہلِ عارفانہ کرکے ایسی خراش چوٹیں کرتا ہی جو بظاہر سخت نہ ہوں مگر تیر کی طرح دل میں اثر کر جائیں۔ باوجودیکہ وہ جان گیا ہی کہ یہ وہی امام حسینؑ سبطِ رسول اللہ ہیں مگر دانستہ ناواقف بن کر یزید سے پوچھتا ہی کہ کیا یہ وہ حسینؑ تو نہیں جو سیّد بطحا ہی؟ جس کی ماں فخرِ مریمؑ و حوّا ہی، جو تیرے رسولؐ کا نواسا ہی، اور جسکے والدِ بزرگوار حیدرِ کرّار ہیں؟ جسکا مطلب یہ ہی کہ نانا کو رسولؐ بھی جانتا ہی انکا کلمہ گو بھی بنتا ہی لیکن ایسی بیدردی کے ساتھ نواسے کو قتل کر ڈالا۔

ان طنزیہ فقروں میں امام حسینؑ اور اُنکے بزرگوں کو جن الفاظ سے یاد کیا ہی وہ بالکل تعریض سے بھرے ہوئے ہیں۔ سیّدِ بطحا۔ فخرِ مریم و حوّا۔ مشکل کشا جسپر نبیؐ نے اپنے پسر کو نثار کیا۔ جسکو خدا نے بچۂ آہو بھیجا۔ ان سب الفاظ کے یہ معنی ہیں کہ تم مسلمان لوگ اپنے عقیدے میں ان پیشوایانِ دین کو ایسا سمجھتے ہو لیکن عملی طور پر اُن کی اولاد کے ساتھ وہ عجیب برتاؤ کیا کہ کوئی کافر بھی ایسا نہ کرتا۔

مثال ۳۔ جب جناب زینبؑ کے صاحبزادے حضرت امام حسینؑ سے

رضائے جنگ لیکر ماں سے ملنے آئے تو اُنھوں نے یہ کہہ کر رخصت کیا کہ جب ماموں کے بدلے زخمِ تیر و سناں کھا کر آؤ گے اُسوقت تم کو پیار کروں گی۔ چنانچہ جب وہ زخمی ہو کر خیمہ میں آئے تو اُسوقت کی حالت لکھی ہے ؎

بنتِ علیؑ کی، لاشوں پہ جسدم پڑی نگاہ
سجدے میں جھک گئی جگرِ ضیغمِ الٰہ

بیٹوں نے ہاتھ اُٹھائے جو تسلیم کے لیے
دیکر دعا کھڑی ہوئیں تعظیم کے لیے

اس میں بلاغت کا کیسا موثر نکتہ ہے کہ حضرت زینبؑ بیٹوں سے محض اسلیے خوش ہوئیں کہ اُنھوں نے امام علیہ السلام پر اپنی جانوں کو قربان کر دیا۔ کوئی ماں بیٹوں کی تعظیم کے لیے کھڑی نہیں ہوتی لیکن حضرت زینبؑ اس شرف پر کہ اُنھوں نے فرزندِ رسول الثقلینؐ پر جان دیکر سعادتِ دارین حاصل کی بیٹوں کو تعظیم دیتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ بچوں کے واسطے جو بین کرتی ہیں اُسکے ایک ایک لفظ میں بھائی کی محبت کا اظہار ہے اور یہ امر صاف نظر آتا ہے کہ اُن کو بیٹوں سے جو کچھ الفت ہے وہ محض اسوجہ سے ہے کہ وہ اُن کے بھائی پر نثار ہوئے۔ چنانچہ فرماتی ہیں ؎

کہتی تھی واہ پیارو بڑا کام کر چلے
ماموں پہ صدقے ہو کے مرا نام کر چلے

ایسا تمھیں نہ جانتی تھی بنتِ مرتضیٰؑ
جب چاہا بے قصور بھی تم کو گھرک لیا

جی بھر کے تم کو پیار نہ میں نے کبھی کیا
پیارو! خدا کیواسطے بخشو مری خطا

جنت میں سامنا ہو جو اماں بتولؑ کا
شکوہ نہ اُن سے کیجیو مجھ دل ملول کا

یعنی میں تمھاری دلیری پر تحسین و آفریں کرتی ہوں کہ تم نے ماموں پر فدا ہو کر میرا نام روشن کر دیا۔ پھر ع ایسا تمھیں نہ جانتی تھی بنتِ مرتضیٰ۔ یعنی مجکو پہلے سے یہ نہ معلوم تھا کہ تم اس جانبازی کے ساتھ میرے بھائی پر اپنی جانوں کو فدا کر دوگے ورنہ اس سے زیادہ تمھاری قدر افزائی کرتی۔ افسوس ہی کہ ایسے سعید و رشید بچّوں کو کبھی جی بھر کے پیار نکیا

مرزا صاحب نے اس موقع پر جس بلیغ و لطیف انداز سے بہن کی عدیم المثال الفت کا مرقع آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہی اس سے زیادہ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

مثال ۴۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہلبیتؑ دربارِ یزید میں گئے ہیں تو وہ اپنی جفا شعاری اور سفّاکی پر اس طرح فخر و مباہات کرتا ہی ؎

روشن[1] تھا نامِ شیرِ خدا مشرقین میں
مارا مرے بزرگوں کو بدر و حنین میں
اب روئیں اہلبیتؑ فراقِ حسینؑ میں
یاد آئیگا یہ جشن انہیں شور و شین میں

رویا کرینگے شاہِ مدینہ کے واسطے
محتاج ہونگے نانِ شبینہ کے واسطے

سر تاجِ کائنات کا سر زیرِ تخت ہے
کیا میری سرنوشت ہی کیا اوجِ بخت ہے
زرّیں کلاہ اور امیری کا رخت ہے
اب رنج زندگانیِ عابدؑ کا سخت ہے

طالع پہ میرے، اوج کا اب خاتمہ ہوا
شکرِ خدا زوالِ نبی فاطمہؑ ہوا

شہزوروں کے گروہ میں، میں بے بدل ہوا
قاتل نبیؐ کی آل کا پہلے پہل ہوا

[1] یہ مرثیہ ابتدائی زمانہ کا معلوم ہوتا ہی کیونکہ زبان زیادہ صاف نہیں ہی۔ لیکن ناظرین الفاظ کی چمک دمک کی پروا نہ کریں بلکہ معنی کی خوبی اور مضمون کی لطافت پر دھیان رکھیں جسکے لحاظ سے ہم نے ان بندوں کو انتخاب کیا ہی۔

مجکو نصیب تیغ سے نصرت کا پھل ہوا　　دنیا میں ایک حکم ہوا اک عمل ہوا

کیا دل رہے گا چین سے اب عمر بھر مرا
کاٹا نبیؐ کا دل کوئی دیکھے جگر مرا

یہ مثال میر صاحب کی مثال نمبر (۴) سے بہت کچھ ملتی ہوئی ہے۔ جن الفاظ یا مصرعوں پر ہم نے خط کھینچ دیئے ہیں وہ قابلِ غور ہیں کیونکہ اُن میں بلاغت کے کئے دلچسپ نکتے پائے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں یزید کے کفر و ارتداد اور سنگدلی کا نہایت لطیف اور سچے پیرایہ میں مرقع دکھا دیا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ وہ جناب امیرؑ کی اولاد سے اپنے آبا و اجداد کا عوض لیتا ہے جو بحالتِ کفر۔ بحکم خدا و رسولؐ جنگِ بدر و حنین میں حضرت علیؑ کی تلوار سے مارے گئے تھے۔ جسکے یہ معنی ہوئے کہ اُس کے زعم میں رسول اللہؐ کی لڑائیاں جو کفار سے ہوئیں دینداری پر مبنی نہ تھیں بلکہ مُلکی جنگیں تھیں جنکا بدلہ وہ اب لے رہا ہے۔ جس سے ضمناً یہ پایا گیا کہ اُسکو خود جناب رسالتمآبؐ کی رسالت کا شک ہے اور اسلام کی صداقت کا مطلق یقین نہیں۔ پھر ان اشعار میں امام حسینؑ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ہے وہ بالکل طنز و تعریض سے بھرے ہوئے ہیں۔ شاہِ مدینہ۔ سرتاجِ کائنات۔ ان سب الفاظ کا یہ مطلب ہے کہ گویا اُس کے خیال میں امام حسینؑ دعویدارِ سلطنت بنکر اپنے آپ کو ایسا سمجھتے تھے اور اُنھوں نے حصول حکومت کے واسطے جنگ و جدل کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ گو اُسکو تسلیم ہے کہ امام حسینؑ نبیؐ کا دل ہیں، اسپر بھی وہ اُن کے قتل کرنے یا نبیؐ کا دل کاٹنے پر اپنے جگر کی ثنا و توصیف، اور اپنی قسمت

۲ یہ یزید کے اشعار کا ترجمہ ہے جو اُسنے فخریہ پڑھے تھے۔ یہ اشعار معتبر کتب تواریخ میں لکھے ہوئے ہیں ۱۲

کے عروج اور سرنوشت کی بلندی پر ناز اور فخر کر رہا ہے۔ اور نبیؐ کی آل کا قاتل ہونے پر اُسکو اپنی شہزوری اور شجاعت کا غرّہ ہے۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ اُسکو خود رسول اللہؐ کی ایذا کی خوشی اور مسرت ہے۔ ان سب پر طرّہ یہ کہ وہ زوالِ بنی فاطمہؑ پر خدا کے احسان کا شکرگزار ہے، گویا اُس کے زعمِ باطل میں یہ امر خدا کو مرغوب اور پسند تھا۔

مثال ۵ - ے

صغرؑا نے ادھر اور اُدھر یاس سے دیکھا
پھر جھولے سے صغرؑ کو اُٹھا لائی وہ دُکھیا

کہنے لگی، تم میری سفارش کرو بھیّا
سب کہہ ہی بابا کی طرف اور میں تنہا

صغرؑا کو تو سمجھاتے ہیں بابا کی طرف سے
کچھ باپ سے کہتے نہیں صغرؑا کی طرف سے

تم اپنی زباں کھولو سفارش میں ہماری
ہونٹوں کو ہلا کر یہ اشارہ کرو واری

صغرؑا کو نہ چھوڑو، یہ بہن ہے مجھے پیاری
اصغرؑ میں بڑی چاہنے والی ہوں تمھاری

اس تپ میں بھی جب ہوش میں آجاتی ہوں واری
ڈر ہے ترے جھولے کی ہلا جاتی ہوں واری

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام علیہ السلام آمادۂ سفر ہیں اور حضرت عباسؑ ہمراہیوں کے نام لکھ رہے ہیں۔ جناب صغرؑا اپنا نام بھی لکھنے کو کہتی ہیں مگر وہ مصلحتِ امامؑ خاموش ہو جاتے ہیں، امامِ حسینؑ سے منت وزاری کرتی ہیں لیکن وہ بھی لیجانے پر رضامند نہیں ہوتے، پھر گھر میں ایک ایک سے سفارش کی خواستگار ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی ہامی نہیں بھرتا اور ہر شخص بجائے خود سفر کی طیّاریاں کر رہا ہے۔ اُسوقت وہ نہایت یاس و اضطراب کی حالت میں حضرت اصغرؑ کو جو شش ماہہ بچّے ہیں گہوارے سے

اُٹھا لاتی ہیں اور خطاب کر کے کہتی ہیں کہ اے ننھے بھائی بابا مجکو لیجانے پر آمادہ نہیں ہیں، سب کنبہ ایک زبان ہی اور میں محض تنہا، میرا کوئی مددگار نہیں۔ میں تمھاری خدمت کرتی ہوں ہر وقت جھولا جھلاتی ہوں ان خدمات کے عوض میں اب تم ہی بابا سے سفارش کرو کہ مجکو بھی ہمراہ لے چلیں۔ تمام کنبے سے مایوس ہو کر ایک بے زبان بچے سے سفارش کرانا حسرت اور ناکامی کی کیسی دردانگیز تصویر ہی۔

مثال ۶ - ہ

کِسدن کے واسطے طلب رایتِ ظفر	واری بہت جیوگے جواب تم تو دوپہر
یہ دوپہر رولائے گی زینبؑ کو عمر بھر	دنیا سے آج فوجِ حسینؑ کا ہے سفر

گھر سے تمھیں حسینؑ کے صدقہ کو لائی ہوں
میں بے نصیب ہونے کو یثرب سے آئی ہوں

جناب زینبؑ کے صاحبزادوں کو خیال تھا کہ ہم مستحقِ علمداری ہیں۔ مگر جب اُن کو علم نہ ملا تو ملال ہوا۔ اسپر اُن کی والدہ اُن کو سمجھاتی ہیں۔ سمجھانے کا پہلو یہ ہی کہ آج میدانِ کربلا میں دوپہر تک تمام اعزا و اقربا اور امام حسینؑ شہید ہو جائینگے تو اتنے قلیل عرصہ کے لیے اس منصب کی ہوس بیکار ہے۔

اس مضمون کو مرزا صاحب نہایت بلاغت سے ادا فرماتے ہیں۔ اُنھوں نے حضرت زینبؑ کی زبان سے اس دردانگیز واقعہ کو کھلے الفاظ میں صاف صاف نہیں بلکہ اشارۃً اور کنایۃً ادا کیا ہی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے صاحبزادوں کی شہادت کا تو کھلے الفاظ میں اظہار کر دیا (واری بہت جیوگی جواب تم تو دوپہر) کیونکہ اُن کو جاں نثاری اور حصولِ شہادت پر آمادہ کرنا تھا۔ لیکن باقی مطلب یعنی حضرت امامِ حسینؑ حضرت

عباسؑ اور تمام کنبے کی شہادت اُسکو پوشیدہ الفاظ میں اشارۃً بیان کرتی ہیں۔ مثلاً
ع یہ دو پہر رولائیگی زینبؑ کو عمر بھر۔ اس میں امام حسینؑ کی شہادت اور
اپنی تمام عمر کی سوگواری کا اشارہ ہی مگر صاف الفاظ میں نہیں۔ پھر ع دنیا سے آج
فوجِ حسینیؑ کا ہی سفر۔ اس میں کنایۃً ظاہر کیا ہی کہ آج تمام کنبے اور خود امام حسینؑ کا
خاتمہ ہی۔ کیونکہ تمام لشکر کے قتل ہو جانے کے بعد سردار کی شہادت لازمی ہی۔ سب
باتوں کو درپردہ ظاہر بھی کر دیا لیکن باقتضائے الفت و محبت کسی بات کو صاف صاف
نہ کہا۔ اس مضمون کو انہیں الفاظ میں میر صاحب مرحوم نے بھی ادا کیا ہی۔ بعض مصرع
قریب قریب ہم مضمون ہیں۔ مثلاً ؎

میر انیس۔ تم ہوگے تا بعصر نہ عباسؑ خوشخصال
مرزا دبیر۔ داری بہت جیوگے جواب تم تو دو پہر

میر انیس۔ مجکو یقیں نہیں کہ بچے فاطمہؑ کا لعل
مرزا دبیر۔ دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہے سفر

مثال ۷۔ امام حسینؑ کے وعظ و پند سے متاثر ہو کر جناب حرؑ نے بیساختہ
حضرت کے لشکر کی طرف رخ کیا۔ امام علیہ السلام کے اعزا اور رفقا سمجھے کہ یہ ہماری فوج
میں مخالفانہ آرہے ہیں۔ چنانچہ اس خیال پر وہ سب کے سب برہم ہو گئے۔ اس موقع کی
تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

پہونچا قریبِ فوجِ خدا جب وہ باوفا	چرچا ہوا حسینؑ کے لشکر میں جابجا
ہشیار اے حسینؑ کے اصحاب و اقربا	ہاں نیزے تانو، تیغیں سنبھالو، غضب ہوا
	لو آتا ہی وہ سامنے شاہِ دلیر کے

لایا ہی کربلا میں جو سید کو گھیر کے

اس متوحش خبر کو جب خیمہ گاہ میں حضرت زینبؑ نے سُنا تو وہ جوشِ محبت میں پریشان و متردد ہو کر فرماتی ہیں ؎

زینبؑ کے کان میں یہ خبر پہونچی ناگہاں
بیتاب ہو کے ڈیوڑھی پہ آئی وہ خستہ جاں
رو کر پکاری، اکبرؑ و عباسؑ ہیں کہاں
میرے حسینؑ بھائی کے لوگو نگاہباں

کہدو ہمارے شیروں سے سینے سپر کریں
زینبؑ نے دودھ بخشا نثار اپنے سر کریں

حضرت علی اکبرؑ جناب زینبؑ کے بھتیجے، حضرت عباسؑ بھائی، عونؑ و محمدؑ صاحبزادے، اور دوسرے لوگ امام علیہ السلام کے یار و انصار ہیں۔ اس موقع پر بلاغت یہ ہی کہ حضرت زینبؑ کو جن جن لوگوں پر جسقدر اختیار تھا اُسی نسبت سے اُن کو امام حسینؑ کی حفاظت کا حکم دیتی ہیں۔ انصار سے فقط یہ کہا کہ لوگو میرے بھائی کے نگہبان رہو، اکبرؑ و عباسؑ کو پکارتی ہیں کہ دیکھو وہ کیا کرتے ہیں، لیکن چونکہ اپنے بیٹوں کی مختارِ کل ہیں اُن کو حکم دیدیا کہ سینے سپر کردو اور ماموں پر اپنے سروں کو نثار کر ڈالو۔ اس فرقِ مراتب کو اس خوبی سے ادا کیا ہی کہ واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے۔

مثال ۸۔ جناب صغراؑ رخصت کیوقت حضرت عباسؑ سے منت و زاری کرتی ہیں ؎

کرنا نہ سکینہؑ کی طرح میری مدارات
خدمت کو سکینہؑ ہی کی لے چلیے مجھے ساتھ
وہ سوئیگی شب کو تو میں بیدار رہونگی

رستے میں سکینہؑ کی خبردار رہونگی

امام حسینؑ سے عرض کرتی ہیں ؎

بابا مجھے چھوڑو نہ یہاں، تم پہ میں واری
بیٹی نہیں میں آج سے لونڈی ہوں تمہاری

منہ ہاتھ دُہلاؤنگی میں اصغرؑ کا تمہارے
گہوارہ جُھلاؤنگی میں اصغرؑ کا تمہارے

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام حسینؑ جناب صغرؑا کے سوا سب کو سفر میں ساتھ لیے جاتے ہیں۔ حضرت صغرؑا کو حالت یاس میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہر شخص اُن بچّوں کو جن سے محبت ہے ساتھ لیے جاتا ہے مگر مجھ سے کوئی الفت نہیں کرتا۔ اسلیے اُنھوں نے منت و زاری اور استدعا کا یہ حسرت خیز طریقہ اختیار کیا ہے کہ اُنکے خیال میں جو بچّہ جس بزرگ کو عزیز تھا اُسی کی خدمت کے لیے اپنی ہمراہی کی درخواست کرتی ہیں تاکہ اُن بچّوں کی خاطر سے منظور کر لی جائے۔ مثلاً حضرت عباسؑ سے کہتی ہیں کہ مجکو سکینہؑ کی خدمت کے لیے ساتھ لیچلو۔ امام حسین علیہ السلام سے جو استدعا کی ہے اُس میں عرض کرتی ہیں کہ "گہوارہ جُھلاؤنگی میں اصغرؑ کا تمہارے"، اس موقع پر "اصغرؑ کا تمہارے"، ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے۔ حضرت اصغرؑ جناب صغرؑیٰ کے چھوٹے بھائی تھے، ہو سکتا تھا کہ وہ اُن کو اپنا بھائی کہکر مخاطب کرتیں، لیکن اُن کو حضرت امام حسینؑ کا اصغرؑ کہکر خطاب کیا ہے اور کہتی ہیں کہ مجکو اس لیے ساتھ لیچلو کہ میں تمہارے اصغرؑ کا گہوارہ جُھلاؤنگی۔

اس اسلوبِ بیان میں حسرت اور خوشامد کا جو دردناک اور پُرتاثیر پہلو پایا جاتا ہے اُسکا لطف خود ظاہر ہے۔ اور اسی پردے میں ایک چُھپا ہوا شکوہ بھی ہے یعنی آپ

اصغرؑ کو اپنا فرزند سمجھتے ہیں جو ساتھ لیے جاتے ہیں، لیکن مجکو اپنا نہیں سمجھتے۔ دیکھو شکایت بھی کی ہے تو کسقدر تہذیب اور ادب کے پردے میں۔

مثال ۹ - شمر سے اور جناب عباسؑ کی والدہ سے کچھ دُور کی قرابت تھی۔ اعدائے دین تاراجیِ خیام کو آئے تو اُس شقی کو کچھ غیرت آئی اور کہا کہ میں عباسؑ کی بیوہ کو ہرگز اسیر نہ ہونے دونگا۔ اس مضمون، اور اُسوقت اہلبیت علیہم السلام کی حسرت ناک حالت کو کن دردانگیز الفاظ میں اور کس خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں ؎

یہ کہہ کے درِ خیمہ پہ چلّایا وہ بے پیر
اے بیوۂ عباسؑ علیؑ صاحب توقیر
اب ہوئیگی سر ننگے یہ سب عترتِ شبیرؑ
اور حضرتِ زہراؑ کی بہو ہوئیگی تشہیر

پر تم مری خواہر کی بہو ہو، یہ ادب ہے
تشہیر جو تم ہو سرِ بازار، غضب ہے

سُن لی یہ صدا زینبِ بیکس نے فضا را
بیساختہ عباسؑ کی زوجہ کو پکارا
لو بھابی! بنا شمر طرفدار تمھارا
اچھا تو ہے اسوقت کرو ہم سے کنارا

وارث نہیں، بے وارثوں پر دیکھیے کیا ہو
دُکھ سے جو تمھیں چین ملے ہم سے جدا ہو

پھر بھر کے دمِ سرد یہ بانوؑ نے کہی بات
ہاں بھابی لُٹو کا ہے کہ بے وارث نکے سات
برگشتہ نصیبوں سے کرو ترکِ ملاقات
کنبے کی محبت میں نہ ہو موردِ آفات

یہ دشمنِ دیں باندھیں گے اب ہات ہمارے
کیا فائدہ جو قید ہو تم سات ہمارے

مجھ میں تو نہیں ہوش تمھیں بچّوں کو بہلاؤ
بے وارثی بھاوج کی اسیری کا نہ غم کھاؤ

تم جاؤ تو اے بھابی سکینہؑ کو بھی لے جاؤ
لپٹاؤ کلیجے سے اسے، گود میں بٹھلاؤ

پاس آپ کے یہ لاڈلی میری جو رہے گی
ظالم کے طمانچوں کی تو ایذا نہ سہے گی

پر شمر جو پوچھے کہ یہ ہے کون تمھاری
بیٹی اسے حضرت کی نہ بتلانا میں واری
کہیو کہ علمدارِ دلاور کی ہے پیاری
جب سے وہ ہوئے قتل قلق اسپہ ہے طاری

بیٹی نہ سمجھنا نہ عزیز اپنی سمجھنا
بن باپ کی بچی کو کنیز اپنی سمجھنا

اصغرؑ کو بھی تم اپنا ہی فرزند بتانا
ممکن ہو تو ننھی سی لحد اُس کی بنانا
موقع جو سفارش کا میں صدقے گئی پانا
بیمار بھتیجے کو اسیری سے بچانا

جو ہو سکے سیدانیوں سے کیجیو بھابی
زندان سے زینبؑ کو چھڑا لیجیو بھابی

اک رات کی بیاہی مری بیٹی جو ہے کبرا
رنڈسالہ کا جوڑا بھی نہیں جس کو مہیا
کس طرح بسر ہو گا یہ بچپن کا رنڈاپا
بابا ہے سو محتاجِ کفن، ماں ہے سو دکھیا

بھیجے جو تمہیں شمرِ لعیں یاں سے وطن کو
لیجائیو ہمراہ بھتیجے کی دُلہن کو

ان بندوں میں بلاغت کے نکتوں پر غور کرو۔ سب سے پہلے، عورتوں کی اسیری و تاراجی میں جو توہین و تذلیل ہے اُس کی دلخراش تصویر کھینچی گئی ہے۔ یعنی شمر کو باوجود اس بے انتہا شقاوت اور بے رحمی کے کہ چشم و چراغ نبویؐ کے ذبح کرنے میں رحم نہ آیا، زوجۂ حضرت عباسؑ کی اسیری گوارا نہیں ہے۔ اسکے بعد، اُس زمانے کے لوگوں کو

رسولؐ مقبول اور اُن کے خاندان سے جو بے تعلقی اور اجنبیت تھی، اُسکو نہایت دلنشین اور موثر پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ یعنی شمر جیسے جفا شعار کو حضرت عباسؑ کی بیوہ کی توہین و تفضیح منظور نہوئی حالانکہ اُسکا تعلق حضرت عباسؑ سے صرف اسی قدر تھا کہ اُن کی والدہ شمر کے قبیلے سے تھیں، لیکن لاکھوں کلمہ گویوں میں اہلبیت رسولؐ کا کوئی اتنا بھی ہمدرد اور دلسوز نہ تھا کہ اُن کی رسوائی اور تحقیر سے کسی دل کو بھی تکلیف محسوس ہو۔ اس کے بعد شمر شقی کی بے انتہا سنگدلی اور بے دینی کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ آج زہراؑ کی بہو تو ضرور اسیر ہوگی لیکن چونکہ تم میری بہن کی بہو ہو اسلیے تمہارا تشہیر ہونا غضب ہے۔ جسکے یہ معنی ہوئے کہ اُس کی نگاہوں میں جناب سیدہؑ کی اتنی بھی عظمت نہیں جتنی اپنی بہن کی۔ اسکے بعد حضرت شہر بانوؑ اپنے بیٹے اور بیٹی کی زوجہ حضرت عباسؑ سے سفارش کرتی ہیں۔ معمولی طریقۂ کلام یہ تھا کہ وہ یہ کہتیں کہ تم میرے بیٹے (سجادؑ) کو اسیری سے بچالینا اور میری بیٹی (کبرا) کو اپنے ساتھ وطن لے جانا، لیکن حضرت بانوؑ اپنے بیٹے کو اُن کا بھتیجا اور اپنی بیٹی کو اُن کے بھتیجے کی دلہن کہکر خطاب کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ موقع ملے تو اپنے بیمار بھتیجے کو قید سے بچالینا اور وطن جاؤ تو اپنے بھتیجے کی دلہن کو بھی ساتھ لیتی جانا۔ دستور ہے کہ جب اپنے کسی عزیز و ہمدرد سے اپنی اولاد کا کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اُن کو اپنی طرف نہیں بلکہ اُسی عزیز کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ گویا اُس کی محبت۔ و ہمدردی۔ اور قرابت مندی کے جذبات کو تحریک دینے کی غرض سے ایسے الفاظ بیان کیے جاتے ہیں کہ یہ کام درحقیقت اُسی عزیز کا کام ہے۔ اس طرز بیان نے کلام کو جو بیحد موثر اور پُر حسرت بنا دیا ہے وہ خود ہی

ظاہر ہے۔

مثال ۱۰۔ تمام اعزّا و انصار کے بعد جب امام حسین علیہ السلام تنہا رہ گئے اور زخمی ہو کر زمین پر تشریف لائے، تو اس دردناک حالت کو اہلبیتؑ سے نہ دیکھا گیا۔ چنانچہ اُسوقت حضرت قاسمؑ کی والدہ اپنے صغیر السن بچّہ کو میدانِ جنگ میں جانے اور چچا پر سینہ سپر ہونے کے واسطے آمادہ کرتی ہیں۔ اُنھوں نے بچّہ کو ہمت دلانے کے لیے درجہ بدرجہ جو ولولہ انگیز الفاظ فرمائے ہیں اُن کو کس بلاغت کے ساتھ بیان کرتے ہیں ؎

ماں رو کے بولی، کیا کہوں کیا پوچھتے ہو لال
ناطاقتی کا زور ہے، قوت کا ہے زوال

واری! تیرا چچا ہی تو ہے یہ لہو میں لال
بھیجوں کسے مدد کو کہ ہو تم تو خُرد سال

افسوس بھوک پیاس سے تم بیقرار ہو
کیونکر کہوں کہ جا کے چچا پر نثار ہو

کمسن ہو کیا بساط ہی روتے ہو پانی بن
جب سنّ پہ وہ چڑھے تھے، تو تھا نو برس کا سن

پر ہاں تمہارے دادا کے قائل ہیں انس و جن
مرتے ہیں مرد نام پہ دنیا ہے چار دن

انساں کرے وہ بات کہ اجر و جزا ملے
بندہ چلے وہ راہ کہ جس میں خدا ملے

جھولے میں تھے یہ زور جنابِ امیرؑ کے
رستم ہوئے غلام شہِ قلعہ گیر کے

تکیے کے نیچے رکھدیا اژدر کو چیر کے
کیوں تم بھی پوتے ہو اُسی شیرِ قدیر کے

بابا حسنؑ چچا ترا شاہِ شہید ہے

؎ اس مصرع کی بلاغت دیکھو۔ سب کچھ کہدیا اور کچھ بھی نہیں۔

گر تم بھی ایسے کام کرو کیا بعید ہے

شیرِ خدا کے چھوٹے بڑے شیر ہوتے ہیں
بچے بھی آبرو کے لیے جان کھوتے ہیں
بانوؑ کے شیرخوار تلک رن میں سوتے ہیں
خاطر ہی جمع، آپ بھی حیدرؑ کے پوتے ہیں

واری! ارادہ شرط ہی کارِ ثواب میں
حصہ دھرا ہوا ہے خدا کی جناب میں

حسرت ہی سوگ پیارے کا میں سوگوار لوں
رن پر چڑھو گے شاہِ نجف کو پکار لوں؟
دولہا بنو گے کنگھی سے زلفیں سنوار لوں
گردن سے طوق کانوں سے بندے اتار لوں

ننھی سی تیری لاش بھی اصغرؑ کے پاس ہو
سب منتیں بڑھاؤں جو پوری یہ آس ہو

آمین کہکے اُس نے کہا لو نہ کھاؤ غم
تم دودھ بخشو ہم سے بھی بابا کی لو قسم
اماں ابھی تو ہوتے ہیں صدقے چچا پہ ہم
مجکو خبر نہ تھی کہ ہیں مولا پہ یہ ستم

لو یہ مرے چچا ہیں، شہِ مشرقین ہیں!
ہی ہی یہ میرے قبلہ و کعبہ حسینؑ ہیں!!

جُھک جُھک کے اہلبیتؑ کو اُسنے کیا سلام
لیکر سلام دوڑ کے لپٹے حرم تمام
زینبؑ پکاری بھابی خدارا پسر کو تھام
اب اک یہ اسرا ہے ترا اور خدا کا نام

وہ بولی، مجکو آرزوے زندگی نہیں
دنیا میں جب حسینؑ نہیں تو کوئی نہیں

کیا بلاغت ہی کہ شروع کے بندوں میں مطلق کوئی حکم نہیں، مگر بتدریج اپنے فرزند کو نصرتِ امامِ مظلوم پر آمادہ کیا جاتا ہی۔ سب سے پہلے امام علیہ السّلام کی بیکسی و

مظلومی کا حال سُنا کر اُن کی دردناک حالت کا نقشہ کھینچتی ہیں۔ ع واری ترا چچا ہی تو ہے یہ لہو میں لال۔ ع ناطاقتی کا زور ہے قوت کا ہے زوال۔ اُسپر ترقی کرکے فرماتی ہیں کہ اب اسوقت اُن کا کوئی مددگار نہیں، ایک تم ہو سو خُرد سال ہو۔ ع بھیجوں کسے مدد کو کہ ہو تم تو خُرد سال۔ ع کم سن ہو کیا بساط ہے روتے ہو پانی بن۔ اُسپر ترقی کرکے فرزند دلبند کو دادا کے کارنامے سُنا کر جوش دلایا جاتا ہے کہ گو تم خرد سال ہو مگر تمھارے دادا نے تو خرد سالی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے ہیں ع جب رن پہ وہ چڑھے تھے تو تھا نو برس کا سن۔

ے جھولے میں تھے یہ زور جناب امیر کے تکیے کے نیچے رکھدیا اژدر کو چیر کے

ع۔ گر تم بھی ایسے کام کرو کیا بعید ہے۔

ع۔ مرتے ہیں مرد نام پہ دنیا ہے چار دن۔

جب جوش انگیز الفاظ سے اپنے نور نظر کے دل میں جاں نثاری اور ہمت کا کافی ولولہ پیدا کرلیا تو اُسوقت بطرزِ استفہام کہتی ہیں۔ ع۔ رن پہ چڑھو گے شاہِ نجف کو پکار لوں۔ اس میں بھی گو کوئی صریح حکم نہیں لیکن ایسا بلیغ استفہام ہے جس میں ضمناً و کنایۃً نہایت خوبی کے ساتھ میدان جنگ کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس سے اور زیادہ ترقی کی تو ایک تمنا کے پیرایہ میں اپنے مقصد کا صاف اظہار کردیا۔ ع۔ ننھی سی تیری لاش بھی اصغرؑ کے پاس ہو۔ ان بندوں میں رفتہ رفتہ اسلوبِ کلام کی ترقی سے جو بلاغت و لطافت پیدا ہوگئی ہے وہ نکتہ دانوں پر مخفی نہیں۔

مثال ۱۱۔ ہند زوجۂ یزید نے جب زندانِ شام میں قدم رکھا تو حضرت

زینبؑ کو دیکھ کر شک ہوا کہ شاید یہ دختر جنابِ امیرؑ ہیں۔ لیکن پھر ساتھ ہی اہلبیتؑ نبوی کی عظمت و شان پر غور کرتے ہوئے یہ امر قیاس میں نہیں آتا تھا کہ اُن کا اس حالِ تباہ میں ہونا ممکن ہے۔ اسلیے اُس نے چاہا کہ اپنا شبہ رفع کرے تاکہ اصلِ حقیقت معلوم ہو جائے۔ اس غرض سے اُس نے جناب زینبؑ کو اس طرح مخاطب کیا ؎

سُنی جو ہند نے آوازِ دخترِ زہراؑ
قریب آکے پکاری، اُٹھاؤ سر تو ذرا
ہے آشنا مرے کانوں سے کچھ تمھاری صدا
زمیں پہ رکھدیا زینبؑ نے سر کو اور یہ کہا

یہ سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہا بی بی
یہ مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا بی بی

پکاری ہند نہ مُنہ کو چھپائیے للہ
تمہاری شکل پہ پہلے جو مینے کی تھی نگاہ
تو ایک بی بی کا گذرا تھا شبہ تم پر آہ
اس اشتباہ سے ہے میرے دل کا حال تباہ

میں یاد کرتی ہوں، ایسا جمال کسکا ہے
زباں پہ لا نہیں سکتی، خیال جسکا ہے

خدا نہ جھوٹ کرے، راست ہے یہ میرا گماں
کہیں مدینے میں لاریب آپ کا ہے مکاں
جنابِ زینبؑ و کلثومؑ کا مکاں ہے جہاں
کبھی جناب بھی جاتی تھیں اُنکے گھر ہمراہ

شریکِ آلِ پیمبرؐ میں تم کو دیکھا ہے
جنابِ فاطمہؑ کے گھر میں تم کو دیکھا ہے

تمہاری شکل ہے زینبؑ کی شکل سے ممتاز
وہ میری بی بی ہے، یادش بخیر، عمر دراز
سخن میں آپ کے اُنکے سخن کا ہے انداز
وہی زباں وہی لہجہ ہے اور وہی آواز

جلال و دبدبہ زینبؑ کا آپ میں سب ہے
تمہارا نام ہی کچھ اور، یا کہ زینبؑ ہے

دیکھو ہند ابتدا میں صاف صاف اپنے شبہ کا اظہار نہیں کرتی، کہ شاید گمان غلط ہو، اسلیے اُس نے رفتہ رفتہ اسلوبِ کلام کو ترقی دی ہی۔ پہلے کہا کہ میرے کان تمہاری آواز سے آشنا ہیں۔ اس سے زیادہ ترقی کی تو کہا کہ تمہاری شکل پر ایک بی بی کا خیال گذرتا ہی جنکا نام زبان پر نہیں لاسکتی۔ پھر کہا کہ کیا آپ کا مکان مدینے میں ہی جہاں حضرت زینبؑ و کلثومؑ تشریف رکھتی ہیں؟ کیا آپ کبھی اُن کے گھر بھی مہمان جاتی تھیں؟ اسکے بعد کہا کہ میں نے تم کو حضرت فاطمہؑ کے گھر میں دیکھا ہی۔ مگر جب رفتہ رفتہ شبہ کم ہوتا گیا تو کہا کہ تمہاری شکل تو حضرت زینبؑ سے ملتی ہی اور گفتگو میں بالکل اُنہیں کا انداز ہی۔ آخر جب شک ایک کافی حد تک رفع ہوگیا تو صاف الفاظ میں کہدیا کہ آپ کا نام زینبؑ ہے یا کچھ اور۔ ان اشعار میں درجہ بدرجہ عاقلانہ و مودبانہ طرزِ گفتگو نے جو بلاغت پیدا کردی ہی اُسکا لطف اربابِ نظر خود معلوم کرسکتے ہیں۔

مثال ۱۲۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہل بیتؑ یزید کے دربار میں گئے اور امامِ ہمام کا سرِ مبارک طشت میں رکھا گیا تو ہند آپ کو پہچان کر بیساختہ پردے سے باہر نکل آئی، اُسوقت اپنے ناموس کی ہتک پر یزید کی تشویش و ندامت، اور اہلِ دربار کی پریشانی کی تصویر اس بلاغت کے ساتھ کھینچتے ہیں ؎

لرزے امرا، کانپ گیا حاکمِ اکفر — پردے سے یہ نکلی، وہ ہوا جامے سے باہر
درباریوں کو حکم دیا تخت سے اُٹھ کر — ہاں ڈھانپ لو رومالوں سے چہروں کو سراسر

رسوا ہوا اقلیم میں اب نام ہمارا
ناموس نکل آیا سرِ عام ہمارا

بانوئے حزیں سہم کے عابدؑ کو پکاری
منہ پھیر لو تم بھی یہاں ہند آتی ہی واری
زینبؑ پہ عجب قہر کا غصہ ہوا طاری
چلائی اب انصاف ترے ہاتھ ہی ناری

بنتِ شہِ مرداں ہوں نہ مرنے سے ڈرونگی
اسوقت تو قائل تجھے مجمع میں کرونگی

ان اشعار میں یزید اور اہلِ دربار کے کفر و ارتداد۔ اور بے حمیتی و جفا شعاری کو کیسے بلیغ اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہی۔ یزید اچھی طرح جانتا ہی کہ ناموس کا بے پردہ ہو جانا کیسی جانفرسا ذلت ہی، اپنی بیوی کے بے پردہ نکل آنے پر وہ بدحواس ہو گیا باوجودیکہ وہاں صرف معدودے چند امرا موجود تھے ہجوم عام نہ تھا، محل بھی اُسی کا تھا نہ کوچہ و بازار، پھر بھی اُسکو صدمہ ہوا اور درباریوں کو حکم دیا کہ اپنے چہرے ڈھانپ لیں، اس درد و قلق کے احساس پر بھی اُسکو حضرت زین العابدینؑ کی دردانگیز مصیبت سے کچھ ہمدردی نہیں ہوتی جو اپنی ماں بہنوں کو بلوائے عام میں دیکھ رہے ہیں اور دم نہیں مار سکتے۔ اسپر بھی اکتفا نہیں بلکہ زبان سے صاف صاف کہتا ہی کہ دربار میں ہمارے ناموس کے نکل آنے سے مُلک مُلک رسوائی ہوئی لیکن وہ محسوس نہیں کرتا کہ اہلبیتؑ کی دربدری سے خود رسول اللہؐ اور علی مرتضیٰؑ بلکہ اسلام کی توہین ہو رہی ہی۔

اُمرا بادشاہ وقت کی بیوی کو باہر دیکھ کر لرز گئے، مگر وہ جفا شعار امام حسینؑ کے حرم اور رسولؐ مقبول کی نواسیوں کو بے تکلف دیکھتے ہیں نہ دل لرزتا ہے

نہ بدن کانپتا ہی۔ حضرت شہر بانوؑ کی زبانی آخر بند کا دوسرا مصرع جو حضرت زین العابدینؑ سے کہا ہی ع۔ منہ پھیر لو تم بھی یہاں ہند آتی ہی واری۔ بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہی جس میں فصاحت و بلاغت کا عجیب نکتہ مضمر ہے، یعنی علاوہ اپنی دینداری اور پابندی شرع کے وہ یزید کو غیرت دلا کر متنبہ بھی کرتی ہیں کہ کسی نامحرم کی صورت دیکھنا بیدینی اور سنگدلی ہی، اسلیے وہ سہم کر اپنے بیٹے کو تاکید کرتی ہیں کہ تم بھی ہند کی جانب سے منہ پھیر لو "سہم کر" کا لفظ اور زیادہ پُرحسرت اور موثر و فصیح ہی۔ یعنی اُن کو مردوں کی مجلس میں ایک عورت کا بے پردہ نکل آنا ایسا عجیب امر معلوم ہوا کہ پریشان ہو کر سہم گئیں۔

مثال ۱۳۔

پہونچی صدا یہ کان میں حضرت کے الحذر	مندیل پھینک دی شہِ دیں نے زمین پر
اور خاک پر وہ بیٹھ گئے تھام کر جگر	زینبؑ پکاری خیر ہی یا شاہِ بحر و بر

شہ بولے ہمشبیہ پیمبرؐ ہوا شہید
زینبؑ تمہارا لاڈلا اکبرؑ ہوا شہید

یہ مثال مولوی شبلی کی مثال نمبر ۱۱ (صفحہ ۶۶) کے بالکل ہم مضمون ہی جس میں اُنھوں نے میر صاحب کے اس مصرع کی بلاغت کا اظہار کیا ہی۔ ع۔ یہ ہم تمہارے لال کے خوں میں نہائے ہیں۔ پس ہم بعینہٖ اُنھیں کے الفاظ میں اس مثال کی بلاغت کا بیان کرتے ہیں۔

یہ وہ موقع ہی کہ حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے وقت امام حسینؑ مضطرب ہو گئے ہیں، اور جناب زینبؑ کے دریافت کرنے پر، اُن کی شہادت کا واقعہ

بیان فرماتے ہیں۔ اس موقع پر الفاظ "تمہارا لاڈلا اکبرؑ" ایک خاص اثر پیدا کرتے ہیں حضرت علی اکبرؑ امام حسینؑ کے صاحبزادے ہیں لیکن آپ اُن کو حضرت زینبؑ کا لاڈلا کہہ کر خطاب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میں جو ایسا مضطرب ہو گیا ہوں، یہ تمہارے لاڈلے کی شہادت کا قلق ہے۔ انسان کو رنج و غم کی حالت میں جب کوئی نہایت قریب کا عزیز ہمدرد اور غمگسار مل جاتا ہے تو جوشِ محبت میں اُس غم کو اپنی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اُسی شخص کی طرف منسوب کرتا ہے، گویا اُس سے ایسی ہمدردی کی امید کرتا ہے کہ وہ واقعہ خود اُسی شخص پر پیش آیا ہے۔ یہاں اس طرزِ بیان نے زیادہ اثر اسوجہ سے پیدا کیا ہے کہ فی الواقع حضرت زینبؑ کو جناب علی اکبرؑ سے نہایت محبت تھی، علی اکبرؑ کو بچپن سے اُنھوں نے پالا تھا اور اُن کو اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ میر صاحب کے "تمھارے لال" کی طرح مرزا صاحب کا "تمھارا لاڈلا" بھی نہایت پُرحسرت اور پُرتاثیر ہے۔

مثال ۱۴۔

پردہ اُٹھا کے ڈیوڑھی سے زینبؑ نے کی نظر — دیکھا سلاح بانٹتے ہیں شاہِ بحر و بر
بیساختہ پکاری بہن صدقے آپ پر — حقدار امیدوار کھڑے ہیں اِدھر اُدھر

آقا ہر اک غلام کے جوہر شناس ہیں
دو نیمچے بھی تیغِ حسینیؑ کے پاس ہیں

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام تمام اعزا و انصار کو ہتھیار تقسیم کر رہے ہیں، اور جناب زینبؑ چاہتی ہیں کہ بزرگوں کے تبرکات میں سے اُنکے بچے بھی حصہ پائیں۔ اس مضمون کو کیسے حُسنِ طلب کے ساتھ ادا فرمایا ہے اور کس بلیغ

پیرایہ میں اپنے لڑکوں کی سفارش کرتی ہیں۔ ع۔ حقدار امیدوار کھڑے ہیں ادھر اُدھر۔ اخیر کا مصرع۔ دو بچے بھی تیغِ حسینی کے پاس ہیں۔ انتہا درجہ کا پُر مضمون موثر۔ اور بلیغ ہے، جسکا لطف دقیقہ رس اور نکتہ شناس طبیعتیں خود محسوس کر سکتی ہیں۔ اگرچہ حقدار ایک ہی شخص ہو، لیکن شریف زادیاں ہر موقع پر حقدار۔ امیدوار۔ دونوں لفظوں کو ایک ساتھ استعمال کرتی ہیں؛ یہاں زیادہ بلاغت یہ ہے کہ حقدار۔ امیدوار بھی دو ہی ہیں۔ ادھر اُدھر کے الفاظ نے ایک اور لطف پیدا کر دیا ہے۔

مثال ۱۵۔ امام حسینؑ جب جناب علی اصغرؑ کو فوجِ شام کے سامنے پانی مانگنے کیواسطے لے گئے ہیں تو اُن لوگوں سے جس انداز اور جس طریقے سے آپنے گفتگو کی ہے اُسکو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بھائی کے غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر
ناگاہ رن میں قتل ہوا نوجواں پسر

اکبرؑ کے بعد شہ کو ملا وقفہ اسقدر
پرسا کھڑے کھڑے دیا بانوؑ کو آنکر

روتے ہی آئے روتے ہی رن کو چلے گئے
اکبرؑ کی لاش رکھ گئے اصغرؑ کو لے گئے

آئے جو شاہ متصل لشکرِ جفا
چادر اُلٹ کے حال دکھایا صغیر کا

آنکھوں کے حلقے خشک زباں چھوٹا سا گلا
چاہا کہ پانی مانگیں، مگر آگئی حیا

مشکل سے اتنا لفظ کہا ڈوبا یاس سے
یارو! قریبِ مرگ یہ بچہ ہے پیاس سے

بلاغت کے ہر پہلو پر غور کرو۔ ممکن تھا کہ امام حسینؑ اپنی جانب سے اپنے خرد

سال بچے کیواسطے پانی مانگتے، لیکن تقاضائے غیرت زبان کو روکتا ہی، اسکے علاوہ یہ بھی خیال ہی کہ سنگدل دشمن اُن کی درخواست کو کبھی قبول نہ کرینگے۔ اسلیے خود علی اصغرؑ کی طرف سے طلب کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی طرف سے بھی صاف صاف سوال کرنا طبیعت گوارا نہیں کرتی، اسلیے پہلے تو کچھ کہنے کی عوض صرف بچے کا حالِ زار دکھانے ہی کو کافی سمجھا تاکہ زبان سے کچھ کہنا نہ پڑے ؎ چادر اُلٹ کے حال دکھایا صغیر کا :: اُنکھوں کے حلقے خشک زباں۔ چھوٹا سا گلا۔ لیکن جب دشمنوں پر اسکا بھی کچھ اثر نہوا تو چاہا کہ بچے کی طرف سے پانی مانگیں مگر اُس کی طرف سے درخواست کرنے پر بھی حیا آگئی۔ ع۔ چاہا کہ پانی مانگیں مگر آگئی حیا۔ مگر اسکے بعد بالکل مجبور ہو کر سوالِ آب کرتے ہیں لیکن وہ بھی مشکل سے۔ پھر کچھ کہا بھی تو صاف صاف نہیں جس میں مذلّتِ سوال کا شائبہ بھی پایا جائے بلکہ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ "یہ بچہ شدتِ تشنگی سے قریبِ ہلاکت ہے" جس سے اپنا مطلب بھی پورا ہو جاتا ہی، اور حقیقت میں دیکھو تو ایک امرِ واقع کا اظہار ہی اور کچھ نہیں۔ حضرت امام حسینؑ سے غیور اور باحمیت بزرگ کی عالی حوصلگی اور غیرتمندی کی یہ اصلی اور سچی تصویر ہی جسکو مرزا صاحب کے جادو رقم قلم نے نہایت بلیغ اور لطیف پیرایہ میں کھینچکر دکھا دیا ہی۔

مثال ۱۶۔ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہلِ حرم زندانِ شام میں گئے اور ہند نے وہاں پہونچکر اور جناب زینبؑ کو پہچان کر لونڈیوں سے کہا ہی کہ یہی میری بی بی حضرت زینبؑ ہیں تو وہ متعجب ہو کر ہند سے اس طرح کہتی ہیں ؎

چلائیں کنیزیں کہ سعادت ہی ہماری	سچ کہتی ہو بی بی؟ یہی بی بی ہیں تمہاری؟

کھاؤ تو قسم پنجتنؑ پاک کی واری	یہ حضرتِ زینبؑ ہے یداللہؑ کی پیاری

نانا کو اسی بی بی کے معراج ہوئی ہے ؟
ہے ہے نہ کہو یہ تو کوئی پیاروں موئی ہے

بخشی ہے قطار اونٹوں کی حیدرؑ نے گدا کو	اس عہد میں بیٹی ہوئی محتاج ردا کو
کیا بھول گئے لوگ پیمبرؐ کو خدا کو	پہچانیے خوب ان کی شباہت کو صدا کو

ہودج میں نہ محمل میں نہ ایوان میں دیکھا
کونین کی شہزادی کو زندان میں دیکھا

ان اشعار میں لونڈیوں کے تحیّر و استعجاب کو نہایت بلیغ اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ وہ خوب جانتی ہیں کہ جناب زینبؑ یداللہؑ کی پیاری ہیں، جنکے جاہ و جلال کا سکّہ دنیائے اسلام پر بیٹھا ہوا ہے، وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ اُنکے جلیل القدر نانا کو معراج کا شرف حاصل ہے، اُن کو اس بات کا بھی علم ہے کہ اُنکے باپ نے سائل کو اونٹوں کی قطار بخشدی تھی، اُن کو اسکا بھی یقین ہے کہ لوگ اسقدر جلد پیغمبر اسلام کو بھول نہیں سکتے۔ ان سب باتوں کے جاننے کے بعد وہ کیونکر مان سکتی ہیں کہ ایسے رفیع الشان خاندان کی عورتیں اسیر ہو جائیں۔ ان بندوں میں یہ دونوں مصرعے۔ ع کھاؤ تو قسم پنجتنؑ پاک کی واری۔ اور ع۔ پہچانیے خوب ان کی شباہت کو صدا کو بلاغت کی جان ہیں۔ قسم کھانے اور شباہت کو خوب غور سے دیکھنے کی فرمائش اسلیے ہے کہ لونڈیوں کے نزدیک خاندانِ رسالت کی عظمت و شان اسقدر مسلّم ہے کہ اُن کا زندانِ شام میں آنا عقل میں نہیں آسکتا اسلیے کہتی ہیں کہ تم کو کچھ دھوکا تو نہیں ہو گیا ان کی صورت اور آواز کو خوب پہچانیے "خوب" کا لفظ اور زیادہ فصیح اور

موثر ہے۔

مثال ۱۷۔ مدینہ میں کربلا سے قاصد آیا ہی، اور حضرت ام البنینؑ اُس سے امام حسینؑ کے حالات دریافت کرتی ہیں۔ اُنکے سوالات اور قاصد کے جوابات کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

کیا خطاب یہ قاصد سے پھر بحالِ تباہ
وہ بولا حال سُنو اپنے تینوں بیٹوں کا آہ

لے اب سُنا خبر بادشاہِ عرش پناہ
گیا جہاں سے پُر ارمان تیرا عبداللہؑ

غریب مرگیا برچھی کلیجے پر کھا کے
وہ بولی صدقے کلیجے پہ ابنِ زہراؑ کے

خبر حسینؑ کی دے مجکو اب برائے حسینؑ
پکاری وہ کہ یہ قربانِ خاکپائے حسینؑ

وہ بولا عونؑ بھی تیرا ہوا فدائے حسینؑ
سعادت اُنکی تھی اب کہہ تو ماجرائے حسینؑ

وہ بولا خون میں جعفرؑ بھی تیرا لال ہوا
گلا بھی کٹ گیا، لاشہ بھی پائمال ہوا

یہ بات سُن کے ہوئی غصے زوجۂ حیدرؑ
میں تجھ سے پوچھتی ہوں ابنِ فاطمہؑ کی خبر

کہا سوال دگر قاصد اجواب دگر
تو حال عونؑ کا کہتا ہی، قصۂ جعفرؑ

یہ کون اور میں کون، اور کس کے چار پسر
فدا حسینؑ پہ ایسے مرے ہزار پسر

ان تمام اشعار میں حضرت ام البنینؑ کی بے انتہا دلی محبت و الفت کا، جو انکو امام حسینؑ سے تھی، موثر و دلنشیں مرقع کھینچدیا ہی۔ مثلاً مقتضائے فطرتِ عام یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنے بیٹوں کی خیریت دریافت کرتیں، مگر انھوں نے

ایسا نہیں کیا بلکہ پہلے امام حسینؑ ہی کا حال پوچھتی ہیں۔ لیکن قاصد خود ہی اس خیال سے کہ ماں کو اپنی اولاد سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہی، سب سے پہلے اُنکے بیٹوں کے حالات بیان کرتا ہی۔ اس نازک موقع پر تقاضائے فطرت عام یہ تھا کہ جناب ام البنینؑ بیٹوں کے اچانک حادثہ کی خبر سُنتے ہی بیقرار ہو جائیں اور امام حسینؑ کا حال دریافت کرنے کے ہوش وحواس نہ رہیں، لیکن نہیں وہ اپنے بچوں کے مرنیکا حال سُنکر بدحواس نہیں ہوتیں، اور یہ دلشکن واقعات بھی جذبۂ محبت پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔ وہ بیٹوں کے حالات کو بے توجہی سے سُنکر بدستور امام حسینؑ کا حال دریافت کرتی جاتی ہیں، بلکہ آخر میں ناخوش ہوتی ہیں کہ میں فرزندِ فاطمہؑ کا حال پوچھتی ہوں اور تو غیر متعلق باتیں بیان کر رہا ہی۔ ایک دردرسیدہ ماں کا ایسے نازک موقع پر اپنے فطرتی جذبات کو قابو میں رکھ کر امام حسینؑ کے حالات سی اسقدر گرویدگی ظاہر کرنا حقیقت یہ ہی کہ ایک عدیم النظیر محبت کی اس سے زیادہ نمایاں مثال مشکل سے ملیگی۔ اور اس عجیب وغریب اُلفت کا سماں جس خوبی اور پُراثر طریقہ سے مرزا صاحب نے دکھایا ہی اُس سے اُنکے قلم کا زور اور زبانِ اُردو پر قدرت کا اظہار ہوتا ہی۔ اُنھوں نے اس موقع پر عام لوگوں کے فطرتی جذبات اور اہلبیتؑ کے خیالات کو الگ الگ دکھا کر ایک امتیازِ خاص پیدا کر دیا ہے اور یہی بلاغت کا اصل اُصول ہی۔

استعارات وتشبیہات مولف نے استعارات وتشبیہات کا جو بیان کیا ہی، بہت صحیح اور درست ہی، سوا اس غلطی کے کہ وہ ہر جگہ استعارہ اور تشبیہ کی ساتھ ساتھ تعریف کرتے ہیں اور کہیں اُن کی عبارت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دونوں میں

فرق کیا ہے۔ گویا وہ استعارہ اور تشبیہ کو دو مترادف الفاظ سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ مثالیں جو اُنھوں نے دی ہیں وہاں بھی استعارہ اور تشبیہ کی مثالوں میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا، دونوں کی الگ الگ مثالیں دینا لازم تھا چونکہ اُنھوں نے دونوں کے علیحدہ علیحدہ عنوان نہیں لکھے اسلیے ہم بھی اُنہیں کی تقلید کرتے ہیں۔

آگے چلکر وہ میر صاحب کے کلام میں تشبیہ کی خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اتنا ہم بھی اُنکے ہمخیال ہیں کہ "تشبیہ کی قابلِ قدر خوبیاں میر انیس صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں"، سوا اس فقرہ کے کہ "اُردو زبان میں اُن کی نظیر نہیں مل سکتی"، اسلیے کہ اُنہیں کے مقابلے میں ہم ایک دوسرے بلیغ اور نازک خیال شاعر مرزا دبیر صاحب کے کلام سے بھی چند ایسے ہی دلکش اور دلفریب نمونے پیش کرتے ہیں جس سے اُن کا کلیہ بالکل باطل ہوا جاتا ہے۔

مرزا صاحب نے خاص طور پر استعارات و تشبیہات میں وہ وہ حیرت انگیز جدّت طرازیاں اور بلند پروازیاں دکھائی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اور انہیں عدیم المثال نازک خیالیوں نے اُن کو شعرا میں ایک ممتاز فوقیت دیدی ہے، لیکن مؤلف کی طبعِ نازک سے اندیشہ ہے کہ وہ اس قسم کے نازک اور باریک استعاروں کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھ سکیں گے اور صاف کہدینگے کہ تکلف اور تصنع سے اثر میں کمی آجاتی ہے اور ہر چیز کا نیچرل حالت میں رہنا لازمی ہے۔

تمام حالتوں کو ظاہر کرنے کیواسطے نیچر سے کام نہیں لینا پڑتا بلکہ بعض اوقات مبالغہ اور استعارہ اور مضامینِ بلند کی چاشنی دیکر کلام کو پُرزور اور پُرشوکت بنانا

پڑتا ہے۔ اگر شعر و سخن میں معنی آفرینی نہ پائی جائے تو شاعری عبث ہے، اور پھر معنی میں لطافت و نزاکت نہ ہو تو شعر کو شعر نہیں کہہ سکتے۔" قدما اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے۔ برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصودِ شاعری) تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مرزا غالب ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے[۲]"

مرزا غالب کے فروغ کا باعث اُن کی بیمثال مضمون آفرینی۔ جدّت طرازی۔ اور بلند پروازی ہے، اور اسی مضمون آفرینی اور لطافتِ معنوی نے عرفی۔ و ظہوری کو اقلیمِ بلاغت کا تاجدار بنا دیا۔ لیکن ہم کو مولوی صاحب کی خاطر منظور ہے اسلیے ہم اُسی قسم کے استعارات و تشبیہات کی مثالیں دینگے جو اُنکے مرغوبِ طبع ہیں

مولف نے میر صاحب کی تشبیہات کی جو خصوصیات لکھی ہیں۔ اُن کی تفصیل یہ تحریر کی ہے۔

(۱) اکثر تشبیہات مرکّب ہیں (مرزا دبیر کے کلام میں بھی اکثر ایسی تشبیہات مل سکتی ہیں)

(۲) اکثر تشبیہات قریب الفہم اور سریع الانتقال الی الذہن ہیں، اور یہی تشبیہ کا کمال ہے (مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ کا کلام بھی ان تشبیہات سے خالی نہیں ہے)

---

۲ یادگار غالب صفحہ ۱۲۴۔

(۳) پھر لکھتے ہیں "علمائے معانی[1] نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبّہ کی رفعت و حُسن، اور کبھی تحقیر و ذلت، اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے، یہ باتیں میر انیس کی تشبیہات میں کمال کے درجہ پر پائی جاتی ہیں" اسکے بعد مولف نے مثالیں لکھی ہیں۔ ہم بھی اس موقع پر مرزا صاحب کے کلام سے اسی قسم کی تشبیہیں لکھتے ہیں مثلاً حضرت سید سجّاد کی حالتِ اسیری کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

تشبیہ کے غرض رفعت و حسن کی مثالیں

درازی مو

بڑھ گئے ہیں جو اسیری کے سبب سر کے بال
ہے عیاں آیۂ رحمت کا نزولِ اجلال
سنبلِ گلشنِ قدرت ہے فقط انکی مثال
بال اُن زلفوں کے ہیں بالِ ہمائے اقبال

طول کاکل کا اسیری میں جو یہ طور ہوا
سلسلہ بخشش امت کا دراز اور ہوا

عریانی

تن میں ملبوس نہ ہے دوشِ مبارک پہ عبا
قطع اس قد پہ ہے پیراہنِ تسلیم و رضا
بے لباس اس تنِ پُر نور کی ہے اور ضیا
طور کے شمع کو فانوس کی حاجت ہے کیا

پیرہن میں بھی تنِ پاک نہیں چھپتا ہے
نور خالق کا چھپائے سے کہیں چھپتا ہے

داغ کف دست

بسکہ کھینچی ہے مہارِ شترِ آلِ عبا
سو کفِ دست میں کس حسن سے گٹّا ہے پڑا
فی المثل مہر میں ہے داغِ قمر جلوہ نما
مُہرۂ مہر کجا، داغِ دلِ ماہ کجا

پشتِ احمدؐ پہ تو تھی مُہرِ نبوت پیدا
یاں کفِ دست میں ہے مُہرِ شفاعت پیدا

[1] تشبیہ کے حالات بیان کرنے کو علمائے علم معانی کی جانب منسوب کرنا چاہیے۔ کیونکہ تشبیہ و استعارہ و کنایہ و مجاز کے حسن و قبح سے بحث کرنا علمائے علمِ بیان کا کام ہے نہ علمائے علم معانی کا۔

حالتِ اسیری میں بالوں کا بڑھ جانا، یا جسم پر لباس کا نہ ہونا، یا اونٹوں کی رسن کھینچتے کھینچتے ہاتھوں میں گٹے پڑ جانا، عموماً ایک بدنما حالت ہی۔ اور اسکے اظہار سے ایک محترم اور معزز بزرگ کی نسبت ذلت کا خیال پیدا ہوتا تھا، مگر ان نادر تشبیہات نے بدنمائی اور ذلت کے عوض ایک خاص شان پیدا کر دی ہی۔

اسیری اہلحرم

یا مثلاً جب تمام اہلبیتؑ ایک ہی رسّی میں اسیر کیے گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ع سب درِ نجف رشتے کے حلقے میں در آئے

ع رسّی میں بندھا جبکہ وہ گلدستۂ اسلام

؎ رسّی میں بندھے سب حرمِ شاہِ شہیداں	جس طرح سے شیرازے میں سیپارۂ قرآن

رسّی میں باندھا جانا اور وہ بھی ایک ہی رسّی میں، بظاہر نہایت ذلت نما حالت تھی، لیکن تشبیہات نے بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا۔

یا مثلاً جب حضرت سجادؑ کی پشت مبارک پر درّوں کے زخم پڑ گئے ہیں تو اس حالت کو اس طرح بیان کیا ہی ؎

زخمِ تازیانہ

اور پشت ہی تختہ چمنِ خلد کا بیشک	درّوں کے گُلِ زخم شگفتہ ہیں ابھی تک

داغِ کفِ دست

اب داغِ کفِ دست میں حیران نظر ہی	یہ مردمکِ باصرۂ شمس و قمر ہے
یا زیبِ سمن لالے کا یہ داغِ جگر ہی	امت کے لیے حشر میں دوزخ کی سپر ہے

طوقِ گلوگیر

طوقِ گلوگیر کی اس طرح تشبیہ دیتے ہیں ؎

کرتا ہوں ثنا طوقِ گلوگیر کی اس جا | مدت سے ہی خورشیدِ امامت کا یہ ہالا

بیڑیاں

بیڑیوں کی اس طرح تشبیہ دیتے ہیں ؎

اور پاؤں میں ہیں بیڑیاں دو دو جو برابر | جوہر میں ہے آئینہ، اور آئینہ میں جوہر
پُر نور قدم سے ہوئے حلقے جو منوّر | اب سلسلۂ سلکِ ثریا سے ہیں بہتر

پائے قدِ بالا میں یہ زنجیریں کہاں ہیں
طوبیٰ کے تنے موجیں یہ کوثر کی عیاں ہیں

ہتکڑی

یا مثلاً حضرت سجّاد کی خوبصورت مگر لاغر کلائی میں ہتکڑی کی تشبیہ اس طرح دی ہے ؎

ہتکڑی میں ہے یہ پتلی سی کلائی روشن | یا ہلالِ شبِ اوّل کے ہے چوگرد گہن

نابینائی

یا مثلاً نابینائی ایک قبیح اور بدنما حالت ہی، لیکن تشبیہ نے کس طرح بدنمائی کو حُسن سے بدل دیا ہے ؎

شہرہ ہے ان سفید بھوؤں کے کمال کا | ہی رنگ بھی ہلال کا خم بھی ہلال کا

مردم عبث ہیں آنکھوں کے یاں اشتیاق میں
ہوتے نہیں چراغ مہِ نو کے طاق میں

بے چشم کے بھی باغ ہی چہرے کا خوشنما | نرگس نہو چمن میں تو نقصِ چمن ہے کیا

خیبر شکن کے شیعوں میں صف شکن ہوئے
خود شیر تھے سو چشم کے آہو ہرن ہوئے

یا مثلاً زندانِ شام میں ہند کی نظر اہلبیتؑ پر پڑی تو ؎

قدرت کے آفتاب چمکتے نظر پڑے | باغِ نبیؐ کے پھول مہکتے نظر پڑے

یا مثلاً حضرت امام حسینؑ کا سرِ مبارک چاہ سے نکلتا ہی تو اُس کی تشبیہیں لکھتے ہیں ؎

نکلی دہن سے شیشہ کے نکہت گلاب کی
یا چاہِ مشرقی سے کرن آفتاب کی
یا نافۂ بہشت سے بو مشکناب کی
یا آب و تاب درج سے لعلِ خوش آب کی

ع۔ شمعِ نبیؐ عیاں ہوئی فانوسِ چاہ سے

یوں فرقِ شاہ چاہ سے نکلا بحسن و جاہ
جیسے دہن سے کلمۂ حق، آنکھ سے نگاہ
مخزن سے گنج، شب سے سپیدۂ گہن سے ماہ
ظلمت سے خضر، غار سے پیغمبرِ الٰہ

ظلمت کی سیر کر کے سکندر عیاں ہوئے
بیر العلم سے ساقیِ کوثر عیاں ہوئے

یا مثلاً حضرت حبیبؓ ابن مظاہر کی پیری، ارتعاشِ اعضا اور ثابت قدمی کی مثال دی ہی ؎

سر ہلتا ہی پر ہر کفِ پا رن میں جمی ہے
جنبش میں ہی لو شمع کو ثابت قدمی ہے

یا مثلاً جب اعدا نے حبیبؓ ابن مظاہر کو پیری اور قد کی کجی کا طعنہ دیا تو وہ جواب دیتے ہیں ؎

قد خم ہو تو ہو عقل تو کج میری نہیں ہے
اسوجہ سے مائل مرا سر سوئے زمیں ہے
پوشیدہ زمیں میں نبیؐ عرش نشیں ہے
جھکنے ہی سے روشن بخدا نامِ نگیں ہے

غافل کو اشارہ ہے کہ محکومِ خدا ہو

ملنا ہی اسی خاک میں باطل سے جدا ہو

جھکنا شرفا کا ہے تقاضائے شرافت
جھکنے ہی سے افلاک کو حاصل ہوئی رفعت
خم ہونے سے محراب بنی جائے اطاعت
شاہد ہے رکوع اسپہ کہ جھکنا ہی عبادت

ڈرتے نہیں تم قدِ خمیدہ سے عجب ہی
جو تیغ کہ خمدار ہو کاٹ اُسکا غضب ہے

تشبیہ سے مذمت
تشبیہ

یا مثلاً اس شعر میں تشبیہ سے دشمن کی زشتی اور بداعمالی ثابت کی ہی ؎

تھا قلب میں صف کے عمرِ سعدِ ستمگر
جیسے دلِ کفار میں ہو کینۂ حیدر

یا مثلاً ان اشعار میں تشبیہ سے دشمنوں کے قد و قامت - تلوار - نیزہ - ڈھال اور مغفر کی زشتی و بدنمائی کو کس انداز سے ظاہر کیا ہی ؎

وہ گھوڑوں پہ یا پریوں پہ آسیب تھے اسود
تلوار بلا - نیزہ غضب - ڈھال شبِ تار

مغفر جو سرِ نحس پہ مغرور دھرے تھے
اُلٹے ہوئے دولوہے کے تنور دھرے تھے

؎ چار آئینے سے شہرِ بدن تھا حصار میں
اندھیر اُس کی ڈھال سے تھا روزگار میں

؎ تن میں زرہ تھی، خود سرِ بے شکوہ پر
وہ زین پر مکیں تھا کہ اژدر تھا کوہ پر

؎ نیزہ بکف اُن پر وہ شقی یک بیک آیا
گویا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک آیا

یا مثلاً جب حضرت حرؑ لشکرِ اعدا سے جدا ہوئے ہیں تو فوجِ مخالف کی زشتی ان الفاظ میں بیان کی ہی ؎

غل تھا وہ مشرکوں سے مسلماں جدا ہوا
ظلمت سے نورِ کفر سے ایماں جدا ہوا
نصرانیوں سے عیسیٰؑ دوراں جدا ہوا
بادل سے آفتابِ درخشاں جدا ہوا

جنت کو کس طریقے سے حرؑ بر محل گیا
عقرب سے چاند، چاہ سے یوسفؑ نکل گیا

حضرت زینبؑ کے صاحبزادے کا نیزہ دشمن کے منہ سے پار ہوتا ہی ؎

نیزے کی زباں تھی دہنِ نحس کے اندر عقرب میں قمر، دلو میں خورشیدِ منوّر

ع۔ انگشتِ یداللہ میں ہے کلّہ اثر در

(۴) پھر لکھتے ہیں "محسوسات سے جو تشبیہ دیجاتی ہی، نہایت عمدہ خیال کی جاتی ہی، کیونکہ محسوسات رات دن محسوس ہوتے رہتے ہیں اسلیے اُنکے ذکر کے ساتھ فوراً اُن کی صورت ذہن میں آجاتی ہی اور اسلیے مشبّہ کی تصویر بھی آنکھوں میں پھر جاتی ہے"۔ یہاں ہم مرزا صاحب کے کلام سے بھی محسوسات کی تشبیہوں کی چند نفیس مثالیں درج کرتے ہیں۔

مثلاً بھاگڑ اور اضطراب کا بیان ؎

یوں جسم رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں
جس طرح بھاگیں زلزلے میں چھوڑ کر مکاں

یہاں یہ تشبیہ دی گئی ہی کہ جسموں سے جانیں اس طرح نکل گئیں جیسے لوگ زلزلے میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس مقام پر رعشہ دار جسم کو زلزلے والے مکان سے جو تشبیہ دی ہی اُسنے ایک خاص لطافت پیدا کر دی ہی۔

تلوار کے جوہروں کی تعریف ؎

جوہر نہ تھے وہ تیغِ شہِ خوش خصال میں
دن کو چمک رہے تھے ستارے ہلال میں

دو حریف برچھیوں سے ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں اور نیزوں کی انیاں متحرک ہوتی ہیں ؎

پھل نیزوں کے اس طرح لرزنے لگے نہیں | جس طرح زباں سانپ کی ہلتی ہے دہن میں

حضرت علی اکبرؑ کی نیزہ برداروں سے لڑائی ہے

دکھلاتے تھے دادا کے ہنر اہلِ دغل کو | پھولوں کی طرح توڑتے تھے نیزوں کے پھل کو

نیزوں کے لچکنے کی تشبیہ ع نیزے افعی کی طرح ہاتھوں میں بل کھانے لگے۔
تلوار اعدا کی ڈھالوں میں ڈوب کر کس طرح نکلتی ہے

فوراً سپر میں ڈوب کے باہر یہ پھل گیا | گویا گہن میں آکے مہِ نو نکل گیا

حضرت عباسؑ کا جسمِ مبارک زرہ میں ہے

مابینِ زرہ ہے تنِ عباسِ علمدار | یا موجوں میں لہراتا ہے خورشیدِ ضیا بار
یا چاند کے آئینے سے جوہر ہیں نمودار | یا گرد ہے طوبیٰ کے عیاں سنبلِ گلزار

تشبیہیں مرے ہاتھ یہ جوشن سے لگی ہیں
تاروں کی یہ آنکھیں تنِ روشن سے لگی ہیں

تلوار زرہ کو کاٹ کر نکل جاتی ہے

کاٹ کر یوں زرہِ جسمِ لعیں پار ہوئی | دام سے جیسے نکل جائے تڑپ کر مچھلی

یا مثلاً باوجود پیری اور ارتعاشِ اعضا کے حضرت حبیبؑ ابن مظاہر کی ثابت قدمی کی مثال دی ہے

سر ہلتا ہے پر ہر کفِ پا رن میں جمی ہے | جنبش میں ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

یا مثلاً آنکھوں کی سیاہی و سفیدی کی کیسی نادر تشبیہ دی ہے

اس سپیدی و سیاہی کا بہم ہے یوں نور | آبِ حیواں کا ہو جس طور سے ظلمت میں ظہور

چشمۂ کوثر و تسنیم کے یہ جام ہیں دو

ایک گردش میں نمایاں سحر و شام ہیں دو

یا مثلاً تلوار کے زرہ اور جسم کو کاٹنے کی یہ تشبیہ دی ہی ؎

غائب ہوئی زرہ جو بدن پر یہ چل گئی
یونس پکارے جال کو مچھلی نگل گئی
چار آئینہ لہو سے ڈبو کر نکل گئی
پتھر نگل کے لعل بدخشاں اگل گئی

حضرت امام حسینؑ کے دستِ منوّر میں نیزہ ؎

نیزے کی چمک دستِ منوّر میں کہوں کیا
ہی خطِ شعاعی کفِ خورشید میں پیدا

(۵) پھر کہتے ہیں کہ "بعض جگہ تشبیہہ سے مبالغہ مقصود ہوتا ہی، اگرچہ فی الحقیقت اس سے تشبیہ کی اصلی غرض نہیں حاصل ہوتی کیونکہ مبالغہ خود ایسی چیز ہی جو اصلیت سے دور کر دیتی ہی" اس کی مثالیں مرزا صاحب کے کلام سے ملاحظہ ہوں۔

گرمی کی شدت کا بیان ؎

مثلِ تنورِ گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
گلخن صدف تھے، دانۂ بریاں درِ خوش آب
آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

پوشیدہ چشمِ خلق سے مرغِ نگاہ تھا
کیا دھوپ تھی کہ رنگ فلک کا سیاہ تھا

ؔ چار آئینہ کو پتھر سے تشبیہ دی ہی اور اُسکا لہو سے ڈوب جانا بالکل گم ہو جانا ہی۔ لہو کو لعل سے تشبیہ دی ہی پس گویا تلوار نے پتھر (زرہ) کو نگل کر لعل بدخشاں (خون) اُگلا ہی۔

کیا دہوپ سے کیا تابشِ خورشیدِ فلک سے
سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہے

حضرت عباسؑ کی شمشیر شرربار کی دہشت سے

یہ ہیبتِ شمشیر کا واں جوش ہوا تھا
جو موجوں سے دریا بھی زرہ پوش ہوا تھا

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار
تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گرانبار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفار
اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدمِ پیر کی مانند

کم زور خوف سے ہوئے ایسے عدوے دوں
مغفر کا بوجھ کوہِ گراں سے ہوا فزوں
بارِ سپر سے گرتا تھا یوں ہر قدِ زبوں
جس طرح بارِ سقف سے اُفتادہ ہو ستوں

اب ہم چند اشعار ہر قسم کی تشبیہ کے ایک جا نقل کرتے ہیں، جنسے اندازہ ہوگا کہ مرزا صاحب نے تشبیہہ میں کیا کیا لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں سے

صف بستہ تھا اس طرح سے شبیرؑ کا لشکر
تسبیح میں جس طرح سے دانے ہوں برابر

بہر گریز تھے قدمِ فوج یوں بہم
خامے کے جس طرح سے برابر اٹھیں قدم
لرزاں تھے مثلِ شعلہ ہر اک ہاتھ میں علم
جویاں تھی تیغ دیدۂ جوہر سے دمبدم

ولہ

اِستادہ تھے رسولؐ کے پیارے زمین پر
روشن تھے دن کو عرش کے تارے زمین پر

پیوستہ نیزے سینے میں پیکاں جگر میں تھے
وہ مہر میں کرن، یہ ستارے قمر میں تھے

یوں زین پہ زینت تھی علمدارِ جری کی
جیسے دلِ مومن میں جگہ حبِّ علیؑ کی

ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام
بالکل اُلٹ دیئے تھے حبابوں نے اپنے جام

دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
منہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

نعرے میں ہی ضیغم، یہ عجب تیز پری ہے
افلاک کے نوشیشوں میں بس ایک پری ہے

چمکا جو علم چار طرف یہ خبر آئی
لو کاہکشاں آج زمیں پر اُتر آئی

جب ہاتھ میں تلوار کا پر تو نظر آیا
خورشید کے پنجے میں مہِ نو نظر آیا

آخر پسینہ آگیا ماتھے پہ، تھک گئے
زہراؑ کے آفتاب پہ تارے چھٹک گئے

کیا تیغِ آبدار تھی جوہر سے خوش جمال
منجدھار میں کھڑی تھی پری کھولے سر کے بال

ابرو کا رخِ صاف میں پرتو نظر آیا
خورشید کے پلّے میں مہِ نو نظر آیا

عباسؑ سے کیا زین مزیّن نظر آیا
یوسفؑ بھی نہ یوں چشمِ زلیخا میں سمایا

پھر میان سے تیغِ دو زباں کھینچ لی اکبرؑ
اژدر کے دہن سے ہوئے دو شعلے نمودار

خاصانِ حق کے خاص ہو، نیکوں کے نیک ہو
مثلِ نگاہ تم مری آنکھوں میں ایک ہو

شمشیر بھی غلاف سے باہر نکل پڑی
غُرفے سے حورِ خلد کھُلے سر نکل پڑی

کیا تیغِ دو زباں کی تجلّی تھی میں فدا
دو شعلے ایک شمع، زہے قدرتِ خدا

آگے بڑھی جو دل پہ یہ قبضہ کیے ہوئے
غل تھا پری وہ اُڑ گئی شیشہ لیے ہوئے

تیغ کے سائے نے دکھلا دیا آتش کا اثر
آبلے پڑ گئے گویا بدنِ دریا پر

سب شیرِ حق کے لال ہیں زہراؑ کے پیارے ہیں
دُرِ نجف ہیں عرشِ معلّےٰ کے تارے ہیں

کیا حُسن ہے کیا نور ہے کیا جلوہ گری ہے
یاں شب کی طرح صبح ستاروں سے بھری ہے

قطرے رُخِ پُرنور سے ڈھلتے ہوئے دیکھو
عطرِ گلِ خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

دندان و دہن کی ہے ثنا میرے سبق میں
دنداں ہیں دہن میں کہ ستارے ہیں شفق میں

غل تھا کہ دھوپ دیکھنے کو سب ترستے ہیں
چھایا ہے ابرِ تیغِ علیؑ سر برستے ہیں

پیاسا ہوا جو ذبح پسر بوتراب کا
اُلٹا ہے دستِ موج نے کاسہ حباب کا

تھے آس پاس یوں رفقا اُس جناب کے
تارِ شعاع جیسے ہوں گرد آفتاب کے

حضرت امام حسینؑ کی تلوار کا ابر میدان میں چھایا ہوا ہے دشمن خوف سے بھاگ گئے ہیں۔ ع۔ بدلی بھی تھی گھری ہوئی مطلع بھی صاف تھا۔

گھوڑے عرق آلودہ ادھر اور اُدھر آئے
بجلی سے برستے ہوئے باراں نظر آئے

باندھی سپرِ تیغ تو جلوہ ہوا گھر میں
خورشید تھے شانوں پہ نو تھے کمر میں

رُخ کرتا تھا جس صف کو وہ ابنِ شہِ مرداں
ایک پل میں الٹتی تھی وہ مثلِ صفِ مژگاں

اکبرؔ لیے ہیں ہاتھ میں تیغ جدال کو	پنجے میں آفتاب کے دیکھو ہلال کو

صنائع و بدائع

اب مولف اُس مقام پر آپہونچے جہاں مرزا دبیرؔ کی شاعری کا آفتاب اوجِ کمال پر نظر آنے لگیگا۔ کیونکہ اُنھوں نے صنائع و بدائع میں عجیب و غریب کمالات دکھائے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ اُنکے ذہن کی بلند پروازی اور خیالات کی رفعت قابلِ تعریف سمجھی جاتی ہی۔ اُنکے نفیس کلام نے جونکتہ سنجانِ سخن کے دلوں کو تسخیر کر لیا ہے اُس میں بہت سا حصہ صنائع بدائع کی دلفریبیوں کا ہی۔ مگر ان پاکیزہ نکات کی قدر صرف اہلِ مذاق ہی کر سکتے ہیں، قابل مولف نے تو عام طور پر فتویٰ لگا دیا کہ اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں، حالانکہ ہر زبان اور ہر زمانے میں صنائع بدائع کی گرم بازاری رہی ہی۔ عربی و فارسی کے تمام نامور شعرا نے اُن کو برتا ہی اور اب بھی کوئی زبان اس چاشنی سے خالی نہیں۔ ہر زبان کے لٹریچر کے مختلف مدارج ہوا کرتے ہیں، پہلا عام درجہ جس میں معمولی روزمرہ کے خیالات سیدھی سادھی زبان میں ادا کیے جاتے ہیں، اور اس موقع پر صاف رستہ اختیار کر لیا جاتا ہی، مگر جب یہ لٹریچر عام درجہ سے خاص اور خاص سے خاص الخاص کے درجے پر پہونچ جاتا ہی تو اسکے واسطے صنائع و بدائع۔ تشبیہات و استعارات لازمی ہو جاتے ہیں تاکہ کلام میں رفعت و دلفریبی کی ایک شان پیدا ہو جائے۔ جن صنائع بدائع سے مولف کو نفرت ہی وہ اُن عام شعرا کی نازک خیالیاں ہیں

جنھوں نے گویا اپنے کلام کی بنیاد ہی صنائع بدائع پر رکھی ہے، اور تکلف و تصنع جا و بیجا بھونڈے طریقے پر اُن کو استعمال کرتے ہیں، جن کی توجہ محض الفاظ کی کاریگری پر رہتی ہے اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہتا ہے۔ لیکن جو عالی دماغ اور قادر الکلام شاعر ہوتے ہیں اُن کا مقصود اصلی تو یہی ہوتا ہے کہ کلام پُر زور۔ پُر تاثیر۔ پر مضمون اور لفظاً و معناً فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو، اسکے بعد ضمناً صنائع و بدائع کا استعمال ایسی بے تکلفی اور بیساختگی سے کرتے ہیں کہ وہ معنی مقصود میں مطلق مخل نہوں بلکہ اُس میں اور زیادہ قوت پیدا کردیں، شعر کا حُسن دوبالا ہوجائے گویا شاہدِ معنی کو زیور سے آراستہ کردیا۔ چنانچہ اس موزونیت کے ساتھ صنائع بدائع کے استعمال کو نیچرل شاعر بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مولانا حالی صاحب جو نیچرل شاعری کے سب سے زیادہ دلدادہ، اور صنائع بدائع کے بیحد مخالف ہیں، مقدمۂ شاعری میں فرماتے ہیں "خاص خاص صنائع عربی اور فارسی کے نامور شعرا نے برتی ہیں، مگر کبھی اُن کا التزام نہیں کیا اور کلام کی بنیاد اُن پر نہیں رکھی، ہاں اگر حُسنِ اتفاق سے کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حُسن پیدا ہوجائے ایسے موقع کو بلاشبہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا"[1]

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں "شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو موثر ہو لفظاً و معنیً سانچہ میں ڈھلا ہو، اگر اسکے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اور بہتر ہے ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں"[2] آگے چلکر مولف خود صنائع بدائع کی ہر دلعزیزی کو

[1] مقدمۂ شاعری صفحہ ۱۷۰ [2] مقدمۂ شاعری صفحہ ۱۷۰

تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھا ہے "میر انیس جس زمانے میں تھے اُس زمانہ میں عام طور پر صنائع بدائع کو بنظرِ استحسان و مقبولیت دیکھا جاتا تھا" اس سے معلوم ہوا کہ جس رنگ کو مرزا صاحب نے کمال پر پہونچا دیا اُس کی دنیا کو کسقدر تلاش تھی، یہی وجہ ہی کہ اُنھوں نے زمانے کا رُخ دیکھ کر اسی پر زیادہ توجہ کی اور اُسکو ترقی کی اُس منزل پر پہونچا گئے کہ اب اُس سے ایک قدم بڑھنا ناممکن ہی۔ اگر زباندانی اور سلاست پسندی کا زیادہ چرچا ہوتا تو وہ سب کو چھوڑ کر ہمہ تن اسی پر متوجہ ہو جاتے پس اُنھوں نے سلاست و سادگی پر اُسیقدر توجہ کی جسقدر اُس زمانے میں اسکی مانگ تھی تاکہ یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ کسی صنف میں عاجز اور مجبور نہیں اور اُنکے کلام سے ہر مذاق کے لوگوں کو حظ حاصل کرنے کا موقع ملے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ "میر انیس نے لغو صنعتوں (اہمال۔ لزوم مالایلزم وغیرہما) کو بہت کم برتا باقی صنعتوں کو اس طرح برتا کہ کلام کی اصلی خوبی یعنی برجستگی۔ صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے ہم ان تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں جو میر صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں"۔ معلوم ہوا کہ مولف کو صنعتوں سے تو کچھ مخالفت نہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ اُن کو اس طرح برتا جائے کہ کلام کی برجستگی میں فرق نہ آنے پائے۔ لہذا ہم بھی مرزا صاحب کے کلام سے اُسی قسم کی صنعتیں بیان کرینگے جو نہایت صفائی کے ساتھ استعمال کی گئی ہیں۔

پہلے ہم اُن صنعتوں کو لکھتے ہیں جو مولف نے میر صاحب کے کلام سے انتخاب کی ہیں، اسکے بعد مرزا صاحب کے کلام سے چند جدید صنعتیں لکھیں گے۔

ایہام - یعنی ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک معنی مراد ہوں اور دوسرے معنی

اگرچہ مراد نہوں لیکن مقدّم و موّخر الفاظ سے اُن کو مناسبت ہو۔ مثلاً ع۔ ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ رنگ کے دو معنی ہیں ایک تو معمولی رنگ، دوسرے بمعنی طرز و قسم اور یہاں اسی سے مراد ہی۔ پہلے معنی مراد نہیں لیکن گُل سے اُن کو مناسبت ہی۔ اب ہم اس صنعت میں مرزا صاحب کے کلام سے چند مثالیں لکھتے ہیں ؎

بُرجوں کو اپنی مہر سے شمس و قمر ملے	دریا کو اپنی چاہ سے لعل و گہر ملے
بے پر نے مس کیا جو ہمیں، بال و پر ملے	فطرس کے ذہن میں نہ یہ رُتبے تھے پر ملے

پر تیرا باپ کون تھا دل میں خیال کر — حیرت ہی سعد کا پسر اور نحس اسقدر

نظارہ غنیمت رخِ پُر نور کا جانا — موسیٰ کو پہاڑ آج ہوا طور کا جانا

پہلے خطاب قاریوں سے شہ نے یہ کیا — قرآں کے حفظ کرنے میں ہو وقف دائما
پر حفظِ آبروے پیمبرؐ نہیں ذرا — معنوں کو چھوڑ کر ہوئے حرف آشنا تو کیا

ثابت ہی کہ سیّارہ ہر اک ماند ہوا ہے — سیّارے ہیں کیا شہر بدر چاند ہوا ہے

اس نیرے سے مباحثہ کی کسکو تاب ہے — گویا زباں کی طرح یہ حاضر جواب ہے

جان اِسطرف رواں تھی قرار اُسطرف فرار | قالب سے رُوح بھاگ گئی دل تو درکنار

احمدؐ مدینہ علم کا در بوتراب ہے | اس باب میں حدیثِ رسالتمآب ہے

ہستی پکاری وہ نظر آئی اجل مجھے | چلایا دن کہ آج ملے گی نہ کل مجھے

مصری نبات کر سکے سب بولے الاماں | بُت بنکے گبر رہگئے پتھرائیں انگلیاں

اس نام کے لیتے ہی طبیعت کا بڑھا زور | شیریں سخنی کا مری عالم میں ہوا شور

بازارِ قدرِ آبِ بقا ہے ذقن سے سرد | پانی کے آگے جیسے تیمم کا حکم گرد

کیوں مُنہ پھرا کے خلد سے دوزخ میں جاتے ہو | بیوجہ تم حسینؑ کا نقشہ مٹاتے ہو

مجرے کو خم کماں لیے چرخِ بریں ہوا | اور تیرِ فتنہ سہم کے چلّہ نشیں ہوا

ع - ہر حال میں حسینؑ پہ رونا ہی فرضِ عین

ع - پلّے پہ تم ہو شیعوں کے میزاں کا ڈر نہیں

ع - زخموں کا خون راہ میں تیری سبیل ہے

ع - سر جاتا ہی پر فرق نہیں بات میں آتا -

ع۔ پنکھا لیے جعفر بھی ہیں طیار پروں کا

ع۔ تھی عین آنکھ میں پہ نظر کو خبر نہ تھی

مبالغہ

مبالغہ مبالغہ، یعنی کسی وصف کی شدت یا ضعف کا اُس حد تک دعویٰ کرنا کہ اُسکا وہانتک پہونچنا بعید یا محال ہو، تاکہ سامع کو یہ گمان نہ رہے کہ اس وصف کی شدت یا ضعف کا کوئی مرتبہ باقی ہی، فن بدیع کے لحاظ سے یہ تین قسم کا ہوتا ہی۔ اوّل یہ کہ عقلاً و عادتاً ممکن ہو اسکو تبلیغ کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ باعتبار عقل ممکن اور باعتبارِ عادت محال ہو اسکو اغراق کہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ باعتبار عقل و عادت دونوں کے محال ہو اسکو غلو کہتے ہیں۔ واقعی مبالغہ اُسی حد تک دلفریب معلوم ہوتا ہے کہ جس میں حد سے زیادہ استبعاد نہ پایا جائے، لیکن اہلِ مذاق کو کیا کیا جائے، خود عرب میں جب تکلّف و تصنّع کو ترقی ہوگئی تو مستبعد و ناممکن مبالغات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ مولف بھی مقر ہیں کہ "میر انیس کے زمانے میں مبالغہ کمال کی حد تک پہونچ چکا تھا اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب تک مبالغہ میں انتہا درجہ کا استبعاد نہو، سامعین کو مزہ نہیں آتا تھا" ہمارے خیال میں بھی سامعین کی یہ گرویدگی کچھ معیوب نہیں کیونکہ علمائے علم بدیع کے نزدیک اُن مبالغوں میں جو عقلاً و عادتاً محال ہوں، اگر ایسے الفاظ لائے جائیں جو اُن کو قرینِ صحّت بنادیں تو پھر ایسے مبالغے مقبول سمجھے جاتے ہیں مثلاً سودا کا ایک شعر ہی ؎

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہی لیکن جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم ہی خزاں کا

شاعر کو اس مضمون کا بیان کرنا مقصود ہی کہ گلشنِ دنیا کی بہار اسقدر ناپائدار ہی کہ آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی جاتی رہتی ہی، لیکن یہ قرینِ صحت نہیں ہوسکتا کیونکہ ساری

فصل کا اس قلیل عرصہ میں بسر ہوجانا نہ باعتبارِ عقل ممکن ہی نہ بلحاظِ عادت۔ لیکن جب آنکھ کھلنا گُل کی طرف منسوب ہوا تو وہ امر مقروں بصحت ہوگیا۔ کیونکہ پھول کھلنے کے بعد ہی (جو گویا اُسکا آنکھ کھولنا ہی) ٹوٹ کر گر جاتا ہی اور یہی اُس کی خزاں ہے۔ یا اسی طرح ایسے مبالغوں کے ساتھ نازک و لطیف خیالات ہوں تو ان خیالات کی لطافت کے سبب وہ مبالغے باوجود قرینِ صحت نہ ہونیکے بھی مقبولِ طبائعِ اہلِ بلاغت ہوجاتے ہیں۔ جیساکہ ہم مرزا صاحب کے کلام میں اس امر کو اچھی طرح ثابت کرینگے۔ لیکن میر صاحب نے مبالغہ کو اُسی حد تک جائز سمجھا جہانتک اُن کے کلام کی بیساختگی و سلاست متحمل ہوسکے یعنی اکثر تبلیغ و اغراق سے تجاوز نہیں کیا شاید اسی وجہ سے اُنکے مبالغوں کو بقول مولف لوگوں نے دلچسپی کی نگاہوں سے نہ دیکھا ہو، اور اس میدان میں وہ اپنے حریف مرزا دبیر سے پیچھے رہ گئے ہوں۔ مرزا صاحب چونکہ ہمیشہ زمانے کے رخ اور مذاق خاص و عام کے مطابق کام کرتے تھے اسلیے اُنھوں نے مبالغوں میں بھی وہی انداز اختیار کیا جو اہلِ مذاق کو مرغوب و مطلوب تھا کیونکہ شعرا ہمیشہ سامعین کے مذاق کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اگرچہ دوسرے بلند خیال شعرا کی طرح مبالغوں میں بعض بعض جگہ تبلیغ سے گذر کر اغراق و غلو سے بھی کام لیا ہی۔ لیکن ایسے دلچسپ پیرائے میں ادا کرتے ہیں کہ طبیعت کو ایک حظ حاصل ہوتا ہی اور بیساختہ اُن کی جدت۔ رسائی طبع۔ باریک بینی۔ نکتہ سنجی بلند پروازی کی داد دینی پڑتی ہی۔ اب ہم اس موقع پر اُن نفیس و نادر مبالغوں کو بھی پیش کرینگے جنکو جمہورِ انام نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا گو مولف کو ناپسند ہوں اور پھر وہ مبالغے بھی تحریر کرینگے جو مولف کو مرغوب ہیں اور جیسے اُنھوں نے

میر صاحب کے کلام سے انتخاب کیے ہیں یعنی جو حد سے زیادہ مستبعد و ناممکن نہوں اور جس میں کلام کی بیساختگی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

گرمی کی شدت کے بیان میں لکھتے ہیں ؎

لکھا ہی عجب فصل میں شرب سے چلے شاہ
یہ دھوپ کی شدت تھی کہ العظمۃ للہ

ان روزوں میں چلتا تھا مسافر نہ کوئی راہ
پرواز سے تھا مرغِ تصور کو بھی اکراہ

لوں چلتی تھی ایسی کہ جلے جاتے تھے ذرے
اسپند کی مانند نظر آتے تھے ذرے

تپتی تھی زمین آہنِ حداد کی تمثال
شہبازِ نگہ کھول نہ سکتا تھا پر و بال

خرمن میں ہر اک دانہ سیہ تھا صفتِ خال
بے رنگِ شفق منہ فلکِ سبز کا تھا لال

اس فصل کی شدت اگر آجائے بیاں میں
غلب ہی کہ چھالے پڑیں خامے کی زباں میں

تھی اس برس وہ شدتِ گرما کہ الحذر
مثلِ چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر

جائے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمر زمینِ گرم تھی ذرے سپند تھے

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

گلخن صدف تھے دانۂ بریاں دُرِ خوش آب
آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی
رنگت ہی برجِ حوت میں ماہی کباب کی

دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی
حدّت ہی موج موج میں تیرِ شہاب کی

فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش

نبضیں چھٹیں شرر کی سقر کانپنے لگے
شعلے زباں نکال کے خود ہانپنے لگے

گھوڑے کی تعریف

چالاکیِ رہوار سے مردم تھے مکدّر
ابرو کی طرح رکھتا تھا نعل آنکھوں کے اوپر

گھہ پھرتا تھا پتلی کی طرح آنکھوں کے اندر
گہ مثلِ نگہ صاف نکل جاتا تھا باہر

کھنچتی نہیں اب تو سن چالاک کی تصویر
عاجز میں نہیں ہوں کہ ہوا کو کروں تسخیر

آتا ہی نہیں ذہن میں کیا کیجیے تدبیر
دل آپ کو حیرت زدہ، عقل آپ کو دلگیر

ہرگز صفتِ اسپ ہنرمند نہ ہوگی
اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہ ہوگی

ہی تیز قدم یہ، جو پنہاؤ اُسے ہیکل
ہیکل کی صدا سنتے ہی یہ اسپ ہو بیکل

ہیکل کی صدا کان کے اندر نہ در آئے
اس عرصہ میں یہ سیر دو عالم کی کر آئے

کہتا تھا فرس ڈھونڈھ تو لے کوئی کہاں ہوں
آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے نہاں ہوں

یہ کہہ کے بڑھایا جونہی گھوڑے کو اُدھر سے
مانندِ تصوّر ہوا پوشیدہ نظر سے

سرعت یہ ہی گر آئینہ خانہ میں رواں ہو
ہرگز نہ کسی آئینے میں عکس عیاں ہو

چالاک ہی اس درجہ عقابِ علی اکبرؑ
آرام نہیں مدح کے حرفوں کو ورق پر

جولانیِ فرس کو کروں کیا میں آشکار
آہو کی طرح ہوتے ہیں مضمون بھی فرار

اس ابروے شمشیر کی جنبش ہوئی بہونچال
مانندِ مگس چہرے سے ظالم کے اُڑے خال
مکر اُسکا چلا کوئی نہ پھرتی کی کوئی چال
خود پلکوں میں چھپنے لگی پتلی کی طرح ڈھال

تارِ نظر اس تیغ کے بڑھنے سے گھٹے تھے
آنکھوں میں جو تھے نشّہ کے ڈورے وہ کٹے تھے

وجہ خمِ شمشیر مرے قبضے میں آئی
دنیا میں جگہ سر کے اُٹھانے کی نہ پائی

مغروروں کو تصویر تواضع کی دکھائی
یا بوجھ نے جوہر کے کمر اُس کی جھکائی

رُک رُک کے قدم رکھتی تھی ہر سر پہ ادب سے
جھک جھک کے مثالِ شرفا ملتی تھی سب سے

خون اعدا کا ہوا نہر صفت رن میں رواں
تھے تپاں مچھلیوں کی طرح زرہ پوش جواں
خوف سے زندہ ہوئے مُردوں میں جا جا کے نہاں
ناوک انداز چھپے گوشہ میں لے لیکے کماں

غائب ہوئی یاں تیغ تو واں سے نکل آئی
حیرت کو بھی حیرت تھی کہاں سے نکل آئی
اللہ رے بل موے میاں سے نکل آئی
رشتے کی طرح سوزنِ جاں سے نکل آئی

کس تیغ کے وہ مُنہ سے ہو بات اُس سے جو ہوئی
زخمی کے لب سے آہ جو نکلی تو دو ہوئی

اللہ رے وغا آنکھ نے دیکھی نہ چمک بھی
پُتلی تو سناں لیگئی جھپکی نہ پلک بھی

ہو قطع روانی جو چلے عمرِ رواں پر
یہ بات پر آئے تو پھرے نوکِ زباں پر

فق ہو گیا ہے چہرۂ پیر و جواں کا رنگ
باغِ جہاں دکھاتا ہے فصلِ خزاں کا رنگ
بدلا ہوا ہی گلشنِ نُہ آسماں کا رنگ
اُڑتا ہی بوے گُل کی طرح بوستاں کا رنگ

پژمردگی سے پھولوں کی رنگت بدل گئی

نکہت صبا کے ساتھ چمن سے نکل گئی

دریا میں موج موج تلاطم ہے آشکار
بے ساختہ نہنگ اُچھلتے ہیں بار بار

مچھلی ہے زیرِ آب مگر جاں ہے بیقرار
موتی ہیں آب آب صدف ہے جگر فگار

اندھیر دیکھ کر یہ خضر کائنات میں
چھپ بیٹھے جا کے ظلمتِ آبحیات میں

خود رفتہ ہوئے بھاگنے کے قصد میں بے پیر
جی کر کے جو ٹھہرے بھی دمِ دار و دمِ گیر

ترکش میں رکھیں تیغیں نیاموں میں رکھے تیر
قبضے کے بدل ہاتھ میں پکڑا سرِ شمشیر

یاد آئے اگر روشنیِ طبع یداللہ
اور کور جو دے سرمۂ خاکِ قدمِ شاہ

بھولے شبِ یلدا میں مسافر نہ کبھی راہ
بے شمع پڑھے شب کو وہ قسمت کا لکھا واہ

گر دھیان گراں گوش کرے شاہ کے لب کا
ناگفتہ سخن کان سے سُنلے ابھی سب کا

وہ چشمہ تھا جاری صفتِ فیضِ الٰہی
شستہ کرے آب اُسکا رخِ شب کی سیاہی

جن پھولوں کا تھا کوئی نزاکت میں نہ ہمسر
پڑتا تھا رگِ گُل کا نشاں پاؤں کے اوپر

ہوتے تھے خراماں جو کبھی خرمنِ گُل پر
گھوڑوں سے کچلواتے ہیں اُنکے تنِ اطہر

۱۶۲ کا مبالغہ

کوچوں میں یہ ہجومِ خلائق کا حال تھا	سایہ کو ساتھ لیکے گذرنا محال تھا

مجمع تھا یہ رواقِ رسالت پناہ میں | سرمہ نگاہ ہوگئی پس پس کے راہ میں

فردوسیوں کا در پہ ہجوم اسقدر ہوا | رضواں بنا بہشت کی بوجب گذر ہوا

حُسن التعلیل - یہ ایک لطیف صنعت ہی، اس کی حقیقت یہ ہی کہ کسی چیز کیواسطے کسی شے کو علت فرض کریں جو درحقیقت اُس کی علت نہو، مثلاً ؎

بھلائی جو کرے دنیا میں ہووے وہ پامال	بسانِ جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

جادہ یعنی رستہ پامال ہوتا ہی اور وہ اس سبب سے ہے کہ لوگ اُسپر راہ چلتے ہیں، لیکن شاعر اس کی یہ وجہ قرار دیتا ہی کہ راستہ لوگوں سے بھلائی کرتا ہی اسلیے پامال ہی یہ ایک قسم کی تخئیل ہی اور اس لحاظ سے یہ صنعت عین شاعری ہی کیونکہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہی۔ مولف لکھتے ہیں کہ "اس صنعت میں اُسوقت زیادہ لطافت پیدا ہوجاتی ہی جب وہ وصف بھی جس کی علت بیان کرنی ہی تخئیل پر مبنی ہو"، مثلاً میر انیس کا یہ شعر ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب	اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

موجوں کے اضطراب اور حباب کے سر چھپانے کی علت ڈر اور خوف کو قرار دیا ہی، لیکن موج کا اضطراب اور حباب کا پانی میں سر چھپانا، خود کوئی واقعی چیز نہیں، بلکہ شاعر نے موج کی حرکت کو اضطراب قرار دیا ہی اور حباب جو ٹوٹ جاتا ہی، تو اُسکو

فرض کیا ہے، کہ اُس نے پانی میں منہ چھپالیا"، بالکل اسی قسم کی نادر مثال مرزا صاحب کے کلام سے ملاحظہ ہو ؎

چاروں طرف تھا بسکہ ہجومِ سپاہِ شام	گویا سیاہ پوش تھا آبِ رواں تمام
ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہی تشنہ کام	بالکل اُلٹ دیئے تھے حبابوں نے اپنے جام

دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے
منہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے

حبابوں کے اپنے جام اُلٹ دینے، اور دریا کے اپنے منہ پر طمانچے مارنے کی علت، مالکِ کوثر کی پیاس کے قلق کو قرار دیا ہی، لیکن حبابوں کا جام اُلٹ جانا، اور دریا کا دستِ موج سے اپنے منہ پر طمانچے مارنا، خود واقعی کوئی چیز نہیں، بلکہ شاعر نے حبابوں کی قدرتی وضع کو جام اُلٹ دینا قرار دیا ہی۔ اور موج کی حرکت کو، فرض کیا ہی کہ دریا اپنے منہ پر طمانچے مار رہا ہی۔

اسکے بعد مولف نے میر صاحب کے کلام سے حسن التعلیل کی مثالیں درج کی ہیں۔ مرزا صاحب کے کلام سے اس صنعت کی یہ چند نادر نظیریں پیش کیجاتی ہیں۔ مثلاً ؎

تن پر کمانیں سہم کے چسپیدہ ہوگئیں	تیغیں سمٹ کے قبضوں میں پوشیدہ ہوگئیں

کمانوں کا بدن پر لپٹ جانا، یا تلواروں کا قبضوں میں پوشیدہ ہونا ایک وصفِ ثابت ہی اور یہ ظاہر ہی کہ یہ اسوجہ سے ہے کہ سلاح پوشوں نے اُنکے واسطے یہی جگہ مقرر کی ہی، لیکن شاعر نے اس کی علت ڈر اور خوف کو قرار دیا ہی اور اس طرح پر اس میں جو لطافت پیدا ہوگئی ہی وہ حسن شناسانِ معنی پر ظاہر ہی۔ اس صنعت کو مرزا دبیر

نے اکثر جگہ نہایت خوبی سے برتا ہے۔ مثلاً ؎

پیاسا ہوا جو دجلہ پہ بو تراب کا		اولٹا ہے دستِ موج نے کاسہ حباب کا
ناگہ عمر کے قصد پہ قرنا نے کی فغاں	ولہ	بیداد کی گواہی کو ہر سو اُٹھے نشاں
چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں		نقارے سینہ پیٹتے آگے ہوئے رواں

بے جسم شے کا کاٹنا، تیغوں کی خو نہ تھی	ولہ	بُرش سے اُسکی ڈھال کے پھولوں میں بو نہ تھی
کس تیغ کے وہ منہ سے ہو بات اُس سے جو ہوئی	ولہ	زخمی کے لب سے آہ جو نکلی تو دو ہوئی
یہ ہیبتِ جہادِ شہِ نیک خو ہوئی	ولہ	خود ذوالفقار میان سے کھنچ کے ہی دو ہوئی
یہ ہیبتِ شمشیر کا واں جوش ہوا تھا	ولہ	جو موجوں سے دریا بھی زرہ پوش ہوا تھا
رن گرم ہوا جوش پہ طبعِ اجل آئی	ولہ	تیغوں کی زباں میانوں کے منہ سے نکل آئی
کیا دھوپ ہے کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہے	ولہ	سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہے
اکبرؑ کے غم میں تیغ ہوئی تارکِ لباس	ولہ	جوہر سے یہ کھلا کہ پریشان ہیں حواس
سقّے کی حرب سے یہ ہوا غل جہان میں	ولہ	دس اُنگلیاں فرات نے موجوں سے کان میں
پیاسے تھے جو اطفال شہِ تشنہ گلو کے	ولہ	تھی غم کی گرہ دل میں حباب لبِ جو کے
اللہ رے ہیبتِ خلفِ حضرتِ امیرؑ	ولہ	دہشت سے تیر تھے دلِ اعدا میں گوشہ گیر

ع ۔ اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار

صنعتِ طباق ۔ یعنی دو متضاد یا مقابل چیزوں کو یکجا جمع کرنا۔

ع۔ کھلتا نہیں کیوں آنسوؤں کا تار بندھا ہے۔

ع۔ ہات ہم باندھتے ہیں عقدہ کشائی کردے

ے ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرمِ عناں ہوا — صرصر کی سانس رُک گئی جب یہ رواں ہوا

ع۔ فاقوں کی تو یہ حد ہے کہ جینے سے ہوئے سیر

ے جنبش سوے یسار جو قطب یمیں نے کی — سکتے میں چرخ آگئے گردش زمیں نے کی

ے کھلنا سرِ حرم کا کسی سے چھپا نہیں — امت کے پردہ پوشوں کے سر پر ردا نہیں

ے القصہ گئی نہر پہ غازی کی سواری — واں گرم وغا ہوتے ہی ٹھنڈے ہوئے ناری

ع۔ تیغیں وہ کھولنے لگے جنکی بندھی تھی دھاک

ع۔ پُرزے ہوا بدن پہ نہ ثابت خطا ہوئی

مُراعات النظیر۔ یعنی الفاظ کی رعایت۔ اس صنعت میں کئی چیزیں متناسب غیر متضاد ایک کلام میں مذکور ہوتی ہیں۔ غیر متضاد کی قید سے طباق نکل گیا۔ یہ وہی صنعت ہے جو آج عوام شعرا کا سرمایۂ کمال ہے، اور جسکو مہذّب ضلع جگت کہہ سکتے ہیں۔ جیسے ذوق کا یہ شعر ے

خط بڑھا زلفیں بڑھیں کاکل بڑھے گیسو بڑھے — حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

خط۔ زلف۔ کاکل۔ گیسو باہم متناسب ہیں۔ لیکن اگر اسی سادہ طریقہ پر اس صنعت کو برتا جائے تو کچھ تعریف اور لیاقت کی بات نہیں، البتہ شاعر کی جولانی فکر کا نمونہ اور قابلِ تعریف و پُر لطف اس کی وہ قسم ہے جسکو ایہام التناسب کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مثلاً دو معنی جمع کریں جنکو آپس میں کچھ مناسبت نہو مگر ان

ایہام التناسب

معنوں کو جن دو لفظوں سے تعبیر کریں اُن میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنیِ دوم جو غیر مقصود ہوں اُن کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو۔ جیسے میر کے اس شعر میں ؎

میر کا ہجر میں وصال ہوا　　چلو جھگڑا ہی انفصال ہوا

یہاں ہجر اور وصال (بمعنی مرگ) کو جمع کیا ہی اور ظاہر ہی کہ ان دو معنوں میں باہم کچھ مناسبت نہیں ہی مگر وصال کے دوسرے معنی یعنی وصل البتہ ہجر کے مناسب ہیں۔

صنعتِ ایہام التناسب کو مرزا صاحب نے نہایت لطف و خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہی۔ چنانچہ اُن کی صناعی کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں ؎

روشن ہی قمر پر کہ علیؑ نورِ خدا ہیں		بندوں پہ کھلا ہی کہ علیؑ عقدہ کشا ہیں
اس کی چمک سے مہر کو بھی انفعال ہی	ولہ	طوبیٰ جو اسکے سائے میں آئے نہال ہی
بارش تھی آبِ تیغ کی برسات سے فزوں	ولہ	بدلی تھی فوجِ شام کی رنگت گھٹا تھا خوں
چہرہ نہ رہا دفترِ انجم میں کسی کا	ولہ	پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا
چاہیے زرہ بنا کے جو داؤد کا وقار	ولہ	واللہ جالسا زہی کیا اُس کا اعتبار
کھولے علم اور باندھ لیے گوشے قبا کے	ولہ	رستے میں ہوئے ہوش ہوا پیکِ صبا کے
دانوں کی طرح سب رفقا گر دپڑے تھے	ولہ	حیران امام اپنی جماعت میں کھڑے تھے
نورِ نظرِ فاطمہؑ نے چشمِ کرم کی	ولہ	یہ عینِ عنایت ہے شہنشاہِ امم کی
کہیے نہ جرس ناقہ کا دل گرمِ فغاں تھا	ولہ	ڈنکے کی یہ نوبت تھی کہ خود سینہ زناں تھا

پوشاک سے خوزادوں کی یہ شان ہوگئی — ولہ — اک عید صدقے دوسری قربان ہوگئی

آئینہ روبروے جہاں ہی جو خوشنما — ولہ — وہ اُن کا روشناس ہی، بس اور وجہ کیا

آقا نے مجکو سب میں نمودار کردیا — ولہ — بے بال و پر کو جعفرِ طیار کردیا

یاں حیدریوں کو خلشِ خار نہیں ہی — ولہ — باغی کے لیے حکم نہیں بار نہیں ہی

جب ان میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے — ولہ — دکھلائے دو ہلال شہِ مشرقین نے

عباسؑ سے بھی چھوٹ چکے تھے شہِ زمن — ولہ — بازو نہ تھا پہ قبضے میں تھا زورِ پنجتنؑ

کفنا چکے ملک شہِ عالی جناب کو — ولہ — مٹی دو آنکر خلفِ بوترابؑ کو

دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں — ولہ — پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپ رہے ہیں

ساتھ اُسکا دیا جائے ہوا سے نہ پری سے — ولہ — شہبازِ نگہ باز رہے تیز پری سے

قبضہ تو رہا تیغ کا دستِ شہِ دیں میں — ولہ — پھل جاکے لگا شاخِ سرِ گاوِ زمیں میں

کچھ وصف لبِ لعل و دہن کا جو سُنایا — ولہ — شیریں سخنی کے ہوئے قائل سخن آرا

ع - جب میان سے نکلی تو میانِ سرِ رن تھی

ع - اسپر بھی کیے لاکھوں ہی جن آپنے بے جاں

ع - جلوہ کیا کرسی پہ شہِ عرش نشیں نے

ع - بن بن کے ہوا خواہ صبا بولی میں قرباں

ع - ہر مورچہ لرزاں ہی سلیماں کی ہے آمد

لف و نشر

لف و نشر - لغت میں لف بمعنی لپیٹنے اور نشر بمعنی پراگندہ کرنیکے ہی۔ لف و نشر کی تعریف اصطلاح میں یہ ہی کہ پہلے کئی چیزوں کو ذکر کریں اُسکو لف کہتے ہیں اور بعد اسکے ہر ایک کے منسوبات و متعلقات کو بغیر تعین بیان کریں اسکو نشر کہتے ہیں۔ اور تعین نہ کرنا اس اعتماد پر ہی کہ سُننے والا ہر ایک منسوب کو اُسکے منسوب الیہ سے متعلق کریگا۔ اس کی دو قسم ہیں مرتب و غیر مرتب ؎

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب	لرزندہ۔ و شرمندہ۔ و درماندہ و بیتاب
خورشید۔ و سحاب۔ و فلک۔ و انجم و مہتاب	سوزان و خروشان۔ و سراسیمہ۔ و بیخواب

بازارِ گُل۔ و موج۔ و صبا۔ سرد ہی اس سے
وہ داغ ہی۔ وہ آب ہی۔ وہ گرد ہی اس سے

یاں بخت۔ و ہاں عمر۔ ادہر عقل۔ اُدہر ہوش	خوابیدہ۔ و برباد۔ و پراگندہ۔ و روپوش
یاں ناطقہ۔ واں حافظہ۔ خاموش و فراموش	بے نور ادہر چشم۔ تو بے بہرہ اُدہر گوش

ایمان و کفر توبہ و عصیاں دمِ جہاد	یہ زندہ۔ اور وہ مردہ۔ یہ خوشدل وہ نامراد

نے چرخ ہی نے دشت۔ نہ کہسار۔ نہ قلزم	وہ سکتہ ہی۔ وہ گرد۔ وہ رعشہ۔ وہ تلاطم

شرمندۂ رخسار و قد و گیسوے پرتاب	باغ تر و سرو سہی۔ و سنبل سیراب
دندان و دہان و لبِ جاں بخش سے آب آب	سلکِ دُر۔ و لعلِ یمن۔ و دانۂ عناب

تفصیل

حق سے علاحدہ کیا باطل کو یک قلم
کعبے سے بت۔ یقیں سے شک۔ عدل سے ستم

وحدت سے شرک۔ خیر سے شر۔ دیر سے حرم
عصیاں سے توبہ۔ کفر سے دیں۔ بخل سے کرم

ہیبت سے یہ بندے کی، دیا خوفِ خدا ہے
سر خود سے۔ دل سینے سے۔ جاں تن سے جدا ہے

آمد شہِ عادل کی ہے انصاف کی رہبر
خرمن سے شرر بھاگتے تھے شیشہ سے پتھر

بلبل سے قفس۔ گل سے خزاں۔ شمع سے صرصر
شبنم سے جو سورج۔ تو کتاں سے مہِ انور

نیکی سے بدی۔ نام سے اب ننگ جدا ہے
توبہ سے شکست۔ آئینے سے زنگ جدا ہے

لڑنے میں ہے یہ عقل۔ بگڑنے میں جہالت
بڑھنے میں ہے یہ حرص، تو گھٹنے میں قناعت

جانے میں حواس، آنے میں عاشق کی طبیعت
مخفی ہے تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت

نذرانۂ لب خلف الصدق بوتراب
لالے سے رنگ، لعلِ بدخشاں سے آب و تاب

ادنے خراجِ گیسوے شاہِ فلک جناب
آہو سے نافہ، نافۂ آہو سے مشکِ ناب

اوّل خراج یئغ کو یہ فوج سے ملا
قالب سے روح، سینے سے دل، عمر سے وفا

گردن سے سر، جگر سے قرار، آنکھ سے ضیا
چہروں سے رنگ و آبرو، اندام سے قوا

مہملہ یعنی بے نقط۔ اس صنعت میں مرزا صاحب کے کئی مرثیے ہیں۔ اُن میں سے ایک مرثیہ کا مطلع ہے۔ ع۔ مہرِ کرم سرورِ اکرم ہوا طالع۔ اُسکے چند بند اس موقع پر لکھے جاتے ہیں بے نقط مرثیوں میں اپنا تخلص عُطارِد رکھا ہے[1]۔

مدح امام حسنؑ

علّام ہر اک علم کا۔ اور مورِد الہام
روح اسد اللہؑ۔ محمدؐ کا دل آرام

وہ اُسکا ہوا حکم۔ کہ اسلام ہوا عام
صدرِ دوسرا، علم کا گھر، مصدرِ اکرام

محکومِ احد، حاکمِ سرکارِ محمدؐ
مداحِ رُسل، محرمِ اسرارِ محمدؐ

مالک ارم و حور کا۔ عالم کا مددگار
صمصامِ صمد۔ عسکرِ اسلام کا سالار

سردارِ اُمم اور اسد اللہ کا دلدار
احمدؐ کا اسد۔ علم کا در۔ سرور و سردار

سالک رہ اللہ کا۔ مالک دوسرا کا
ہمسر اسد اللہ کا۔ ہمدرد گدا کا

اسکے علاوہ بہت سے سلام اور بکثرت رباعیاں اس صنعت میں لکھی ہیں۔ بخوف طوالت صرف چند رباعیاں تحریر کی جاتی ہیں۔ رباعی۔

دردا کہ مُلول امامِ معصوم رہا
مالک ہوا ساحل کا گروہِ گمراہ

ہر اہلِ طمع عمرؓ کا محکوم رہا
اور ہائے امامِ عصر محروم رہا

واللہ کہ طالع رساحرؑ کو ملا
گھر اُس کا ہوا احمدِ مرسلؐ کا دل

سردار امامِ دوسرا حسنؑ کو ملا
حور۔ وارم۔ وحلہ صلاحسنؑ کو ملا

[1] عُطارِد تخلص کے بارہ میں لکھتے ہیں ؎ ڈھونڈا جس دم تخلص بے نقط۔ ہمنام دبیر کا عطارد نکلا۔

حرؑ کو مددِ حرم کا الہام ہوا
ہر درد و الم، سُرور و آرام ہوا
مسلمؑ ہوا سرور کا ہمراہ اول ہو کر
حاصل حرؑ کو کمال اسلام ہوا

تلمیح - مرزا صاحب اپنی نظم میں عربی فقرات کو نہایت خوبی کے ساتھ چسپاں کر دیتے ہیں - چنانچہ اس صنف میں جو جو لطافتیں اُنھوں نے پیدا کی ہیں، اُن کی چند نظیریں پیش کی جاتی ہیں ؎

قرآں میں قتل نفس کی حُرمت ہے جا بجا
سیّد کا خون حلال کہاں سے تمہیں ہوا
ہے نفسِ مصطفےٰ بخدا بسطِ مصطفےٰ
آخر جزائے مَن قتل مومناً ہے کیا

سید نہیں، امام نہیں، مقتدا نہیں
مومن بھی میں تمھارے عقیدے میں کیا نہیں؟

تھی نور سے پیدا جو وہ رشکِ شرر طور
حل کرنے لگی ترجمۂ نُفخ فی الصور
میداں میں قلم کر کے سرِ ظالمِ مقہور
لفظِ غضب اللہ علیہم کی مسطور

پھر یوں پکارتا ہوا شہ کی طرف چلا
اے یادگارِ فاطمہؑ زوجی لک الفدا

اُس چہرۂ انور سے ہوا رن میں اُجالا
سب کہنے لگے سلمک اللہ تعالیٰ

پوشش مہِ عارض کی ہے یہ زلفِ شب آسا
لو حل ہوئی شرح جعل اللیل لباسا

کہتے ہیں اس جمال پہ سب کو دک و سن	صلّوا علی النبیؐ و آلِ محمدؐ

یہانتک وہ صنعتیں ختم ہوئیں جو مؤلف نے میر صاحب کے کلام سے لکھی ہیں۔ دونونکے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ میر صاحب کی طرح مرزا صاحب نے بھی صنائع بدائع میں کیا کیا خوبیاں پیدا کی ہیں۔ اب یہاں ہم چند جدید صنعتیں شروع کرتے ہیں جنکی مثالیں مولوی صاحب نے میر صاحب کے کلام سے درج نہیں کیں، اور جنکو مرزا صاحب نے اس خوبی اور صفائی سے استعمال کیا ہے کہ الفاظ کا حسن دوبالا ہوجانے کے علاوہ معنی اور مضمون میں بے انتہا قوت اور شان پیدا ہوگئی ہے۔

صنعت معاد

صنعت معاد۔ یہ صنعت رد العجز علی الصدر کے قبیل سے ہے، اس میں وہ الفاظ جو مصرع اوّل کے آخر میں ہوتے ہیں اُن کو مصرع دوم کے اوّل میں لاتے ہیں، اور جو مصرع دوم کے آخر میں ہوتے ہیں ان کو مصرع سوم کے اول میں لاتے ہیں وعلی ہذا القیاس۔ مرزا صاحب نے اس صنعت میں اکثر نفیس اشعار فرمائے ہیں جو بہت پُر لطف اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ بطور نمونہ چند بند لکھے جاتے ہیں جو مسلسل اسی صنعت میں ہیں ؎

زہرا کا گہر، اخترِ صدرِ شرف ہے	یہ اخترِ صدرِ شرف، درِ نجف ہے
یہ درِ نجف، حیدرِ صفدر کا خلف ہے	یہ حیدرِ صفدر کا خلف، حق کی طرف ہے
یہ حق کی طرف، مثلِ رخِ قبلہ نما ہے	
یہ قبلہ نما، کعبۂ تسلیم و رضا ہے	

یہ کعبۂ تسلیم و رضا، فخرِ پدر ہے
یہ فخرِ پدر، فاطمہؑ کا نورِ نظر ہے
یہ فاطمہؑ کا نورِ نظر، رشکِ قمر ہے
یہ رشکِ قمر، درجِ امامت کا گہر ہے

یہ درجِ امامت کا گہر، جانِ نبیؐ ہے
یہ جانِ نبیؐ، خاصِ خدائے احدی ہے

یہ خاصِ خدائے احدی، قبلۂ دیں ہے
یہ قبلۂ دیں، کعبۂ اربابِ یقیں ہے
یہ کعبۂ اربابِ یقیں، عرش نشیں ہے
یہ عرش نشیں، مُہرِ نبوت کا نگیں ہے

یہ مہرِ نبوت کا نگیں، دُرِّ عطا ہے
یہ دُرِّ عطا، ماہرِ اسرارِ خدا ہے

صنعتِ رجوع - یہ ایک دلچسپ صنعت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کسی خاص لفظ سے ایک چیز کی تعریف کرتا ہے، پھر کلام اوّل کو باطل کر کے کسی خاص فائدہ اور نکتہ کی غرض سے دوسرے کلام کی طرف مصرف ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

رخ ہے تیرا ماہ یا خورشید، پر ہے یہ غلط
دلستانی اسقدر مہ میں کہاں، خور میں کہاں
قد ہے تیرا اک صنوبر باغِ عالم میں، ولے
راستی جو ہے ترے قد میں صنوبر میں کہاں

پہلے معشوق کے چہرے اور قد کی ایک صفت کی، پھر اس صفت سے رجوع کر کے اُن کی خوبی اور دلفریبی کو اور زیادہ ترقی دیدی، اور فائدہ اس رجوع سے یہ ہے کہ معشوق کا چہرہ ماہ سے اور قد صنوبر سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔ مرزا صاحب نے اس صنعت کو اکثر مقام پر نہایت خوبی سے برتا ہے ؎

رو دار ہے خورشید، پہ ابرو نہیں رکھتا
ابرو مہِ نو رکھتا ہے، یہ رو نہیں رکھتا

قدر رکھتا ہی شمشاد، پہ گیسو نہیں رکھتا
سنبل کے ہیں گیسو، قدِ دلجو نہیں رکھتا

گل گوش ہے، پر گوشِ سماعت نہیں رکھتا
غنچہ ہے دہن، طرزِ فصاحت نہیں رکھتا

بو ہے گُلِ جنّت میں، پہ رخسار نہیں ہے
ایمن میں تجلّی ہے، پہ دیدار نہیں ہے

قدر رکھتا ہے طوبیٰ، پہ یہ رفتار نہیں ہے
شیریں لبِ کوثر ہی، پہ گفتار نہیں ہے

آئینے میں رو ہی یہ خطِ سبز کہاں ہے
غنچے کے دہن ہی نہ زباں ہی نہ بیاں ہے

بسکہ کھنچی ہی مہارِ شُتُرِ آلِ عبا
سو کفِ دست میں کس حُسن سے گتّا ہی پڑا

فی المثل، مہر میں ہے داغِ قمر جلوہ نما
مہرۂ مہر کجا، داغِ دلِ ماہ کجا

پشتِ احمدؐ میں تو تھی مہرِ نبوّت پیدا
یاں کفِ دست میں ہی مہرِ شفاعت پیدا

صنعتِ ترصیع - یعنی تمام یا اکثر الفاظ دو فقروں یا دو مصرعوں میں مقابل اور متحد الوزن والقوافی ہوں۔ جیسا غالب کا یہ شعر ؎

تیری دانش مرے اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

مرزا صاحب کی صناعی کے یہ نمونے ہیں ؎

میزانِ خدا۔ مفتیِ دیں۔ قاضیِ فردا
سلطانِ ازل۔ شاہِ ابد۔ عُروۂ وُثقا

خورشیدِ نجف ۔ بدرِ حرم ۔ رونقِ بطحا
اقبالِ عرب ۔ اوجِ حرم ۔ خسروِ دنیا

بیعت کو سند ہاتھ سے، قرآں کو قلم سے
خطبے کو شرف نام سے، منبر کو قدم سے

کس نے یہ مجزّا کیے سیپارۂ ایّام
کس نے یہ مصفّا کیے رخسارۂ اسلام
مجموعہ یہ کس نے کیا شیرازۂ آرام
مرفوع یہ کس سے ہوا آوازۂ انعام

کس نور سے آدم کا شرف خاک نے پایا
کس طور سے نورِ ابد افلاک نے پایا

جس روز سے ہے ملکِ خضر آبِ بقا پر
جس عہد سے ہے ابرِ کرم دوشِ ہوا پر

ہے کوہِ فرازندہ جو ساکن ہو ترا راں
ہے ابرِ خرامندہ اگر ہو یہ خراماں
ہے جلوۂ گلزار اُسے گشتِ بیاباں
ہے قلّۂ کہسار اُسے تختِ سلیماں

ہے برقِ شرر خیز اگر جلوہ کناں ہے
ہے ابرِ گہر ریز اگر قطرہ زناں ہے

حاتم کا کرم بخل ہے فیض و کرم ایسا
گردوں کا حشم پست ہے جاہ و حشم ایسا

تنسیق الصفات

تنسیق الصفات - اسکے یہ معنی ہیں کہ ایک موصوف کے لیے متواتر کئی اوصاف کا ذکر کریں - جیسے ؎

تیری شمشیر سرِ خصم پہ ہے میداں میں	صاعقہ - برق - بلا - قہرِ خداوندِ تعالیٰ

مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

رخشِ حسین - قدرتِ حق - صنعِ کبریا	دلدل خرام و برق لجام و براق پا
پردیں دُم - وسہیل دُوال - وقمر ضیا	گلگونِ شاہِ دیں کی نزاکت کہوں میں کیا

چھل بل تھی - چھلاوہ تھی، طلسمات تھی اسرار	چالاک - سبکبار - نمودار - طرحدار
نیزہ کہیں - خنجر تھی کہیں - اور کہیں تلوار	بجلی تھی کسی جا - تو کہیں نور - کہیں نار

سیماب تھی - سیلاب تھی - طوفاں تھی - ہوا تھی
شعلہ تھی - شرارہ تھی - قیامت تھی بلا تھی

حضرت عباسؑ

شبیرؑ کے بازو بھی ہیں - اور زورِ کمر بھی	رشتے میں برادر بھی ہیں - الفت میں پسر بھی
خادم بھی - مصاحب بھی - دل و جاں بھی جگر بھی	اللہ کی شمشیر - شہِ دیں کی سپر بھی

باقی تنسیق الصفات کی مثالیں صفحہ ۸۳ پر دیکھو جو ہم پچھلے اوراق میں لکھ آئے ہیں -

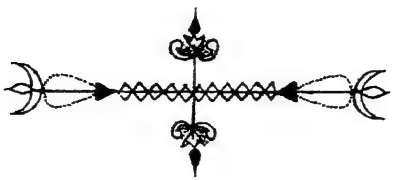

سیاقۃ الاعداد

سیاقۃ الاعداد - یہ وہ صنعت ہی کہ کلام میں اعداد کو ذکر کریں خواہ ترتیب سے ہوں یا بے ترتیب ؎

گو صف تھی ہر اک نظم مسلسل کے مقابل
ابتر صفتِ نثر پریشاں ہوئے قاتل
ہر چار عناصر کی رباعی ہوئی باطل
خمسہ تھا حواس سپہِ شام کا زائل
دو کر کے کیا چار ہر اک اہلِ حسد کو
کیا قطع کیا تیغ نے ہر مصرعِ قد کو

تصنیفِ مسدس میں رہا شش در و قاصر
تھے پانچ حواس ایک مخمس پہ نہ قادر

اک شب میں دمِ خواب دعا میں ہوا گویا
اے ناظمِ بیتِ دوسرا، موجدِ اشیا
وہ خمسۂ قدرت کہ دو عالم میں ہی یکتا
یعنی حسنینؑ و نبیؐ و حیدرؑ و زہراؑ
اب اُنکے تصدق سے پذیرائیِ دعا کر
مجکو شرفِ مرثیہ گوئی تو عطا کر

کیا یکدل و یکتن تھے دمِ جنگ وہ خوشذات
اک طرز تھا۔ اک ڈھنگ تھا اک قول تھا اک بات
تلواریں تو دو تھیں مگر اک ضرب اور اک ہات
سب کہتے تھے حیرت سے کہیں دیکھا ہی یہ سات
دو تیغیں اور اک ہاتھ نیا ربط یہاں ہے
قبضے میں یداللہؑ کی تیغِ دو زباں ہے

صنعت ذوقافیتین و ذوالقوافی

صنعت ذوقافیتین و ذوالقوافی ۔ یعنی اشعار میں دو یا زیادہ قافیے ہوں ۔ اس صنعت میں مرزا صاحب کے دو چار اشعار لکھے جاتے ہیں ؎

معبودِ جزو کل نے کریمانہ رضا دی	اور صاحبِ دلدل نے بزرگانہ دعا دی
فوج اپنی توکّل نے دلیرانہ بڑھا دی	آمد کے تجمّل نے نقیبانہ ندا دی

کبھی دو قافیوں کے بیچ میں ردیف بھی لاتے ہیں انکو ذوی القافیتین مع الخاص کہتے ہیں ۔ اس صنعت میں مرزا صاحب کے یہ اشعار ہیں ؎

یاں سب کو تھا یقیں کہ وہاں تھی وہیں نہ تھی	واں اتفاق تھا کہ یہاں تھی نہیں نہ تھی
ہر جا تھی، اور پوچھو کہاں تھی کہیں نہ تھی	لاکھوں کے قتل کرنے کو ہاں تھی نہیں نہ تھی

بجلی کا جست شیر کی آمد ہوا کا شور	قدرت کا کھیل قہر کی طاقت بلا کا زور

جمعیت الفاظ

جمعیتِ الفاظ ۔ اگرچہ علم بدیع میں اسکو کسی صنعت میں شمار نہیں کیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بھی شاعر کی جولانیٔ فکر کا ایک دلچسپ نمونہ ہے، اسلیے ہم اس عنوان کے تحت میں مرزا صاحب کے کلام سے چند بند نقل کرکے صنائع بدائع کی بحث کو ختم کیے دیتے ہیں ۔

نخل و گل و برگ و ثمر و میوہ و طوبےٰ	خلد و ارم و کوثر و فردوسِ معلےٰ
ہر مصحف و سیپارہ و ہر سورہ ہر آیہ	انسان و جن و حور و ملک آدم و حوّا

ان سب سے کہو کون امامِ ازلی ہے

بیساختہ چلّائیں حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

کرسی و فلک مہر و قمر عرشِ معلّےٰ
ہر ذرّہ و ریگ و جبل و قریہ و صحرا

ارضِ نجف و ماریہ و یثرب و بطحا
دُرِّ نجف و لعل و دُرر و قطرہ و دریا

واللہ جو مخلوقِ خدائے احدی ہیں
سب تابعِ فرمانِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں

نامِ نامی ہے حسینؑ ابن علیؑ صلِّ علےٰ
مخزنِ صبر و رضا معدنِ الطاف و عطا

اور لقب بیوطن و بیکس و شاہِ شہدا
مرجعِ رحمتِ حق، مبدءِ افضالِ خدا

سورۂ نور سے بھی نور دوچند اُسکا ہی
رتبہ تکبیر کے نعرے سے بلند اُسکا ہی

شرفِ کلکِ قضا۔ گلشنِ قدرت کی بہار
راکبِ دوشِ نبیؐ۔ مُہرِ نبوّت کا سوار

زینتِ لوح و قلم عرشِ الٰہی کا وقار
مصحفِ ناطق۔ و تفسیرِ کلام غفّار

فخر وہ شکل نہ کیوں چاند پہ چند کرے
جسپہ یہ پیرِ فلک تاروں کو اسپند کرے

شمع و چراغ۔ و آئینہ۔ و صبح و آفتاب

باغ و بہار و یاسمن و لالہ و گلاب

ناہید و بدر و مشتری و قطب و ماہتاب
آبِ حیات، لعلِ بدخشاں دُرِ خوش آب

یوسفؑ اور اُنکے سارے خریدار اِک طرف
سب اک طرف یہ روئے ضیا بار اک طرف

گُل پیرہن و گلبدن و گلرخ و گلفام
خوش قامت، و خوشرو و خوش آغاز، و خوش انجام

شمشاد قد، و غنچہ دہان، و سمن اندام
حُسنِ چمنِ شرع، بہارِ گُلِ اسلام

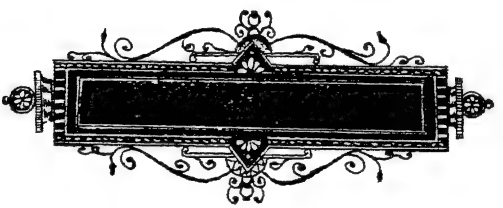

انسانی جذبات یا احساسات

اس میں شک نہیں کہ صنائع بدائع جنکا ذکر ہو چکا، شاعری کے اصلی جوہر نہیں البتہ شاہدِ سخن کے واسطے ایک خوشنما زیور ضرور ہیں۔ اصلی شاعری، دلی جذبات اور خیالات کا ہو بہو اور صحیح صحیح نقشہ اُتارنا ہی۔ اور یہ نقشہ جسقدر اصل کے مطابق ہوگا اُسیقدر موثر و دلنشین ہوگا۔

کسی شے کی تصویر کھینچنا درحقیقت ایک مصوّری ہی۔ لارڈ مکالے کا قول ہی کہ "مصوّر صرف اشیاء خارجی کا صحیح نقشہ اُتار سکتا ہی، انسان کا بطون جہاں کسی مصوّر کی رسائی نہیں صرف شاعر ہی کی قلمرو ہی۔ نفسِ انسانی کی باریک، گہری، اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری، کائنات کی تمام اشیاے خارجی و ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہی۔ عالمِ محسوسات، دولت کے انقلابات۔ سیرتِ انسانی۔ تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں۔ اور تمام وہ چیزیں جنکا تصوّر مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہی سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں" ایک دوسرے محقق نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہی کہ "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اسلیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُسکو سُنکر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہی" شاعر اپنی خداداد قوت احساس کی مدد سے، پہلے اُس کیفیت سے جسکا بیان کرنا منظور ہی، خود متاثر و متکیف ہو جاتا ہی، اور اپنے دل میں وہ تمام فطرتی

جذبات جو ایسے مواقع پر پیش آنا ضروری ہیں، پیدا کر لیتا ہے اسکے بعد جو کچھ بیساختہ اُس کی زبان و قلم سے نکلتا ہے وہ اُن محسوسات و جذبات و کیفیات کا اصلی پرتو ہوتا ہے اسلیے دلی خیالات کی اصلی اور سچی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے، اور دردناک و موثر الفاظ اُس تصویر میں تاثیر کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ دلی جوش جو شاعر سے جذباتِ صادقہ کا نقشہ کھنچوا دیتا ہے اُس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "مضمون بیساختہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے، جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے ارادہ سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اُس سے بندھوایا ہے۔ ایسا جوش شاعر کے ہر قسم کے کلام میں عام اس سے کہ اپنی حالت بیان کرے یا دوسرے کی، خوشی کا بیان کرے یا غم کا، تعریف کرے یا مذمت، سب میں پایا جانا ممکن ہے۔ شاعر کی ذات میں ہر چیز سے متاثر ہونے، ہر شخص کی خوشی و غم میں شریک ہونے، اور ہر ایک کے جذبات سے متکیف ہو جانے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے۔ وہ بے زبان بلکہ بے جان چیزوں کی حالت اُن کی زبانِ حال سے ایسا ہی بیان کر سکتا ہے کہ اگر اُن میں گویائی ہوتی تو وہ بھی اپنی حالت اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتیں"، پس فصیح و بلیغ شاعر کا اصلی جوہر یہ ہے کہ وہ جس واقعہ کا ذکر کرے اُسکے اطراف و جوانب و متعلقات کا اس خوبی کے ساتھ خیال رکھے کہ جس جس واقعہ کے ساتھ جو جو امور ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں الفاظِ مناسب بعینہٖ اُن کی تصویر کھینچدیں۔ تاکہ آنکھوں کے سامنے وہی سماں بندھ جائے۔ ورنہ واقعہ کی اصلی تصویر کھینچنے سے جسقدر بُعد ہو جائیگا اُسیقدر تاثیر میں کمی آجائے گی۔

شاعر کا جوش و ولولہ

واقعات کی تصویر ۴

۴ مقدمہ شاعری مولوی حالی

مرزا دبیر صاحب کی طبیعت گداز تھی

مرزا دبیر صاحب نے چونکہ طبیعت نہایت گداز پائی تھی اسلیے پہلے تو وہ خود ہر کیفیت سے متاثر ہو جاتے تھے اور جب اُنکے دل پر چوٹ لگتی تھی تو زبان سے درد انگیز الفاظ نکلتے تھے، اور سُننے والوں کے دل پر بھی وہی حالت طاری ہو جاتی تھی جو خود اُنکے دل پر پیدا ہوئی تھی۔ پس اُنکے اشعار گویا اُنکے اندرونی احساس کی اصلی تصویریں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ اُنھوں نے ایسے مضامین کے ادا کرنے میں کمال پیدا کرلیا ہی۔ وہ جس واقعہ کا نقشہ اُتارتے ہیں، جس کیفیت کی تصویر کھینچتے ہیں اُسکو ایسے دردناک اور دلنشیں پیرائے سے شروع کرتے ہیں کہ سامعین کی طبیعت بے چین ہو جاتی ہی، الفاظ کی جادوگری سے سننے والوں کے درد و غم۔ فرحت و انبساط کے فطرتی ولولے جوش میں آجاتے ہیں، اور تمام قدرتی جذبات میں حرکت پیدا ہو جاتی ہی۔ اُن کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ اُنھوں نے رنج و غم۔ مہر و محبت۔ غیظ و غضب۔ شکوہ و شکایت۔ ہمدردی و الفت۔ بیقراری و بیتابی۔ مسرت و خوشی۔ غرض جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے اُس میں دلربائی اور تاثیر کی روح پھونک دی ہی۔ اور جسقدر اصل واقعہ پیش آنے سے انسان کی طبیعت میں کوئی خاص کیفیت محسوس ہوتی ہی، بعینہ اُن کا کلام سامعین کے دلوں میں جذبات و تاثیر کی وہی کیفیت پیدا کر دیتا ہی۔

مثال ۱۔ جب امام حسین علیہ السلام نے قصدِ ملکِ عراق کیا تو چاہا کہ اہلبیتؑ کو بھی ساتھ لیجائیں۔ حضرتِ صغراؑ اُس زمانہ میں علیل تھیں اسلیے اُن کو ہمراہ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ جنابِ صغراؑ کو جب امام علیہ السلام کے سفر اور اپنے ساتھ نہ جانے کا علم ہوا تو سخت بیتاب ہوئیں۔ اُن کو ضد اور اصرار ہی کہ

میں عزیزوں سے چھٹ کر اس بیماری کی حالت میں کہ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، تنہا نہیں رہ سکتی۔ وہ حالتِ اضطراب میں سب سے سفارش کی خواستگار ہیں مگر امام علیہ السّلام کی مصلحتوں کے خیال سے کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا اور جناب صغرا کو ہر طرف سے مایوس ہونا پڑتا ہی۔ یہ سین بجائے خود نہایت ہی دردناک اور طبیعت پر ایک خاص اثر پیدا کرنے والا ہی، اور جب شاعر بھی زورِ کلام سے اسکو اور زیادہ پُرحسرت بنا دے تو یہ درد و حرماں کی جانکاہ تصویر دل کو پاش پاش کر دیتی ہی۔ حضرت صغرا کی رخصت مرثیہ گوئی کا ایک خاص واقعہ ہے جسپر شعرا نے بڑی بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اس مضمون کے طرزِ بیان میں میر صاحب اور مرزا صاحب نے انتہا درجہ کا سوز و گداز پیدا کیا ہی اور ایک ایک مصرع کو درد و غم کا مرقع بنا دیا ہی۔ اس جانکاہ واقعہ کی جزئیات یہ ہیں۔ حضرتِ صغرا کا اپنی نازک حالت کو ظاہر کرنا۔ ساتھ جانے پر ضد کرنا۔ ایک ایک سے سفارش کے لیے خوشامد کرنا۔ ماں بہنوں سے روٹھ جانا۔ پھر خود ہی من جانا۔ حضرت امام حسینؑ کی مجبوری اور پریشانی۔ آخر ماں باپ۔ بھائی بہنوں کا اُن کو بیقراری کے ساتھ رخصت کرنا۔ حضرت صغرا کا اپنے چھوٹے شیر خوار بھائی اصغر سے وداع ہونا۔ رخصت کے وقت تمام کنبے کو یاس و حسرت کی نگاہوں سے دیکھنا ان سب باتوں کا جس طرح اظہار ہوا اُسکو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

یثرب سے شہِ صابر و شاکر کا سفر ہی	اقلیمِ شہادت کے مسافر کا سفر ہی
ہی شور کہ یہ منزلِ آخر کا سفر ہی	لو، قبرِ پیمبرؐ کے مجاور کا سفر ہی

گر پوچھتا ہی کوئی کہاں جاتے ہیں شبیرؑ

آتی ہی ندا سوے جناں جاتے ہیں شبیرؑ

سب کہتے تھے اللہ شتابی نہیں لانا
تقدیر یہ کہتی تھی کہ اب ہوگا نہ آنا
اک کہتا تھا یارب علی اصغرؑ کو بچانا
کہتی تھی اجل تیر کا ہونگے یہ نشانا

فرماتے ہیں خود سبطِ پیمبرؐ یہ زبان سے
واں جاتا ہوں کوئی نہیں پھرتا ہی جہاں سے

شعبان میں گھر سے شہِ والا کا سفر ہے
اب فاطمہؑ صغرا ہی، اور اُجڑا ہوا گھر ہے
اشک آنکھوں میں، اور باپ کے چہرہ پہ نظر ہی
دامانِ پدر ہاتھ میں ہی، پاؤں پہ سر ہے

یوں دیکھتی ہی یاس سے شبیرؑ کی صورت
جو آنکھ جھپکتی نہیں تصویر کی صورت

صغرا کا تو یہ حال ہی، مولا کو ہی سکتا
سینے سے لگاتے ہیں اُٹھا کر سرِ صغراؑ
فرماتے ہیں کیوں روتی ہو اے باپ کی شیدا
کہتی ہی تمہیں تو ہمیں رُلواتے ہو بابا

اکبرؑ و سکینہؑ تو چلیں ساتھ سفر میں
صغرا رہے رونے کو اس اُجڑے ہوئے گھر میں

دیکھا علی اکبرؑ کو تو بولی وہ دل افگار
پیاری تھی سکینہؑ چلی ہمراہِ علمدار
دعوے ہی ہمیں تم پہ گواہ اسکا ہی غفار
لیچلتے ہو بھیا ہمیں یا کرتے ہو انکار

گر بالی سکینہؑ علی اصغرؑ کی بہن ہے
صغرا کو یہ ہے فخر کہ اکبرؑ کی بہن ہے

بولے علی اکبرؑ کہ یہ دشوار ہے بنیا!
پر کوفے میں آرام اگر پائینگے بابا
ہم آنکے وہاں سے تمھیں لیجائینگے صغراؑ
تقدیر پکاری نہ وفا ہوگا یہ وعدا

سینے سے ترے پارانی ہوئیگی اکبرؑ
پردیس میں وعدہ شکنی ہوئیگی اکبرؑ

بے آس ہوئی سنتے ہی اس بات کو صغرا
منہ دیکھا عجب یاس سے ہمشکل نبیؐ کا
آنسو تھے جو اُمڈے ہوئے بہنے لگا دریا
دل سے تو نہ نکلا، پہ زباں سے کہا اچھا

بچ جائینگے گر موت سے لیجائیو بھائی
مختار ہو، جب چاہیو تب آئیو بھائی

ناگاہ روانہ ہوئی ذریت حیدرؑ
اُمِ سلمہؑ تھیں وہاں استادہ کھلے سر
زینبؑ نے سلام آخری اُن کو کیا جھک کر
جینے کی دعا دیکے یہ بولی وہ مکرر

اللہ رکھے تجکو سدا امن و اماں میں
زہراؑ کی طرح پردہ رہے تیرا جہاں میں

نقارہ بجا کوچ کا مولا ہوئے اسوار
رونق تھی جو یثرب میں وہ جاتی رہی اکبار
تھرائی زمیں ایسی کہ کانپے در و دیوار
ناگاہ پس پشت ہوا حشر نمودار

کیا دیکھتے ہیں شاہ کہ چلاتی ہے صغرا
ہمجولیوں کے ساتھ چلی آتی ہے صغرا

بانوئے حزیں پردہ اُلٹ کر یہ پکاری
تکلیف نہ کر اے مری بی بی مری پیاری
تھراتے ہوئے پاؤں سے آنیکے میں واری
جا گھر کو خدا صبر دے رخصت ہے ہماری

اب ننھا سا سجادہ بقیعہ میں بچھا کر
زہراؑ کے مسافر کے لیے حق سے دعا کر

محمل کے قریب آکے پکاری وہ پریشاں
جھولے کی جگہ مجکو نظر آئی جو ویراں

تڑپا علی اصغرؑ کے لیے دل مرا اس آں
اماں ترے صدقے ترے واری ترے قرباں

میں یہ نہیں کہتی کسی محمل میں بٹھا دو
پردے سے بھیا علی اصغرؑ کو دکھا دو

علی اصغرؑ حضرت

صغراؑ کی صدا سُنکے ہمکنے لگا اصغرؑ
الفت سے سوے راہ لگا دیکھنے مڑکر
دیکھا نگہِ یاس سے صغراؑ نے مکرر
اور بولی کہ اللہ نگہبان برادر

بچپن میں مدینے سے نکلتے ہوئے دیکھا
گھر میں نہ تمھیں گھٹنوؤں چلتے ہوئے دیکھا

جب سر اسیمہ وطن سے شہِ ابرار چلے
سرفروشی کو شہادت کے خریدار چلے
کہتی تھی فاطمہ صغراؑ کہ ہمیں مار چلے
لو مسیحا بھی مجھے چھوڑ کے بیمار چلے

ساتھ اماں کے نہ ہمراہِ پدر جاتی ہوں
لوگو بتلاؤ تو میں کیوں نہیں مر جاتی ہوں

مطلع ثانی

جب شہِ دیں کو دیا موت نے پیغامِ سفر
گریہ آغاز کیا سوچکے انجامِ سفر
آگے صغراؑ کے کسی نے نہ لیا نامِ سفر
گھر میں ہنگامۂ محشر ہوا ہنگامِ سفر

شور تھا قبر میں محبوبِ خدا روتے ہیں
بیوطن آج حسینؑ ابنِ علیؑ ہوتے ہیں

منزلِ گور کا حضرت نے جو سامان کیا
گھر کو برباد کیا، شہر کو ویران کیا
بولی صغراؑ مجھے اس کوچ نے بیجان کیا
میرے آزار پہ علیؑ نے نہ کچھ دھیان کیا

بے اجل آج موئی رنج کے مارے صغراؑ

چھٹکے بابا سے ہوئی گور کنارے صغرا

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبر کا میں بابا تیار
یہ نہ جانا ہی مرے دم سے لگی اک بیمار

بھیا اصغر کو لیے ہو گئیں اماں بھی سوار
رو کے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار

ٹھہرو اے صاحبو ٹھہرو، مجھے آ لینے دو
بھیا اصغر کو کلیجے سے لگا لینے دو

سارباں سے کہو اونٹوں کو ٹھہراؤ ذرا
تم کو ہر چند ہے ملنے کی مرے کیا پروا

ناتوانی پہ مری رحم کرو بہرِ خدا
میری آواز سے بیزار ہو صورت سے خفا

جلد اس طرح سے تشریف لیے جاتے ہو
آج گویا کہ مجھے دفن کیے جاتے ہو

مجھ سے بے آس ہو تم مجکو شفا کا ہی یقیں
ورنہ ایسی بھی تو بیمار نہیں میں غمگیں

اور جو دم نکلے تو اب باپ کے آگے آئیں
گرتی پڑتی ہوئی تم پاس میں آئی کہ نہیں

بھائی کے بیاہ کا میں کام کرونگی لوگو
دیکھ کر سہرا میں اکبر کا مرونگی لوگو

مجکو الفت ہی تمھاری تھیں الفت ہی نہیں
اماں لیں گود میں ایسی مری قسمت ہی نہیں

ساتھ دوڑوں جو سواری کے سو طاقت ہی نہیں
پیار آجائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں

لونڈیاں ساتھ چلیں آج عزیزوں کی طرح
میں جو بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح

جسنے چلنے کو کہا سب سے کہا بسم اللہ
گر خطا ہی یہ خطا ہے، جو گنہ ہے یہ گناہ

مجھ سے جھونٹوں بھی نہ پوچھا میں گنہگار تھی آہ
اندنوں شدتِ تپ سے مری حالت ہی تباہ

یہی نہ، دو دو پہر غش میں پڑی رہتی ہوں
اب تو ہشیار ہوں چلنے کے لیے کہتی ہوں

بیٹھے بیٹھے مرا اسوقت کا چلنا دیکھو
گرنا بیساختہ، مشکل سے سنبھلنا دیکھو
تپ میں کیا دیکھا تھا اب دل کا اچھلنا دیکھو
ہاتھ میں باندھتی ہوں ہاتھوں کا ملنا دیکھو

زردی آنکھوں کی تڑپ دل کی، دھڑک سینے کی
سب یہ مرجانے کی باتیں ہیں، یا جینے کی

یک بیک میرے مقدر کا بگڑنا دیکھو
پاؤں پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
سانس کا بات کے کہنے میں اکھڑنا دیکھو
حال یہ، اُسپہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہی بیٹی کو اسوقت میں بابا چھوڑیں

یہ تو اس کوچ سے اب ہوگیا صغرا کو یقیں
باپ کے ہاتھ کی مٹی مری قسمت میں نہیں
سب کو بابا نے مرے سامنے اسوریاں دیں
مجکو تابوت ہی چھوٹا سا منگا دیں شہ دیں

بعد مرنے کے لبِ گور جو جائے صغرا
باپ کے ہاتھ کا تابوت تو پائے صغرا

آہ الزام سے خالی نہیں مرنا بھی مرا
بھیا اکبر کا نہ بیاہ ایک برس تک ہوگا
پر مرا سوگ بھی کاہے کو کوئی رکھنے کا
لاڈلی کسکی ہوں اور کسکی ہوں پیاری میں بھلا

کیوں سبک سمجھے نہ ہر ایک مجھ آزاری کو
طول سا طول کھچا ہے مری بیماری کو

مینے چاہا تھا کہ دکھلاؤں نہ یہ حالِ زبوں
جاؤں در پر بھی نہ زحمت کے لیے میں محزوں

پھر یہ سوچی کہ حقیر اور بھی گنتے میں نہوں
بات ہی جب نہ کوئی پوچھے تو کس سے روٹھوں

متوجہ جو کسی کو میں نہیں پاتی ہوں
آپ ہی روٹھتی ہوں آپ ہی من جاتی ہوں

ہائے اب میں ہوں تنہائی ہے اور سونا گھر
دل کے بہلانے کو تم سب کے ہیں تھا یا اصغرؔ

نہ خبر مجکو تمہاری نہ تمہیں میری خبر
خالی جھولے سے میں ٹکراؤنگی یاں اپنا سر

الفتیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی
ہائے اللہ مری موت کو کیوں دیر ہوئی

ہوش میں آئی جو صغرا تو کیا شہ نے مقال
بولی وہ میں بھی تو بابا یہی کرتی ہوں سوال

اس نقاہت پہ مری جان سفر کا ہے خیال
چھوڑ دو تنہا اُسے تم گھر میں، ہو جسکا یہ حال

بعد اگر آپکے جانے کے غش آتا مجھ کو
کون اس پیار سے گودی میں اُٹھاتا مجھ کو

گو کہ میں غش میں تھی پر صاف یہ کانوں سے سُنا
دوڑو صاحب کہ ہوئی غش مری بیٹی صغرا

مجکو غش آیا تو چلا کے یہ اماں نے کہا
بعد انکے بھی کوئی چاہے گا مجکو ایسا؟

نانی صاحب کو بھی گو میری بہت الفت ہے
ماں کی شفقت میں مگر اور ہی کچھ لذت ہے،

دردِ سر۔ سوزشِ دل۔ رنجِ بخار ایک طرف
سو علاج ایک طرف۔ آپ کا پیار ایک طرف

اور یہ ہجرِ شہِ عرش وقار ایک طرف
لاکھ چین ایک طرف شہ کا کنار ایک طرف

گر قضا ہے تو فراقِ شہِ ابرار سے ہے

گر شفا ہے تو اسی شربتِ دیدار سے ہے

اب کہو یا نہ کہو، تم پہ یہ بیٹی ہو نثار
اونٹ بٹھلائیے ہو جاتی ہوں میں آپ سوار
والدہ ہاتھ پکڑ کر مجھے کیا دینگی اُتار
کبھی تو راہ میں آئے گا تمھیں مجھ پر پیار

پھوپی زینبؑ کو سفارش کے لیے لاؤنگی
پاؤں پڑ کر یہ خطا آپ سے بخشاؤنگی

جب کسی پر کچھ اثر نہ ہوا تو اُنھوں نے غصّے میں آکر اپنا زیور اُتار کر پھینک دیا ہے حضرتِ بانوؑ مضطرب ہو کر فرماتی ہیں کہ لوگو میری بیٹی غصّے ہو گئی ہے اسکو مناؤ۔ اُس کے جواب میں حضرت صغراؑ کہتی ہیں ؎

کہا صغراؑ نے کہ بس بس نہ کڑھاؤ اماں
کون ہوں میں مجھے کاہے کو مناؤ اماں
اب یہ زیور بھی سکینہؑ کو پہناؤ اماں
میں نہیں بولتی جاتی ہو تو جاؤ اماں

جان پر کھیلی ہوں زنہار نہیں جینے کی
لو قسم کل سے دوا بھی میں نہیں پینے کی

کہا بانوؑ نے میں صدقے گئی کچھ ماں کی خطا
مجھ پہ غصّے ہوئیں اور باپ سے کچھ بس نہ چلا
بولی صغراؑ کہ میں ناحق تو نہیں تم سے خفا
تم جو لے چلتیں مجھے، کیا کوئی شکوہ کرتا

ہی شکایت تمہیں صغراؑ کے خفا ہونے کی
میری غربت پہ ہی اسوقت جگہ رونے کی

ماں کی آغوش میں واں پی رہا تھا دودھ صغیرؑ
سُن کے بیمار کی آواز وہ ہمکا رو کر
کی ہر ایک سمت کو الفت بھری آنکھوں سے نظر
کہا صغراؑ نے ادھر دیکھو کھڑی ہوں میں ادھر

سہمے سہمے ہوئے کچھ تم نگراں ہوتے ہو

سرمہ آنکھوں سے بہا جاتا ہے کیوں روتے ہو

الوداع اے مرے ننھے سے مسافر ناداں
آج ہی منہ پہ ہیں پردیسیوں کے سارے نشاں

الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قرباں
مسکرانا نہ اشارہ نہ ہمکنا اس آں

میرے بھولے مرے پیارے مرے کمسن بھائی
گھٹنوؤں بھی نہ چلے گھر میں تم اکدن بھائی

چشم بد دور جب ان آنکھوں کا آئیگا خیال
دلپہ لہرائینگے جسدم یہ جھنڈولے ترے بال

آنکھیں رو رو کے شب و روز کرونگی میں لال
انہیں بالوں کی طرح ہوگا پریشاں مرا حال

چوسنے پر ان انگوٹھوں کے ہو قرباں صغرا
اب رہیگی یہاں انگشت بدنداں صغرا

ایک اک دم میں ترے لاکھ دم اے نور نگاہ
صد وسی سال ترے سر پہ سلامت رہیں شاہ

مصطفےٰ تیرے نگہبان، علی پشت و پناہ
باپ کے سائے میں پروان چڑھائے اللہ

تپ میں ہوں اسلیے گودی میں نہیں لیتی ہوں
ضامنی میں تمھیں اللہ کی میں دیتی ہوں

پھر یہ کبرا سے لگی کہنے بہ فریاد و بکا
خیر اب گھر میں جب آؤگی تو کرلونگی گلا

منہ پھرائے ہوئے، شرمائی ہوئی بیٹھی ہو کیا
سونپا اصغر کو تمھیں اور تمہیں حق کو سونپا

آجتک کام بہن نے کیا اس جانی کا
ذمہ اب تم کرو اصغر کی نگہبانی کا

دودھ راتوں کو پیا کرتے ہیں پچھلے پہر
میں لیا کرتی تھی یاں راتوں کو اٹھ اٹھ کے خبر

ہاتھوں سے ڈھونڈھتے ہیں ماں کو ادھر ادھر
بارہا سوتے میں تکیے سے سرک جاتا ہے سر

جاگتی رہیو تمھیں گر مرا اصغر سو جائے
نئی گردن کہیں بھائی کی نہ بیکل ہو جائے

مثال ۲ - حضرت علی اکبرؑ کی رخصت اور ماں باپ کی حالت۔

اکبرؑ نے کیا عزم جو میدانِ ستم کا
تغیر ہوا حال شہنشاہِ امم کا
رو کر کہا مجکو ہے بھروسا ترے دم کا
عباسؑ موئے میں بھی ہوں مہماں کوئی دم کا

کس منہ سے کہوں مرنے کو جاؤ علی اکبرؑ
بانوؑ کی کمائی کو لٹاؤ علی اکبرؑ

میں تو نہ کہونگا کبھی، تم مرنے کو جاؤ
سر باپ کے تن پر رہے تم سر کو کٹاؤ
اور خاک میں سب بانوؑ کے ارمان ملاؤ
سہرا نہ دکھاؤ مجھے لاش اپنی دکھاؤ

عباسؑ کے ماتم سے کمر خم ہے پدر کی
اکبرؑ یہ دوا کرتے ہو تم دردِ کمر کی

منصف کیا ہم نے تمھیں بتلاؤ یہ بیٹا
بیٹے کو کسی باپ نے ہے مرنے کو بھیجا
پتھر نہیں آخر ہے یہ انساں کا کلیجا
کس طرح سے بھیجوں تمھیں جلّا دو نہیں بیٹا

ہرگز نہ میں مانونگا نہ کچھ مجھ سے کہو تم
تنہائی میں۔ غربت میں۔ مرے ساتھ رہو تم

میں کرتا ہوں منّت تمھیں اسکا بھی نہیں دھیان
ماں بیاہ کی حسرت میں، تمھیں مرنے کا ارماں
بابا کی ضعیفی پہ کرو رحم میں قرباں
پیارے کی جدائی ہے مری موت کا ساماں

تنہا ہمیں ان ظالموں میں چھوڑتے ہو تم

بھائی نے کمر توڑی ہی، دل توڑتے ہو تم

اٹھارہ برس کا ابھی کل سن ہے تمہارا
نے بیاہ ہوا ہی نہ کوئی بیٹا ہے پیارا
بیٹا تمہیں انصاف سے بتلاؤ خدارا
کس طرح مجھے داغ تمہارا ہو گوارا

دل کو غمِ فرقت میں سنبھالا نہیں جاتا
سینے سے کلیجے کو نکالا نہیں جاتا

سن سن کے بیاں باپ کا رونے لگے اکبرؑ
کی عرض کہ ارشاد بجا ہی یہ سراسر
پر مجکو مناسب ہی یہی اے شہِ مضطر
اعدا سے لڑوں، صدقے ہوں مولا کے قدم پر

حسرت ہی نہ شادی کی، نہ اولاد کی بابا
شادی ہی یہی اکبرؑ ناشاد کی بابا

گر بیاہ کے قابل مجھے کرتا مرا غفار
کیوں آپ مصیبت میں یہاں ہوتے گرفتار
اب تو یہی شادی ہے مری اے شہِ ابرار
ہو آپ کے قدموں پہ فدا آپ کا دلدار

آغاز سے بہتر ہو اب انجام ہمارا
روشن رہے دنیا میں سدا نام ہمارا

اکبرؑ کا بیاں سن کے یہ بولے شہِ ابرار
بس بس نہ کڑھاؤ نہ کڑھاؤ مجھے دلدار
میں تو نہ اجازت کبھی دونگا تمہیں زنہار
بانوؑ سے تمنائے دلی اب کرو اظہار

مرنے کے لیے اپنے نہ شبیرؑ سے پوچھو
جو پوچھنا ہو بانوؑ سے دلگیر سے پوچھو

ناگاہ قریب آ کے بانوؑ یہ پکاری
قربان گئی کس لیے تم کرتے ہو زاری
کس بات پہ ضد کرتے ہو مجھسے کہو واری
محکوم ہوں میں، تابعِ فرماں ہوں تمہاری

لو جلد بتاؤ کہ کلیجہ مرا شق ہے
کیا بات ہے، کیوں غصے ہو کیوں رنگ فق ہے

میں بھی تو سنوں داری ہے کیا قصد تمھارا
وہ بولی کہ یہ تو نہ کہو مجھ سے خدارا

اکبرؑ نے کہا کوچ ہے دنیا سے ہمارا
ان باتوں کے سننے کا نہیں ہے مجھے یارا

مادر کے کڑھانے کی نہ تقریر کرو تم
خنجر کے تلے ماں کا کلیجہ نہ دھرو تم

انصاف سے للہ بتاؤ مجھے بیٹا
اور اُسکا بھی ہمشکلِ نبیؐ بیٹا ہو تم سا

مجھ سی جو کوئی اور ہو ماں غمزدہ دُکھیا
وہ چاہے گی مر جائے مری گود کا پالا

تم چاہتے ہو ماں کو یہ خدمت کا صلہ دوں
اب خاک میں بانوؑ کے سب ارمان ملا دوں

اسدم کوئی برچھی ہے مرے دل پہ لگاتا
بے چین ہے دل، دم نہیں سینے میں سماتا

گویا ہے کلیجہ کوئی میرا لیے جاتا
اسدم مری آنکھوں سے نظر کچھ نہیں آتا

لذت مرے جینے کی لیے جاتا ہے کوئی
بے تیغ مجھے ذبح کیے جاتا ہے کوئی

آگاہ تو ہے نزع کی حالت سے زمانا
پر کوئی نہیں دیکھتا ہے روح کا جانا

گر پاؤں رگڑنا، کبھی آنکھوں کا پھرانا
اسوقت سُنے کوئی مرے غم کا فسانا

چھاتی غمِ اکبرؑ سے پھٹی جاتی ہے میری
میں دیکھتا ہوں جان چلی جاتی ہے میری

دریا کی طرف دیکھ کے کہتے ہیں کہ آؤ
عباسؑ کہاں ہو، علی اکبرؑ کو مناؤ
اک عمر کی دولت مری لٹتی ہی بچاؤ
کیا کہہ کے میں روکوں اسے، اللہ بتاؤ

اک درد نیا اُٹھتا ہی رہ رہ کے جگر سے
فرزند برابر کا بچھڑتا ہے پدر سے

ناگاہ یہ غل آلِ پیمبرؐ نے مچایا
یا شاہ خبر لیجیے زینبؑ کو غش آیا
کیا جانیے کیا آنکے فضّہ نے سُنایا
جو ہوش میں پھر زینبؑ بیکس کو نہ پایا

عرصہ ہوا کھولا تھا ذرا دیدۂ نم کو
اب نبض کسی ہاتھ کی ملتی نہیں ہم کو

زینبؑ سے زیادہ یہاں بیہوش تھے شبیرؑ
یہ غل جو سُنا، بانوؑ سے کرنے لگے تقریر
ہی خیر تو، یہ شور ہے کیا بانوؑ ے دلگیر!
کیا جھولے میں دم توڑتا ہی اصغرؑ بے شیر

کیا مر گیا وہ کل سے جو بیہوش پڑا تھا
بیمار تھا۔ مظلوم تھا۔ محتاج دوا تھا

بانوؑ نے کہا یہ جو کمر باندھے کھڑے ہیں
اور آپ سے فردوس کے جانے پہ اڑے ہیں
اور زخم اُٹھانے کے بھی مشتاق بڑے ہیں
انکے لیے ہم لوگ مصیبت میں پڑے ہیں

تم آنکے دیکھو تو، نہیں ہوش کسی کو
غش آیا ہی صاحب! علی اکبرؑ کی پھوپی کو

پھر خیمۂ عصمت میں جو آئے شہِ والا
ایک ایک کو مُردہ وہاں شبیرؑ نے پایا
زینبؑ کو زمیں سے شہِ بیکس نے اُٹھایا
بولے کہ میں ناحق اسے پردیس میں لایا

قربان کیا بیٹوں کو مجھ بھائی کے اوپر

ہے تیسرا فاقہ مری ماں جائی کے اوپر

پھر شانہ ہلا کر کہا لو ہوش میں آؤ
ہم کہتے نہ تھے جی کو نہ اکبرؑ سے لگاؤ
بانوؑ نے کہا شاہ سے شانہ نہ ہلاؤ
خوشبو نہیں تم گیسوے اکبرؑ کی سنگھاؤ

پھر ہوش میں یا شاہ ابھی آئیگی زینبؑ
گر مر بھی گئی ہوگی تو جی جائیگی زینبؑ

بو گیسوے مشکیں کی جو اکبرؑ نے سنگھائی
پھر خواہرِ شاہِ شہدا ہوش میں آئی
شہ سے کہا میں جیتی ہوں کیوں روتے ہو بھائی
پر خوب ہے، مر جاؤں جو میں غم کی ستائی

بیخود مجھے حضرت کی محبت نے کیا ہے
بیٹوں کا بھی مرنا مجھے اب بھول گیا ہے

پھر دیکھ کے اکبرؑ کی طرف بولی وہ دکھیا
بھیا مجھے بتلاؤ کہ یہ کہتے ہیں اب کیا
حضرت نے کہا تھام کے ہاتھوں سے کلیجا
یہ دھیان نہیں کرتے کہ مظلوم ہے بابا

میں کیا کہوں جو جو کہ خوشامد مری کی ہے
قسمیں مجھے دے دیکے رضا مرنیکی لی ہے

ہوش اڑ گئے زینبؑ کے لگی کرنے یہ گفتار
تھے آپ بھلا کون رضا دینے کے مختار
تم عابدؑ و اصغرؑ کے ہو مالک شہِ ابرار
مشہور ہے سب کنبے میں اکبرؑ مرا دلدار

کیوں اذن دیا تم نے یہی رنج و الم ہیں
مختار رضا دینے نہ دینے کے تو ہم ہیں

کہتے تو کہا شاہ سے یہ بادلِ مضطر
پھر ڈھانپ کے منہ رونے لگی دختر حیدرؑ
شہ نے کہا ہمشیر کو چھاتی سے لگا کر
کیوں روتی ہو، روتا ہے تمہارا علی اکبرؑ

خیمے کی زمیں ہلتی ہے آہیں نہ بھرو تم
رو رو کے کلیجہ مرا ٹکڑے نہ کرو تم

وہ بولی نہ کیوں روؤں کہ رونیکی ہے یہ جا
تمنے مجھے اکبرؑ سے جدا کردیا بھیا
کل تک یہ مجھے کہتے تھے ماں میں نہیں بیٹا
بے پوچھے مرے کام تم کچھ کرتے تھے اصلا

ٹھہری نہ کوئی آج میں ہمشکل نبیؐ کی
سچ تو یہ ہے تقدیر نہ پھر جائے کسی کی

کچھ پالنے کا حق بھی نہ ثابت ہوا زنہار
وہ میری مشقت وہ مرے دکھ وہ مرے پیار
کیا یاد نہیں ہیں تمہیں اے سیّد ابرار
بانوؑ تو فقط دودھ پلانے کی ہے مختار

جو رسم محبت تھی میں لائی تھی عمل میں
قرآں کی طرح سے لیے پھرتی تھی بغل میں

میں نے اسے ابتک نظر بد سے بچایا
کھانا بھی اسے اوٹ میں دامن کے کھلایا
الحمد کو دم کرلیا پانی جو پلایا
ثمرہ مگر اس پالنے کا آج یہ پایا

اپنا جسے سمجھی تھی وہ بیگانہ ہوا ہے
قسمت کا نہیں پھیر تو صدقے گئی کیا ہے

منہ دیکھ کے ہمشیر کا رونے لگے سرور
اور ڈالدیا بیٹے کو خواہر کے قدم پر
فرمایا بہن، تجھپہ ہو قرباں یہ برادر
کب میں نے کہا آپکا بیٹا نہیں اکبرؑ

بانوؑ کا ہی کچھ زور نہ کچھ دخل مرا ہے
میں اُسکا ہوں مختار نہ وہ اہل عزا ہے

وہ بولی اگر آپ سمجھتے مجھے مختار
بن پوچھے مرے ان کو رضا دیتے نہ زنہار

کی تم نے خبر بھی نہ مجھے اے شہِ ابرار
جو درد مرے دل میں ہے کس سے کروں اظہار

کیوں نکلیں نہ آنسو کہ چھری دل پہ چلی ہے
اسوقت بڑی آس مری ٹوٹ گئی ہے

اور سچ بھی ہے کیا ان پہ بھلا زور ہمارا
ہم کون ہیں، تم باپ، یہ فرزند تمھارا
بھیّا! مری تقدیر کا ہے پیچ یہ سارا
دُکھیاروں سے کرتے ہیں سبھی دُکھ میں کنارا

کوئی بھی نہیں اے شہِ مظلوم ہمارا
یہ بخت، یہ تقدیر، یہ مقسوم ہمارا

پھر بولی یہ اکبرؑ سے وہ دُکھ درد کی ماری
تمنے بھی نہ سمجھا کوئی اپنا مجھے واری
گو عمر کروں صرف میں خدمت میں تمہاری
بانوؑ سے زیادہ نہ مگر ہونگی میں پیاری

بالفرض کہ مادر نہیں میں زار و حزیں ہوں
کیا چاہنے والی بھی تمھاری میں نہیں ہوں

لیکن ہے غرض ہمکو تو جینے سے تمہارے
ماں باپ کے تم ہو کے جیو اے مرے پیارے
شہ نے کہا اب جائینگے یہ گو کنارے
اکبرؑ ہیں نہ انکے، نہ تمھارے، نہ ہمارے

اب آج محمدؐ کی نشانی نہ رہیگی
یہ قد نہ رہے گا یہ جوانی نہ رہیگی

مثال ۳ - حضرت امام حسینؑ بہن - بیٹی، اور بیوی سے رخصت ہوتے ہیں ؎

اُسوقت اہلبیتؑ میں تھی طرفہ واردات
جز نوحہ کچھ سخن تھا نہ جز آہ کوئی بات

کہیے نہ صبح قتل قیامت کی تھی وہ رات
غل تھا حسینؑ چھوڑتے ہیں بیکسوں کا ساتھ

بے وارثی کا آلِ نبیؐ کو پیام ہے
لو رخصتِ حسینِ علیہ السّلام ہے

جب صبح بے ردائی زینبؑ عیاں ہوئی
اور آخری سپاہِ خدا میں اذاں ہوئی
ناموسِ مصطفےٰ میں بپا یہ فغاں ہوئی
بس اب بہارِ گلشنِ زہراؑ خزاں ہوئی

کانپے گا عرش فاطمہؑ کے شور و شین سے
جسدم وداع ہوئیگی زینبؑ حسینؑ سے

فارغ ہوئے نماز سے ناگہ شہِ امم
آئے حرم سرا میں پئے رخصتِ حرم
فضّہ کو دیکھ کر یہ پکارے بچشمِ نم
لا کہنہ جامہ کوج ہے اپنا سوئے عدم

روداد آج کی نہ فراموش ہوتی تھی
یہ دن وہ ہے کہ فاطمہؑ جس دن کو روتی تھی

زینبؑ سے پھر کیا شہِ بیکس نے یہ کلام
لو خواہر الوداع کہ ہے رخصتِ امام
یہ صبحِ قتل ہم کو شہادت کا ہے پیام
اب رات بھی تمام ہے اور بات بھی تمام

جاتا ہوں میں تو شیعوں پہ قربان ہونے کو
دنیا میں تم رہو مری غربت پہ رونے کو

ہاتھوں سے دل پکڑ کے گری دخترِ بتولؑ
دامن سے لپٹی شاہ کے وہ بیکس و ملول
ٹھہرا کے دل کو بولی کہ اے نائبِ رسولؐ
مرنا قبول ہے ترا ماتم نہیں قبول

زینبؑ کو پہلے ذبح کر و خیمہ گاہ میں
پھر جاؤ سر کٹانے کو خالق کی راہ میں

تنہا جو چھوڑتے ہو مری کچھ خطا بھی ہی
کوئی بجز حضور مرا آسرا بھی ہی
کوئی بزرگ سر پہ ہمارے رہا بھی ہی
یہ درد لا علاج ہی، یا کچھ دوا بھی ہی

دم اتنے بیکسوں کا ترے دم کیسا ہے
بھیا! خدا کی ذات ہی یا تیری ذات ہے

مرقوم ہیں یوں شاہ کے اخبارِ مصیبت
جب رو چکے ہفتاد و دو تن کیلیے حضرت
گھر آنے کی میداں سے نہ تھی شاہ میں طاقت
پر کھینچ کے لے آئی سکینہؑ کی محبت

یاں آنکے دیکھا تو اُسے پیاس بڑی ہی
ماں بیٹھی ہی بالیں پہ وہ بیہوش پڑی ہی

زینبؑ سے یہ رو رو کے گلا کرینگے شاہ
جیتے جی مرے حال سکینہؑ کا یہ ہے آہ
ہی خاک پہ بیہوش، خبر تم کو نہیں - واہ
جانو اسے بن باپ کی شفقت کرو للہ

غافل مرے بچوں سے جو اس آن ہوئی ہو
ہاں پال کے اکبرؑ کو پشیمان ہوئی ہو

لے لے کے بلائیں کہا زینبؑ نے میں واری
تو ہی مجھے پیارا - تری اولاد بھی پیاری
میں نے اسے گودی میں اُٹھایا کئی باری
ہوش آتا ہی تو کہتی ہی یہ پیاس کی ماری

اے صاحبو الفت مری تم دل سے بھلا دو
یا مجکو تڑپنے دو - دیا پانی پلا دو

یہ کہکے سکینہؑ کو لیا گود میں اک بار
بانو نے ملے بیٹی کے رخسار پہ رخسار
ہوش آیا سکینہؑ کو تو کی اُسنے یہ گفتار
بابا مرے آئے، جو مجھے کرتے ہیں سب پیار

لی میری خبر آکے حسینؑ ابنِ علیؑ نے
ابتک تو زمیں سے نہ اُٹھایا تھا کسی نے

شہ نے بھی پکارا کہ مری جان ہم آئے
یہ کہہ کے تب اُس پیاسی نے ہاتھ اپنے بڑھائے

یاں آؤ کہ بابا تمھیں چھاتی سے لگائے
حضرت کے سوا کون مرے ناز اُٹھائے

بن باپ کی دُنیا میں نہ کہلائے سکینہؑ
اب لیکے بلا آپ کی مرجائے سکینہؑ

یہ سُن کے ہوا چاک دلِ سیدِ ابرار
پھر کان میں آہستہ یہ کی شاہ نے گفتار

مانند یتیموں کے اُسے شہ نے کیا پیار
لائی ہے مجھے رن سے تری حسرتِ دیدار

درگاہِ خدا میں طلبِ سروردیں ہے
اب اس سے سوا حکم ٹھہرنے کا نہیں ہے

پر تم سے وصیت یہ پدر کی ہے خبردار
ہر بات پہ بانوؑ سے نہ تم روٹھیو زنہار

اب یاد نہ تم کیجیو مجکو، نہ مرے پیار
وہ اکبرؑ و اصغرؑ کے ہے ماتم میں گرفتار

تم روٹھو گی تو اور وہ گھبرائیگی پیاری
اچھی بھی اُسے بات نہ خوش آئیگی پیاری

زینبؑ کو بھی تازہ ہے ابھی ماتمِ اولاد
ہوئیگا مرے غم میں مریض اور بھی سجادؑ

اور بعد مرے آئینگے فرزند بہت یاد
ایک ایک ترے کنبہ میں ہے بیکس و ناشاد

بھائی سے، نہ ماں سے، نہ بہن سے، نہ پھوپی سے
اب بعد مرے ناز بھی کرنا نہ کسی سے

سینے پہ مرے سو چکیں۔ اب خاک پہ سونا
آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا

گو قہر ہے اس سن میں جدا باپ سے ہونا
لاشا مرا تڑپیگا بہت مجکو نہ رونا

گر چاہو مری روح ہو نا شاد سکینہؑ
تو غم میں مرے کیجیو فریاد سکینہؑ

اک آہ سکینہؑ نے کی اور بولی یہ رو رو
دریا سے بلا لو مرے عباسؑ چچا کو
گر چھوڑتے ہو تم تو چچا کو مجھے سونپو
حضرت نے کہا نام نہ عباسؑ کا تم لو

دریا پہ فقط لاش ہی اور مشک و نشاں ہے
عباسؑ تو مارا گیا۔ عباسؑ کہاں ہے

رخصت ہوئے القصہ شہِ صابر و شاکر
سب بیبیاں بولیں کہ خدا حافظ و ناصر
تھی موت رکابِ شہِ مظلوم میں حاضر
اور فاطمہؑ کی روح جلو داری کی خاطر

مینھ تیر و تکا پڑنے لگا کفار کی صف سے
پیغامِ قضا آنے لگے چار طرف سے

اب فرضِ عین سب کو خیالِ حسینؑ ہے
رن میں عجیب صورتِ حالِ حسینؑ ہے
دن ڈھل چکا ہے وقتِ زوالِ حسینؑ ہے
ہفتم سے بھوکی پیاسی سب آلِ حسینؑ ہے

منہ پیٹو۔ ابنِ فاطمہؑ پا در رکاب ہے
صورت یہی نجات کی روزِ حساب ہے

نو لاکھ کی جفائیں برابر اٹھا چکے
اور ایک دل پہ داغ بہتر اٹھا چکے

لہ مرثیہ غیر مطبوعہ و غیر منقسمہ سے جسکا مطلع یہ ہے۔ ع۔ عشق خدا کا بار نہ کہسار سے اٹھا۔

اکبرؑ کی لاش، صدمۂ اصغرؑ اٹھا چکے
دنیا سے ہاتھ سبطِ پیمبرؐ اٹھا چکے

آئے ہیں بیکسوں سے وداعِ اخیر کو
حسرت سے دیکھتے ہیں صغیر و کبیر کو

زین العبا کو رازِ امامت بتا چکے
زینبؑ کو اپنا صاحبِ ماتم بنا چکے
بانوؑ سے مہر بھی شہِ دیں بخشوا چکے
پیغام موت کا ملک الموت لا چکے

زہراؑ کی قبر، ہلتی ہے پوتی کے بین سے
لپٹی ہے چار سال کی بیٹی حسینؑ سے

جب دیکھتے ہیں اُسکی طرف تھرتھراتے ہیں
کُرتے میں گھنڈی دیتے ہیں ٹوپی پہناتے ہیں
دکھلا کے اُسکا حال بہن کو سُناتے ہیں
اس سن کے بچے اور بھی دُکھ اُٹھاتے ہیں

دریا پہ خون بی بی کے سقّے کا بہ گیا
یہ خشک ہونٹ دیکھنے کو باپ رہ گیا

کیا حال ہو گیا ہے مری بیوطن کا آہ
کیا دل دھڑک رہا ہے مری خستہ تن کا آہ
کیا منہ اُتر گیا ہے مری کم سخن کا آہ
کیا تن لرز رہا ہے مری گلبدن کا آہ

سانس ایسے لے رہی ہے کہ بابا میں دم نہیں
اکبرؑ کی لاش دیکھنے سے کچھ یہ کم نہیں

زینبؑ جواب دیتی ہیں۔ فاقہ ہے میرا
بھیّا ابھی سکینہ کا سن کیا، بساط کیا
دیتی ہے وہ قسم نہ کڑھیں شاہِ کربلا
سر پر ہیں آپ۔ ہے یہ بڑی نعمتِ خدا

دل پر نہ داغ قبلہ و کعبہ کا لونگی میں
جان اپنی دونگی آپ کو جانے نہ دونگی میں

یہ جو کہا سکینہؑ نے ٹھہرا سبھوں کا دم
خالق نے عاجزی پہ ہماری کیا کرم

اکبرؑ نے عرض کی شہ دیں سے بچشم نم
خاموش تھے حضور کے پاس ادب سے ہم

کیا یاور اس گھڑی بھی نہ مقسوم ہوئیگا
اب رن کو جائیے گا تو معلوم ہوئیگا

لی ہم سے، انسے آپ رضا لیں تو جانیں ہم
ہاتھوں سے انکے ہاتھ چھڑا لیں تو جانیں ہم

گردن سے ننھی باہیں نکالیں تو جانیں ہم
کہنا سکینہؑ جان کا ٹالیں تو جانیں ہم

روٹھیں تو پھر حضور نہیں کی خوشی کریں
یہ اپنی ضد کی ہیں جو کہیں پھر وہی کریں

شہ بولے بے جدائی کے چارہ نہیں ہمیں
اللہ کے عتاب کا یارا نہیں ہمیں

اب رو و پیٹو۔ دھیان تمھارا نہیں ہمیں
کوئی خدا کے سامنے پیارا نہیں ہمیں

عشق خدا کا روز ازل دم بھرے حسینؑ
دنیا میں آکے وعدہ خلافی کرے حسینؑ!!

مثال ۴ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی حضرت عباسؑ کے مرنیکی خبر سنکر رزمگاہ میں جاتے ہیں ؎

گھوڑے سے گرے جب تو برادر کو پکارا
سنتے ہی نہ حضرت کو رہا ضبط کا یارا

کام آیا یہ خادم یہ نمک خوار تمھارا
بس ہائے اخی کہکے گریباں کیا پارا

کانپا جو بدن، حیدرؑ صفدر نے سنبھالا
غش کھا کے گرے تھے کہ جو اکبرؑ نے سنبھالا

پھر مڑ کے جواں بیٹے کو چلائے کہ جلد آؤ
اکبرؑ مرے لوٹے ہوئے بازو سے لپٹ جاؤ

بیتاب ہوں میں جلد مرے بھائی کو دکھلاؤ
دم آنکھوں میں آپہونچا، ہمیں نہر پہ پہونچاؤ

آنکھوں سے مرے خونِ دل اسوقت بہا ہے
چھریوں سے کلیجے کو کوئی کاٹ رہا ہے

اب دل میں ہے وہ درد جو پہلے تھا کمر میں
یوں کوئی مسافر نہ لٹا ہوگا سفر میں

شانوں کی طپش کھیل کے آئی ہے جگر میں
بیٹا مرے عباسؑ کا باہر ہے کہ گھر میں؟

سمجھا دو چچی کو کہ اُسے پاس بلالیں
بہنوں سے یہ کہدو کہ سکینہؑ کو سنبھالیں

مظلوم کو مظلوم کے بیٹے نے سنبھالا
ہاتھوں کو کیا فاطمہؑ نے چاند کا ہالا

پر گرتے تھے اسپر بھی تڑپ کر شہِ والا
جس طرح کہ بسمل کا جگر ہوتہ و بالا

اکبرؑ کا یہ عالم تھا کہ گھبرائے ہوئے تھے
عباسؑ کے ماتم کی سناں کھائے ہوئے تھے

سر پیٹتے روتے ہوئے میداں کو چلے شاہ
بابا کی کمر تھام کے اکبرؑ ہوئے ہمراہ

عباسؑ کا لاشہ جو نظر آگیا ناگاہ
بھائی سے بغل گیر ہوئے سرورِ ذیجاہ

کچھ کہنے نہ پائے کہ مسافر ہوئے عباسؑ
مُنہ دیکھتے ہی دیکھتے آخر ہوئے عباسؑ

بولے شہِ مظلوم یہ شانے کو ہلا کر
اُٹھتے نہیں، کیا سو گئے عباسؑ دلاور

ہمراہ تھے ہم بھی، نہ توقف کیا دم بھر
اللہ! یہ جلدی ہوئی اے جانِ برادر

پایا جو مکاں سرد تو نیند آگئی تم کو
ہاں شیر تھے دریا کی ہوا بھا گئی تم کو

ڈیوڑھی پہ علم غرق بخوں آیا کہ محشر
ماتم کا اشارہ کیا پنجے نے لچک کر
پھر تو کوئی غش تھا کوئی بیخود کوئی ششدر
ڈیوڑھی پہ حرم پیٹتے تھے لونڈیاں باہر

سردار بھی بیہوش تھا اور اہلِ حرم بھی
مُنہ ڈھانپ کے روتا تھا پھریرے سے علم بھی

ایک دوسرے مرثیے میں فرماتے ہیں ؎

واں ایک بلندی جو درِ خیمہ کے تھی پاس
بے فوج کا سردار کھڑا تھا وہاں بے آس
سیّد کی تو آنکھیں نگراں تھیں سوئے عباسؑ
منہ دیکھتے تھے اُن کا حرم در سے بصد یاس

واں نہر پہ غل اُٹھتا تھا یاں دردِ جگر میں
تاریک تھا دن آلِ پیمبرؐ کی نظر میں

چہرہ شہِ بیکس کا ہوا زردِ قضا را
اکبرؑ نے دعا کے لیے عمامہ اُتارا
گھبرا کے درِ خیمہ سے زینبؑ نے پکارا
عباسؑ پہ کیا گذری، کہو جلد خدارا

سنتی ہوں کہ اب خیر سے خیمے کو پھرے ہیں
حضرت نے ملے ہاتھ کہ لشکر میں گھسے ہیں

منہ پیٹ کے بانوؑ یہ سکینہؑ کو پکاری
ہر بات پہ ضد کرنا بُرا ہوتا ہے واری
لو ہوتی ہیں اب رانڈ چچی جان تمھاری
اب کسکے چچا جان کو گھیرے ہیں یہ ناری

حضرت نہیں جینے کے اس اندوہ و تعب سے
سب گھر کی تباہی ہوئی بی بی کے سبب سے

شرما کے یہ کہنے لگی وہ نازوں کی پالی
ہے ہے، یہ بلا میں نے چچا جان پہ ڈالی
قربان ہوئی نہر پہ میں بھیجنے والی
اللہ نہ ٹوٹے کمرِ سیّدِ عالی

جسوقت بلائیں ہیں چچا جان کی لونگی
یہ بالیاں کانوں کی تری راہ میں دونگی

ناگاہ ہوا عرصۂ مقتل تہ و بالا
اور بیٹھ گئے دل کو پکڑ کر شہِ والا

منہ پردے سے پھر زینبؑ بیکس نے نکالا
پونچھا تو کیا شاہِ شہیداں نے یہ نالا

اب منہ سے نکلتا ہی کلیجہ مرا پھٹ کر
سینے پہ لگا تیر، گرے بھائی اُلٹ کر

زینبؑ نے بھی گردن طرفِ نہر پھرائی
چلائی کہ ہی ہی شہِ مرداں کی دہائی

اک چیز چمک کر مجھے گرتی نظر آئی
پنجہ یہ نشاں کا ہی، کہ پرچم ہی طلائی

بازوے علمدار قلم ہوگیا لوگو
ٹھنڈا مرے بھائی کا علم ہوگیا لوگو

کیوں صاحبو! سر ننگے میں اب خیمے سے جاؤں
ماتھے پہ لہو سقّے کے شانے کا لگاؤں

دریا پہ صفِ ماتمِ عبّاسؑ بچھاؤں
اماں کو بھی اسوقت بقیعے سے بلاؤں

بابا کی شہادت کا قلق تازہ ہوا ہی
سیدانیو! میرا علوی بھائی موا ہی

پھر بیوۂ مسلمؑ کو پکاری وہ دل افگار
بھائی ہی حقیقی ترا عبّاسؑ علمدار

دے اذن تو ساماں کروں ماتم کا میں نادار
وہ بولی کہ مالک ہیں حضورؑ اور شہِ ابرار

پر آپ ترائی میں جو کھوئے ہوئے سر جائیں
اکبرؑ تو نہ غیرت سے گلا کاٹ کے مرجائیں

سیدانی نے منہ اکبرِ مظلوم کا دیکھا
نہوڑا لیا شہزادے نے تھرّا کے سر اپنا

سمجھی کہ رضائے علی اکبرؑ نہیں اصلا
زینبؑ نے وہیں پیٹ کے منہ پر لیا پلّا

یاں شور و فغاں گنبدِ دوّار پہ پہونچا
سردار وہاں لاشِ علمدار پہ پہونچا

شہ بولے لپٹ کر یہ برادر ترے صدقے
بھائی! مرا بابا مری مادر ترے صدقے
بھائی! مرا اکبرؑ مرا اصغرؑ ترے صدقے
بھائی! مرے شیعہ مرا سب گھر ترے صدقے

تجھ سا نہ کوئی اہلِ وفا ہوئیگا عبّاسؑ
میں اُسپہ تصدّق جو تجھے روئیگا عبّاسؑ

غازی نے دعا دی کہ ہمیشہ رہو آباد
خالق علی اکبرؑ کو کرے صاحبِ اولاد
شیعوں کی ترقی ہو، موالی رہیں دلشاد
لو جاتا ہوں، اللہ نے بندے کو کیا یاد

لبّیک پیمبرؐ مجھے فرماتے ہیں آقا
بابا بھی وہ سر ننگے چلے آتے ہیں آقا

یہ کہکے تبسّم کیا پھر لب نہ ہلایا
سینے میں رُکی سانس، جبیں پر عرق آیا
آنکھوں کی سیاہی کو سفیدی نے چھپایا
منکا جو ڈہلا، سر قدمِ شہ پہ جھکایا

غش ہو گئے شبیرؑ، قضا کر گئے عبّاسؑ
تھرّا کے بدن رہ گیا اور مر گئے عبّاسؑ

جا کر درِ خیمہ پہ کسی نے یہ سنایا
ہمشکلِ نبیؐ دوڑو کہ حضرت کو غش آیا
آکر علی اکبرؑ نے جو حضرت کو اُٹھایا
شہ بولے کہ بھائی سے مقدّر نے چھڑایا

روتا ہمیں عبّاسؑ نے چھوڑا علی اکبرؑ
دم بھی مری آغوش میں توڑا علی اکبرؑ

حالتِ نزع

پھر لاشہ پہ یہ مرثیہ پڑھنے لگے رو کر
افسوس تری بیکسی و یاس برادر
ہی ہی مرے عاشق تجھے گھیرے رہا لشکر
ہم بہرِ مدد آ نہ سکے وائے مقدر

غم سے ترے تڑپیگی مری روح بدن میں
جب تک نہ بدن ہوئیگا پوشیدہ کفن میں

پھر گھر کو چلے لاش اُٹھا کر شہِ والا
آگے علم و مشک لیے گود کا پالا
ٹکڑے تھا جو عباسِ علیؑ کا قدِ بالا
گہ آپ سنبھالا کبھی اکبرؑ نے سنبھالا

لاشے کو تو معراج تھی دوشِ شہِ دیں پر
اور پاؤں رگڑتے ہوئے آتے تھے زمیں پر

سیدانیوں میں لاشۂ عباسؑ جو آیا
گھبرا گئیں بہلا کے سکینہؑ کو چھپایا
اور جعفرِ طیار کی مسند کو بچھایا
آہستہ سے لاشہ اسی مسند پہ لٹایا

شہ بولے، علمدار سفر کر گئے زینبؑ
لشکر کا ہوا خاتمہ ہم مر گئے زینبؑ

اب لاش پہ سیدانی ہر اک اشک بہائے
زینبؑ نے کہا پہلے بہن رونے کو جائے
یاں سے تو نبی زادی چلی سر کو جھکائے
واں بیوہ نے مُردے کے کٹے شانے ہلائے

چلائی کہ صاحب مرے، تسلیم کو اُٹھو
ہمشیرِ حسینؑ آتی ہیں تعظیم کو اُٹھو

زینبؑ نے کہا سونیکی یہ کون گھڑی ہے
اے بھائی اُٹھو فوجِ ستم گرد کھڑی ہے
رو لونگی میں پھر، رونے کو سب عمر پڑی ہے
پر اب تو مجھے تم سے شکایت یہ بڑی ہے

اسوقت سدھارے جو ملاقاتِ نبیؐ کو

سونپا کسے عباسؑ حسینؑ ابنِ علیؑ کو

ناگاہ کہا ماں سے سکینہؑ نے یہ کیا ہی
دم گھٹتا ہی تم نے مجھے کیوں روک رکھا ہی
سر کھولکے کُنبہ مرا مصروفِ بکا ہی
ہی ہی کہیں مظلوموں کا مرنا بھی چھپا ہی

میں نے اُنہیں مشکیزہ دیا کیا کہ خطا کی
اب لاش بھی مجکو نہ دکھاؤ گی چچا کی

اماں! مجھے عمّوں کی زیارت سے نہ ترساؤ
گر ہوں میں گنہگار سفارش مری فرماؤ
رومال سے تم ہاتھ مرے باندھ کے لیجاؤ
دیدار چچا کا اسی تقریب سے دکھلاؤ

لونڈی کی طرح گردِ علمدار پھرونگی
زانو پہ نہ بیٹھوں گی، میں قدموں پہ گرونگی

مثال ۵ - علی اکبرؑ نزع کی حالت میں ہیں اور امام حسینؑ اُنکے پاس جاتے ہیں ؎

گم ہوگیا ہی کھا کے سناں یوسفِ حسینؑ
بن بیاہا، نامراد جواں، یوسفِ حسینؑ
صابر، غریب، تشنہ دہاں یوسفِ حسینؑ
ہونٹوں پہ پھیرتا ہی زباں یوسفِ حسینؑ

گر گر کے لوٹنا نہیں بیجا حسینؑ کا
برچھی کی نوک میں ہی کلیجا حسینؑ کا

بیٹا لہو میں لال ہی، منہ انکا زرد ہی
زلفوں میں بال بال بیاباں کی گرد ہی
واں لب پہ لعطش ہی یہاں آہِ سرد ہی
واں نیزہ ہی جگر میں، یہاں دل میں درد ہی

روتے پہ شہ کے صاحبِ اولاد روتے ہیں

وہ حال ہی کہ دیکھ کے جلّاد روتے ہیں

یعقوبؑ یوں پھرے تھے نہ یوسفؑ کی چاہ میں
تاریک آسمان و زمیں ہے نگاہ میں
تھالے لہو کے سونگتے ہیں قتل گاہ میں
ہاتھوں سے لاش ڈھونڈتے ہیں گرد کے راہ میں

جو پوچھتا ہی گم ہوئی کیا شے حضور کی
فرماتے ہیں تلاش ہی آنکھوں کے نور کی

دولت ملی ہی خاک میں اٹھارہ سال کی
سو خاک چھانتا ہوں میں دشتِ قتال کی
للہ لو خبر کوئی بانوؑ کے لال کی
چھائی ہی میرے چاند پہ بدلی زوال کی

ڈھونڈے کہاں حسینؑ کدھر جائے کیا کرے
معذور آنکھوں سے نہ کسی کو خدا کرے

اے عاشقِ حسینؑ سنبھالو حسینؑ کو
نرغے سے ظالموں کے نکالو حسینؑ کو
تلواریں پڑ رہی ہیں بچالو حسینؑ کو
کس جا ہو، کس طرف ہو، بلالو حسینؑ کو

پالا تھا تم کو ہاتھ پکڑنے کے واسطے
یا ایڑیاں زمیں پہ رگڑنے کے واسطے

خنجر بکف کھڑے ہیں رسالے، مدد کرو
گھیرے ہوئے ہیں برچھیوں والے، مدد کرو
دیکھو جگر پہ چلتے ہیں بھالے، مدد کرو
بنتِ علیؑ کی گود کے پالے! مدد کرو

بیٹا جواب دو، کہ مرے دل کو کل پڑے
وہ وقت ہی کہ منہ سے کلیجا نکل پڑے

کیا کیا تڑپ تڑپ کے بیاں شاہ نے کیا
اکبرؑ کو دردِ دل نے نہ واں بولنے دیا
دردِ جگر سے بیٹھ گئے شاہِ اتقیا
تڑپے حسینؑ اور کلیجہ پکڑ لیا

چلّائے ہائے کونسی صورت نکالوں میں
فرزند کو پکاروں کہ دل کو سنبھالوں میں

اے کردگارِ لم یزلی آہ الغیاث
یا مرتضیٰ علیؑ ولی آہ الغیاث

نانا چھری گلے پہ چلی آہ الغیاث
زینبؑ نے خاک منہ پہ ملی آہ الغیاث

اے موت اور ایک سہارے کو لے گئی
مقتل سے کسطرف مرے پیارے کو لے گئی

اے آسمان، زمیں کا ستارہ کدھر گیا
اے نہر، تشنہ لب مرا پیارا کدھر گیا

اے آفتاب چاند ہمارا کدھر گیا
اے عرش و فرش نور تمھارا کدھر گیا

اے خاکِ پاک درِ نجف کی تلاش ہے
اے کربلا بتا کدھر کبرؑ کی لاش ہے[1]

ناگاہ اک طرف سے صدا آئی، الوداع
لینے کو روحِ شیرِ خدا آئی الوداع

بابا حسینؑ آؤ قضا آئی الوداع
سر ننگے دادی خیرِ نسا آئی الوداع

لیکن یہ عرض ہے کہ نہ گھبرا کے آئیو
اماں کو میری، خیمہ میں بٹھلا کے آئیو

بچے کہیں نہ ہو کے ہراساں نکل پڑیں
بہنیں نہ بال کر کے پریشاں نکل پڑیں

[1] ٹیپ کا آخری مصرع عجب رقت خیز اور درد انگیز ہے اور لفظوں میں وہ اثر بھرا ہوا ہے کہ دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ کو کسی سنگدل سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اُن کے نورِ نظر کی لاش کا پتہ بتائیگا۔ اسلیے کبھی آسمان کو کبھی نہر کو، اور کبھی کربلا کو مخاطب کر کے اپنے فرزند کی لاش کا نشان پوچھتے ہیں۔ اس خطاب سے کیسی مایوسی حسرت۔ اور بیکسی کا اظہار ہوتا ہے۔

سیدانیاں نہ باسرِ عریاں نکل پڑیں
ایسا نہو مری پھوپی امّاں نکل پڑیں

ہوگا مقامِ خندہ زنی اہلِ شام کو
اللہ آبرو سے اُٹھالے غلام کو

بولے حسینؑ کنبے کے پردے کا دھیان ہے
اس آن بھی تمہاری وہی آن بان ہے
سینے میں پھل ہی برچھی کا، ہونٹوں پہ جان ہے
سب تم میں ہمّتِ شہِ مرداں کی شان ہے

خاطر نشاں رکھو ابھی سب ہیں خیام میں
مغرب کیوقت ہوئینگی بلوائے عام میں

آیا حسینؑ آیا، کدھر ہو تم اے پسر
اکبرؑ پکارے قبلہ و کعبہ ادھر ادھر
ہی ہی حضور ضعفِ بصارت سے اسقدر
پہلو میں ہی غلام اور آتا نہیں نظر

بیٹے کی لاش پر شہِ غمناک گر پڑے
گویا زمیں پہ قبّۂ افلاک گر پڑے

گودی میں لاش لیکے چلے شاہِ نامدار
فضّہ کھڑی تھی راہ میں اُسوقت بیقرار
آکر کہا یہ کان میں رانڈوں کے ایکبار
اکبرؑ کی لاش آتی ہی، بانوؑ سے ہوشیار

جیتے تھے جسکو دیکھ کے وہ قتل اب ہوا
اللہ سب کی خیر کرے کیا غضب ہوا!!

بانوؑ کی اوٹ کرکے کھڑے ہوگئے حرم
گھبرا کے بانوؑ بولی ارے لوگو سمجھے ہم
آمد ہی لاشۂ علی اکبرؑ کی، ہی ستم!
سر کو خدا کیواسطے، گھٹتا ہی میرا دم

عزّت سے لاؤ شاہِ امم کے فدائی کو
رستے میں جاؤں لاش کی میں پیشوائی کو

تسکین سب نے دی یہ تمہیں کیا خیال ہے
زندہ خدا کے فضل سے حضرت کا لال ہے
بولی خدا یونہی کرے، پر جی نڈھال ہے
ہو خیر اسکی جان کی، میٹھا یہ سال ہے

رن سے ابھی صدا کسی بسمل کی آئی تھی
برچھی کسی جواں نے کلیجے پہ کھائی تھی

جب چمن خاک میں اکبرؑ کی جوانی کا ملا
پانی پانی کہا اک قطرہ نہ پانی کا ملا
داغ سیدانیوں کو احمدِ ثانی کا ملا
رن میں شہ کو نہ پتہ بانوؑ کے جانی کا ملا

رو کے کہتے تھے نہ طاقت ہے نہ بینائی ہے
بیٹا مارا گیا اور عالمِ تنہائی ہے

ہائے ہم دور ہیں پاس اپنے بلا لو اکبرؑ
نکلا پڑتا ہے جگر منہ سے، سنبھالو، اکبرؑ
مرتا ہوں ضعفِ بصارت سے بچا لو اکبرؑ
زندہ در گور ہوں تم آ کے نکالو اکبرؑ

نظر آتی نہیں تصویر تمہاری بیٹا
زندگی موت سے بدتر ہے ہماری بیٹا

اے مرے شیر، تو جنگل میں کہ خبگاہ میں ہے
شور رونے کا مزارِ اسد اللہ میں ہے
مرے یوسفؑ مجھے آواز دے کس چاہ میں ہے
تیرا یعقوبؑ سراسیمہ کھڑا راہ میں ہے

کیسی مجبوری سے رستے کی طرف تکتا ہوں
اٹھ کے گر پڑتا ہوں گر کر نہیں اٹھ سکتا ہوں

اے جوانمرگ مرے، اے مری پیری کے عصا
دولتِ آلِ نبیؐ، رونقِ آلِ کسرا
اے مرے نام و نشاں، حیف ترا نام مٹا
کیا کوئی صاحبِ اولاد نہ اس فوج میں تھا

سب زیارت کو تری ہوتے تھے حاضر بیٹا
کس نے تجویز کی برچھی تری خاطر بیٹا

جان تن میں ہے، نہ اب تن میں توانائی ہے
مُردنی چہرے پہ چھائی ہے، اجل آئی ہے
جشن ہے ظالموں میں، اور صف آرائی ہے
یاں پریشانی و مظلومی و تنہائی ہے

نہ کوئی ہات پکڑنے کو، نہ سمجھانے کو
ہم ہیں رونے کو، جدائی تری رُلوانے کو

ناگہاں گوشۂ صحرا سے اک اسوار آیا
خوں بھرا نیزہ ہلاتا، وہ جفا کار آیا
اور یہ کہتا ہوا پیشِ شہِ ابرار آیا
جسکو تم ڈھونڈ رہے ہو، میں اُسے مار آیا

قبر میں پاؤں ہیں، اور خاک پہ سر اُسکا ہے
دیکھو، برچھی کی انی میں یہ جگر اُسکا ہے

وہ تو دم توڑتے ہیں، پاس بُلاتے ہو کسے
وہ نہیں ملنے کے، تم ڈھونڈنے جاتے ہو کسے
ہوش اُنکو نہیں، آواز سُناتے ہو کسے
خود وہ بیحال ہیں، حال اپنا دکھاتے ہو کسے

موت کے گھر سے کوئی پھر کے بھلا آتا ہے
کہیں مُردہ بھی بُلانے سے چلا آتا ہے

خوش نصیبوں کو پسر ایسا خدا دیتا ہے
ایسی دولت بھی کوئی پا کے لُٹا دیتا ہے
خاک میں دُرِ نجف کوئی ملا دیتا ہے
کوئی باپ ایسا چراغ اپنا بُجھا دیتا ہے

روئیے، پیٹیے، چلّائیے، کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے

ناگہاں آئی یہ آواز، کہ بابا آؤ
جاں بلب ہے یہ غلام، آؤ مسیحا آؤ

اے مرے خضر، سوے گوشۂ صحرا آؤ
پر مری ماں نکل آئی ہو تو بٹھلا آؤ

رن سے جنگل میں گئے شہ، تو وہ محبوب ملا
بولے سب، یوسفِ گم گشتہ سے یعقوب ملا

کہا اکبرؑ نے کہ روئیں نہ مرے غم میں جناب
ہائے پیری مری، اور آہ تری مرگِ شباب

بولے شہ، تیرے ہی ماتم میں تو رونا ہے ثواب
نہ تو تابوت کا ساماں، نہ عزا کا اسباب

جنکے مہمان ہیں، وہ دیکھ کے خوش ہوتے ہیں
نہ ہمیں دیتے ہیں پُرسا، نہ تمھیں روتے ہیں

لائے تب لاش کو خیمہ میں شہنشاہِ امم
دیکھا بانوؑ نے یہ سامان غضب کا جسدم

یہاں بانوؑ کو سنبھالے ہوئے روتے تھے حرم
رو کے چلائی، مری کوک لٹی وائے ستم

لاش گھوڑے پہ ہے، شہ آگے بڑھے آتے ہیں
علی اکبرؑ مرے، پروان چڑھے آتے ہیں

شہ نے چلا کے کہا، بانوؑ بڑھا نا قدم
گھوڑا لاشہ لیے آپہونچا جو گردن کیے خم

علی اکبرؑ کے بدن میں ابھی باقی ہے دم
لاش اُتروانے لگے بانوؑ کی ہمراہ حرم

ٹکڑے بانوؑ کے کلیجے کے ہوئے جاتے تھے
ہاتھ بھی کانپتے تھے پاؤں بھی تھرّاتے تھے

کہتی تھی ماں، کہ یہ کیا کام لیا واری ماں
ہائے دنیا میں تو اتنا نہ جیا واری ماں

لاش اُتروانے سے ممتاز کیا، واری ماں
ماں کے تابوت کو کاندھا نہ دیا واری ماں

گود میں لیتی ہوں لاشہ میں تمھارا ہے ہے
تم نے اماں کو لحد میں نہ اُتارا ہے ہے

کہہ کے یہ خوب کلیجے سے لگایا لاشہ
جا کے مسند پہ پیمبرؐ کے لٹایا لاشہ
غل ہوا بانوؑ کے بن بیاہے کا آیا لاشہ
آس تھی سہرہ کی قسمت نے دکھایا لاشہ

نبض ہمشیرِ شہنشاہِ امم دیکھتی تھی
ہاتھ رکھے ہوئے ماں سینے پہ دم دیکھتی تھی

کسی کا خانۂ امید بے چراغ نہو
جوان بیٹے کا دل کو پدر کے داغ نہو
ہزار باغ لُٹیں، پر خزاں یہ باغ نہو
پسر کے غم میں پریشاں دل و دماغ نہو

فلک بلا کا، حشرِ کربلا پہ ٹوٹا ہے
مسافری میں برابر کا لال چھوٹا ہے

وہ لال[1] جسکو نہ پہونچے کوئی درِ شہوار
وحیدِ عصر، شباہت میں احمدِ مختار
ہمیشہ مثلِ علیؑ روزہ دار و شب بیدار
شجاع، و متقی، و خوش مزاج، و غیرت دار

یہ سب کمال ملے زیرِ خاک اک دن میں
تمام ہو گئے اٹھارہ سال کے سن میں

مطیعِ ربِ ہدا والدین کا محکوم
حیا و خلق و مروت میں سیدِ مسموم
وغا میں حمزہؑ، جلالت میں ہاشمِ مرحوم
بتولؑ پاک کا ہمسن، حسینؑ سا مظلوم

صحیفۂ رخِ محبوبِ کردگار مٹا
نشان سارے بزرگوں کا ایکبار مٹا

جدا ہوئے ہیں عجب وقت دونوں شہ جناب
پدر کا عہدِ ضعیفی پسر کا سنِ شباب
یہ دردِ دل سے، وہ زخمِ جگر سے ہیں بیتاب
حسینؑ تشنۂ دیدار ہیں، وہ تشنۂ آب

[1] یہ دو بند جلد مرزا صاحب میں دو مرثیوں میں مکرر طبع ہوئے ہیں۔ وقتِ انتخاب اس کتاب میں بھی سہواً

وہ راہوار پہ تھامے جگر تڑپتے ہیں
یہ دل کو پکڑے ہوئے خاک پر تڑپتے ہیں

لکھا ہی وا ابتا کی جو نہیں صدا آئی
حسینؑ امام کے چہرے پہ مُردنی چھائی
وہ آہ کی، کہ ضریح رسولؐ تھرّائی
روانہ ہو گئی اشکوں کے ساتھ بینائی

سوارِ دوشِ پیمبرؐ کی آس ٹوٹ گئی
عنانِ صبر تو تھامی، لگام چھوٹ گئی

قدم قدم پہ ٹھہرتے تھے، شاہِ تشنہ گلو
ہوا میں سونگھتے تھے اپنے لال کی خوشبو
زمیں پہ بیٹھ کے گاہے بہاتے تھے آنسو
تلاش کرتے تھے ہاتھوں سے لاش کو ہر سو

جو کوئی پوچھتا تھا، کیا حضورؐ ڈھونڈتے ہیں
تو رو کے کہتے تھے، آنکھوں کا نور ڈھونڈتے ہیں

قریبِ فوج، جو سلطانِ بحر و بر آئے
پکارے ہنس کے عدو، خیر ہی کدھر آئے
یہ کون مر گیا، جو آپ ننگے سر آئے
پیادہ دھوپ میں تھامے ہوئے جگر آئے

یہ کون چاند ہوا آج دُور آنکھوں سے
کہ چین دل سے گیا اور نور آنکھوں سے

کہا حسینؑ نے رو کر، تمھیں نہیں معلوم
لٹے گھر میں ہے محشر، تمھیں نہیں معلوم
مٹی شبیہِ پیمبرؐ، تمہیں نہیں معلوم
چھٹا حسینؑ سے اکبرؑ، تمہیں نہیں معلوم

رولانے کو یہ امامِ امم[1] سے پوچھتے ہو

[1] شاید ناواقف معترض کو یہ لفظ کھٹکے کہ حضرت خود اپنے کو امامِ امم فرماتے ہیں۔ لیکن ایسے الفاظ اکثر مرثیہ گویوں نے بلا تکلف استعمال کیے ہیں۔ مثلاً امام حسینؑ کی زبان سے میر صاحب فرماتے ہیں ؎ سر دینے کو موجود امامِ دو جہاں ہے بھیجو اُسے خنجر ہے کہاں شمر کہاں ہے (جلد ۳ صفحہ ۲۶)

چھُرے پھرا کے کلیجے پہ ہم سے پوچھتے ہو

مہارے تیرِ جفا کا تو میں نشانا تھا
بھلا نبیؐ کے مرقع کو کیا مٹانا تھا
کہ فیضیاب زیارت سے سب زمانا تھا
جو نیزہ سینے پہ مارا تھا دل بچانا تھا

گلا کسی سے نہیں، جو ہوا سو خوب ہوا
بتاؤ، چاند ہمارا کہاں غروب ہوا؟

پدر کا گیسوؤں والا، کہاں ہے بتلاؤ
پھوپی کی گود کا پالا کہاں ہے بتلاؤ
حرم کے گھر کا اُجالا، کہاں ہے بتلاؤ
اور اُسکے سینے پہ بھالا کہاں ہے بتلاؤ

جگر پہ پلرے ہیں نیزے، کہ دل پہ بھالے ہیں
تمام ہو گئے، یا منتظر ہمارے ہیں

یہ کون شخص ہے، کیا ہے نہ دیکھ بھال لیا
کلیجہ تاک کے بھالے کو بس سنبھال لیا
نبیؐ کے سارے عزیزوں کا دل نکال لیا
تمام گھر کا مرے اپنے سر و بال لیا

جو منہ کو پیٹتا ہوں میں تو منہ پھراتے ہو
یہ اَور ظلم ہے لاشہ نہیں بتاتے ہو

پکارا شمر، کہ کوئی نہیں بتانے کا
بڑا ثواب ہے سادات کے رولانے کا
نہ زندہ چھوڑیں گے بچہ بھی اس گھرانے کا
ارادہ ہے علی اصغرؑ کے خوں بہانے کا

جو تیر پار ہوئے ننھے گلے سے، عید کریں
تمہاری گود میں شش ماہے کو شہید کریں

نہ آپ دیکھیں گے لاشِ پسر، تو کیا ہوگا
نکل پڑیگا جو منہ سے جگر، تو کیا ہوگا
لحد میں تڑپیں گے خیر البشر، تو کیا ہوگا
جنابِ فاطمہؑ پیٹیں گی سر، تو کیا ہوگا

پھرا ہے حاکمِ وقت آپ کے گھرانے سے
تمہارے واسطے رحم اُٹھ گیا زمانے سے

یہ سُنکے اُور طرف شاہِ حق شناس چلے
کبھی حواس میں اور گاہ بیحواس چلے
نہ تھا یہ ہوش کدھر آئے کسکے پاس چلے
پکارتے ہوئے ہر سو بحالِ یاس چلے

مرے جواں مرے عاشق مرے جگر بولو
کدھر سدھارے کہاں چھپ رہے پسر بولو

مرے غیور مرے کم سخن علی اکبرؑ
مرے دلیر مرے صف شکن علی اکبرؑ
مرے غریب مرے بیوطن علی اکبرؑ
مرے حسین مرے نازکبدن علی اکبرؑ

بڑے سعید ہوئے اور بڑے رشید ہوئے
پدر کے بدلے جوانی میں تم شہید ہوئے

جواب دو مرے پیارے کدھر گئے بولو
ہماری آنکھ کے تارے کدھر گئے بولو
نہیں ہیں ہوش ہمارے کدھر گئے بولو
پدر ہے گور کنارے کدھر گئے بولو

گلا نہ کیجو کہ مجھ تک پدر نہیں آتا
ہماری آنکھوں سے بیٹا نظر نہیں آتا

گئے جو زیرِ شجر اپنے گُل کی بو پائی
مگر نہ لاشِ پسر شاہ کو نظر آئی
وہ شوق دیکھنے کا اور وہ ضعفِ بینائی
تڑپ گیا دل اور روح گھبرائی

جدھر سے آئی تھی بو اُسطرف کو جانے لگے
پسینہ آنے لگا پاؤں تھرتھرانے لگے

پکارے گر کے کدھر ہو کہاں ہو اے بیٹا
پسر نے ہاتھ اُٹھایا ادھر ادھر بابا

یہ حال قبلہ و کعبہ کا آہ کب سے ہوا
حسینؑ بولے تمہارا مزاج ہے کیسا

کہا پسر نے کوئی دم کی اَور ایذا ہی
قدم حضور کے دیکھے، غلام اچھا ہی

یہ سُنکے جانبِ آواز شاہِ تشنہ چلے
قریب جاتے ہی، ملنے لگے پسر کے گلے
جبیں جبیں سے ملی، لب پسر کے لب سے ملے
اُٹھا کے سر کو رکھا ایک ہاتھ سر کے تلے

پکارے ہائے غضب چہرہ زرد ہوتا ہی
وہ بولا میرے کلیجے میں درد ہوتا ہی

وَداع ہوتے ہیں، جنّت کو جاتے ہیں بابا
یہ دیکھیے وہ پیمبرؐ بُلاتے ہیں بابا
برہنہ سر، مرے دادا بھی آتے ہیں بابا
چچا حسنؑ بھی وہ تشریف لاتے ہیں بابا

جبیں پہ موت کا ٹھنڈا پسینہ آتا ہی
رگوں کے کھنچنے سے جی سنسنایا جاتا ہی

یہ کہہ کے کلمے کی اُنگلی بلند کی ناگاہ
کہا کہ اشہد ان لا الہ الاّ اللہ
پھرا کے آنکھوں کی جانبِ حسینؑ نگاہ
حسینؑ رونے لگے اور پکارے واویلاہ

میں زندہ بیٹھا ہوں تم میرے آگے مرتے ہو
پدر کو کلمے کا اپنے گواہ کرتے ہو

سُن لی یہ صدا شاہ نے اکبرؑ کی جو ناگاہ
سر پیٹتے میداں کو چلے سیّدِ ذیجاہ
ہر ایک قدم گرتے تھے اور کہتے تھے یہ شاہ
اکبرؑ! نظر آتا نہیں اب کچھ مجھے واللہ

واللہ تری مرگ کے اندوہ و محن سے

نور آنکھوں سے جاتا رہا اور نہ دم رہا ہے

افسوس یہ تنہائی مری اور یہ ماتم
کس طرح سے پہونچوں ترے لاشے پہ میں اسدم

نے یار نہ غمخوار نہ مونس ہے نہ ہمدم
میں روتا ہوں اور جھکتا ہی سب کرِ اظلم

کیا جانیے، کس سمت کو میں جاتا ہوں نہیں
آنکھوں میں بصارت ہے نہ طاقت ہی بدن میں

پھر دیکھ کے دریا کی طرف بادلِ پُر غم
عباسؑ اُٹھو، بیکس و بے یار ہوئے ہم

بھائی کے تصوّر میں یہ بولے شہِ عالم
دو چار قدم چلنے کی طاقت نہیں اسدم

ہی شور مرے خیمے میں فریاد و فغاں کا
تم لے چلو لاشہ مرے فرزندِ جواں کا

پھر مڑ کے سوئے گنجِ شہیداں یہ پکارے
اکبرؑ تو ہمیں چھوڑ کے جنّت کو سدھارے

نوشاہ! تمہیں آؤ ذرا پاس ہمارے
اسوقت مرے جسم میں طاقت نہیں پیارے

کاندھے پہ دھرو لاشۂ ہمشکلِ نبیؐ کو
یہ چاند سی تصویر دکھا لاؤ چچی کو

مثال ۶ - حضرت علی اکبرؑ نزع کی حالت میں امامِ حسین علیہ السّلام کو پکارتے ہیں اور وہ بدحواس قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ اُسوقت کی اضطرابی حرکات اور باپ بیٹے کی گفتگو ؎

آواز سُنی بیٹے کی شہ نے جو قضارا
سر پیٹ کے ہاتو سے گریباں کیا پارا

گھبرا گئے، باقی نہ رہا ضبط کا یارا
کس یاس کے عالم میں سوئے خیمہ پکارا

میدان میں ضائع مری دولت ہوئی زینبؑ
ہے ہے علی اکبرؑ کی بھی رحلت ہوئی زینبؑ

پھر اور یہ پُر درد صدا کان میں آئی
یارب! مرے بابا نے کہاں دیر لگائی
بیتاب ہوئے اور شہِ کرب و بلائی
آواز کی جانب کو چلا حق کا فدائی

کہتے تھے کہ اب صبر نہیں آتا ہے مجکو
کس درد سے بیٹا مرا چلاتا ہے مجکو

روتے ہوئے یہ کہہ کے چلے زنکی طرف کو
آتا تھا نظر کچھ نہ پیمبرؐ کے خلف کو
یوں پوچھتے تھے، دیکھ کے جلادوں کی صف کو
کس خاک میں پوشیدہ کیا دُرِ نجف کو

للہ بتا دو علی اکبرؑ کو بتا دو
گر مر گئے ہوں جلد مجھے لاش دکھا دو

اس کلمے پہ منہ پھیر کے ہنسنے لگے اعدا
اور آگے بڑھے روتے ہوئے سیدِ والا
مڑ مڑ کے ہر اک سو یہ ندا دیتے تھے آقا
کس سمت ہو، آواز سناؤ مجھے بیٹا!

آنکھوں سے نہیں کچھ بھی نظر آتا ہے پیارے
ہر ایک قدم منہ کو جگر آتا ہے پیارے

قربان پدر اے مرے پیارے تو کدھر ہے
اے نورِ نظر چاند ہمارے، تو کدھر ہے
اے یثرب و بطحا کے ستارے، تو کدھر ہے
بابا ہے ترا گور کنارے، تو کدھر ہے

مجبور ہوں، اب صبر کا مقدور نہیں ہے
مر جائے تڑپ کر جو پدر، دور نہیں ہے

اے مہر کہاں ہے وہ مرا گیسوؤں والا
اے چاند، کدھر ہے وہ مرے گھر کا اُجالا

اے دشت ہی کس جا مری آغوش کا پالا
کس چاہ میں یوسفؑ کو مرے موت نے ڈالا

اے نہر بتا وہ دُرِ نایاب کہاں ہے
اے بادِ صبا وہ گُلِ شاداب کہاں ہے

جب کچھ نہ پتا لاشۂ فرزند کا پایا
دریا کی طرف لختِ دلِ فاطمہؑ آیا
واں بھائی کے لاشہ کو یہ رو رو کے سُنایا
عباسؑ! فلک نے ہمیں اکبرؑ سے چھڑایا

کھویا گیا ہمشکلِ پیمبرؐ نہیں ملتا
لاشا مجھے اکبرؑ کا برادر نہیں ملتا

بھیا ہمیں آنکھوں سے سُجھائی نہیں دیتا
کانوں سے بھی اسوقت سُنائی نہیں دیتا
تسکین ہمیں دردِ جُدائی نہیں دیتا
کیا سات بُرے وقت میں بھائی نہیں دیتا

کیا لیٹے ہو اُٹھو مجھے مرنے سے بچا دو
لاشہ علی اکبرؑ کا تمھیں چلکے دکھا دو

تھرانے لگا لاشۂ سقائے حرم آہ
مقتل سے چلے دشت کی جانب شہِ ذیجاہ
گھوڑا علی اکبرؑ کا ملا راہ میں ناگاہ
روتے ہوئے شبیرؑ چلے گھوڑے کے ہمراہ

ناگاہ صدا آئی کہ شبیرؑ نہ آئے
دردا اجل آئی، شہِ دلگیر نہ آئے

دوڑے سوئے آواز، شہِ شرب و بطحا
دکھلائے پدر کو نہ خدا بیٹے کا لاشا
فرزندِ جواں کو جو تڑپتے ہوئے دیکھا
بس ہائے پسر کہہ کے گرے خاک پہ مولا

اعدا میں ہوا غل کہ قضا کر گئے شبیرؑ
لو دیکھتے ہی لاشِ پسر مر گئے شبیرؑ

پھر رونے لگے لاشۂ فرزندِ حزیں پر
کس قہر کا صدمہ تھا شہِ عرش نشیں پر
اُٹھتے تھے کبھی، اور کبھی گرتے تھے زمیں پر
لب پر کبھی مُنہ رکھتے تھے اور گاہ جبیں پر

بیٹے کو جو ہر بار لگاتے تھے جگر سے
آلودہ تھا ملبوس بدن خونِ پسر سے

چلّاتے تھے اے نورِ نظر آنکھ تو کھولو
آیا ہی پدر خاک بسر، آنکھ تو کھولو
حاضر ہی یہ مظلوم پدر، آنکھ تو کھولو
جانا سوئے فردوس، مگر آنکھ تو کھولو

زخمی ہی جگر، سینے میں نیزے کی انی ہی
بتلاؤ مری جان، کہ کیا جی پہ بنی ہی

بولو مرے پیارے، مرے عاشق، مرے شیدا
مظلوم سے کس بات پہ تم روٹھے ہو بیٹا
ہاں آنے میں عرصہ ہوا، میں جلد نہ پہونچا
منصف ہو تمہیں اس میں ہی تقصیر مری کیا

آنکھوں میں نہ بینائی، نہ قابو میں جگر ہی
جس طرح یہاں آیا ہوں، خالق کو خبر ہی

یوں رن میں تڑپتے تھے جنابِ شہِ والا
اور خیمے میں رانڈوں کا جگر تھا نہ وبالا
ہر چند کہ زینب نے بہت دل کو سنبھالا
پالے کی محبت نے مگر گھر سے نکالا

یوں گھر سے وہ سر پیٹتی باہر نکل آئی
جو قبر سے زہرا بھی کھُلے سر نکل آئی

چلّاتی تھی سر پیٹ کے، اے گیسوؤں والے
اے نورِ نظر اے مری آنکھوں کے اُجالے
اے میرے پُر ارماں، مری آغوش کے پالے
نکلی ہی پھوپی خیمے سے پاس اپنے بُلالے

بے دیکھے ترے گھر کو نہ میں جاؤنگی پیارے

آواز سُناؤ نہیں مرجاؤنگی پیارے

باقی مجھے اب ضبط کا یارا نہیں بیٹا
زندہ کوئی فرزند ہمارا نہیں بیٹا
اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں بیٹا
کیوں تم نے ہمیں گر کے پکارا نہیں بیٹا

تکرار میں رخصت کی خفا ہو گئے واری
اپنی پھوپی اماں سے جُدا ہو گئے واری

منہ پھیر کے حضرت نے جو یہ حادثہ دیکھا
غیرت سے لرزنے لگا لختِ دلِ زہرا
شانہ علی اکبرؑ کا ہلا کر ہوئے گویا
کیا غش میں ہو اُٹھو کہ غضب ہو گیا بیٹا

برباد مری عزّت و حرمت ہوئی اکبرؑ
ہمشیر نکل آئی قیامت ہوئی اکبرؑ

لاش کو خیمے میں لے آئے شہِ جن و بشر
تب لٹانیکے لیے ماں نے بچھادی چادر
اور کہا ان کو مری گود میں دو اے سرور
یہ تصدّق ہوئے تم پر میں تصدّق انپر

سینے پہ پالا ہی سینے پہ لٹالوں آقا
اپنے اس روٹھے مسافر کو منالوں آقا

اتنے میں شاہِ شہیداں نے لٹایا لاشہ
گرد لاشے کے تڑپنے لگی مادر دُکھیا
بین کرنے لگی اکبرؑ تمہیں ڈھونڈوں کس جا
تجکو روؤں کہ جوانی کو تری اے بیٹا

لو خبر درد مرے دل میں اُٹھا ہی پیارے
اس تڑپنے کی ترے پاس دوا ہی پیارے

مجکو برباد کیا کیا کہ کہیں کا نہ رکھا
پردہ رہ جائے ہوں پیوندِ زمیں میں دُکھیا

موت تو میرے مقدر میں نہیں ہی بیٹا
حیف دم میرا نہ نکلا، ترا لاشا دیکھا

ہم سے منہ موڑ کے تم خلد میں دلدار گئے
آپ کیا مر گئے ساتھ اپنے ہمیں مار گئے

دل مرا پھٹتا ہی جاتا ہی کروں فکر میں کیا
ہاتھ باندھوں میں ترے پاؤں پڑوں اے بیٹا
تم تسلّی نہیں دیتے ہو جیوں خاک بھلا
اتنا صدقے گئی تم کہدو کہ ہاں بولونگا

ورنہ ہو جائے گی کم قدر ہماری بیٹا
میں وہی پالنے والی ہوں تمہاری بیٹا

دل میں نیّت نکرے پہلے سے انسا کوئی
کیونکہ اُس قصد کی ہو جاتی ہی اُفتاد بُری
میں یہ کہتی تھی جواں ہو چکا بشکلِ نبیؐ
بیاہ لاؤنگی دُلہن چاند سی اک دن اسکی

حیف پورے مرے دل کے نہ یہ ارمان ہوئے
بیاہ بھی ہونے نہ پایا تھا کہ بے جان ہوئے

میں یہ کہتی تھی کہ اکبرؑ مجھے دفنائیں گے
رکھ کے تابوت مرا کاندھے پہ لیجائینگے
یہ نہ معلوم تھا پہلے ہی مر جائیں گے
صدمۂ داغِ جوانی مجھے دکھلائیں گے

ہائے یہ مر گئے میں اور ہی تدبیر میں تھی
انکے ہاتوں کی نہ مٹّی مری تقدیر میں تھی

کس خوشی سے تمہیں پہنائی تھی مینے پوشاک
اب وہی خون میں ہی غرق اور آلودۂ خاک
دمبدم چومتی تھی میں یہ ترا سینۂ پاک
اب وہاں نیزے کو پاتی ہی یہ بانوؑ غمناک

اتنی طاقت نہیں جو اُٹھ کے کھڑے ہو بیٹا
تم کفن کے لیے محتاج پڑے ہو بیٹا

دیس بیگانہ ہے کچھ بس نہیں چلتا میرا
ورنہ میں اوڑھ کے چادر کو نکلتی بیٹا

کہتی ہر ایک مسلمان سے یہ اشک بہا
ایک سیّد ہی کفن کے لیے محتاج پڑا

اُسکے لاشے کو کفن دیکے جو گڑواؤ گے
حشر میں اسکا صلہ فاطمہؑ سے پاؤ گے

عزیزو بخیۂ زخمِ جگر نہیں ہوتا
کسی سے چارۂ داغِ پسر نہیں ہوتا

یہ درد وہ ہے کہ جانبر بشر نہیں ہوتا
ہزار صبر کرے کوئی، پر نہیں ہوتا

امامِ دیں سے برابر کا لعل چھٹتا ہے
جوانیِ علی اکبرؑ کا باغ لٹتا ہے

تلف ہوئی جو شہِ خوش خصال کی دولت
عدو نے لوٹ لی اٹھارہ سال کی دولت

تباہ کی نبیؐ ذوالجلال کی دولت
ملا دی خاک میں زہراؑ کے لال کی دولت

نہ جان تن میں، نہ بینائی چشمِ تر میں رہی
کہ اب رسولؐ کی تصویر بھی نہ گھر میں رہی

وہ لعل جسکو نہ پہونچے کوئی دُرِ شہوار
وحیدِ عصر، شباہت میں احمدِ مختار

ہمیشہ مثلِ علیؑ روزہ دار و شب بیدار
شجاع و متقی و خوش مزاج و غیرت دار

دعا میں پوتے کی ماں کا ہر ایک سال کٹا
ثمر کی فصل جب آئی تو یہ نہال کٹا

جدا ہوئے ہیں عجب وقت دونوں عرش جناب
پدر کا عہدِ ضعیفی، پسر کا سنِ شباب

یہ دردِ دل سے وہ زخمِ جگر سے ہیں بیتاب
حسینؑ تشنۂ دیدار ہیں وہ تشنۂ آب

وہ راہوار پہ تھامے جگر تڑپتے ہیں
یہ دل کو پکڑے ہوئے خاک پر تڑپتے ہیں

مرقعِ نبویؐ موت نے مٹایا ہے
فلک نے خاک پہ خورشید کو گرایا ہے
چراغ شہ کا بجھایا ہی دل جلایا ہے
قضا نے خاک میں دُرِ نجف ملایا ہے

قلم عدو نے عرب اور عجم کا باغ کیا
مدینے اور مدائن کو بے چراغ کیا

وہ شمع گُل ہوئی جس سے کہ نام روشن تھا
نبیؐ کی آل کا گھر صبح و شام روشن تھا
دلِ حسینؑ علیہ السلام روشن تھا
مدینہ کیا کہ زمانہ تمام روشن تھا

نصیب بانوؑ کے دل کو جگر کا داغ ہوا
پکارتی تھی کہ ٹھنڈا مرا چراغ ہوا

کہو امام سے مقتل کچھ ایسا دُور نہیں
پسر کو ڈھونڈتے کیوں سیدِ غیور نہیں
حسینؑ کہتے تھے آنکھوں میں میری نور نہیں
خدا گواہ ہے بانوؑ مرا قصور نہیں

جو دل کا حال ہی اسدم سُنا نہیں سکتا
پسر بُلاتا ہے، اور باپ جا نہیں سکتا

یہ کہہ کے پاؤں جو بیساختہ بڑھانے لگے
گرے زمین پہ تھرّا کے اور غش آنے لگے
حضورِ فوجِ ستم جا کے پھر سُنانے لگے
بتاؤ جیتے ہیں اکبرؑ و یا ٹھکانے لگے

جگر پہ مارے ہیں نیزے کہ دل پہ پارے ہیں
تمام ہو گئے، یا منتظر ہمارے ہیں

سنبھالتا ہوں بہت، دل نہیں سنبھلتا ہے
جگر کو ہاتوں سے رہ رہ کے کوئی ملتا ہی

بتاؤ جلد کدھر وہ لہو اُگلتا ہے
کہ ابتو منہ سے کلیجہ مرا نکلتا ہے

جگر کی چوٹ سے بیدل ہوں بیقرار ہوئیں
لعینو رحم کا تم سے امیدوار ہوئیں

ہزار درد کی تقریر لب پہ لاتے تھے
مدد کے واسطے عباسؑ کو بلاتے تھے

پہ دل میں سنگدلوں کے اثر نہ پاتے تھے
ہر ایک سمت سراسیمہ ہو کے جاتے تھے

پکارتے تھے کدھر ہو جواب دو اکبرؑ
تباہ پھرتا ہے بابا پکار لو اکبرؑ

یہ جاں نثار تو حاضر تھا تم بلا لیتے
تمہارے بدلے سناں ہم جگر پہ کھا لیتے

نثار ہوتے، بلا سے تمہیں بچا لیتے
غش آتا پیارے کو، تو گود میں اُٹھا لیتے

غضب ہے سینے سے برچھی دمِ وغا گذری
جگر پہ اے مرے نازک مزاج کیا گذری

یہ سُنکے شاہ چلے اُس طرف بحالِ تباہ
حسینؑ بیٹے سے لپٹے تو بولا وہ دلخواہ

عقاب لاش لیئے آیا روبروئے نگاہ
غلام صدقہ ہو، خیمے میں لیچلو یا شاہ

پھوپی کو دیکھ لیں قدموں پہ سر کو ٹھہرا لیں
جناب والدہ صاحب سے دودھ بخشا لیں

حسینؑ بولے چلو میری جان بسم اللہ
درِ خیام پہ لاشہ لیئے جو پہنچے شاہ

پھوپی بھی بہنیں بھی ماں بھی تڑپتی ہیں سراہ
پکاری بانوؑ کہ رستہ دو بیبیو للہ

بتولؑ بال کھلے سات سات آتی ہے
علیؑ کے پوتے کی رن سے برات آتی ہے

بچھاؤ مسندِ محبوبِ کبریا، لوگو! | بٹھاؤ دولہ کو آرام سے ذرا لوگو
میں ہاتھ باندھتی ہوں اُڑہ لو ذرا لوگو | کہیں گھر آتے ہی اکبرؑ نہ خفا لوگو

امامِ جن و ملک اُسکو جا کے لائے ہیں
یہ مجھ سے رُوٹھے تھے حضرت منا کے لائے ہیں

سنبھالا بیبیوں نے لاشۂ علی اکبرؑ | کسی نے پاؤں کسی نے کمر کسی نے سر
لٹایا مسندِ خیر الانام پر لا کر | یہ حال دیکھ کے پہلو میں گر پڑی مادر

نہ غیرتِ پسرِ مہ لقا کا ہوش رہا
نہ سر کا ہوش رہا نے ردا کا ہوش رہا

ہلا کے ہونٹوں کو اکبرؑ نے کچھ پھوپی سے کہا | پھرا کے منہ کو بہت روئی دخترِ زہراؑ
کہا یہ بانوؑ سے رو کر کچھ آپ نے بھی سُنا | مزاج داں ہو تم اکبرؑ کی سارے گھر سے سوا

نہ جان بوجھ کے غصہ دلاؤ اکبرؑ کو
اشارہ کرتا ہے اکبرؑ کہ ڈھانپ لو سر کو

عالمِ نزع

یہ گفتگو تھی کہ دم توڑنے لگے اکبرؑ | کہا یہ بانوؑ نے زینبؑ سے دیکھئے تو ادھر
یہ سانس لیتے ہیں کیوں جلد جلد گھبرا کر | یہ آنسو آنکھ سے کیسے بہے ہیں عارض پر

سر ان کا تکیے سے کیوں خود سرک گیا ہے
مجھے گماں ہے کہ منکا ڈھلک گیا ہے

رگوں کے کھنچنے سے لونڈی کا دل دہڑکتا ہے | پھرا کے پتلیاں قبلے کو کیوں یہ تکتا ہے
یہ کیا سبب ہے کہ تالو بہت لپکتا ہے | اور ایک بال پلک کا نہیں جھپکتا ہے

جگر سے ہاتھ اُٹھا کر جبیں پہ دھرتے ہیں

گذر ہوا ہے علیؑ کا سلام کرتے ہیں

یہ دیکھتی تھی کہ جو رہ گیا بدن ہل کر
لپٹ کے لاش سے چلائی بانوؑ مضطر

پکاری بیٹ کے زینبؑ کہ چل بسے اکبرؑ
تباہ کر گئے بانوؑ کو آہ اے دلبر

ابھی تو آنکھ سے اپنی نظارہ کرتے تھے
ردا اُٹھانے کا مجھ سے اشارہ کرتے تھے

اہل حرم کے بین

ہتیار پسر کے تنِ مجروح کے سارے
سر رکھ دیا تکیے پہ اور اُٹھ کر یہ پکارے

اُس لاش کے گرد آپ نے مسند اُتارے
لو بی بیو بیٹو علی اکبرؑ گئے مارے

اک حشر ہوا، سینوں میں دل رہ گئے پھٹ کر
ماں نے یہ پڑھا مرثیہ، لاشے سے لپٹ کر

ہی ہی مرا بن بیاہا مرا گیسوؤں والا
ہی ہی مری فاقوں کی کمائی مرا پالا

ہی ہی مرا خورشید مرے گھر کا اُجالا
ہی ہی مرا محبوب، حبیبِ شہِ والا

میں مر گئی برباد جوانی ہوئی اس کی
ہی ہی مرے یوسفؑ کو نظر کھا گئی کس کی

ہی ہی کسی قاتل نے تری قدر نہ جانی
ہونے نہ دیا چاند تمہیں اے مرے جانی

ہی ہی ابھی تھے تم تو ہلال احمدِ ثانی
ہی ہی مرے پیارے ترے ہاتھ آیا نہ پانی

اماں ترے اس روئے کتابی کے تصدق
اماں تری دستارِ گلابی کے تصدق

ہَی ہَی مرے پیارے کی مسیں خون سے بھیگیں
ہَی ہَی مرے بن بیاہے کا جوڑا ہو نگیں

ہَی ہَی نہ جنازہ نہ نماز اور نہ تلقیں
نے گور نہ تابوت نہ تجہیز نہ تکفیں

پڑھتے تھے درود اہلِ نظر تجھپہ وطن میں
سو فاتحہ بھی اب ترا ہوئیگا نہ رن میں

یہانتک انسانی جذبات و احساسات کی وہ مثالیں ختم ہوچکیں جس قسم کی قابل مولف نے میر صاحب مرحوم کے کلام سے دی تھیں - انکے علاوہ مرزا صاحب مرحوم کے کلام میں اور بھی چند ایسی نادر مثالیں ہماری نظر سے گذری ہیں جن میں انتہا درجہ کا یاس و قلق بھرا ہوا ہے - ہم چاہتے ہیں کہ دو چار جدید مثالیں دیکر چند درد و الم کے مرقعے اور بھی ناظرین کے سامنے پیش کردیں -

مثال ۹ - امام حسینؑ کا نانا کی قبر سے رخصت ہونا

جب کوچ کی شب قبرِ نبیؐ پر گئے شبیرؑ
رخصت کو مع آلِ پیمبرؐ گئے شبیرؑ

قندیلیں جو روشن کیں تو غش کر گئے شبیرؑ
زینبؑ نے یہ جانا کہ نہیں مر گئے شبیرؑ

تھی غش میں ندا، ہم اسی حسرت میں مرینگے
اب روشنی اس قبر پہ کاہے کو کرینگے

اے نانا کے روضے، مرا گھر ہوتا ہی ویراں
اے قبرِ حسینؑ آج کی شب ہے ترا مہماں

کل صبح مری منزلِ آخر کا ہی ساماں
کل روح مرے نانا کی ہوئیگی پریشاں

اے قبر، میں دکھ پاؤنگا پردیس میں جاکر

تو شق ہو تو نانا سے لپٹ جاؤں میں آکر

اے قبر میں کیسا ترے صاحب کا ہوں پیارا
سجدے میں مجھے پشت سے اپنی نہ اُتارا
اب خنجرِ جلاّد ہے اور سینہ ہمارا
سُنیو کہ مجاور ترا پیاسا گیا مارا

تیری تو ملاقات کی یہ رات ہے باقی
پھر خنجر و گردن کی ملاقات ہے باقی

پانی ہی وہ شے پیتے ہیں سب مومن و کافر
پر قحط اسی پانی کا ہوگا مری خاطر
دنیا سے کفن لیتے ہیں سب عقبےٰ کے مسافر
لیکن نہ کفن پائے گا ترا یہ مجاور

کس شخص کو مرقد پسِ مردن نہ ملے گا
اے قبرِ پیمبرؐ ہمیں مدفن نہ ملے گا

مثال ۱۰۔ حضرت عباسؑ فوج میں گھر گئے ہیں امام حسینؑ اُنکے واسطے دعا کرتے ہیں

یاں حال یہ تھا غش تھے اُدھر سبطِ پیمبرؐ
سر سجدے میں تھا، ہاتھوں پہ عمامۂ اطہر
فرماتے تھے بیکس ہوں میں اے خالقِ اکبر
کر رحم بچھڑتا ہے برادر سے برادر

عالم ہی عجب سینۂ سوزاں میں نفس کا
ساتھ آج چھٹا جاتا ہے انتیس برس کا

غمخوارِ جگر بندِ پیمبرؐ نہیں کوئی
ہمدردِ دلِ حیدرِ صفدر نہیں کوئی
اس بیکس و محتاج کا یاور نہیں کوئی
اب اس کے سوا اور برادر نہیں کوئی

تلوار سے اس گیسوؤں والے کو بچانا
یارب! مری آغوش کے پالے کو بچانا

مثال ۱۱- حضرت قاسمؑ کی وفات پر امام حسینؑ کی آہ وزاری اور اہلِ حرم کا اضطراب

لاشے سے لپٹ کر شہِ مظلوم پکارے
کیا سوتے ہو اُٹھو مرے پیارے مرے پیارے
کرتے نہیں اب نرگسی آنکھوں سے اشارے
مُرجھا گئے یہ پھول سے لب پیاس کے مارے

دیکھا کیے ہم، حشر کا ساماں ہوا بیٹا
پامال ترا لاشۂ بے جاں ہوا بیٹا

ہی ہی مرے جرّار مرے شیرِ دلاور
اے میرے بہادر مرے غازی مرے صفدر
اے میرے کلیجے، مری آنکھیں مرے دلبر
قربان تری لاش کے میں بیکس و مضطر

دنیا سے پُر ارمان سفر کر گئے بیٹا
باتیں بھی نہ شبیرؑ سے کیں مر گئے بیٹا

تھا آلِ محمدؐ میں عجب طرح کا ماتم
پکڑے ہوئے ماں کو کھ کو چلاتی تھی پیہم
آنسو نہیں تھمتے تھے، یہ تھا بچوں کا عالم
سر پیٹتے تھے ننھے سے ہاتوں سے بصد غم

بھائی کے قلق میں جو نہ خواہر کو کل آئی
قاسمؑ کی بہن خیمے سے باہر نکل آئی

سر پیٹ کے ہاتوں سے یہ کہتی تھی وہ مضطر
ہے ہے مرا مانجایا مرا شیرِ دلاور
اب ضبط کا یارا نہیں، قابو نہیں دل پر
ملنے کے لیے بھائی سے نکلی ہوں کھلے سر

مجھ بیکس و مضطر پہ یہ احساں کرو لوگو
لیچل کے مجھے لاش پہ قرباں کرو لوگو

مثال ۱۲ - امام حسینؑ ذبح ہوتے ہیں اور جناب زینبؑ یہ قیامت خیز نظارہ دیکھ رہی ہیں اُسوقت بہن کی مضطربانہ اور مایوسانہ حالت اور شمر سے منت و زاری کی درد انگیز تصویر۔

جس دم نگین خاتمِ پیغمبراں گرا
رونق اُٹھی زمیں سے، امامِ زماں گرا
گرنے پہ سب گروہ لیے برچھیاں گرا
ہی ہی! نہ اِن جفاؤں پہ بھی آسماں گرا

زہراؑ سے پوچھیے یہ قلق نورعین کا
تپنا زمیں کا، اور وہ تڑپنا حسینؑ کا

لکھا ہی جبکہ غش ہوئے مولائے حق شناس
آئی عزیز مُردہ بہن شاہِ دیں کے پاس
وہ بیکسی، وہ درد، وہ اندوہ، وہ ہراس
قابو نہ کچھ مدد کا، نہ فریاد کے حواس

کچھ بس نہ تھا کہ بھائی کے بدلے نثار ہو
پوچھو یہ درد اُس سے جو بے اختیار ہو

آگے ہے وہ مقام کہ غش ہونگے مومنیں
وہ سامنے حسینؑ ہی وہ زینبؑ حزیں
گردن پہ تیغ، دل میں سناں، سینے پر لعیں
زینبؑ یہ حال دیکھتی ہی اور بس نہیں!!

نامحرموں کا دھیان نہ پردے کا ہوش ہی
یہ سب لہو کا جوش ہی، الفت کا جوش ہی

وہ رونا بیکسی کا، وہ گھبرانا یاس کا
وہ تھرتھرانا دل کا وہ اُڑنا حواس کا
کہنا بلک بلک کے یہ کلمہ ہراس کا
اے شمر واسطہ علی اصغرؑ کی پیاس کا

للہ تین روز کے پیاسے کو چھوڑ دے
صدقہ نبیؐ کا اُن کے نواسے کو چھوڑ دے

پھر رو کے بولی اُس قلق و اضطرار میں
اے شمر دل نہیں ہے مرا اختیار میں

باہر نکل پڑی ہوں میں بھائی کے پیار میں
یہ ایک تن ہے پنجتنِ نامدار میں

تھم جا، دعائیں دینگے سب اہلِ حرم تجھے
تو جسکو مانتا ہے اُسی کی قسم تجھے

تھم جا، خدا کو مان حبیبِ خدا کو مان
زہرا کو مان حضرتِ مشکل کشا کو مان
سوگندِ فقر و فاقۂ آلِ عبا کو مان
اپنی رسول زادی کی تو التجا کو مان

سارے بزرگ مر گئے مجھ بدنصیب کے
میرا کوئی نہیں ہے سوا اس غریب کے

اب ہم نہ بھائی کو نہ ہمیں بھائی پائینگے
اب واں سدھارتے ہیں جہاں سے نہ آئینگے
ہم ننگے سر پھرینگے، نہ چادر اوڑھائینگے
ہاں نیزے پر تڑپ کے یہ آنسو بہائینگے

للہ دیکھ یاس سے حضرت کا دیکھنا
دل ٹکڑے کر رہا ہے یہ حسرت کا دیکھنا

اے[1] شمر! پاس بھائی کے آؤں جو تو کہے
زخموں سے جلتی ریت چھڑاؤں جو تو کہے
چادر بدن کے نیچے بچھاؤں جو تو کہے
بیکل ہے سر میں آکے اُٹھاؤں جو تو کہے

پانی تو یاں ملے گا نہ زہرا کی جائی کو
آنسو چھڑک کے ہوش میں لاؤں گی بھائی کو

[1] جناب زینبؑ کے اس استغاثہ سے عجب حسرت اور بیکسی ٹپک رہی ہے۔ اور فاضل شاعر نے جوشِ الفت اور فرطِ محبت کی عجب حسرت ناک اور مضطربانہ کیفیت دکھائی ہے۔ حضرت زینبؑ خوب جانتی ہیں کہ شمرِ جفاکار نے تمام کنبہ کا خاتمہ کر دیا اور اب امام حسینؑ کے قتل کے درپے ہے، اور ایسے سنگدل سے ہرگز رحم کی امید نہیں، بااینہمہ باوجود قطعی ناامیدی کے اُس سے التجا کرنا ایک سخت مجبوری اور بیحد مایوسی ظاہر کرتا ہے۔

سونپا کسے بہن کو یہ پوچھونگی بھائی سے
پردیس میں بچھڑتے ہیں زہرا کی جائی سے
یہ بے خطا ہی پوچھ لے ساری خدائی سے
دعوی ہی کیا تجھے مری مانگی کمائی سے

کچھ قرض ہو تو بیچ کے گھر کو ادا کروں
سمجھاؤں کس طرح سے تجھے، آہ کیا کروں؟[1]

اے شمر میں گلے سے لگالوں تو ذبح کر
کچھ درد اپنے دل کا سنالوں تو ذبح کر
سیّد کو قبلہ رو میں لٹالوں تو ذبح کر
بھائی سے ملکے خیمے میں جالوں تو ذبح کر

پانی نہ بھوکے پیاسے کو اے بدخصال دے
پر وقتِ ذبح آنکھوں پہ کپڑا تو ڈال دے

مثال ۱۳ - امام علیہ السلام کی شہادت کے وقت حضرت زینبؑ کی بیقرار حالت کا اظہار، شہدا کو مدد کے واسطے بلانا۔

زینبؑ کا جگر ہل گیا گر کر یہ پکاری
آؤ علی اکبرؑ میں تمھارے گئی واری
بہائی موئے نکلی ہی پھوپی گھر سے تمھاری
ہے ہے مرا ماں جایا، مرا عاشقِ باری

مرجاؤنگی حسرت میں یہیں پاؤں رگڑ کر
تم لاش پہ لیجاؤ مرا ہاتھ پکڑ کر

عباسؑ کدھر ہو، ادھر آؤ ادھر آؤ
قاسمؑ! مجھے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملاؤ

[1] ٹیپ کا آخری مصرع (سمجھاؤں کس طرح سے تجھے آہ کیا کروں) اپنے اثرِ بیان سے جگر و دل کو مجروح کر دیتا ہی۔ غور کرو کسقدر مجبوری اور مایوسی ہی۔ یہ خیال ہوتا ہی کہ شمر لعین کی شقاوت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ بنتِ شیرِ خدا اُسکو کسی طرح سمجھا نہیں سکتیں اس لیے مجبور ہو کر فرماتی ہیں "آہ کیا کروں"

اے عونؑ و محمدؑ تمہیں رستے سے لگاؤ
شبیرؑ کے لاشے کے مجھے گرد پھراؤ

لا لا کے خبر دیتے تھے تم فوجِ عمر کی
ماموں پہ چھری چل گئی مجکو نہ خبر کی

دھڑکا یہ ہے کہ ذبح نہ ہو جائیں شاہِ دیں
چلتی ہیں جلد اور زمیں سوجھتی نہیں
واں لڑکھڑائیں، اور یہاں منہ کے بھل گریں
آنکھیں کہیں، خیال کہیں۔ اور دل کہیں

بو سونگھتی ہیں، خون کے تہلے جو ملتے ہیں
دل کی طرح سے کان کے بُندے بھی ملتے ہیں

تا حشر وہ نہ بھولے گی زینبؑ خدا گواہ
جس شکل سے حسینؑ ملے وا مصیبتا
اک آنکھ بند کرتے تھے اک کھولتے تھے شاہ
پھیلا تھا ایک پاؤں تو سمٹا تھا ایک آہ

کچھ سر پہ کچھ زمیں پہ گلابی عمامہ تھا
آلودہ خاک و خوں میں پیمبرؐ کا جامہ تھا

لکھا ہی جب جگر پہ لگا تھا یہ تیر آہ
زینبؑ کھڑی تھی ڈیوڑھی پہ با حالتِ تباہ
چلائی، ہائے کیا ہوئی مظلوم کی سپاہ
ہے ہے تڑپ رہے ہیں امامِ فلک پناہ!!

عباسؑ آ کے تھام لے، اکبرؑ سنبھال لے
کوئی جگر سے تیر سہ پہلو نکال لے

ناگہ امامِ پاک گرے خاکِ پاک پر
کھینچا جو تیر سینے سے تڑپے دل و جگر
چلّو کو رکھا زیرِ جراحت جھکا کے سر
جب بھر چکا لہو سے تو کی ریشِ پاک تر

پونچھا جو ظالموں نے کہا یہ زبان سے
فردوس میں ملونگا یوں ہی نانا جان سے

آیا جو شمر بولے پیمبرؐ لعیں ٹھہر
اوروں سے اسکو پونچھ لے گر تو ہی بیخبر

سہواً یہ ظلم کرتا ہے تو یا کہ جان کر
ہے ہے یہ کس غریب کا تو کاٹتا ہی سر؟

ہاں ہاں یہ میری فاطمہؑ کا نورِ عین ہی
یہ میرے دل کا چین ہی، میرا حسینؑ ہی

بس بس یہ بے گناہ ہی یہ بے گناہ ہی
موزے کے نیچے گنجِ علومِ الٰہ ہے

خالق گواہ مخبرِ صادق گواہ ہی
خنجر جہاں رکھا ہے مری بوسہ گاہ ہے

تو حلق کاٹتا ہے وہ کہتا ہی پیاس ہے
کیوں بے لحاظ کیا یہی مہماں کا پاس ہے

لے تو ہی کہہ نہیں یہ پیمبرؐ کا پیارا ہے
امت نے کس نبیؐ کے نواسے کو مارا ہے

کُل حق کی کائنات میں ایک ستارا ہے
اسکو نہ ذبح کر یہ نواسا ہمارا ہے

دیتے ہیں پانی نزع میں یٰسین پڑھتے ہیں
مذہب میں تیرے سینۂ زخمی پہ چڑھتے ہیں

مثال ۱۴- حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کا خیمے میں آنا اور اہلحرم کے بین

ماتم سرا کی ڈیوڑھی پہ پہنچا جو راہوار
زینبؑ ہلا کے شانہ کو چلائی ایک بار

غش میں پڑی ہوئی تھی سکینہؑ جگر فگار
لو اُٹھو آئے بی بی کے بابا پھوپی نثار

سُن لو صدا سمندِ شہِ مشرقین کی

واری گئی کھڑی ہے سواری حسینؑ کی

اُٹھی یہ مژدہ سُنکے سکینہؑ خوشی خوشی
بولی کہ آپ بھی مرے ساتھ آئیے پھوپی
فرمائیو پدر سے سفارش مری ذری
اب کے نہ چھوڑ جائیں مجھے نائبِ علیؑ

بچپن پہ حق نے مہر کیا میرے دن پھرے
شکرِ خدا کہ رن سے شہِ انس و جن پھرے

مجرا کرونگی قدموں پہ رکھدوں گی اپنا سر
اور التجا کروں گی میں ہاتوں کو جوڑ کر
لونڈی کی پیاس کو ہی یہ چوبیسواں پہر
اور ابتلک حضور کو ہے ہے نہیں خبر

کنبہ میں قدر آپکے لطف و کرم سے ہے
میری تو زیست قبلہ و کعبہ کے دم سے ہے

کہکر یہ بات در پہ جو آئی وہ خستہ جاں
دیکھا کہ گھوڑے پر نہیں سلطانِ دو جہاں
باگیں کٹی ہیں زین ہے سارا لہو لہاں
چشمِ رکاب سے بھی زمیں پر ہی خوں رواں

شادی تھی جسکے آنے کی ہی وہ ہی نہیں
مرکب تو ہی پہ راکب دوشِ نبیؐ نہیں

بیساختہ تڑپ کے سکینہؑ نے کی فغاں
خالی ہی زین اے پھوپی اماں پدر کہاں
بیکس یتیم ہو گئی ہی ہی میں خستہ جاں
بی بی شہید رن میں ہوئے شاہِ دو جہاں

چوتھے برس نصیب نے بیکس کیا مجھے
بچپن میں ہائے داغِ یتیمی دیا مجھے

اب دمبدم گلے سے لگائیگا ہائے کون
بچپن کے میرے ناز اُٹھائیگا ہائے کون
کہہ کر سکینہؑ جان بلائیگا ہائے کون
روٹھونگی کس سے اور منائیگا ہائے کون

غربت میں جان دی مرے بابا امام نے
میں بے نصیب مر نہ گئی اُن کے سامنے

بیساختہ پھر اگلے سموں سے لپٹ گئی
روکر پکاری۔ ننھی سی چھاتی جو پھٹ گئی
اے ذوالجناح کیا مری قسمت اُلٹ گئی؟
گردن ترے سوار کی خنجر سے کٹ گئی

نانا کے گھوڑے کہہ مرے بابا کو کیا کیا
آرام جانِ فاطمہؑ زہرا کو کیا کیا

تھا عہد سے نبیؐ کے تو پیار حسینؑ کو
تنہائی میں ترا تھا سہارا حسینؑ کو
بتلا کہاں زمیں پہ اُتارا حسینؑ کو
زندہ ہیں یا کہ شمر نے مارا حسینؑ کو

بچپن میں آسرا مرا توڑا غضب کیا!
نو لاکھ میں سوار کو چھوڑا غضب کیا!!

آنسو بہا کے زینبؑ مضطر سے پھر کہا
کیا ذہن میں حضور کے آتا ہے، میں فدا
بیچ بیچ یتیم ہو گئی میں غم کی مبتلا
شبیرؑ کے گلے پہ پھرا خنجرِ جفا

زینبؑ پکاری ہاں ترا بابا ہوا شہید
پیغمبرِ خدا کا نواسا ہوا شہید

دنیا سے ترا چاہنے والا گذر گیا
بابا کی لاڈلی! ترا بابا گذر گیا
پانی تھا ماں کا مہر، وہ پیاسا گذر گیا
اس کربلا میں ہم پہ بھی کیا کیا گذر گیا

ستّر دو تن تمام ہوئے بھائی چھٹ گئے
آلِ نبیؐ اُجڑ گئے سادات لُٹ گئے

بے وارثوں کا مونس و غمخوار مر گیا
رانڈوں کا بیکسوں کا مددگار مر گیا

پردا تھا جس کے دم سے وہ سردار مرگیا
سب مومنوں کا قافلہ سالار مرگیا

برباد احمدِ عربی کا چمن ہوا
قربان جاؤں، خاتمۂ پنجتن ہوا

دشتِ بلا میں مرگیا زہرا کا لاڈلا
تن سے جدا ہوا سرِ اقدس حسین کا

پانی کی طرح خاک پہ پیاسے کا خوں بہا
ہے ہے جہازِ آلِ پیمبر کا ناخدا

لاشے پہ بال کھول کے ماتم بپا کرو
واری حقوقِ شاہِ شہیداں ادا کرو

زینب نے پیٹ کر جو سکینہ سے یہ کہا
ماتم سرا سے ہائے حسینا کا غل اٹھا

سیدانیاں تڑپنے لگیں گر کے جا بجا
گھر میں شفیعِ حشر کے محشر بپا ہوا

وارث کے غم سے منہ جو حرم ڈھانپنے لگے
طوبیٰ و سدرہ لوح و قلم کانپنے لگے

رو کر سکینہ کہتی تھی بابا حسین ہائے
چلا رہی تھی دختر زہرا حسین ہائے

زہرا کی یہ فغاں تھی کہ بیٹا حسین ہائے
بانو پکارتی تھی کہ آقا حسین ہائے

سونپا کسے حضور نے اس واردات میں
لونڈی کا ہاتھ تم نے دیا کس کے ہات میں

آنکھوں کے آگے قتل ہوئے اکبرِ جواں
بے شیر کھا کے تیر سدھارے سوئے جناں

والی کے سوکھے حلق پہ خنجر ہوا رواں
اب قبر کے سوا ہے ٹھکانا مرا کہاں

ایراں سے نکلی، شاہِ مدینہ سے چھٹ گئی
میکہ مرا اجڑ گیا سسرال لٹ گئی

سب رنج ہوں، مگر نہ رنڈاپے کا ہو تعب
شوہر کی موت سامنے عورت کے ہو غضب!
درپیش مجکو ہائے یہی حادثہ ہے اب
تم تشنہ لب شہید ہوئے میں ہوں جاں بلب

کیونکر نہ بارِ غم سے کمر اُس کی ٹوٹ جائے
جو خادمہ بڑھاپے میں آقا سے چھوٹ جائے

دو بچوں کے سوا مری دولت تھی اور کیا
آنکھوں کے آگے لے گئی وہ لوٹ کر قضا
بیجان ایک تیر سے اک نیزے سے ہوا
وارث کی آس تھی سو گلا اُس کا بھی کٹا

پانی ہی بند، خونِ جگر کب سے پیتی ہوں
اب ہائے کس جفا کے اُٹھانے کو جیتی ہوں

لوٹیں گے یا جلائیں گے اب گھر کو اشقیا
والی! کہاں ہیں آپ کا ماتم کروں بپا
ماتم کی صف بچھے گی تو کون آکے روئیگا
ہمسایہ دُور، کُنبہ مصیبت میں مبتلا

صاحب! تمہاری بیوہ کا پرساں نہیں کوئی
رونا یہ ہے کہ سوگ کا ساماں نہیں کوئی

مثال ۱۵۔ شمر سے اور جناب عباس علیہ السلام کی ماں سے کچھ دور کی قرابت پائی جاتی تھی۔ اعدائے دین تاراجیِ خیام کو آئے تو اس شقی کو کچھ غیرت آئی اور کہا کہ میں عباسؑ کی زوجہ کو ہرگز لوٹنے نہ دونگا۔ چنانچہ وہ ان کو اہلِ حرم سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مضمون کو اور نیز اُسوقت اہلِ حرم کی جو حسرتناک حالت تھی اُسکو کس دردانگیز پیرایہ سے ادا کرتے ہیں۔ جس سے انسانی جذبات کی ہو بہو تصویر کھچ جاتی ہے۔

یہ کہہ کے درِ خیمہ پہ چلّایا وہ بے پیر
اے بیوۂ عباسؑ علیؑ صاحبِ توقیر

اب ہوئیگی سر ننگے یہ سب عترتِ شبیرؑ
اور حضرتِ زہراؑ کی بہو ہوئیگی تشہیر

پر تم مری خواہر کی بہو ہو یہ ادب ہے
تشہیر جو تم ہو سرِ بازار غضب ہے

عباسؑ سے مشہور قرابت ہی ہماری
یاں بعدِ عمر آج حکومت ہی ہماری
در در جو پھرو تم، تو حقارت ہی ہماری
سب قوم میں سب کنبے میں ذلت ہی ہماری

کچھ کہنا ہے سُن جاؤ خدارا نہ ڈرو تم
پردے تلک اب جلد قدم رنجہ کرو تم

سُن لی یہ صدا زینبِ بیکس نے فضا میں
بیساختہ عباسؑ کی زوجہ کو پکارا
لو بھابی، بنا شمر طرفدار تمہارا
اچھا تو ہے اسوقت کرو ہم سے کنارا

وارث نہیں بے وارثوں پر دیکھیے کیا ہو
دُکھ سے جو تمہیں چین ملے ہم سے جُدا ہو

پھر بھر کے دمِ سرد یہ بانوؑ نے کہی بات
ہاں بھابی لُٹو کا ہیکو بے وارثوں کے ساتھ
برگشتہ نصیبوں سے کرو ترکِ ملاقات
کُنبے کی محبت میں نہو موردِ آفات

یہ دشمنِ دیں باندھیں گے اب ہاتھ ہمارے
کیا فائدہ جو قید ہو تم ساتھ ہمارے

مجھ میں تو نہیں ہوش تمہیں بچوں کو بہلاؤ
بیواریٔ بھاوج کی اسیری کا نہ غم کھاؤ
تم جاؤ تو اے بی بی سکینہؑ کو بھی لیجاؤ
لپٹاؤ کلیجے سے اُسے، گود میں بٹھلاؤ

پاس آپکے یہ لاڈلی میری جو رہے گی
ظالم کے طمانچوں کی تو ایذا نہ سہے گی

پر شمر جو پوچھے کہ یہ ہے کون تمھاری
بیٹی اسے حضرت کی نہ بتلانا میں واری
کہیو کہ علمدارِ دلاور کی ہے پیاری
جب سے وہ ہوئے قتل قلق اسپہ ہے طاری

بیٹی نہ سمجھنا نہ عزیز اپنی سمجھنا
بن باپ کی بچی کو کنیز اپنی سمجھنا

اصغر کو بھی تم اپنا ہی فرزند بتانا
ممکن ہو تو ننھی سی لحد اُس کی بنانا
موقع جو سفارش کا میں صدقے گئی پانا
بیمار بھتیجے کو اسیری سے بچانا

جو ہو سکے سیدانیوں سے کیجیو بھابی
زندان سے زینبؑ کو چھڑا لیجیو بھابی

اک رات کی بیاہی مری بیٹی جو ہے کبرا
رنڈسالے کا جوڑا بھی نہیں جسکو مہیا
کس طرح بسر ہوگا یہ بچپن کا رنڈاپا
بابا ہے سو محتاجِ کفن، ماں ہے سو دُکھیا

بھیجے جو تمہیں شمر لعیں یاں سے وطن کو
لیجائیو ہمراہ، بھتیجے کی دُلہن کو

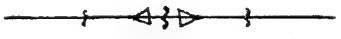

مثال ۱۶ - حضرت زینبؑ کا قبر سید الشہداؑ سے رخصت ہونا

چہلم جو کربلا میں بہتر کا ہو چکا
پیوند بیکسوں کے تن و سر کا ہو چکا
اور فاتحہ حسینؑ کے لشکر کا ہو چکا
قبروں پہ شور آلِ پیمبرؐ کا ہو چکا

ماتم میں تین روز رہے شور و شین سے
روئے لپٹ لپٹ کے مزارِ حسینؑ سے

مثلِ چراغ گورِ غریباں پہ دل جلائے
پھولوں کے ساتھ قبروں پہ لختِ جگر چڑھائے

پیاروں کی بود و باش کے ساماں جو یاد آئے
زینبؑ کلیجہ تھام کے بولی کہ ہائے ہائے

اب کس کے ساتھ داخلۂ کربلا ہوا
لایا تھا جو مدینے سے ہم کو وہ کیا ہوا

آئے تھے دوسری کو محرم کی کسکے سات
خیمے بپا ہوئے تھے برابر لبِ فرات
اُترے تھے ہم، تو روکی تھی عباسؑ نے قنات
تاکید تھی پکار کے کوئی کرے نہ بات

ہی ہی کہاں بچھڑ کے وہ آرامِ دل گئے
پردہ تھا جن سے خاک کے پردے میں مل گئے

آتا ہی یاد داخلۂ شاہِ دوسرا
کیسی چہل پہل تھی نہ تھا رنج اک ذرا
اُترے تھے یاں رفیق، اُدھر تھی محل سرا
پر ساتویں سے ٹوٹتا جاتا تھا آسرا

نقارہ و نشان کی یاں زیب و زین تھی
انجامِ کار نوبتِ قتلِ حسینؑ تھی

بازار اک طرف تھا، خریدار اک طرف
سردار اک طرف تھا، علمدار اک طرف
اکبرؑ کا تھا عروج پہ دربار اک طرف
ابنِ حسنؑ کی چھوٹی سی سرکار اک طرف

اصطبل واں تھا دوشِ نبیؐ کے سوار کا
جھولا پڑا ہوا تھا یہاں شیر خوار کا

ہی ہی وہ شیر مر گئے افسانہ رہ گیا
ارمان نوجوانوں کو کیا کیا نہ رہ گیا
نے بارگہ رہی نہ جلو خانہ رہ گیا
بستی علیؑ کی لُٹ گئی، ویرانہ رہ گیا

وحشت سے آج تاب نہیں یاں قیام کی
کل یاں کھڑی ہوئی تھی جماعت امام کی

زہراؑ کی یادگار کے صدقے میں سوگوار
تنہا رہے تو ٹوٹ پڑے آکے سو ہزار
گھوڑے سے واں گرے تھے شہنشاہِ نامدار
قاتل ہوا تھا سینے پہ حضرت کے یاں سوار

سینے کا درد کرتا تھا بیدم حسینؑ کو
ہم کو حسینؑ دیکھتے تھے ہم حسینؑ کو

راضی ہوں جو رضائے امامِ جلیل ہے
پر قابلِ ملاحظہ بازو کا نیل ہے
نے کوئی دادرس ہے نہ کوئی کفیل ہے
بھائی! بغیر آپ کے زینبؑ ذلیل ہے

پشت و پناہ اُٹھ گیا بے خانماں ہوئی
دیکھو، یہ پشت قابلِ نوکِ سناں ہوئی

حضرت کی قبر ہل گئی زینبؑ کے بین سے
رو کر کہا بشیر نے ابنِ حسینؑ سے
شہزادے! جاں بلب ہے پھوپی شور و شین سے
چلیے وطن کو قبرِ شہِ مشرقین سے

عابدؑ نے پوچھا کیوں پھوپی اماں قبول ہے
وہ بولی اختیار ہے کیا، ہاں قبول ہے

ہونے لگا سوار رسالہ بشیر کا
ڈنکا بجا حرم کے وداعِ اخیر کا
خیمہ اُٹھا لحد سے شہِ بے نظیر کا
اور سب تبرکات جنابِ امیرؑ کا

تربت کے گرد اونٹ برابر کھڑے ہوئے
رخصت کو جمع قبر پہ چھوٹے بڑے ہوئے

زینبؑ پکاری کوچ کا سامان ہو گیا
پھر شہر میرے بھائی کا ویران ہو گیا
پھر مقبرہ حسینؑ کا سنسان ہو گیا
ہُو کا مکان، قتل کا میدان ہو گیا

آئی مسافروں کو مرے وہ زمیں پسند

دنیا میں جس زمین کو بستی نہیں پسند

لے کربلائے سرورِ دلگیر الوداع
اے قبرِ ابنِ صاحبِ تطہیر الوداع

اے قتلگاہِ حضرتِ شبیرؑ الوداع
لو بھائی جان جاتی ہے ہمشیر الوداع

کیا بے نصیب ہے یہ نواسی رسولؐ کی
تم نے مجاوری نہ ہماری قبول کی

بے آپ کے بقیعے میں کس منہ سے جاؤنگی
گر جاؤنگی نجف تو ندامت اُٹھاؤنگی

نانا کے بھی مزار پہ عزت نہ پاؤنگی
پوچھیں گے سب بزرگ تو میں کیا بتاؤنگی

رخصت کیا حضور نے کیونکر یہاں ہوں
جاؤں تو کسطرف، جو رہوں تو کہاں رہوں

بھیا اُٹھو کجاوے پہ مجکو تمہیں بٹھاؤ
روکیں قنات، اکبرؑ و عباسؑ کو بُلاؤ

بھیا میں بے نقاب ہوں رہگیروں کو ہٹاؤ
خالی ہے گود بھابی کی اصغرؑ کو لیتے آؤ

سردار سارے قافلے میں آگے ہوتے ہیں
تیار کارواں ہوا اور آپ سوتے ہیں

مثال ۱۵ - اہلحرم کی وطن کو واپسی اور حضرت زینبؑ کے بین

جب گورِ غریباں سے وطن میں حرم آئے
کہتے تھے نہ اکبرؑ نہ امامِ امم آئے

سر پیٹتے سجادؑ بزیرِ علم آئے
اٹھارہ بنی فاطمہؑ کو کھو کے ہم آئے

آوازِ بتولؑ آئی کہ تاریک جہاں ہے
زینبؑ مرا یوسفؑ مرا شبیرؑ کہاں ہے

زینبؑ! مرے بچے کو کہاں چھوڑ کے آئی
زینبؑ مرے پردیسی کو یثرب میں لائی
زینبؑ مرے مظلوم سے کی تو نے جدائی
زینبؑ تو لٹا آئی بزرگوں کی کمائی

نکلی تھی تو سب کنبے کی اولاد کو لیکر
آئی ہے فقط عابدِ ناشاد کو لیکر

زینبؑ کو قلق سے یہ خبر بھی نہ تھی اصلا
جنگل ہی کہ بستی ہی مدینہ ہے کہ بطحا
پھر یک بیک اُسنے جو سُنا نالۂ زہراؑ
عابدؑ سے کہا کونسی منزل ہے یہ بیٹا

وہ بولے یہ مسجد ہی وہ روضہ ہی نبیؐ کا
وہ خانۂ ویراں ہی حسینؑ ابنِ علیؑ کا

گھبرا گئی منہ پیٹ کے عابدؑ کو پکاری
کچھ تم نے سُنی فاطمہؑ کی گریہ و زاری
میں کہتی نہ تھی مجکو نہ گھر لے چلو واری
بولو تو میں اب کیا کہوں دادی سے تمہاری

وہ طالبِ شبیرؑ ہے شبیرؑ نہیں ہے
شبیرؑ نہیں ہے مری توقیر نہیں ہے

کیوں لائے وطن میں مجھے کیا کام وطن سے
بچھڑی ہی بہن بھائی سے اور بھائی بہن سے
ہی ہی میں اُٹھی کیوں لحدِ شاہِ زمن سے
بہتر تھا وہ ویرانہ مدینے کے چمن سے

سب طعنے مجھے دینگے میں ہی کدھر آئی
بھائی کا تو سر کٹ گیا پھر کس کے گھر آئی

نے بھائی، نہ بھائی کی لحد، پھر یہاں کیا ہی؟
نے گنجِ شہیداں نہ یہاں خاکِ شفا ہی
نے رونے کی لذت ہی، نہ ماتم کا مزا ہی
واری! مجھے مقتل ہی میں لیچل تو مزا ہی

پہلو میں مزارِ شہِ کونین ملے گا

بے چین ہوں یاں، مجکو وہیں چین ملے گا

ناگہ خبرِ آمدِ سادات ہوئی عام
مردوں سے بھرے راستے اور عورتوں سے بام
ہر سمت تصدق کا، ضیافت کا سرانجام
پر نوحۂ زہراؑ سے بقیعہ میں تھا کہرام

یہ کہتے ہوئے لوگ چلے آتے تھے گھر سے
کہدو کوئی صغراؑ سے حسینؑ آئے سفر سے

زنجیرِ درِ فاطمہ صغراؑ کی ہلا کر
اک لڑکی نے جلدی سے یہ آواز دی آکر
لے بی بی پدر آیا ترا شکرِ خدا کر
مل آتی ہوں کبراؑ و سکینہؑ سے میں جا کر

مرضی تری اماں کی اگر پاتی ہوں بی بی
تو گود میں اصغرؑ کو اٹھا لاتی ہوں بی بی

اتنے میں عجب حشر کا ساماں نظر آیا
یعنی شترِ زینبؑ نالاں نظر آیا
ماتھے پہ جما خونِ شہیداں نظر آیا
سر فاطمہؑ کی بیٹی کا عریاں نظر آیا

خوں بہتا تھا زخموں کی طرح دیدۂ تر سے
آتی تھی صدا ہائے حسینا کی جگر سے

انبوہِ جوانانِ وطن جو نظر آیا
دل بالوں کا اکبرؑ کے تصور میں بھر آیا
تھرایا جگر یاد جو لختِ جگر آیا
بیساختہ یہ حرف لبِ پاک پر آیا

بیٹے کی جدائی میں مجھے صبر نہیں ہے
یثرب کے جوانو! مرا اکبرؑ بھی کہیں ہے؟

صغراؑ نے سنی مادرِ بیکس کی جو زاری
دوڑی گئی محمل کے قریب اور یہ پکاری
اے والدۂ ماجدہ، تسلیم ہماری
اصغرؑ کو دکھا دو ہمیں، ٹھہراؤ سواری

کہدو کہ تمنا ترے ملنے کی بڑی ہے
بیمار بہن ہاتوں کو پھیلائے کھڑی ہے

مثال ۱۶۔ حضرت اصغرؑ کی فرقت میں اُن کی ماں کے جگر خراش بین

بانوؑ پچھلے پہر اصغرؑ کے لیے روتی ہے
ایک وہ جاگتی ہے خلقِ خدا سوتی ہے
سر کو بھی پیٹتی ہے جان کو بھی کھوتی ہے
پر عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے

پیٹتے پیٹتے بیہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہے ہے علی اصغرؑ کی صدا آتی ہے

سوگ کا فرش ہے، اور سامنے جلتا ہے چراغ
بازو میں داغ رسن، سینے میں اولاد کا داغ
جان اندوہ میں، دل رنج میں، آشفتہ دماغ
نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے ہیں نہ زہراؑ کا وہ باغ

گوشہ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

کبھی گوشے میں وہ منہ ڈھانپ کے چلاتی ہے
اور کبھی صحن میں گھبرا کے نکل آتی ہے
کوکھ پکڑے ہوئے ہر ایک طرف جاتی ہے
ڈھونڈتی ہے، مگر اصغرؑ کو نہیں پاتی ہے

تن کو لغزش ہے جدا، اور ہے منہ زرد جدا
دل تڑپتا ہے جدا، سینے میں ہے درد جدا

کہتی ہے بعدِ خزاں باغ میں آتی ہے بہار
پھولتے پھلتے ہیں، ہوتے ہیں ہرے سب اشجار
مل گیا خاک میں اس طرح ہمارا گلزار
جسکا اب پھولنا پھلنا ہے نہایت دشوار

پھر بسا شہر، اگر ظلم سے برباد ہوا

اک مرا گھر ہے کہ لُٹ کر نہ پھر آباد ہوا

گود پھیلا کے کبھی کہتی کہ دلبر آؤ
روح بے چین ہے آؤ علی اصغرؑ آؤ
دل تڑپتا ہے مرا، گود کے اندر آؤ
فاطمہؑ کے لیے آؤ پے حیدرؑ آؤ

بوند پانی کے لیے ہائے تری جان گئی
اماں صدقے گئی، واری گئی قربان گئی

آ کے سینہ مرے سینے سے لگاؤ پیارے
آگ بھڑکی ہے کلیجے میں بجھاؤ پیارے
خشک منہ اپنا مرے منہ سے ملاؤ پیارے
اک نظر چاند سی تصویر دکھاؤ پیارے

جائیو خلد کو، یاں تم کو نہ بہلاؤں گی
ایک دم سے نہ زیادہ تمہیں ٹھہراؤں گی

اس جہاں سے چمنِ خلد ہے برسوں کی راہ
ہائے جس ملک میں قاصد بھی نہیں جاتا آہ
کس سے منگواؤں خبر میں تری اے نورِ نگاہ
یاں سوا صبر کے کچھ بس نہیں چلتا واللہ

ماں سے بچھڑے رہو، پر خرم و مسرور رہو
دل سے نزدیک رہو آنکھوں سے تم دور رہو

ہائے اصغرؑ نہ ترا دین ہوا ماں سے ادا
بوجھ کوئی مری گردن سے نہ اُترا تیرا
نہ تری سالگرہ کی نہ ترا بیاہ کیا
نہ لحد تجکو ملی اور نہ کفن تجکو ملا

ذبح تم ہو گئے سینے پہ لٹاؤں کس کو
چھوٹے چھوٹے یہ شلوکے میں نہاؤں کس کو

واقعاتِ شام

انسانی جذبات یا احساسات کی جگر سوز تصویر واقعاتِ شام کے درد انگیز حالات میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے، جو اہل حرم کے مصائب کا نہایت دلخراش واقعہ ہے، مرثیہ گویوں نے ان عبرت انگیز واقعات کو تاثیر کا رنگ دینے میں زورِ طبیعت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ لائق مؤلف اس اہم اور ضروری واقعہ کو بالکل نظر انداز کر گئے۔ مشہور ہے کہ زندان شام اور ہند کے حالات کو مرزا صاحب نے نہایت پُر تاثیر انداز سے لکھا ہے۔ اور حقیقت میں یہ شہرت بجا معلوم ہوتی ہے۔ مرزا صاحب خود بھی اس امر پر فخر کرتے ہیں۔

بے مثل مرثیے کہے احوالِ ہند میں　　تیرا جواب ہے نہ عرب میں نہ ہند میں

واقعاتِ شام کے افسوسناک حالات میں مختلف جزوی واقعات ہیں، اور اُن میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ مثلاً قید خانے کی وحشت و ویرانی کا سماں، اہلِ حرم کی پریشانی، وارثوں کی یاد، اور بچوں کا اضطراب، اُدھر ہند کا خود بخود اس جانکاہ واقعہ کے اثر سے متاثر ہو کر قید خانے میں جانیکا قصد کرنا۔ اہلِ حرم کا یہ خبر سُنکر اس لحاظ سے کہ ہند نے اُن کو پہلے شان و تجمل کی حالت میں دیکھا تھا اور اب اس درماندہ حالی میں ملاقات ہوتی ہے، فطرتاً بدحواس اور پریشان ہو جانا؛ ہند کا داخل زندانِ شام ہو کر اسیروں کے سچے حالات معلوم کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرنا، پھر صحیح صحیح حالات

معلوم ہو جانے پر اُس کے دل کی مضطربانہ کیفیت وغیرہ وغیرہ - ان میں سے ہر ایک واقعہ جُدا جُدا انداز رکھتا ہی - ان مختلف اور کثیر الانواع خصوصیات کو مرزا صاحب نے جن موثر پیرایوں میں ادا کیا ہی اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ فطرت کے کتنے بڑے نکتہ داں تھے - اُنھوں نے ہر واقعہ کے بیان میں جو دلخراش الفاظ استعمال کیے ہیں اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے اُس سے ہر چیز - ہر واقعہ - ہر حالت - اور ہر کیفیت کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہی، سامعین کے فطرتی جذبات جوش میں آجاتے ہیں، اور درد و قلق حسرت و یاس کا دریا دلوں میں موجزن ہو جاتا ہی -

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ ایسے موزوں اور مناسب لائے ہیں جن سے بے انتہا درد و غم ظاہر ہوتا ہی اور ہر لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہی، اور یہ اُنکے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہی - وہ ہمیشہ بنیہ مضامین میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ جو اپنے دل میں ہی وہی دوسرے کے دل میں پیدا ہو جائے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے - اور موزوں و مناسب الفاظ حقیقی اور نیچرل جذبات کی پوری تصویر کھینچنے میں کامیاب ثابت ہوں - اب ہم ان مضامین کو مختلف عنوانات کے تحت میں درج کرتے ہیں -

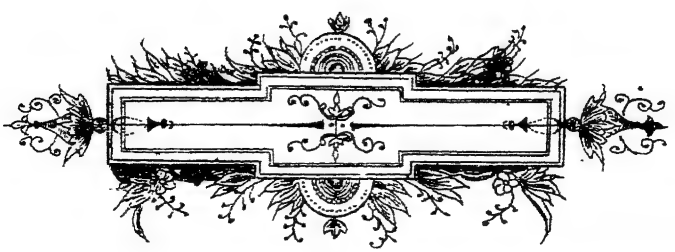

۱- دربارِ یزید

آمد ہے اہلبیتِ پیمبرؐ کی شام میں
گیسو کھلے ہوئے ہیں عزائے امام میں
سر پیٹتی ہے فاطمہؑ دارالسلام میں
زینبؑ یہ نوحہ کرتی ہے دربارِ عام میں

لوگو! خبر کرو مرے نانا رسولؐ کو
بلوے میں شمر لایا ہے بنتِ بتولؑ کو

نانا! تری نواسی کے سر پر ردا نہیں
امت خوشی سے دیکھ رہی ہے، حیا نہیں
تیرا حسینؑ مرگیا، سوگ و عزا نہیں
عابدؑ غریب مرتا ہے تپ میں دوا نہیں

غیرت سے کانپ کانپ کے سجادؑ رو رہا ہے
اب داخلہ یزید کی محفل میں ہوتا ہے!

زینبؑ تڑپ کے اونٹ پہ کرتی تھی یہ بیاں
دربار میں طلب ہوئے سادات ناگہاں
اونٹوں سے اُترے، بندھ گئی شانوں میں ریسماں
اُسوقت اہلِ شہر تھے سب مجتمع وہاں

سامانِ جشنِ عام تھا، دربارِ عام تھا
اور ننگے سر حسینؑ کا کنبہ تمام تھا

مطرب ترانہ سنج تھے، رقاص شادماں
پڑھتے تھے تہنیت کے قصیدے قصیدہ خواں
حاضر وکیلِ روم و حبش باشکوہ و شاں
ہاتوں پہ نذرِ فتح لیے خود اور کلاں

نوحہ یہ تھا ملائکۂ مشرقین کا
قدرت خدا کی جشن ہے قتلِ حسینؑ کا!!!

دربارِ عیدگاہ تھا وہ دن تھا روزِ عید
کس خرّمی سے کہتے تھے یہ شامیِ پلید
قتلِ حسینؑ تجکو مبارک ہو اے یزید
سیدانیاں ہلاک ہوں، عابدؑ بھی ہو شہید

چھُپ کر اُٹھا تھا شب کو جنازہ بتولؑ کا
ہے آج سب کے سامنے کنبہ رسولؐ کا

حیراں کھڑے تھے سب حرمِ شاہِ مشرقین
مُہرِ سکوت لب پہ، نہ شکوہ نہ شور و شین
زینبؑ نے دیکھا تخت پہ ناگہ سرِ حسینؑ
بیساختہ تڑپ کے یہ کرنے لگی وہ بین

ہی ہی نہ موت آئی مجھے راہِ شام میں
بھیّا سلام کرتی ہوں دربارِ عام میں

لکھا ہی دستِ بنتِ علیؑ تھا بندھا ہوا
اور پاس ہی رسن میں سکینہؑ کا تھا گلا
زینبؑ نے یہ بیاں جو سرِ شاہ سے کیا
دیکھا سکینہؑ پیاسی نے بھی سر اُٹھا اُٹھا

چشمِ ادب سے باپ کے سر پر نگاہ کی
ہاتوں سے تو بلائیں لیں، اور منہ سے آہ کی

چلّائی ہائے بابا کٹا کب تمہارا سر؟
سب مجھسے کہتے تھے، ہی سفر میں ترا پدر
ہی ہی جب ہی لعینوں نے لوٹا ہمارا گھر
ہی ہی جب ہی طمانچے مجھے مارے بے خطر

سچ ہے کہ باپ والی کو سب پیار کرتے ہیں
یوں ہم سے بے پدر کو گرفتار کرتے ہیں

یہ سُن کے بد دماغ ہوا حاکمِ لعیں
بولا کہ قیدی روتے ہیں کیا شمر یاں نہیں
کہتا ہوا یہ شمر گیا تخت کے قریں
کیا حکم ہے غلام تو موجود ہے یہیں

جو کہہ انہیں سزا دوں مجھے کیا دریغ ہی

حاضر یہ تازیانہ - یہ خنجر - یہ تیغ ہے

درباریوں کا قلب یہ سنتے ہی ہل گیا
انگلی دبا کے دانتوں میں ہر ایک نے کہا
ہم جانتے تھے ہے انہیں مظلوموں کی خطا
پر اب کھلا کہ بے سبب ان سب پہ ہے جفا

رونے کا ضبط صاحبِ ماتم سے ہوگا؟
جسکا کوئی مرے گا وہ کیونکر نہ روئے گا!!

حاضر جو شہر شہر کے تھے قاصدِ عقیل
تھا اک فرنگی ان میں شہِ روم کا وکیل
انجیل خواں محبِ خدا خاصۂ جلیل
حاکم سے وہ عقیل ہوا صرفِ قال و قیل

بتلا کہ گم حواس مرے اے امیر ہیں
یہ سر ہے کسکا اور یہ کہاں کے اسیر ہیں؟

جاتا ہوں شاہِ روم کی خدمت میں یا نبی جب
وہ مجھ سے پوچھتا ہے وقائع یہاں کے تب
پر آج ماجرا نظر آتا ہے یہ عجب
امیدوار ہوں کہ مفصل سنا تو سب

مسکن تھا اس قتیل کا کس سرزمین پر
تھا اور دین پر کہ محمدؐ کے دین پر

زنجیر پہنے کانپتا ہے جو یہ ناتواں
کیا نام اس مریض کا ہے جلد کر بیاں
یہ ننّی لڑکی جسکے گلے میں ہے ریسماں
اسکا تو ہے وہ سن کہ ہو کافر بھی مہرباں

رانڈوں سے انتقام تو لیتا ہے حیف ہے!
آزار ننّھے بچّوں کو دیتا ہے حیف ہے!

یہ وہ معاملہ ہے کہ بس ہوش جاتا ہے
کیا حرفِ بد تجھے یہ کٹا سر سناتا ہے
جو چوبِ بید اس کے لبوں پر لگاتا ہے
کوئی بھی ہاتھ مردے کے سر پر اٹھاتا ہے

اسکا گناہ تو مجھے حیران کر گیا
باقی قصاص رہ گیا اور سر اُتر گیا

مذہب پہ اس سے جنگ ہوئی یا کہ ملک پر؟
کیا تارک الصلوٰۃ تھا کاٹا جو اسکا سر؟

کیا منحرف تھا قبلے سے لوٹا جو اسکا گھر؟
زینبؑ سے ضبط ہو نہ سکا بولی پیٹ کر

حق پر مرا ہے، فرقۂ باطل سے پوچھ لے
سجدے میں سر کو کاٹا ہے قاتل سے پوچھ لے

یہ سُنکے اور کانپے فرنگی کے دست و پا
پوچھے جو شاہِ روم کروں اُس سے عرض کیا

کہنے لگا یزید سے تو نے نہ کچھ کہا
یہ کِسکا سر ہے؟ نام بتا اور نسب بتا

بولا شقی بلند نہ کر شور و شین کو
کہدیجیو یزید نے مارا حسینؑ کو

اُسنے کہا، جو سیّدِ بطحا ہے وہ حسینؑ؟
تیرے رسولؐ کا جو نواسا ہے وہ حسینؑ؟

ماں جس کی فخرِ مریم و حوّا ہے وہ حسینؑ؟
مشکل کشا علیؑ کا جو بیٹا ہے وہ حسینؑ؟

جسپر نبیؐ نے اپنے پسر کو فدا کیا؟
خالق نے جس کو بچۂ آہو عطا کیا؟

حاکم نے سر ہلا کے کہا ہاں وہی حسینؑ
غارت کرے شتاب تجھے ربِ مشرقین

منہ پیٹ کر فرنگی پکارا بشور و شین
اے خاک تیرے چین پہ کھویا علیؑ کا چین

اے اہلِ شام کیوں یہی مذہب تمہارا ہے
نانا کا کلمہ پڑھ کے نواسے کو مارا ہے!!

شبیرؑ و مصطفیٰؐ کی قرابت تو ہے عیاں
کُل اک جناب فاطمہؑ ہیں اُنکے درمیاں

اس اصل پر جدا کیا سر اُن کا، الاماں!! ہی کل کی بات زندہ تھے پیغمبرِ زماں

مرقد میں داغ اُنکے کفن کو لگا نہیں
اور آج سر پہ آلِ نبیؐ کے ردا نہیں!!

اب نوحے کا ہنگام ہی رقت کی گھڑی ہی شہ مر گئے زینبؑ پہ قیامت کی گھڑی ہی
دربار میں اب آمدِ عترت کی گھڑی ہی حیدرؑ کے محبو! یہ عدالت کی گھڑی ہی

جائز ہی حرم مجلسِ میخوار میں جائیں
عابدؑ لیے ماں بہنوں کو دربار میں جائیں

دربار بھی ظالم کا ہی عادل کا نہیں ہے اندیشہ عدو کو حق و باطل کا نہیں ہے
وقت اس سے زیادہ کوئی مشکل کا نہیں ہے کچھ بس حرمِ بیکس و بیدل کا نہیں ہے

منظور ہی یہ، طوق تو گردن میں پڑے ہوں
سب کرسیوں پہ بیٹھے ہوں سادات کھڑے ہوں

یہ سُنکے سکینہؑ نے کہا ماں سے میں قرباں دربار میں کسکے ہے طلب آپ کی اس آن؟
کیا بیٹھا ہی انصاف پہ اس شہر کا سلطاں گر یہ ہی، تو بی بی نہ حزیں ہوں نہ ہراساں

نے خون کیا ہمنے کسی کا، نہ خطا کی
چل کر سرِ دربار دُہائی دو خدا کی

پہلے کہو حاکم سے کہ حیدرؑ کے حرم ہیں زُوّارِ پیمبرؐ کے ہیں، حجّاجِ حرم ہیں
دسویں سے محرّم کی گرفتارِ الم ہیں سر ننگے ہیں ہم، پیاروں کے سر تن سے قلم ہیں

+ اصل یعنی حسب و نسب یعنی باوجود ایسے عالیشان حسب و نسب اور خاندانی اقتدار کے انکا سر جدا کر لیا

دے داد ہماری کہ عزیزوں سے چھٹے ہیں
کعبے کے مسافر تری سرحد میں لٹے ہیں

زینبؑ علی اکبرؑ کا کہیں وقعہ سارا
تم کہیو کہ برقع مرا ظالم نے اُتارا
یوں نیزہ لگا، یوں جگر اُن کا ہوا پارا
نالش میں کروں گی کہ طمانچہ مجھے مارا

گر پوچھے گا وہ، کیا تری مرضی ہی بتا دے
میں ہاتوں کو جوڑونگی کہ بابا سے ملا دے

تو شہر کا حاکم ہے تجھے ہوئیگا معلوم
عاشور سے روپوش ہوئے ہیں شہِ مظلوم
نے بھوک سے مضطر ہوں، نہ ہوں پاس سے مغموم
غم یہ ہی کہ بابا کی زیارت سے ہوں محروم

غم باپ کا رُلواتا ہی چُپ ہو نہیں سکتی
دہشت سے طمانچوں کی مگر رو نہیں سکتی

ماں نے کہا ایسا تو مقدر نہیں اپنا
پُرساں کوئی جز خالقِ اکبر نہیں اپنا
اس شہر میں مُنہ لائقِ چادر نہیں اپنا
دشمن کوئی حاکم کی برابر نہیں اپنا

کہنے سے اسی کے ہوا گھر صاف ہمارا
اللہ کے آگے ہے اب انصاف ہمارا

بانوؑ و سکینہؑ میں یہ تھی درد کی گفتار
رسّی لیے ہاتوں میں غضبناک تھے کفّار
ناگاہ اُدھر ہند محل میں ہوئی بیدار
ہاتوں کو کلیجے پہ دھرے آنکھوں سے خونبار

اُسوقت جسے ہند کا عالم نظر آیا
ماتم کا مرقع اُسے برہم نظر آیا

لے لیکے بلائیں یہ کنیز ایک پکاری
کچھ آپ کو اسوقت تردّد ہی میں واری

باہر تو بڑا جشن ہی خیرات ہی جاری
فرمائیں جلوس آپ بھی نذریں لیں ہماری

مجرے کی رعیت کو بھی تاکید ہوئی ہی
اس فتح کی حاکم کو بڑی عید ہوئی ہی

وہ بولی کہ میں جشن نہیں کرنیکی زنہار
لے جاؤ ہٹاؤ یہ ہر اک خلعتِ زرتار

مسند بھی اُلٹ دو مجھے اب کچھ نہیں درکار
کیوں سوئی میں اسوقت، پناہ اے مرے غفار

گرتے ہوئے کعبے کے ستون خواب میں دیکھے
قرآں کے ورق غرق بخوں خواب میں دیکھے

ویرانے میں اک گنجِ شہیداں نظر آیا
خورشیدِ فلک خون میں غلطاں نظر آیا

اک غول لیے خنجرِ بُرّاں نظر آیا
سب حادثوں کے بعد یہ ساماں نظر آیا

نیزے پہ جگر کاٹ کے رکھا ہی نبیؐ کا
اور رُخ ہے مرے گھر کی طرف فوجِ شقی کا

سب نے کہا بس آپ ہیں اس خواب سے مضطر
مدت ہوئی بی بی کہ جناں میں ہیں پیمبرؐ

توبہ کہاں احمدؐ کا کلیجہ کہاں خنجر!!
وہ بولی وفات اُن کی تو مشہور ہی گھر گھر

ہی ہی مجھے دھڑکا ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کا
یہ پھول نبیؐ کا، یہ کلیجہ ہے نبیؐ کا

اس کلمۂ حق سے ہوئی ہر قلب پہ تاثیر
پر ہند کی تسکین میں کھولے لبِ تقریر

اک نے کہا زینبؑ کو عریضہ کرو تحریر
لکھ بھیجیں گی وہ خیریتِ حضرتِ شبیرؑ

چلائی اجل پُرزے ہوئے تنکے زمیں پر
تلوار کا خط کھنچ گیا حلقِ شہِ دیں پر

اک نے کہا یہ مشورہ میں نے تو نہ مانا
اللہ کو دیکھا نہیں پر عقل سے جانا
جو کُل کا پیمبر ہے، وہ شبیرؑ کا نانا
حاکم کلمہ پڑھتا ہے اور سارا زمانا

امّت کا نہ ہاتھ اُٹھے گا سیّد پہ بلالوں
اس بات پہ کہیے تو میں قرآن اُٹھالوں

اب چل کے قدم رنجہ کرو بام پہ بی بی
فرماؤ نظر تہنیتِ عام پہ بی بی
غش قیدیوں کو آتا ہے ہر گام پہ بی بی
کھانا دو انہیں فاطمہؑ کے نام پہ بی بی

چھڑوا دو انہیں نامِ حسینؑ ابنِ علیؑ پر
آئے گی نہ پھر کوئی بلا سبطِ نبیؐ پر

یا فاطمہؑ کہتی ہوئی وہ بام پر آئی
مسند وہیں غرفے میں کنیزوں نے بچھائی
ناگاہ اُٹھا شور کہ اللہ دُہائی
ہے ہے کہا اور ہند نے یہ بات سُنائی

واللہ لگی چوٹ مرے قلبِ حزیں پر
یہ نالہ و شیون ہے فلک پر کہ زمیں پر؟

چلمن کو اُٹھا کر یہ کنیز ایک پکاری
رسّی سے اسیروں کے گلے بندھتے ہیں واری
چھل چھل کے رگیں سینے تلک خون ہے جاری
دم گھٹتا ہے تو کرتے ہیں گھبرا کے وہ زاری

عریاں بدن و فاقہ کش و تشنہ جگر ہیں
کچھ عورتیں کچھ بچے ہیں کچھ مردوں کے سر ہیں

خولیؔ نے جو نیزہ درِ حاکم پہ جھکایا
پر تو سرِ شبیرؑ نے ہر سمت گرایا
دل ہند کا اُس نور کے شعلے نے جلایا
جُھک جُھک کے رخ اپنا طرفِ نیزہ پھرایا

منہ پیٹ کے سر خم کیا تسلیم کی خاطر

مسند پہ کھڑی ہو گئی تعظیم کی خاطر

چلائی یہ کس بندۂ غفار کا سر ہے
اک نے کہا محبوسوں کے سردار کا سر ہے
بولی کوئی، حاکم کے گنہگار کا سر ہے
یہ کھانے لگی قسمیں کہ دیندار کا سر ہے

ہوتی نہیں یہ صاحبِ تقصیر کی صورت
بالکل ہے مرے حضرتِ شبیرؑ کی صورت

یہ کہتی تھی اور سینے میں ملتا تھا کوئی دل
واں آلِ نبیؐ بزمِ شقی میں ہوئے داخل
اللہ رے جلالِ حرمِ سیدِ عادل
خود بند ہوا نغمۂ تنبور و جلاجل

مطرب ہوئے تسبیح بکف، پھینک کے دف کو
رقاص کھڑے ہو گئے قبلے کی طرف کو

اب لکھتے ہیں یوں راقمِ مجموعۂ ماتم
تھی ایک زنِ ہاشمیہ ہند کی محرم
فریاد جو زینبؑ کی محل میں گئی پیہم
منہ پیٹتی سر ننگے نکل آئی وہ پُرغم

انبوہ میں کچھ کہہ نہ سکی آلِ نبیؐ سے
دل پکڑے ہوئے پھر گئی دربارِ شقی سے

جاتے ہی گری روبرو دے ہند وہ مغموم
چلائی عجب رتبہ کے ہیں قیدیِ مظلوم
ہے ہے ہوئیں دو بی بیاں اس شان کی معلوم
گویا مری شہزادیاں ہیں زینبؑ و کلثومؑ

قیدی ہیں کہ گلدستہ ہے وابستہ رسن سے
سادات کی خوشبو چلی آتی ہے بدن سے

یوں پھول دمِ صبح مہکتے نہیں دیکھے
ایسے مہ و خورشید چمکتے نہیں دیکھے
بچے کہیں بن پانی بلکتے نہیں دیکھے
دل ننّے سے اس طرح دھڑکتے نہیں دیکھے

داخل اُنھیں اسوقت خرابے میں کیا ہے
گھر چھین کے تقدیر نے زندان دیا ہے

نزدیک رہا جب کہ درِ حاکمِ گمراہ
باندھے گئے رسّی میں غزالانِ حرم آہ
استادہ تھی اک خادمۂ ہند سرِ راہ
دوڑی گئی اور جا کے کیا ہند کو آگاہ

لو پھر چکے ہر کوچہ و بازار میں قیدی
کوٹھے پہ چلو جاتے ہیں دربار میں قیدی

کوٹھے پہ تو وہ جا نہ سکی حال تھا تغیر
آہستہ چلی جانبِ در ششدر و دلگیر
ساتھ اُس کے ہوئی حاکمِ خونخوار کی ہمشیر
پہنے ہوئے بھائی کی طرح خلعتِ توقیر

تھا مقنعِ زر خواہرِ بے پیر کے سر پر
کپڑا نہ تھا شبیرؑ کی ہمشیر کے سر پر!

دو کرسیاں لے آئیں کنیزیں وہاں فوراً
اور پردہ در باندھ دیا چھوڑ کے چلمن
دربار کا سب حال ہوا ہند پہ روشن
اک بی بی نظر آئی جھکائے ہوئے گردن

چلّائی کہ فریاد رسولِ عربی کی
یہ تو مری سیدانی نواسی ہے نبیؐ کی!!

تھرّا گئی حاکم کی بہن اُس کے سخن پر
ہاتھ اپنا رکھا ہندِ خوش ایماں کے دہن پر
بولی، مرا بھائی ہے شریعت کے چلن پر
وہ ظلم کرے گا یہ بھلا شہ کی بہن پر

شک ہے تمہیں یہ خواہرِ شبیرؑ نہ ہوگی
ایسی تو مرے بھائی سے تقصیر نہ ہوگی

فہمیدہ ہو تم خود، نہیں سمجھانے کے قابل
یہ بات نہیں آپ کے فرمانے کے قابل
دربار میں زینبؑ سے بھلا آنے کے قابل!
رسّی جگرِ فاطمہؑ کے شانے کے قابل!!

سر ننگے یہ ہمشیرِ امام مدنی ہے
ہے ہے نہ کہو، بے ادبی بدشگنی ہے

اتنے میں کھلا تخت پہ واں طشتِ طلائی
ہر سو سرِ شبیرؑ نے کی جلوہ نمائی
یاں ہند کو چلمن سے تجلّی نظر آئی
پر چوب شقی نے جو لبِ شہ پہ لگائی

کرسی سے گری ہندِ حزیں منہ کو پھرا کر
سر پیٹتی باہر گئی چادر کو گرا کر

لرزے امرا، کانپ گیا حاکمِ اکفر
پردے سے یہ نکلی وہ ہوا جامے سے باہر
درباریوں کو حکم دیا تخت سے اٹھ کر
ہاں ڈھانپ لو رومالوں سے چہروں کو سراسر

رسوا ہوا اقلیم میں اب نام ہمارا
ناموس نکل آیا سرِ عام ہمارا

بانوئے حزیں سہم کے عابدؑ کو پکاری
منہ پھیر لو تم بھی یہاں ہند آتی ہے واری
زینبؑ پہ عجب قہر کا غصہ ہوا طاری
چلائی اب انصاف ترے ہاتھ ہے ناری

بنتِ شہِ مرداں ہوں نہ مرنے سے ڈرونگی
اسوقت تو قائل تجھے مجمع میں کرونگی

بے پردگیِ ہند سے تو اتنا ہے مضطر
سر کھلنے سے بانوئے کے تڑپتے ہیں پیمبرؐ
محتاجِ ردا پھرتی ہوں جس دن سے میں در در
اماں مری جنت میں نہیں اوڑھتی چادر

چلاتا ہے تو ہند کی صورت کو نہ دیکھو

فرماتے ہیں حیدرؑ مری عترت کو نہ دیکھو

۲- زندان شام کی وحشت و ویرانی - اہلبیتؑ کی مصیبت، عزیزوں کی یاد

جب قیدیوں کو راہ میں ماہِ صفر ہوا
ماہِ صفر کی پہلی کو آخر سفر ہوا

اور شام میں ورود بوقتِ سحر ہوا
ہر جا قلق اسیروں پہ افزود تر ہوا

دربار میں جو چار گھڑی تک کھڑے رہے
زنداں میں آکے غش کئی ساعت پڑے رہے

راوی نے حالِ خانۂ زنداں ہی یوں لکھا
آئی جو شب اسیروں کو صدمہ سوا ہوا

وحشت میں مثلِ قبر اور آفت میں کربلا
نے فرش تھا نہ سایہ نہ پانی تھا نے غذا

شمعوں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتمِ حسینؑ کے داغوں کی روشنی

ماں کو سوادِ شب نظر آیا جو بربلا
بے اختیار دوڑی سوے در وہ ننگے پا

اصغرؑ کو قید خانے میں دل ڈھونڈنے لگا
زینبؑ لپٹ کے بولی کہ بھائی یہ کیا کیا

زنداں سے اسیر کہیں جانے پاتے ہیں
وہ بولی کیا کروں علی اصغرؑ بلاتے ہیں

اسوقت یاد آتی ہی اصغرؑ کی واردات
جنگل میں جاگا ہوگا جو معصومِ نیکذات

میدان سونا لاشے پہ لاشا اندھیری رات
پہلو میں ڈھونڈھا ہوئیگا مجکو اٹھا کے ہات

جانے دو مجکو جانے دو اب جان جاتی ہی
اصغرؑ کے رونے کی مجھے آواز آتی ہی

مسلمؑ کی بیوہ رو کے لگی کرنے التماس
اصغرؑ تو قتل گہ میں ہی اپنے پدر کے پاس

بی بی ہمارے درد و قلق پر کرو قیاس
رکھتی ہوں چار داغ جگر پر میں بیحواس

دو بیٹے قتل گاہ میں ہیں تن پہ سر نہیں
دو آئے تھے جو کوفے میں اُن کی خبر نہیں

والی کی لاش ہے درِ کوفہ میں بے کفن
رونے کو اُن کی لاش پہ نے ماں ہے نے بہن
کبرا پکاری سب سے سوا ہے مرا محن
کنگنے کی جا بندھی ہے مرے ہاتھ میں رسن

لوگو کبھی یہ ظلم ہوا ہے زمانے میں
میرے سوا دُلہن ہو کوئی قید خانے میں

سب، وارثوں کی یاد میں کرتی تھیں کلام
دروزباں سکینہ کو تھا شاہِ دیں کا نام
کہتی تھی ڈھونڈتی ہوئی آئی ہیں تا بشام
لیکن نظر نہ بیٹی کو آئے کہیں امام

حیراں ہوں اب وہ الفتِ شبیر کیا ہوئی
ایسی بھلا سکینہ سے تقصیر کیا ہوئی

حضرت سکینہؑ کی دردناک حالت کا نقشہ

جب داغِ بے کسی نہ سکینہ اُٹھا سکی
اور سوزِ دل نہ خوف کے مارے سُنا سکی
کھائے طمانچے شمر کے جب تک کھا سکی
سن کم تھا دُکھ بہت تھے نہ برداشت لا سکی

روئی تو ظالموں نے جفا بے شمار کی
آخر یہ جبر دیکھ کے موت اختیار کی

گر آہ کی تو شمر پکارا خموش ہو
اور چپ ہوئی تو بے پدری نے کہا کہ رو
گہ شدتِ عطش میں پکاری کہ پانی دو
گہ یاد کر کے رہ گئی بابا کی پیاس کو

سوئی جو آنسو پونچھ کے چشمِ پُر آب سے

ہی ہی حسینؑ کہہ کے وہ اُٹھ بیٹھی خواب سے

دل میں سما گیا تھا جو شمرِ لعیں کا ڈر
سوتے میں بھی پکارتی تھی چونک چونک کر
فریاد چھینتا ہے گہر شمرِ بدگہر
اماں بچاؤ آتا ہے درّہ لیے عمر

زینبؑ پھوپی دُہائی کلیجہ دھڑکتا ہے
سجادؑ بھائی دیکھو وہ خولی گھڑکتا ہے

فاقوں سے رفتہ رفتہ یہ لاغر بدن ہوا
اکثر بدن سے خوں بھرا کُرتہ اُتر پڑا
آواز بند ضعف سے، منہ پیاس سے کھلا
تھا پوست برگِ گُل کی طرح چہرے سے جُدا

جاری تھے آنسو آنکھوں سے اور خون کان سے
پیدا تھا شورِ ہائے حسینؑ زبان سے

بن فرش سوتے سوتے جمی پیرہن میں گرد
رہنے لگا تڑپتے تڑپتے بدن میں درد
دل غم سے جلتے جلتے ہوا زندگی سے سرد
تھا فاقہ کرتے کرتے بدن خشک چہرہ زرد

چلّا کے رونا شمر کی دہشت سے چھُٹ گیا
یاں تک گلا بندھا کہ دمِ آخر گھُٹ گیا

جب پیاس لگتی رو کے چچا کو پکارتی
دُکھتے جو کان شاہِ ہُدا کو پکارتی
آتا نہ جب کوئی تو خدا کو پکارتی
جینے سے تنگ آ کے قضا کو پکارتی

کہتی تھی نے چچا نہ امامِ امم رہے
رُلوانے کو عدو رہے رونے کو ہم رہے

باپ کی یاد میں حضرت سکینہؑ کے نالے

چوتھا برس آغاز، یہ ہی سن کی صغیری
بچپن کی یتیمی ہے لڑکپن کی اسیری

تھی جسکے بزرگوں کو دو عالم کی امیری
اُسکو نہ امیری ہی نہ سامانِ فقیری

سر کو در و دیوار سے ٹکراتی ہے کیا کیا
بیلی جو اسیری ہے تو گھبراتی ہے کیا کیا

ہر شب درِ زنداں پہ وہ شبیرؑ کی شیدا
چلاتی ہی رو کر ہے کوئی رحمدل ایسا
جا کر مرے بابا کو یہ پیغام دے میرا
زنداں سے سکینہؑ کو نہیں چھوڑتے اعدا

بیداد سکینہؑ پہ ہے تم داد کو پہونچو
مارے ہیں طمانچے مری فریاد کو پہونچو

یا سبطِ نبیؐ بیٹی کو زنداں سے چھڑاؤ
کانوں پہ ورم آگیا ہے دیکھ تو جاؤ
ماں پاس نہیں سوتی ہوں تم پاس سُلاؤ
کُرتا ہے بھرا خون سے اب آکے دُھلاؤ

پالا ہی ہمیں تم نے بڑے ناز و نعم سے
اب اتنا جگر سخت کیا آپنے ہم سے

۳۔ شہرِ شام کی زینت، ہند کی سیر، خود بخود دل کی پریشانی

ہر گھر سے نمودار زمانے کی خوشی تھی
زنداں میں سادات کے جانے کی خوشی تھی
مفلس کو بھی اک شمع جلانے کی خوشی تھی
زہراؑ کے چراغوں کے بجھانے کی خوشی تھی

اس جشن کی تاکید تھی سب خلقِ خدا پر
اور قید تھی رونے کی اسیرانِ بلا پر

بازار میں بھی شہر میں بھی جشن عیاں تھا
حاکم کے ہر اک شہر میں عشرت کا سماں تھا
پر ہند کے ایوان پہ جنّت کا گماں تھا
خاتونِ جناں کی وہ کنیزک کا مکاں تھا

آرائشِ ایواں جو اُسے مدِّ نظر تھی
شبیرؑ کے گھر لُٹنے کی ابتک نہ خبر تھی

ناگاہ خواصوں نے کہا لیکے بلائیں
کچھ عرض کریں ہم جو اماں جان کی پائیں
وہ بولی کہو، عرض یہ کی دیکے دعائیں
بی بی کا محافہ درِ دولت پہ لگائیں

گلگشتِ بہارِ گُل و ریحاں کی یہ شب ہے
قربان ہوں ہم سروِ چراغاں کی یہ شب ہے

وہ کہنے لگی خیر، جو ہے شہر میں ساماں
ہاں چلتی ہوں موجود سواری ہو اسی آں
چلائی محلدار ابھی لائی میں قرباں
ہرکارے گئے چار طرف سُنکے یہ فرماں

موجود محافہ بھی ہوا تختِ رواں بھی
ڈنکا بھی ہوا دار بھی نوبت بھی نشاں بھی

اک ہودجِ زرّیں میں وہ خوش خو ہوئی اسوار
باجے بھی سلامی کے بجے ہر طرف اکبار
غل پڑ گیا اسوار ہوئی ہندِ خوش اطوار
زنداں میں گھبرانے لگی زینبؑ ناچار

فضّہ سے کہا دیکھ تو آمد ہے کدھر کو؟
اللہ کرے آئے سواری نہ ادھر کو!!

القصہ کہ ناقہ ادھر آیا اُدھر آیا
پر ہند نے کچھ لطف سواری کا نہ پایا
آئینوں نے بالکل اُسے حیران بنایا
دل کو مع امید چراغوں نے جلایا

بستی میں اُسے صاف تباہی نظر آئی
ہر شمع کے شعلے میں سیاہی نظر آئی

بیٹھی تھیں خواصیں جو سر آداب سے نیوائے
اُسنے کہا ناحق مجھے تم لوگ یہاں لائے

ہی ہی مجھے ہول آتے ہیں، جلدی کوئی بتلائے
کس شہر کا وارث ہوا، کس ملک سے سر آئے

بستی میں طبیعت مری گھبراتی ہی لوگو
دنیا مجھے ویران نظر آتی ہے لوگو

ڈھونڈو تو، کہ باشندۂ یثرب کوئی یاں ہے؟
پوچھ آؤ کہ اُس شہر میں تو امن و اماں ہے؟

ان پیر و جواں میں نجفی کوئی جواں ہی؟
اب دُرِّ نجف فاطمہؑ کا لال کہاں ہے؟

دم رُکتا ہی اب حال مرا غیر ہی لوگو
دریافت کرو مکّہ میں تو خیر ہے لوگو؟

کس قوم کی بندی یہاں آئی ہی کھُلے سر
گویا کہ ہوا ہے گذرِ آلِ پیمبرؐ

ہر کوچہ ہی سادات کی خوشبو سے معطّر
آباد نہ سمجھو اسے، ویراں ہے یہ کشور

اس خوں کی کوئی دن کو سزا ملتی ہی لوگو
دیکھو مری آنکھوں سے زمیں ہلتی ہی لوگو!!

بازار سے ناقے کی مہار اُسنے پھرائی
واں ہائے حسینؑا کی صدا کان میں آئی

مسجد کی طرف حُبِّ حرم کھینچ کے لائی
ٹھہرا کے سواری کہا، اللہ دوہائی

سیدانیاں تھرّائیں نقیبوں کی صدا سے
یہ غش ہوئی سیدانیوں کی آہ و بکا سے

بے ساختہ چلّائیں کنیزانِ خوش اعمال
گھبرا کے کوئی جھلنے لگی چہرے پہ رومال

کیا ہو گیا ان کو ارے کھُلواؤ کوئی فال
سہلانے لگی تلوے کوئی مضطر و بیحال

اسپند کیا ایک نے رخسارِ نکو پر
اک نادِ علیؑ پڑھنے لگی مصحفِ رو پر

بکھرا کے کوئی بال نجف کو یہ پکاری
اللہ بچانا کہ محب ہے یہ تمھاری

اے میرے جنابِ شہ مرداں ترے واری
مولا! تمہیں سنتے ہو برے وقت ہماری

گھبرائی ہوئی سوئے محل جاتی تھی کوئی
شیشہ لیے زمزم کا چلی آتی تھی کوئی

غش سے جو کھلی آنکھ کیا اُس نے اشارا
پھر کان لگائے سوئے زنداں جو قضارا

خاموش رہو صاحبو سنئے دو خدارا
ہیہات یہ فریاد سنی اُسنے دوبارا

زنداں میں تو ہائے حسینؑ کی صدا ہے
دروازے پہ وا قرۃ العینا کی صدا ہے

دل میں کہا دو بی بیوں کا شورِ بکا ہے
ہاتف نے ندا دی کہ دو عالم میں عزا ہے

زنداں میں ماتم ہے جدا، در پہ جدا ہے
بیرونِ خرابہ سرِ شاہِ شہدا ہے

زنداں میں ہمشیر ہے دروازے پہ ماں ہے
وہ نوحہ ہے زینبؑ کا یہ زہراؑ کی فغاں ہے

یہ سنتے ہی پُرزے کیا سب خلعتِ زرتار
چلائی مرے ہاتوں کو باندھو پے غفار

پھینکا کہیں تاج اور کہیں موتیوں کے ہار
زہراؑ کی گنہگار ہوں زینبؑ کی گنہگار

اس بیخبری پر کوئی کاٹو مرے سر کو
زنداں میں زینبؑ تھی میں آئی نہ خبر کو!!

دنیا کے نہ پردے پہ رکھے اب مجھے اللہ
زنداں میں ہوا ہائے غضب بانوئے ذیجاہ

زینبؑ ہوئی بے پردہ میں پردہ میں ہی آہ
ایوان میں میں جشن کا سامان کروں واہ!!

آ کر نہ گروہِ حرمِ پاک میں مل جاؤں

غارت ہو نہیں، اللہ کرے خاک میں ملجاؤں

میں کہتی تھی کیا ہے سبب اس عیش و خوشی کا
لو سوگ تھا اُمت میں پسر فرزندِ نبیؐ کا!!
سُنتی تھی کہ جنگل میں جلا خیمہ کسی کا
وہ گھر تھا مری فاطمہؑ کا میرے علیؑ کا

جل جائے گھر آقا کا تاسف نہ کرو نہیں!!
بجلی جو گرے مجھ پہ تو اب اُف نہ کرو نہیں

اک مرتبہ قدموں پہ گریں لونڈیاں ساری
چلائیں کہ یہ کیا کلمے منہ سے ہیں جاری
تم لونڈی ہو زہراؑ کی وہ بی بی ہیں تمہاری
چاہو تو قسم لو، یہ خوشامد نہیں واری

ہم آپ کے آداب سے خاموش ہیں بی بی
تقصیر معاف، آپ ابھی بیہوش ہیں بی بی

فہمیدہ ہو تم خود، نہیں سمجھانے کے قابل
کونین کی شہزادیاں ویرانے کے قابل
توبہ، رسن ان بی بیوں کے شانے کے قابل
یہ بات نہیں آپ کے فرمانے کے قابل

زنداں میں ناموسِ رسولِ مدنیؐ ہے!!
ہے ہے نہ یہ ارشاد کرو بدشگنی ہے

کیا منہ جو کوئی آنکھ اُٹھائے شہِ دیں پر
حکم اُن کا ہے لوح و قلم و عرش بریں پر
ٹکڑے کیا نانا نے قمر چرخِ مبیں پر
اور باپ نے کاٹے پرِ جبرئیلؑ زمیں پر

مغرب سے پھرا شمس اشارے سے علیؑ کے
اندھیر ہے پھر جائیں جو پیارے سے علیؑ کے

خلعت کوئی دربار سے پہنے ہوئے آتا
اک نذر لیے ہاتوں پہ دوڑا ہوا جاتا
ڈیوڑھی سے محل کی کوئی محمل کو لگاتا
ناموس کو اپنے کوئی واں دھوم سے لاتا

سب خانہ نشیں، پردہ نشیں، گوشہ نشیں تھے
بلوے میں کھلے سر حرم قبلۂ دیں تھے

پر ہند کا توفیقِ خدا سے تھا عجب حال
مسند پہ وہ بیٹھی تھی رکھے آنکھوں پہ رومال
تھا آنسوؤں کا تار بندھا اور کھلے بال
تہلیل ہوئی جاتی تھی گھڑیوں وہ خوش اقبال

لے نذر وہ لیتی تھی نہ تسلیم کسی کی
حاشا نہ مدارات نہ تعظیم کسی کی

جس دم کسی عورت کی اترتی تھی سواری
منہ پھیر کے دروازے سے وہ کرتی تھی زاری
سکتے میں کھڑی تھیں امرا زادیاں ساری
کہتی تھیں کہ یہ جشن ہے یا تعزیہ داری

ہم نذر کو آئے ہیں کہ پرسے کو کسی کے!
کھلتے نہیں یہ راز جنابِ احدی کے!!

نذروں پہ نظر ہی نہیں فرماتی ہیں بی بی
بیساختہ اشک آنکھوں میں بھر لاتی ہیں بی بی
کچھ سوچ کے ہر بار لرز جاتی ہیں بی بی
یوں روتی ہیں جو ہم کو بھی رلواتی ہیں بی بی

دولت ہے ریاست ہے حکومت ہے حشم ہے
حیرت ہے الٰہی نہیں کس بات کا غم ہے!

تب ہند پکاری کہ مجھے خود نہیں معلوم
آنکھیں کسے روتی ہیں میں ہوں کسلیے مغموم
سکتا ہے مجھے، شہر میں اس جشن کی ہے دھوم
دل کڑھتا ہے جسکے لیے ہے کون وہ مظلوم

کھلتا نہیں کچھ آہ، یہ کیا مجکو ہوا ہے

کیوں بال بکھیرے ہیں مرا کون موا ہے

در پر تو مرے جشن کی نوبت ہی سحر سے
رونے کی صدا کان میں آتی ہی کدھر سے؟
دل ٹکڑے ہوا جاتا ہی کیوں دردِ جگر سے
کیا ہی کہ گری پڑتی ہی چادر مرے سر سے

ہوں سوگ میں، اور علم نہیں کس کی عزا ہی
کھلتا نہیں کیوں آنسوؤں کا تار بندھا ہی

جن قیدیوں کے آنے کی اسوقت خبر ہی
دریافت ہے کچھ تم کو کہ اُن کا کہاں گھر ہی؟
سُنتی ہوں کہ سب قافلہ کھولے ہوئے سر ہے
اور طوق کے ہالے میں کوئی رشکِ قمر ہی

کیا قوم ہی ان لوگوں کی کیا ملّت و دیں ہی
کاٹا گیا سر جس کا وہ سیّد تو نہیں ہی؟

وہ بولیں کہ ہم کہنے میں شرماتے ہیں بی بی
کوچوں میں منادی کھڑے چلاتے ہیں بی بی
مکّے کے مدینے کے اسیر آتے ہیں بی بی
ہی ہی یہ بنی فاطمہؑ کہلاتے ہیں بی بی

کہتے ہیں کہ سر کاٹا ہی جس حق کے ولی کا
حاجی تھا وہ کعبے کا مجاور تھا نبیؐ کا

۴ - ہند حالتِ اضطراب میں یزید سے امام حسینؑ کے حالات دریافت کرتی ہے دونوں کے سوال و جواب

یہ حال رفتہ رفتہ کہیں ہند نے سُنا
بیساختہ وہ کانپ گئی اور یہ کہا
اللہ خیر کیجیو، یہ کیا غضب ہوا
ہی ہی حسینؑ پر یُورشِ لشکرِ جفا!!

زہراؑ کے خاندان میں تو اک حسینؑ ہی

یہ اور ہی کہ فاطمہؑ کا نورِ عین ہے ؟

شاید اُدھر بھی جمع ہیں فوجیں برائے جنگ
جو خوف سے یزید کا یاں اُڑ رہا ہی رنگ
ہر دم کے مشورے سے ہی فرصت کا وقت تنگ
ہی خرمی کبھی تو کبھی فکرِ نام و ننگ

دیکھوں یہ فوج لاتی ہے سر کس شہید کا
دیکھوں کسے رُلاتا ہے ہنسنا یزید کا

آقا مرا حسینؑ ہے معصوم و بیگناہ
نے اُسکو حرصِ دولت و زر ہی نہ حبِ جاہ
پھر کس حسینؑ سے یہ زمانہ پھرا ہے آہ ؟
جانِ نبیؐ کی جان کو اللہ کی پناہ

مشکل کشا ہی اپنے پسر کی مدد کرے
خالق گھڑی گھڑی کی بلا اُسکی رد کرے

بیچارہ فاقہ کش ہے کچھ اہلِ دول نہیں
دو دن کے بعد آج غذا ہی تو کل نہیں
غیر از دعائے خیر کچھ اُس کا عمل نہیں
حاکم کے بندوبست میں اُس سے خلل نہیں

ابتک قصاص بھائی کا اپنے لیا نہیں
دعویٰ کسی سے خونِ حسنؑ کا کیا نہیں

سب اُسکے ہیں عدو وہ کسی کا عدو نہیں
خُلقِ محمدیؐ ہے تکبر کی خو نہیں
امّت کا عیب پوش ہی وہ عیب جو نہیں
نقّارہ و علم کی اُسے آرزو نہیں

ناحق کا اُس سے بغض ہی سارے جہان کو
حیدرؑ کی ضامنی مرے آقا کی جان کو

اُسوقت اک کنیز نے یہ ہند سے کہا
سُنتی ہوں یہ حسینؑ بھی سیّد ہی قوم کا
لو اب سُنا یہ تم نے لڑائی کا ماجرا
میں سُن رہی ہوں کب سے یہ تیاریِ وغا

ذی الحج سے جمع ظالم خونریز ہوتے ہیں
خنجر کئی مہینے سے یاں تیز ہوتے ہیں

آگاہ حالِ کوفہ سے بی بی نہیں ہیں آہ
واں کشت و خوں بڑا ہوا، اللہ کی پناہ!
مارا اسی حسینؑ کے بھائی کو بے گناہ
چلائی ہند سچ ہے؟ وہ بولی خدا گواہ

مشہور کب سے ہے یہ خبر خاص و عام میں
سر بھی لٹک رہا ہے درِ ملکِ شام میں

لونڈی سے ہند نے کہا رو کر دہائی ہے
اب کہہ یہ کس حسینؑ کے گھر کی صفائی ہے
وہ فاطمہؑ کا بیٹا ہے زینبؑ کا بھائی ہے؟
وہ بولی یہ خبر نہیں تحقیق پائی ہے

زینبؑ کا ہے وہ بھائی کہ ابنِ بتولؑ ہے
پر سنتی ہوں مجاورِ قبرِ رسولؐ ہے

اندیشہ اس خبر سے ہوا ہند کو کمال
کھانا حرام ہو گیا خونِ جگر حلال
شب کو یزید آیا تو دیکھا یہ اُسکا حال
پوچھا کہ کیوں تو روتی ہے بولی وہ خوشخصال

کیا میرا رونا حشر تو اُسوقت ہوئیگا
جب مصطفےٰؐ نواسے کے لاشے پہ روئیگا

بولا وہ کاذبِ ازلی صادقوں کے طور
الزام پیچھے دیجیو پہلے یہ سن بغور
کیا وجہ میں جو آلِ نبیؐ پر کرونگا جور
یہ تو حسینؑ اور ہے اور وہ حسینؑ اور

وہ نورِ چشمِ فاطمہؑ ہے اور یہ غیر ہے
میں اُس سے شر کرونگا بھلا تجکو خیر ہے

قتلِ حسینؑ کا میں کروں قصد بھی اگر
امت کا ہاتھ اُٹھے گا نبیؐ کے نواسے پر؟

جسکو سوارِ دوش کرے سید البشرؐ — کوئی بشر چڑھائے گا نیزے پہ اُسکا سر

ایمان چھوڑ دے گا کوئی میرے زور سے
سر ننگے مصطفےٰؐ کو نکالیگا گور سے

تیرے ہی کیا نبی ہیں محمدؐ مرے نہیں — ہی وہ حسینؑ میرے پیمبرؐ کا جانشیں
نانا کا اُسکے پڑھتے ہیں کلمہ سب اہلِ دیں — میں قتل اُسے کرونگا تجھے آگیا یقیں

کیا تو ہی فاطمہؑ کی بڑی دوستدار ہی
میرا تو ملک و مال سب اُس پر نثار ہی

---

۵ - ہند زندانِ شام کو جاتی ہی - اُسکے درد و قلق کی تصویر، لونڈیوں کی گفتگو

بالائے بام بیٹھی تھی جو ہند بیقرار — بولیں کنیزیں اُس کے حضور آکے ایکبار
وہ قیدی آئے بی بی کو جن کا تھا انتظار — پر ہیں کمال درد رسیدہ وہ سوگوار

بچوں کو اپنے جبکہ وہ ناشاد روتے ہیں
اس شہر کے بھی صاحبِ اولاد روتے ہیں

یہ ذکر تھا کہ شور اُٹھا وا مصیبتاہ — زیرِ محل گذر ہوا اہلِ حرم کا آہ
اونٹوں کے گرد خلق، پس و پیش سب سپاہ — بے اختیار ہند نے چلمن سے کی نگاہ

دیکھی جو بندی آلِ رسالت پناہ کی
دے پٹکا سر دریچے پہ اور منہ سے آہ کی

کنیزیں اسیروں کا حال دیکھ کر کہتی ہیں

رکھ کر جبیں پہ ہاتھ یہ کی ایک نے فغاں — ہی ہی لہو اسیروں کے ماتھے سے ہی رواں

کوئی پچھاڑیں کھا کے یہ کرنے لگی بیاں
ہی ہی سبھوں کے ماتھے پہ ہیں نونِ سناں!!

پہلے پہل جو پردے سے باہر یہ آئے ہیں
کیسے حیا سے بالوں میں منہ کو چھپائے ہیں

بولی کوئی کہ بچوں پہ تو کیجیے نگاہ
کیا سہمے سہمے لپٹے ہیں ماں سے یہ رشکِ ماہ
یہ مکھڑے پیارے پیارے، بدن گورے گورے آہ
سونلا گئے ہیں دھوپ سے اللہ کی پناہ

کپڑا نہیں نصیب نہ آب و غذا نصیب
ہی ہی یہ حادثہ یہ سن و سال یا نصیب!!

بیہوش ہند ہو گئی سنکر یہ ماجرا
واں بزمِ عام میں گئے ناموسِ مصطفیٰ
حاکم نے لے کے جائزہ زنداں نہیں دیا
اور خود محل میں آیا تو یہ ہند نے کہا

ان قیدیوں کو دیکھ کے میں ہول کھاتی ہوں
دے حکم اک گھڑی کو میں زنداں میں جاتی ہوں

خواب اپنا کہہ کے رونے لگی وہ شکستہ حال
سب بولے خیریت ہے نہ کچھ کیجیے ملال
یہ خواب تو یزید کی باتوں کا ہی خیال
چلائی وہ کہ خیر سے ہے گر علیؑ کا لال

کون اُٹھ گیا جہاں سے کہ غم ہی زمانے کو
دل میرا کھینچتا ہے مجھے قید خانے کو

وحشت پکارتی ہی نکل گھر سے ننگے پا
الفت کسی کی کہتی ہے جینے سے ہاتھ اُٹھا
ہاتوں کو شوقِ جامہ دری ہی جدا جدا
مدِ نظر ہے آنکھوں کو طوفان جا بجا

کہتا ہی کوئی کان میں کیا بے نصیب ہے

تو دُور ہے نبیؐ کی نواسی قریب ہے

ماتم یہ کِسکا مجکو رولاتا ہے یا علیؑ
سینے میں دل کو کون دُکھاتا ہے یا علیؑ
آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آتا ہے یا علیؑ
زندان کو کوئی لیے جاتا ہے یا علیؑ

گر پوچھتی ہوں کس سے ملاقات ہوئیگی
کہتا ہے دل زیارتِ سادات ہوئیگی

یوں قصر سے رواں ہوئی وہ شہ کی خیر خواہ
جیسے قلق میں آنکھ سے آنسو دہن سے آہ
پہلو میں بیٹی غرقِ جواہر بزیب و جاہ
اور مہتمم جلو میں کنیزانِ رشکِ ماہ

خلعت سبھوں کا سرخ بصد زیب و جاہ تھا
پر دودِ دل سے ہند کا جامہ سیاہ تھا

ہیہات قید خانے کے در پر وہ آئی کب
پیاروں کے نام لیکے حرم پیٹتے تھے جب
پڑہ کر درود ناموں پہ بولی کہ ہے غضب
نامِ خدا علیؑ کے عزیزوں کے ہیں لقب

یا تو یہ سوگوار، محبِ بتولؑ ہیں
یا خود یہ اہلبیتِ جنابِ رسولؐ ہیں

خالی تھا وہ گھر چین سے مثلِ دلِ نادار
تھا سقف کے ہلنے سے عیاں زلزلہ ہر بار
عقرب کے کہیں چھپتے تھے، ہر در کی کہیں غار
ہر کونے میں یہ ڈر تھا کہ اب گرتی ہے دیوار

سونے کا ٹھکانا تھا نہ سامانِ خورش تھا
در پر زنِ حاکم کی کنیزوں کا یورش تھا

اک لیکے خبر بیوؤں کی دوڑی ہوئی جاتی
اک ہانپتی حاکم کے محل سے ادھر آتی

گن گن کے کوئی مُردوں کے سر اشک بہاتی
اک جھانک کے دیوار کے روزن سے سُناتی

ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ خاموش رہو تم
روئے نہیں مگر ہائے حسینا نہ کہو تم

اس نام سے ہول آتے ہیں بی بی کو ہماری
یہ سُنتے ہی زینبؑ پہ قیامت ہوئی طاری

دروازے پہ سر ننگے کھڑی کرتی ہیں زاری
عابدؑ سے لرز کر کہا کچھ سُنتے ہو واری

دیکھے گی ضرور آ کے ہند آلِ نبیؐ کو
کیوں کُنبے کے وارث تو چھپا لیگا پھوپی کو

پردے کے لیے بھائی کو لاؤنگی کہاں سے
دیوار گرے سر پہ میں اُٹھ جاؤں جہاں سے

ہے ہے کدھر اسوقت نکل جاؤں یہاں سے
یہ کیا کیا تقدیر نے مجھ تشنہ دہاں سے

پردے کے لیے ہائے نہ شبیرؑ کو چھوڑا
بھائی کو قضا لے گئی ہمشیر کو چھوڑا

ناگاہ بڑھو اور بچو کی ہوئی اک دھوم
دیواروں پہ مشعل کا اوجالا ہوا معلوم

رونے لگے سادات دہلنے لگے معصوم
رو کر کہا زینبؑ نے کہ یہ بھی مرا مقسوم

تب ہند ملی آہ نبی زادی سے چھُٹ کر
سیدانیاں بندی میں جب آئیں یہاں لُٹ کر

ہر گام لہو ہند بہاتی ہوئی آئی
دل عرش کا نالوں سے ہلاتی ہوئی آئی

رستے میں دُر و لعل لُٹاتی ہوئی آئی
نذرِ شہِ دیں پانی پلاتی ہوئی آئی

خیرات ادھر دی اور اُدھر حق سے دعا کی
ہو خیر الٰہی پسرِ شیرِ خدا کی

دیکھا درِ زنداں پہ جو سر شہ کا دوبارا
روکر کیا انگشتِ شہادت سے اشارا
لوگو مجھے بے موت اسی نے ہی مارا
دربانوں سے فرمایا کہ در کھولو خدارا

سُنتے ہی یہ آواز مشوش ہوئی زینبؑ
یاں قفل کھُلا اور وہاں غش ہوئی زینبؑ

---

۶ - ہند کی آمد کا جاہ و جلال، ملازموں کی خوشامدانہ تقریر۔

درِ زنداں پہ ہوا اتنے میں انبوہ کمال
بولے دربان کہ بڑھے دولت و عمر و اقبال
قیدیو اُٹھو دعا دے کے کرو استقبال
زنِ حاکم کا ہی زنداں میں نزولِ اجلال

تم کھُلے سر ہو حضور اب تمہیں چادر دینگی
رحمدل ہیں ابھی زنداں سے رہا کر دینگی

مہرباں ہونگی تو خلعت ابھی پہنا دینگی
صبح کو بیڑیاں بھی پاؤں کی کٹوا دینگی
عذر حاکم نہ کریگا جو یہ سمجھ دینگی
نام جس شہر کا لوگی وہیں پہونچا دینگی

قصرِ شاہی سے جو تشریف یہاں لائی ہیں
پرورش کرنے کو تم سب کی حضور آئی ہیں

درِ زنداں پہ قدم ہند نے رکھا ناگاہ
اور باہر سے نقیبوں نے کہا بسم اللہ
لونڈیاں آگے بڑھیں کہتی ہوئیں پیش نگاہ
پیچھے دامن لیے ہاتوں میں خواصیں ہمراہ

سر پہ رکھے کوئی کرسی زبرجد آئی
کوئی بغلوں میں لیے تکیہ و مسند آئی

زنِ حاکم کی یہ حشمت یہ لباسِ پُر زر
اور بانوئے حسینؑ ابنِ علیؑ ننگے سر!

نہ مدائن نہ مدینہ نہ پدر نے شوہر
دونوں سرکاریں لُٹیں، رہنے کو پایا یہ گھر

خون اکبرؑ کا لگائے ہوئے پیشانی پر
روتی تھی اپنی پریشانی و حیرانی پر

۷۔ ہند اپنی بیٹی کو قید خانے میں بھیجکر اہلِ حرم سے اندر آنے کی اجازت طلب کرتی ہے دخترِ یزید کے تجمل اور جناب سکینہؑ کی خستہ حالی کا مقابلہ۔

بیٹی سے اپنی کہنے لگی وہ ادب شناس
واجب ہے ان اسیروں کا مجھ پر لحاظ و پاس
شاید یہ میرے آنے سے ہوں اور بیحواس
جا دست بستہ کر مری جانب سے التماس

نکلی ہے گھر سے سُنکے صدا شور و شین کی
حاضر ہے یاں سلام کو لونڈی حسینؑ کی

زنداں میں بنتِ ہند گئی پہنے رختِ زر
در سے لگی کھڑی تھی سکینہؑ برہنہ سر
چلّا رہی تھی نامِ پدر لے کے بے پدر
دیکھا جو اُسکو رہ گئی خاموش سہم کر

حسرت سے اُسکے خلعتِ زر پرزنگاہ کی
اپنے پھٹے لباس کو دیکھا اور آہ کی

اُس کی نظر تھی زخم پہ کانوں کے دمبدم
گہنا یہ اُس کا دیکھتی تھی سر سے تا قدم
زینبؑ پکاری جیتے ہیں یہ دیکھنے کو ہم
اے چرخ کچھ بھی ہے تجھے انصاف ہے ستم

بچپن میں کسکو رنج ہے اور کسکو چین ہے
وہ دخترِ یزید، یہ بنتِ حسینؑ ہے!!

پہنے ہے کون خلعتِ زر، ننگے سر ہے کون
نازاں پدر پہ کون ہے اور بے پدر ہے کون

قصر و محل ہے کسکے لیے دربدر ہی کون
خوشدل ہی کون اور شکستہ جگر ہی کون

سرخی خوشی کی چہرے سے کسکے نمود ہی
منہ پھول سا طمانچوں سے کسکا کبود ہی

حشمت سے بنتِ ہند کا آنا نہ بھولے گا
شرما کے اسکا آنکھ جھکانا نہ بھولے گا
کرتا الٹ کے منہ کا چھپانا نہ بھولے گا
یہ انقلاب، اور یہ زمانا نہ بھولے گا

محتاجی لباس ہی، اور قحطِ آب ہے
بن باپ کی سکینہؑ کا بچپن خراب ہے

ناگہ جھکی سلام کو بنتِ امیرِ شام
اور بولی، اپنی اماں کا ہم لائے ہیں پیام
زہراؑ کی لونڈیوں میں ہے مشہور جنکا نام
مشتاق ہیں جمالِ مبارک کی، والسلام

در پر کھڑی ہیں، حکم کا بس انتظار ہے
بیبیوں نے سر جھکا کے کہا، اختیار ہے

---

۸ - آمدِ ہند کی خبر سنکر اہلبیتؑ کا اضطراب، پریشانی اور ندامت کی تصویر۔

یہ کہکے پیادہ چلی زندانِ ستم کو
چھوڑا یہیں ڈنکے کو سواری کو حشم کو
دربان وہاں ہنس کے پکارے یہ حرم کو
لو اب تو بھلا رو، شہنشاہِ امم کو

بدخواب ہوئی غصے میں گھر سے نکل آئی
یہ ہند نہیں آئی، تمہاری اجل آئی

دل بچوں کا ننھا سا اچھلنے لگا اس آن
قالب میں سکینہؑ کے تو باقی نہ رہی جان
جلد آنسوؤں کو پونچھ کے یہ بولی وہ نادان
اماں یہاں کون آتا ہی، کیا کہتے ہیں دربان؟

ناحق بھی غریبوں پہ خفا ہوتے ہیں اماں
ہم تو نہیں چلاّ کے یہاں روتے ہیں اماں

ناحق مجھے جو چاہیے دے رونیکا الزام
لو دیکھ لو آنکھیں، کہیں آنسو کا نہیں نام
گو لیٹتی ہوں موند کے آنکھوں کو میں ناکام
پر درد سے کانوں کے نہ ہی نیند نہ آرام

میں طعنوں سے ڈرتی ہوں قضا سے نہیں ڈرتی
یا نکی ہی وہ خلقت کہ خدا سے نہیں ڈرتی

اب قتل کی اعدا نے یہ تدبیر نکالی
کچھ اور نہ تھا، رونے کی تقصیر نکالی
خونریزیِ سادات پہ شمشیر نکالی
تقصیر نئی اور نئی تعزیر نکالی

اب بھی نہیں گردوں کے طبق پھٹتے ہیں لوگو
اس شہر میں رونے پہ گلے کٹتے ہیں لوگو

بھیا کی غریبی پہ میں تھراتی ہوں اماں
بیمار کے سر کٹنے کا غم کھاتی ہوں اماں
ابتو نہ میں روتی ہوں نہ چلاتی ہوں اماں
بخشیں مری تقصیر میں سو جاتی ہوں اماں

گر غصہ کرے ہند کہ روتی ہے سکینہ
تم کہیو سرِ شام سے سوتی ہے سکینہ

ان باتوں سے دہڑکا جو ہوا اہلِ حرم کو
چلاّ کے علمدار کو اور شاہِ امم کو
حلقے میں لیا عابدِ محبوسِ الم کو
کبرا نے دہرا زانو پہ بھائی کے قدم کو

بانو نے لیا گود میں سجادِ حزیں کو
بیمار کی گردن پہ رکھا اپنی جبیں کو

یہ حال تھا ناموسِ پیمبر کا ابھی آہ
جو مشعلوں کی روشنی در پر ہوئی ناگاہ

اور شور ہوا اے حرمِ سیّدِ ذیجاہ
آگاہ ہو، آگاہ ہو، آگاہ ہو، آگاہ

آداب سے مجرے کو چلو باندھ کے صف کو
آمد زنِ حاکم کی ہے زنداں کی طرف کو

ہوش اُڑ گئے زینبؑ کے پکاری میں کروں کیا
لو آتی ہے یاں ہند چھپوں جا کے میں کس جا
پہلے مرے بھائی سے بھی عقد اسکا ہوا تھا
یہ ہند وہی ہے جو مجھے کرتی تھی مجرا

میں خاک نشیں آج ہوں وہ تخت نشیں ہے
منہ کس سے چھپاؤں کہ ردا بھی تو نہیں ہے

مطلع ثانی

جب ہند کی آمد ہوئی زندانِ ستم میں
بیوؤں کو غمِ تازہ ہوا قید کے غم میں
زینبؑ نے کہا یادِ شہنشاہِ امم میں
جلد آؤ بہن مرتی ہے بھیا کوئی دم میں

وارث کوئی جز ذاتِ خدا سر پہ نہیں ہے
ہند آتی ہے ملنے کو ردا سر پہ نہیں ہے

یہ ذکر تھا جو ہند وہاں آئی پہ بیہوش
عابدؑ سے کہا بانوؑ نے داری گئی خاموش
اک اک کے پسِ پشت ہوا شرم سے روپوش
بچے تو یہ سمجھے کہ ہوئی پیاس فراموش

منہ ڈھانپ لیے خوف سے کرتوں کو اُلٹ کر
اور سانس نہ لی بیوؤں کے سینے سے لپٹ کر

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے
دخترِ فاطمہؑ غیرت سے موئی جاتی ہے
روح قالب میں وہ زنداں میں گھبراتی ہے
بیحواسی سے ہر اک بار یہ چلاتی ہے

آسماں دور، زمیں سخت کدھر جاؤں میں

بی بیو مل کے دعا مانگو کہ مرجاؤں میں

آمدِ ہند کا غل عترتِ شبیرؑ میں ہے
دخترِ فاطمہؑ روپوشی کی تدبیر میں ہے

شورِ ماتم حرم صاحبِ تطہیر میں ہے
کہتی ہے جاؤں کہاں پاؤں تو زنجیر میں ہے

کس غضب کی یہ خجالت ہے دہائی لوگو
ہند آپہونچی مجھے موت نہ آئی لوگو

جاکے دربانوں کو قسمیں دو کہ بہرِ سبحاں
رات کا وقت ہے بچے ہیں ہمارے ناداں

کوئی کھلوائے نہ تم کھولیو قفل زنداں
گر نکل جائینگے تو ہم انہیں ڈھونڈینگے کہاں

حاکمِ شام کا کل تم پہ عتاب آئے گا
اور ہمارا تو گلا پہلے ہی بندھ جائے گا

کیا کروں کیا نہ کروں جلد بتاؤ لوگو
اوٹ کرکے ہو کھڑے مجکو چھپاؤ لوگو

صدقہ اکبرؑ کا حقارت سے بچاؤ لوگو
یا کسی کونے میں لیجاکے بٹھاؤ لوگو

سر کھلے ہوں کسی حجرے میں مجھے بند کرو
یہ بھی ممکن نہ ہو تو خاک کا پیوند کرو

اُسنے پہچان کے گر کچھ کیا لطف و احساں
بی بی کچھ خیر ہے زینبؑ کہاں زنداں کہاں

لونڈیاں ہند کی گھبرا کے کرینگی یہ بیاں
باپ تو عقدہ کشا بیٹی اسیرِ زنداں

بے ردائی ہے تباہی ہے پریشانی ہے
توبہ توبہ یہ نبیؐ زادی ہے سیدانی ہے!!

کس طرح ہند کے آنے سے نہ گھبراؤں میں
کوئی دیوار جو شق ہو تو سما جاؤں میں

بنتِ حیدرؑ رہوں نہ کیوں قید میں شرماؤں میں
سیدھی ماں جائے کے مقتل کو چلی جاؤں میں

کربلا میں نہ یہ ذلت ہی نہ رسوائی ہے
بے کفن میں ہوں تو بیگور مرا بھائی ہے

لیکے لاشے کی بلائیں کہوں حالِ زنداں
تھا یہی خوف کہ گھبرا کے کریگی وہ بیاں

ہندواں آئی ہی بھیّا میں چلی آئی یہاں
اے پیمبرؐ کی نواسی تو اسیروں میں کہاں!

قابلِ طوق ہوئی لائقِ زنجیر ہوئی
کیا گنہ تجھ سے ہوا کونسی تقصیر ہوئی

سب ستم دیکھے یہ اندوہ اُٹھائے نہ گئے
قید میں نام بزرگوں کے بتائے نہ گئے

ہند کو خاک بھرے بال دکھائے نہ گئے
دربدر پھرنے کے احوال سُنائے نہ گئے

ملتی کیا ہند سے میں خاکِ عزا تھی سر پر
نہ تو تم تھے مرے سر پر نہ ردا تھی سر پر

کربلا کا جو سُنا نام سکینہؑ نے آہ
اچھی میری پھوپی اماں مجھے لینا ہمراہ

یک بیک ہو کے کھڑی کہنے لگی بسم اللہ
وہاں ملیگی مجھے ظالم کے طمانچوں سے پناہ

ضبط اب رونے کا زنہار نہوگا مجھ سے
ننگے سر روز کا دربار نہوگا مجھ سے

آہ بھر کر کہا زینبؑ نے میں تیرے قرباں
طوق گردن میں ہی اور پاؤں میں زنجیر گراں

کربلا شاہِ شہیداں کی کہاں اور میں کہاں
میں ہوں زنداں کے قابل مرے قابل زنداں

بیٹھو صدقے گئی بیٹھو میں کدھر جاؤنگی
بیڑیاں پہنے کسی دن یہیں مرجاؤنگی

میں ہوں بیخود مرے کہنے پہ نہ جاؤ واری
آنے جانے کا کہیں ذکر نہ لاؤ واری
پھوپی کہہ کہہ کے نہ اب شور مچاؤ واری
ہند آتی ہے مری گود میں آؤ واری

غیر ملنے کو جو آتا ہے تو چپ رہتے ہیں
پھوپی کو ایسی جگہ کنبہ موئی کہتے ہیں

ماں کو وہ پونچھے تو آوارہ وطن بتلانا
نام خواہر کا فقط رانڈ بہن بتلانا
بھائی کو قیدیِ زنجیر و رسن بتلانا
باپ کو سیدِ بیگور و کفن بتلانا

دیکھو غیرت سے میں ہو جاؤنگی پانی پانی
ہند کے آگے نہ تم مانگیو جانی پانی

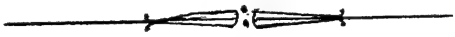

۹ - دختر یزید اور حضرت سکینہؑ کی طفلانہ گفتگو۔

زینب تو بیاں کرتی تھی یہ ہند سے رو کر
واں پاس سکینہؑ کے گئی ہند کی دختر
بولی کہ بہن آتا ہے رونا مجھے تم پر
کرتا ہے پھٹا سی نہیں دیتیں تمہیں مادر

ہم غیروں کے دل پر ترے نالوں کا اثر ہے
اللہ! تری ماں کا بھی کیا سخت جگر ہے!!

بہنیا مری ماں تو مجھے کرتی ہے بہت پیار
پوشاک بھی اک دن میں بدلتی ہے کئی بار
ماں تیری عجب ہے جو ہے اس دکھ کی روادار
کنگھی بھی ترے بالوں میں کرتی نہیں زنہار

صورت تو ہے واللہ بہت آپ کی پیاری
تم ماں کی بہت پیاری ہو یا باپ کی پیاری؟

تب اک نفسِ سرد سکینہؑ نے بھرا آہ
فرمایا میں کیا حال سے اپنے کروں آگاہ

تم ماں کی ہو پیاری تو مبارک کرے اللہ
ہم دُکھ میں ہیں کیا چاہیے ہم کو حشم و جاہ

تم خلعتِ زر پہنو کہ آرام ہے تم کو
کُرتا جو پھٹا ہے مرا کیا کام ہے تم کو

ماں باپ کو اپنے تو کبھی ہم بھی تھے پیارے
بابا بھی برادر بھی چچا بھی تھے ہمارے
سارے یہ مرے چاہنے والے گئے مارے
تم خوش ہو کہ ماں باپ سلامت ہیں تمہارے

راحت سے ہمیں کام نہ سونے سے غرض ہے
زنداں کے گرفتاروں کو رونے سے غرض ہے

کُرتا ہی نہیں چاک جگر بھی ہے مرا چاک
گھر لُٹ گیا، اسباب جلا، چھن گئی پوشاک
بابا نہیں جو گرد مرے منہ سے کرے پاک
ماں اپنے ہی غم میں ہے مری غور کرے خاک

تم ہم سے نہ بولو کہ دل افگار ہیں بی بی
ہم سب ترے بابا کے گنہگار ہیں بی بی

دل ہند کی بیٹی کا اُمنڈ آیا یہ سُن کر
اور باندھ کے ہاتوں کو کہا چل تو مرے گھر
پوشاک پہناؤں میں، ضیافت کروں خواہر
وہ بولی، یہی گھر ہی ہمارے لیے بہتر

زنداں میں رہنے دے مجھے یادِ پدر میں
کیا جاؤں پھٹے کُرتے سے بنیا ترے گھر میں

۱۰- ہند حضرتِ سجادؑ کے حالات دریافت کرتی ہے۔

لونڈیاں تھیں زنِ حاکم کے جلو میں جو رواں
دیکھتی کیا ہیں کہ اک شخص ہی آہن میں نہاں
لاغر و خستہ تن و فاقہ کش و تشنہ دہاں
منہ پہ سیلی کے نشاں، پشت پہ درّوں کے نشاں

ساقِ پا فاقے سے زنجیر میں تھرّاتی ہے
استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے

سب نے مل کر طرفِ ہندیہ کی نوحہ گری
دیکھیے شام کے زنداں میں چراغِ سحری
کیوں مسلسل کیا، ہے یہ تو عدم کا سفری
یادِ حق کی ہے خبر، خلق سے ہے بیخبری

کس نے دم بند کیا طوقِ جفا سے اسکا
سلسلہ ملتا نہو شیرِ خدا سے اسکا

خشکیِ لب سے عیاں ہے کہ مہینوں کی ہی پیاس
تپ سے بیہوش ہی پر شکرِ خدا کا ہی حواس
نہ بچھونا ہے نہ تکیہ نہ عمامہ نہ لباس
سر کو زانو پہ جھکائے ہوئے بیٹھا ہی اُداس

لنگرِ طوق سے سیدھا نہیں ہو سکتا ہی
نہ تو سو سکتا ہے بیمار نہ رو سکتا ہے

سورۂ نور جو پڑھنا ہو تو چہرہ دیکھو
لیلۃ القدر ہے کاکل سے ہویدا، دیکھو
شجرِ طور کے بدلے قدِ زیبا دیکھو
یدِ بیضا کے عوض آبلۂ پا دیکھو

کیوں نہ یاں صلِّ علیٰ منہ سے ہمارے نکلے
صدقے ان پاؤں کے جن سے یہ ستارے نکلے

ہتکڑی میں ہی یہ پتلی سی کلائی روشن
یا ہلالِ شبِ اوّل کے ہے چوگرد گہن
دیکھنا بی بی گلے میں ہے یہ طوقِ آہن
یا کہ ہالے میں ہی خورشیدِ فلک جلوہ فگن

بی بی قربان ترے اس کی رہائی کر دے
ہاتھ ہم باندھتے ہیں عقدہ کشائی کر دے

ہند نے دیکھ کے رانڈوں کی طرف دی یہ صدا
خاک پر دُرِّ نجف ہائے پڑا ہے کس کا
کسکا یوسفؑ ہے یہ زنداں میں گرفتارِ بلا
کیسی بیقدر ہو تم، قدر نہیں اس کی ذرا

کام آخر ہوا، اک دم میں یہ دم توڑتا ہے
ایسے بیماروں کو تنہا بھی کوئی چھوڑتا ہے

گرد عابدؑ کے پھری پھر وہ بحالِ تغییر
رکھدیا پاؤں پہ سر اپنا اُٹھا کر زنجیر
بولے وہ کون؟ یہ چلائی کنیزِ شبیرؑ
السّلام اے رسن و طوق و سلاسل کے اسیر

ہے وصیت کا محل مرنے پہ تیار ہے تو
کچھ کفن کے لیے رکھتا ہے کہ نادار ہے تو

غم نہ کھا گور و کفن میں تجھے دونگی واللہ
ننگے سر تیرے جنازے کے چلونگی ہمراہ
مرنے والے ترا کیا نام ہے کیسا ہے تباہ
بولے مولا ابھی چالیس برس جینا ہے آہ

نام بیکس بھی ہے، قیدی بھی ہے، نادار بھی ہے
حال یہ ہے کہ اسیری بھی ہے، آزار بھی ہے

ہند نے پوچھا مرض کیا ہے، کہا بے پدری
رو کے وہ بولی دوا کیا ہے، کہا نوحہ گری
گھر جو دریافت کیا کہنے لگے دربدری
بولی لیتا ہے خبر کون، کہا بے خبری

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرمانے لگے
تازیانوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے

بولی وہ کونسے عصیاں پہ ملی یہ تعزیر
رو کے فرمایا گنہ کچھ بھی نہ تھا بے تقصیر

اُسنے منہ پیٹ لیا اور کہا ہو کب سے اسیر
بولے دسویں تھی محرّم کی جو پہنی زنجیر

کچھ کفن کے لیے ہمراہ نہیں لایا ہوں
باپ کو چھوڑ کے بیگور چلا آیا ہوں

سُنکے عابدؑ کے کلام اُسنے خوشامد سے کہا
صاف کعبہ کے فصیحوں کا ہے لہجہ بخدا
مل گیا حیدرِ کرّار کی باتوں کا مزا
اب چلو رانڈوں سے پوچھیں نہ انہیں دو ایذا

پاس بیووں کے جو وہ صاحبِ حشمت آئی
آلِ خاتونِ قیامت میں قیامت آئی

ہوش اُسکے گئے آتے ہی زنداں میں کبار
دیکھا کہ چراغِ سحری ہے کوئی بیمار
ہر چند اندھیرے میں نظر آنا ہے دشوار
پر اُسکے بدن کی ہیں رگیں صاف نمودار

لے سکتا ہی کروٹ نہ اُٹھا سکتا ہی سر کو
دم توڑتا ہی بند کیے دیدۂ تر کو

سوجے ہوئے پاؤں میں تو زنجیر ہی بھاری
شانوں کی رسن خون سے آلودہ ہے ساری
ناگاہ کنیز ایک قریب آکے پکاری
یوسفؑ میں جسے کہتی تھی وہ ہی یہی واری

اس سے خبرِ حضرتِ شبیرؑ بھی پوچھو
اور شوق سے پھر خواب کی تعبیر بھی پوچھو

ماتھے پہ دھرے ہاتھ جھکی ہند خوش ایماں
کہنے لگی مڑ کر طرفِ عابدِ ذیشاں
آداب بجا لاتی ہوں اے یوسفِ زنداں
حضرت نے کہا خیر ہی اے ششدر و حیراں

آداب مرا کیا کہ حقیر اور حزیں ہوں

ہوں سوگ نشیں کنبے کا اور خاک نشیں ہوں

یوسفؑ مجھے کسواسطے تو کہتی ہے مرہار
وہ مصر کے حاکم تھے میں ہوں یکس و ناچار

تب ہند یہ بولی قسمِ حیدرِ کرار
چہرے سے ترے جاہ و جلالت ہے نمودار

شوکت میں جلالت میں اسیری میں بلا میں
اس عہد کے یوسفؑ ہو تمہیں خلقِ خدا میں

نام آیا مصیبت کا تو عابدؑ ہوئے گریاں
فرمایا یہ درجہ تو ہی یوسفؑ سے فزاواں

گھر سے گئے یوسفؑ تو ہوئے مصر کے سلطاں
ہم نکلے وطن سے تو بھرا گھر ہوا ویراں

یوسفؑ نے زمانے میں یہ محشر نہیں دیکھا
ماں بہنوں کو بلوے میں کھلے سر نہیں دیکھا

یوسفؑ کا فقط باپ کی فرقت میں کڑھا دل
اور بعد جدائی کے ہوا وصل بھی حاصل

پر ہاتھ رکھے میرے جگر پر کوئی عادل
اٹھارہ عزیز آنکھوں کے آگے ہوئے بسمل

ہم گھر میں رہے اور سفر کر گئے بابا
ملنے کی بھی امید نہیں، مر گئے بابا

یوسفؑ نے لہو باپ کا منہ پر نہ ملا تھا
دل پیاس سے تن دھوپ سے کب انکا جلا تھا

یوں طوق میں اور رسّی میں اُن کا نہ گلا تھا
یعقوبؑ کا فرزند نہ کانٹوں پہ چلا تھا

درّے نہ لگے تھے تنِ یوسفؑ پہ جفا کے
یہ تو کہا اور رونے لگے پشت دکھا کے

آنکھوں کو ملا ہند نے دروں کے نشاں پر
پر کان کھڑے اُسکے ہوئے طرزِ بیاں پر

کی عرض، تصدق میں لبِ لعل فشاں پر
قربان فصیحانِ عرب تیری زباں پر

بالکل پسرِ فاطمہؑ زہرا کا بیاں ہے
گویا ترے منہ میں شہِ والا کی زباں ہے

تم فاطمہؑ کے پیارے کے پیارے تو نہیں ہو؟
مکّے کے مدینے کے ستارے تو نہیں ہو؟

ہی ہی کہو شہزادے ہمارے تو نہیں ہو؟
کیوں، بانوؑ کے تم راج دُلارے تو نہیں ہو؟

آنکھوں کے تلے پھرتی ہی سجادؑ کی صورت
تم ہو حسنِؑ پاک کے داماد کی صورت

۱۱- ہند زندانِ شام میں پہونچکر ایک ایک سے امام حسینؑ کے حالات اور اہلحرم کی کیفیت دریافت کرتی ہی۔ اُسکے اور اہلِ حرم کے سوال و جواب

دربانوں سے یہ کہہ کے ہوئی داخلِ زنداں
جس طرح خفی اور جلی معنیِ قرآں

یوں اُسکو اسیروں میں ملی زینبؑ نالاں
یا جیسے عیاں اور نہاں حکمتِ یزداں

گلدستۂ سادات میں پیدا بھی نہاں بھی
جسطرح سے بو پھولوں میں مخفی بھی عیاں بھی

دیکھا جو بغور اُن کو تو چلّائی وہ رو رو
زینبؑ مری آنکھوں کے تلے پھرتی ہی لوگو

یہ کون ہی زنداں میں؟ حذا خبر کرے لو!
جُھک کر کہا زینبؑ سے کہ مشتاق ہوں بولو

یہ عرش زمیں پر ہے کہ تم خاک نشیں ہو
سلمانؓ و ابوذر کی خوزادی تو نہیں ہو؟

ہمسائے کو ہمسایہ بہت ہوتا ہے پیارا
اب ہائے حسینا جو وظیفہ ہی تمہارا

یاں آپ ہیں زنداں میں، اُدھر گھر ہی ہمارا
یہ کون ہے تم لوگوں کا بتلاؤ حذارا

میں صاحبِ انصاف ہوں مجھ سے نہ ڈرو تم
چاہو تو مرے گھر میں قدم رنجہ کرو تم

آنکھوں پہ مرے، سر پہ مرے، پاؤں تمہارے
یہ بچے جو تھرا رہے ہیں خوف کے مارے

حاکم مرا سر تن سے اُتارے تو اُتارے
کس شمع کے یہ شعلے ہیں؟ کس برج کے تارے

دھڑکوں میں یہاں ننھا سا دل انکا پھٹے گا
شب خیر سے گذریگی تو کل دن نہ کٹے گا

وہ بولی کہ ہمسائگی شاہ و گدا کیا
شیروں کو اجل کھا گئی بچوں کی قضا کیا

جب غیر کے بس میں ہوئے ایذا کا گلا کیا
فرزند جواں مر گئے تو ہم نے کیا کیا

لے فرش کے قابل ہیں، نہ ایوان کے قابل
رہنے دے کہ ہم ہیں اسی زندان کے قابل

ان حالوں سے تو قصر میں لیجائے گی مجکو
کیا کہتی ہے، واللہ حیا آئے گی مجکو

مسند پہ کھلے بالوں سے بٹھلائے گی مجکو
مانے گا نہ جی لاکھ تو سمجھائے گی مجکو

یاں خاک اُڑاتی ہوں، وہاں ہات ملونگی
زندان میں تقدیر کو کیا چھوڑ چلونگی

شبیرؑ ہیں حلالِ مہمات کے پیارے
وارث نہیں کوئی، یہی وارث ہیں ہمارے

اُن کو نہ پکارے تو کوئی کسکو پکارے
بیووں کے وسیلے ہیں، یتیموں کے سہارے

یثرب کے سوا اور عزیز اُنکے کہاں ہیں
محکوم ہم اُنکے یہ امامِ دوجہاں ہیں

ہاں کہیے تو کس طرح ہے اُس شہر کا والی
شبیرؑ، امامِ دو جہاں سیدِ عالی
یا رب، کبھی زہراؑ کا بھرا گھر نہو خالی
آسودہ ہیں مولا کے اہالی و موالی ؟

آزار تو کوئی نہیں پہونچاتا ہے بی بی؟
اُنکے درِ دولت پہ ولید آتا ہے بی بی؟

اب کون اذاں دیتا ہی مسجد میں نبیؐ کی
یاں دھوم ہے ہمشکلِ رسولؐ عربی کی
بخشی ہی خدا نے اُسے آواز علیؑ کی
اللہ کو مقبول اذاں ہوگی اُسی کی

اکبرؑ پہ عجب لطفِ قدیرِ ازلی ہے
ہمشکلِ نبیؐ ہے تو ہم آوازِ علیؑ ہے

فرمائیے جاگیر کھُلی خیرِ نسا کی
آیا فدک اب ملک میں شاہِ شہدا کی
موقوف ہوئی فاقہ کشی آلِ عبا کی
ہمشیر تو اچھی ہی شہِ ارض و سما کی

شادی مرے آگے ہوئی تھی فضلِ خدا سے
اب نامِ خدا کتنے ہیں حیدرؑ کے نواسے؟

زینبؑ نے کہا یاد تو ہے حال یہ سارا
پر سُن تو خلاصہ کہ نہیں طول کا یارا
جب حج کے لیے قافلہ نکلا تھا ہمارا
تھا خیر سے بی بی اسدؑ اللہ کا پیارا

مجرائی بھی آسودہ تھے اور شاہِ زمن بھی
اُس روز تو بھائی بھی سلامت تھا بہن بھی

اُس سے تو یہ فرمایا پہ جی میں کہا رو کر
بھائی کا گلا کٹ گیا جیتی رہی خواہر!
اک دفعہ جھکیں لونڈیاں سجدے کو برابر
اور ہند سے کی عرض کہ آیا تمہیں باور؟

لو زیب دہِ تختِ امامت ہی خوزادہ

بی بی کو مبارک ہو سلامت ہی خوزادہ

خوش ہو کے وہ زینبؑ کے قریں اور بھی آئی
تم نے مرے مولا کی خبر مجکو سنائی
اور بولی کہ لو تم کو مبارک ہو رہائی
مرتی تھی میں ہولوں سے مری جان بچائی

نائب تمہیں اپنا پے سادات کرونگی
اور ساتھ میں کچھ ہدیہ و سوغات کرونگی

کل تم جو مع الخیر ہو یثرب کو روانا
پہلے مرے آقا ہی کی سرکار میں جانا
ایک ایک کو سب نذر کا اسباب دکھانا
منہ چوم کے اصغرؑ کو علی بند پہنانا

الفت ہی برابر مجھے ساداتِ عرب کی
لینا مری جانب سے بلائیں وہاں سب کی

نعلین پہ زینبؑ کے جھکا دیجیو سر کو
دینا مرا پیغام یہ اُس نیک سیر کو
لونڈی تمہیں یاد آئی، نہ زہراؑ کے پسر کو
تم سے یہ توقع نہ تھی مجھ خستہ جگر کو

لونڈی نے تمہیں واسطہ شبیرؑ کا لکھا
تم خط نہ لکھو، یہ مری تقدیر کا لکھا

گو نامہ و پیغام ہے دستور جہاں کا
مطلب تھا مگر اس میں یہ مجھ سوختہ جاں کا
ہوتا ہے معلوم تمہیں حال یہاں کا
بدخواہ زمانہ ہے شہنشاہِ زماں کا

ہر لحظہ بلا رد ہو حسینؑ ابن علیؑ کی
آقا کو مرے ضامنی اللہ و نبیؐ کی

کچھ سوچ کے پھر لونڈیوں کو وہاں سے ہٹایا
اور چپکے سے یہ دخترِ زہراؑ کو سنایا
زینبؑ سے یہ کہنا کہ بُرا وقت اب آیا
اللہ رکھے شیعوں پہ شبیرؑ کا سایا

کان اُسکے بھرے لوگوں نے سرور کی طرف سے
حاکم کو عداوت ہوئی زہرا کے خلف سے

مدت سے وہ تجویز میں ہے مکر و دغا کی
لکھتا ہی ولید اُس کو خبر شاہِ ہُدا کی
گو عاشقِ زار آپ ہیں شاہِ شہدا کی
پر تم کو میں دیتی ہوں قسم خیرِ نسا کی

مشتاقوں کے خط کوفے سے آئیں کہ یمن سے
جانے نہ کہیں دیجیو بھائی کو وطن سے

یہ ذکر تھا کہ ہند چلی آئی یک بیک
زخمِ جگر پہ بیووں کے چھڑکا گیا نمک
پہونچی درود پڑھتی ہوئی وہ حرم تلک
دیکھا زمیں پہ عرش کہیں، اور کہیں فلک

قدرت کے آفتاب چمکتے نظر پڑے
باغِ نبیؐ کے پھول مہکتے نظر پڑے

رو کر پکاری، سینہ فگارو مرا سلام
ماتم نشینو، تعزیہ دارو مرا سلام
زندان کی زمین کے تارو مرا سلام
اے خاکسارو، عرش وقارو مرا سلام

میں سُن رہی ہوں در پہ کھڑی سب کے بین کو
روتا تھا تم میں کون جنابِ حسینؑ کو؟

ہی کونسی وہ کوکھ جلی بے نصیب ماں
جو کہہ رہی تھی ہائے علی اکبرِ جواں
شرما کے اک دُلہن بھی تو کرتی تھی کچھ بیاں
یہ کون پوچھتا تھا کہ اصغرؑ گیا کہاں

تم اپنے پیاروں کے لیے بیچین ہوتے ہو
یا حضرتِ علیؑ کے عزیزوں کو روتے ہو؟

سب تو رہے خموش پہ زینبؑ نے یہ کہا
اے بی بی بیحواسوں سے تو پوچھتی ہے کیا
کب ہوش رونے پیٹنے میں رہتے ہیں بجا
کیا جانے ہم نے کیا کہا، اور تو نے کیا سنا

شبیرؑ کو، نہ اکبرؑ و اصغرؑ کو روتے ہیں
اے بی بی ہم تو اپنے مقدر کو روتے ہیں

کی عرض اُسنے دل ہے مرا اضطراب میں
مینے ابھی رسولؐ کو دیکھا ہے خواب میں
جلوہ ہے اُنکے نور کا بالکل جناب میں
کیا ہیں جناب آلِ رسالتمآب میں؟

زینبؑ ہو ٹھیک ٹھیک شکوہ وقار میں
دولت سرا حضور کا ہے کس دیار میں؟

زینبؑ پکاری خیر ہے زینبؑ بھلا کہاں
بلوے میں ہائے آلِ رسولؐ خدا کہاں
گھر اپنا قید خانہ ہے، دولت سرا کہاں
نادار ہیں، محل کہاں فرش و ردا کہاں

ہم چھوٹ گئے وطن سے، وطن ہمسے چھوٹ گیا
بھیا! غریب خانہ بھی غربت میں لُٹ گیا

سارے شرف دیئے ہمیں، قربانِ کبریا
ہمسایہ ہم کو صاحبِ معراج کا کیا
ہر صبح دیکھتے تھے رُخِ شاہِ انبیا
اب تو فلک نے خاک میں ہم کو ملا دیا

کب عادلوں کے دور میں ایسے حقیر تھے
شیرِ خداؑ کے عہد میں ہم بھی امیر تھے

جب ہم کو یاد اپنے گُل اندام آتے ہیں
مرتے نہیں پہ موت کے پیغام آتے ہیں
لب پر علیؑ کے لاڈلوں کے نام آتے ہیں
مشکل کے وقت سب کے یہی کام آتے ہیں

ہر وقت اِک چھری سی کلیجے پہ چلتی ہے

حیرت ہی جان کیوں نہیں تن سے نکلتی ہے

زینبؑ کی سرگذشت پہ پیٹی وہ اپنا سر
ان حادثوں میں مُنہ سے نکل آتا ہے جگر

کھائی قسم کہ صبر ہی بس ختم آپ پر
ایّوبؑ سے بھی صبر نہ ہوتا یہ، الحذر

اتنا سُنا ہی گھر پہ امامِ امم نہیں
ان قدموں کی قسم کہ مرے دم میں دم نہیں

گھر ہی بزیرِ سایۂ دیوارِ اہلبیتؑ
اتنا ہی کہدو، زندہ ہی سردارِ اہلبیتؑ

معلوم پھر تمہیں نہیں اخبارِ اہلبیتؑ!
شبیرؑ ابنِ فاطمہؑ، سالارِ اہلبیتؑ

شاہ نجف کے خرد و کلاں سب ہیں خیر سے
ہمشکل آپ کی مری زینبؑ ہیں خیر سے

پڑھتی ہوں کلمہ احمدِ ثانی کا ہر گھڑی
ہر لحظہ پیشِ چشم وہ تصویر ہے کھڑی

اکبرؑ ہے نام عمر بھی اکبرؑ کی ہو بڑی
اٹھارہویں برس کی گرہ اس برس پڑی

شہرت تو مُلک مُلک ہی اُنکے جمال کی
ٹھہری ہی بات بھی کہیں بانوؑ کے لال کی؟

اس بات پر تڑپ گئی بانوؑ نے خوشخصال
زینبؑ نے کی فغاں میں ہوئی پال کر نہاں

رو کر پکاری ہائے جوانمرگ میرے لال
بولی سکینہؑ دیکھ کے سب کا تباہ حال

یارب بخیر خاتمہ ہو اس بیان کا
کیوں اماں ذکر ہی یہ مرے بھائی جان کا

بانوؑ نے ہاتھ رکھدیا منہ پر کہ چُپ رہو
چلائی ہند بی بی تمہیں منہ سے کچھ کہو

عزّت کا ہی خیال تو خاموش دُکھ سنو
زہراؑ اسے حشر میں کہیں لونڈی خجل نہو

عابدؑ کی ماں ہو زوجۂ شاہِ دو کون ہو؟
صدقہ جوانیِ علی اکبرؑ کا کون ہو؟

دل کو سنبھال کر کہا زینبؑ نے آہ آہ
بدخواہ تو امام کی ہے یا کہ خیر خواہ
کیا مر گئے حسینؑ جو بانوؑ ہوئی تباہ
ہوتا ہے قیدیوں کہیں ناموسِ بادشاہ

ایسا غضب بھی ہونے لگا کیا زمانے میں
ہمصوتِ رسولؐ کی ماں قید خانے میں!!

فضہؑ کو بھی بتا کبھی دیکھا ہے ننگے سر؟
اس عہد میں رسولؐ کی ہو آل دربدر!
شرما کے پھر یہ کہنے لگی ہندِ خوش سیر
بی بی میں کیا کروں کہ پھٹا جاتا ہے جگر!

گذرا ہے کچھ تو فاطمہؑ کے نازنین پر
بارش لہو کی ہے کئی دن سے زمین پر

تم کہتی ہو کہ خیر سے ہے آلِ مصطفیٰؐ
اللہ اُن کی عمر کرے خضر سے سوا
آنکھوں پہ اس کنیز کے فرمانا آپ کا
قول آپ کا میں رد کروں، توبہ، مجال کیا!

میں کب یہ چاہتی ہوں زینبؑ کو چین ہو
بی بی! خدا یونہیں کرے زندہ حسینؑ ہو

میں جان و دل سے جانِ پیمبرؐ پہ ہوں فدا
لونڈی پہ آئے زینبؑ و کلثومؑ کی بلا
بدخواہِ ابنِ شیرِ خدا ہونگی میں بھلا؟
دنیا میں اُس گھڑی کو مجھے موت دے خدا

گو فالِ بد نکالنا منہ سے زبون ہے
پر کس طرح چھپے گا یہ سیّد کا خون ہے

قائل کریں حضور کہ پھر وجہ کیا ہوئی
کیوں ذوالفقار[1] قبضے سے شہ کے جدا ہوئی

[1] ہند لوٹ کے اسباب میں ذوالفقار جناب امامؑ اپنے گھر دیکھ آئی تھی، ۱۲

بیہوش بنتِ حضرتِ مشکل کشا ہوئی
اور پشتِ قید خانہ سے پیدا صدا ہوئی

اے ہند اہلبیتؑ سے شبیرؑ چھُٹ گیا
بچّہ مرا شہید ہوا کُنبہ لُٹ گیا

یہ نوحہ تھا جو ہند قریب آگئی ناگاہ
پہلو میں تڑپ کر یہ پکارا دلِ آگاہ

دیکھا کبھی زینبؑ کو کبھی سوئے سرِ شاہ
یہ بنتِ یداللہؑ ہی وہ ابنِ یداللہؑ

سر ننگے ہے یہ صاحبِ معراج کا کنبہ
یا ہے یہ کسی بیکس و محتاج کا کنبہ

پھر جوڑ کے ہاتوں کو یہ بولی وہ خوش اعمال
لونڈی ہی کوئی ساتھ کہ میں پوچھونگی احوال

کیوں اے شرفا زادیو تم سب تو ہو بیحال
رو کر کہا زینبؑ نے کہ اے صاحبِ اقبال

مقدور کہاں لونڈیوں کا ہم غربا ہیں
بدتر ہیں کنیزوں سے، فقیروں سے سوا ہیں

زینبؑ پہ نظر فضّہ نے کی سر کو پھرا کے
خود ہند سے فرمانے لگی سر کو جھکا کے

زینبؑ نے اُسے منع کیا آنکھ دکھا کے
محتاج ہوئے تھے کبھی سادات رِدا کے

کچھ خیر ہی بی بی تجھے لے نام خدا کا
شاہد ہی خدا کنبہ ہے شاہِ شہدا کا

حیرت سے وہ چلّائی کہ شاہِ شہدا کون؟
کچھ سوچ کے پوچھا کہ یہ ہی فاطمہؑ کا کون؟

یہ نام سُنا آج شہِ کرب و بلا کون؟
میں واری گئی آپ کی ہیں خیرِ نسا کون؟

بیٹی کوئی زہراؑ کی ہی ان میں کہ بہو ہے

بالکل کسی بی بی میں مری بی بی کی خو ہے

صاحب ابھی ہوش اتنا ہی مجھ بے سر و پا کو
بھولی ہوں نہ زینبؑ کو نہ میں خیر نساؑ کو
پہچانتی ہوں دختر حیدرؑ کی صدا کو
رکھ سکتا ہی پردے میں کوئی نور خدا کو

لونڈی ہی اُلش خوار نمک خوار نہیں کی
صورت یہ نہیں کی ہے یہ گفتار نہیں کی

زہراؑ کا گھرانا مجھے کیا بھول گیا ہی
تسلیم کو جانا مجھے کیا بھول گیا ہی
فرش اُن کا بچھانا مجھے کیا بھول گیا ہی
نعلین اُٹھانا مجھے کیا بھول گیا ہی

زہراؑ کی طرح خاص قدیر ازلی ہو
سو میں کہوں لاکھوں میں تمہیں بنت علیؑ ہو

زینبؑ نے فغاں کی کہ یہ اصرار غضب ہے
توبہ ہی زینبؑ کا لحاظ اور ادب ہے
سیدانی کے قابل یہ قلق ہی یہ تعب ہے
زینبؑ اگر آئی یہاں یہ قدرت رب ہے

اُن کی یہ لیاقت ہی کہ دربار میں آئیں
سر کھولے ہوئے شام کے بازار میں آئیں

زینبؑ ہے وہ زینبؑ کہ ہی تو جنکی نمکخوار
زینبؑ ہے وہ زینبؑ کہ بڑی جنکی ہی سرکار
اکبرؑ سا پسر قاسمؑ و عباسؑ جلو دار
زینبؑ وہ ہی جو مسند زہراؑ کی ہی مختار

میں پیاروں موئی کا ہیکو ہونے لگی زینبؑ
یہ کہتے ہی منہ پھیر کے رونے لگی زینبؑ

اُس دم سر شہ طشت میں تڑپا کئی باری
آنکھوں سے لہو منہ سے یہ کلمہ ہوا جاری
اے ہند یہی خواہر بیکس ہے ہماری
بڑھکر یہ پکاری میں اس آواز کے واری

ہی ہی پسرِ فاطمہؑ زہرا کا یہ سر ہے!
لونڈی کو نہ تھا علم کہ آقا کا یہ سر ہے!!

۱۲۔ حضرت سجادؑ اور حضرتِ زینبؑ اپنا حال بہت چھپاتی ہیں۔ مگر آخر ضبط نہیں ہوتا۔

یہ سنتے ہی غش آگیا زینبؑ کو قضارا
سجادؑ بھی تڑپے نہ رہا ضبط کا یارا
چلائے کہ خاموش ہو اے ہند خدارا
حاکم نے ترے حاکمِ کونین کو مارا

زہراؑ کو قلق تیرے بیٹے کا دیا ہے
شوہر نے ترے ماں کو مری بیوہ کیا ہے

ہی ہی کسے زینبؑ نہ نکلنے دے وطن سے
بھائی تو جدا ہو گیا مقتل میں بہن سے
یثرب بھی چھٹا گھر بھی چھٹا شاہِ زمن سے
سر کی بھی جدائی ہوئی بابا کے بدن سے

زینبؑ نہ وطن میں ہی نہ شبیرؑ وطن میں
سر ننگے یہ زنداں میں وہ بیکس ہی رن میں

پہلے سے نہ لکھ بھیجے یہ اخبار غضب کے
یثرب سے پدر نکلے مہینے میں رجب کے
شعبان میں مہماں تھے حرم کعبۂ رب کے
عاشور کو جنگل میں گلے کٹ گئے سب کے

عرصہ ہوا اے ہند شہادت کو پدر کی
چالیسواں بابا کا ہے بستم کو صفر کی

جسدم پیام ہند نے زینبؑ کو یہ دیا
پھر تو نہ ضبط دختر زہراؑ سے ہو سکا
آنکھوں سے خونِ دل کو بہا کر وہ بے ردا
بولی میں کس حسینؑ کو سنگام دوں ترا

بیٹا ہے جو کہ فاتحِ بدر و حنین کا
لایا ہے شمر کاٹ کے سر اُس حسینؑ کا

اے ہند باغِ فاطمہؑ زہرا خزاں ہوا
سجّادؑ ہے یہ بیڑیاں پہنے ہوئے پڑا

اکبرؑ بھی مر گیا علی اصغرؑ بھی مر گیا
ہے خواہرِ حسینؑ کو تیرا پیام کیا

بھائی کی لاش چھوڑ کے جنگل میں آئی ہوں
زینبؑ میں ہی وہ فاطمہؑ زہرا کی جائی ہوں

تو جانتی ہے شب کو ہوئی دفن فاطمہؑ
پرسا حسینؑ کا نہ کسی نے مجھے دیا

انبوہ میں پھری میں کھلے سر برہنہ پا
امت نے مصطفےٰؐ کی اُتاری مری ردا

ایذا دی ظالموں نے شہِ کائنات کو
باندھا رسن سے دخترِ زہراؑ کے ہات کو

۱۳- امام حسینؑ اور اہلِ حرم کے صحیح صحیح حالات معلوم ہو جانے پر ہند کی بیقراری۔
آہ و زاری اور بین جگر خراش۔

تب پہلوے زینبؑ میں وہ گر کر یہ پکاری
چلائی کنیزوں کو دمِ نالہ و زاری

ہے ہے مری مخدومۂ کونین کی پیاری
لو لُٹ گئی اب پانچویں سرکار ہماری

سر پیٹو، مرے بال پریشاں کرو لوگو
زینبؑ یہی نکلی، مجھے قرباں کرو لوگو

شانوں میں رسن، پاؤں میں زنجیر کو دیکھو
اس عصر میں سیدانی کی توقیر کو دیکھو

چھلتا ہے گلا طوقِ گلوگیر کو دیکھو
زندان کو اور خواہرِ شبیرؑ کو دیکھو

مجرا کرو، خاطر کرو، عزّت کرو لوگو
آؤ مری بی بی کی زیارت کرو لوگو

چلّائیں کنیزیں کہ سعادت ہی ہماری
سچ کہتی ہو بی بی - یہی بی بی ہیں تمہاری؟
کھاؤ تو قسم پنجتنؑ پاک کی واری
یہ حضرتِ زینبؑ ہے یداللہؑ کی پیاری

نانا کو اسی بی بی کے معراج ہوئی ہے
ہی ہی نہ کہو یہ تو کوئی پیاروں موئی ہے

بخشی تھی قطار اونٹوں کی حیدرؑ نے گدا کو
اس عہد میں بیٹی ہوئی محتاج ردا کو!
کیا بھول گئے لوگ پیمبرؐ کو خدا کو
پہچانیے خوب ان کی شباہت کو صدا کو

ہودج میں نہ محمل میں نہ ایوان میں دیکھا
کونین کی شہزادی کو زندان میں دیکھا!!

اُس دم سرِ شہ طشت میں تڑپا کئی باری
آنکھوں سے لہو، منہ سے یہ کلمہ ہوا جاری
اے ہندیہی خواہرِ بیکس ہے ہماری
بڑھ کر وہ پکاری، میں اس آواز کے واری

ہی ہی پسرِ فاطمہؑ زہرا کا یہ سر ہے!
لونڈی کو نہ تھا علم کہ آقا کا یہ سر ہے

حیران تھی میں کون شہِ کرب و بلا ہے
اب سمجھی لقب یہ مرے سیّد کو ملا ہے
ہی ہی مرے مولا تو ہی شاہِ شہدا ہے
مذبوحِ تغافل ہے، تو ہی مسلوبِ رضا ہے

آدابِ پیمبرؐ نہ کیا ہائے شقی نے
اس طشت کی خاطر تجھے پالا تھا نبیؐ نے

ایوبؑ ترے صبر و شکیبائی کے صدقے
یوسفؑ تری زیبائی و رعنائی کے صدقے
عیسیٰؑ مرے عیسیٰ کی مسیحائی کے صدقے
یحییٰؑ تری مظلومی و تنہائی کے صدقے

لونڈی تری اعجاز نمائی کے تصدق
کونین تری وعدہ وفائی کے تصدق

حضرت مرے گھر قتل کے میدان سے آئے
سر ننگے حرم کوفہ کے زندان سے آئے
لکھا تھا جو کچھ ویسے ہی سامان سے آئے
اے صادق الاقرار نئی شان سے آئے

یثرب میں چڑھے دوشِ رسولؐ دو جہاں پر
اس شہر کے کوچوں میں پھرے نوکِ سناں پر

آقا کہو لشکر کو کہاں چھوڑ کے آئے؟
قاسمؑ کو نہ لائے علی اکبرؑ کو نہ لائے
عباسؑ کے رخسارِ منور نہ دکھائے
اصغرؑ نہیں لونڈی کسے جھولے میں جھلائے

آواز یہ دی سر نے کہ تنہا نہیں ہم ہیں
سب پیاروں کے سر نیزوں کی نوکوں پہ علم ہیں

۱۴۔ حضرت سکینہؑ کی زندانِ شام میں وفات اور ماں کے دلخراش نالے۔

جب گل ہوا چراغِ حرم قیدِ شام میں
یعنی سکینہؑ مر گئی یادِ امام میں
دیکھے ستم یزید کے دربارِ عام میں
شہ کے سلام کو گئی دارالسلام میں

دنیا میں دادرس نہ ملا دادخواہ کو
جا کر نشاں طمانچوں کے دکھلائے شاہ کو

غل پڑ گیا حسینؑ کی عاشق نے کی قضا
بانوؑ نے نبض دیکھی تو پایا نہ دم ذرا

چلّائی صدقے جاؤں مجھے دے چلیں دغا
اپنی کہی نہ میری سُنی ہائے کیا کیا

اصغرؑ کو کچھ پیام بھی میں نے دیا نہیں
تم چل بسیں اور اماں نے رخصت کیا نہیں

بابا کی پیاری، اماں کی پیاری، زبانکو کھول
شربت میں لائی اے مری پیاسی ماں کو کھول
ماں رو رہی ہے، دیدۂ گوہر فشاں کو کھول
مہماں بندھے گلے سے نہ جا ریسماں کو کھول

دادی کرینگی بی بی کی زلفیں سنوار دوں
لو اُٹھو یہ پھٹا ہوا کُرتہ اُتار دوں

اصغرؑ کی بھولی باتیں سُناؤ نثار ماں
اکبرؑ کا ذکر کرکے رولاؤ نثار ماں
سیلی کا نیل ماں کو دکھاؤ نثار ماں
بابا کو جا کے در پہ بُلاؤ نثار ماں

ماتم کے غلغلے ہیں نہ رونے کے جوش ہیں
بی بی جو اب خموش ہیں تو سب خموش ہیں

منہ ڈھانپنے کا وقت ہے پچھلا پہر ہوا
بابا کو تیرے روتی ہوں اُٹھ ساتھ دے مرا
کُرتے سے منہ کو ڈھانپ کے پہلو میں بیٹھ جا
اماں کی بیٹی اماں کو آواز تو سُنا

ماتم سرا یہ گھر تھا ترے بین کرنے سے
زندان سونا ہو گیا بی بی کے مرنے سے

یاں کس کے پاس رہتیں شہِ کربلا نہیں
بی بی کے ناز اُٹھانے کی خاطر چچا نہیں
نادار ماں ہے پانی نہیں اور غذا نہیں
پر اب کفن کیواسطے ہے ردا نہیں

اماں کے پاس رہنے کی ایذا اُٹھا چکیں
بی بی طمانچے کھا چکیں گردن بندھا چکیں

جب خانۂ زنداں میں سکینہؑ نے قضا کی
روکر کہا بانوؑ نے کہ فریاد خدا کی

ولہ

دیکھا سرِ شبیرؑ کو اور جان فدا کی
کیا خوب مرے درد کی قسمت نے دوا کی

مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹی ہیں
زنداں میں اس لاڈلی دختر سے چھٹی ہیں

اسوقت نظر آتی ہے دنیا مجھے ویراں
سب لوگ کہیں بیٹی پہ مادر ہوئی قرباں

اب موت جو آجائے تو نکلے مرا ارماں
ہیں رن میں حسینؑ اکبرؑ و اصغرؑ کے نگہباں

فرزند تو ہیں شاہِ مدینہ کی برابر
بانوؑ کی بنے قبر سکینہؑ کی برابر

پھر بولی سکینہؑ کی وہ میت سے لپٹ کر
بانوؑ تو ہے محتاج کفن دے تمہیں کیونکر

ہے ہے یہ تری موت یہ ناداریِ مادر
نے غسل کو پانی ہے نہ تابوت میسر

پوچھے کوئی یہ درد اسیرونکے جگر سے
ہم رو نہیں سکتے ہیں تمہیں شمر کے ڈر سے

لو شمر گھر کتا ہے تمہیں اے مری پیاری
دربار میں پھر مجکو لیے جاتے ہیں ناری

اب ڈر کے لپٹتی نہیں چھاتی سے ہماری
تم باندھ کے ہاتوں کو سفارش کردو ناری

اصغرؑ کو میں اب روتی ہوں سمجھاؤ سکینہؑ
دربار میں بانوؑ کی عوض جاؤ سکینہؑ

اب ہم سے نہیں پوچھتیں کب آئینگے بابا
اب ماں سے نہیں کہتیں کہ دم گھٹتا ہے میرا

اب ذکر نہیں کرتیں کہ کب چھوٹینگے اعدا
اب یادِ وطن ہے نہ غمِ فرقتِ صغرا

اب کانوں کا دکھ درد سناتیں نہیں ہم کو

اب نیل طمانچوں کے دکھاتیں نہیں ہم کو

عباسؑ کی تم کو میں قسم دیتی ہوں پیاری!
لینا مری جانب سے بلائیں کئی باری

اصغرؑ سے ملاقات ہو جس وقت تمہاری
اور کہیو کہ دائی سے خطا کیا ہوئی واری

ظاہر میں اگر شکل کو دکھلا نہیں سکتے
کیا خواب میں بھی گھٹنوؤں تم آ نہیں سکتے

جب داغِ بیکسی نہ سکینہؑ اُٹھا سکی
کھائے طمانچے شمر کے جبتک کھا سکی

اور سوزِ دل نہ خوف کے مارے سُنا سکی
سِن کم تھا دُکھ بہت تھے نہ برداشت لا سکی

روئی تو ظالموں نے جفا بے شمار کی
آخر یہ جبر دیکھ کے موت اختیار کی

گر آہ کی تو شمر پکارا خموش ہو
گہ شدّتِ عطش میں پکاری کہ پانی دو

اور چُپ ہوئی تو بے پدری نے کہا کہ رو
گہ یاد کر کے رہ گئی بابا کی پیاس کو

سوئی جو آنسو پونچھ کے چشمِ پُر آب سے
ہے ہے حسینؑ کہہ کے وہ اُٹھ بیٹھی خواب سے

دل میں سما گیا تھا جو شمرِ لعیں کا ڈر
فریاد، چیختا ہے گہ شمرِ بد گہر

سوتے میں بھی پکارتی تھی چونک چونک کر
اماں بچاؤ درّہ لیے آتا ہے عمر

زینبؑ پھوپی دوہائی کلیجہ دھڑکتا ہے
سجادؑ بھائی دیکھو یہ خولی گھرکتا ہے

بے فرش سوتے سوتے جمی پیرہن میں گرد
رہنے لگا تڑپتے تڑپتے بدن میں درد

دل غم سے جلتے جلتے ہوا زندگی سے سرد
تھا فاقہ کرتے کرتے بدن خشک چہرہ زرد

چلا کے رونا شمر کی دہشت سے چھوٹ گیا
یاں تک گلا بند ہا کہ دم آخر کو گھوٹ گیا

جب پیاس لگتی روکے چچا کو پکارتی
دکھتے جو کان شاہِ ہدا کو پکارتی
آتا نہ جب کوئی تو خدا کو پکارتی
جینے سے تنگ آکے قضا کو پکارتی

کہتی تھی نے چچا نہ امامِ امم رہے
رُلوانے کو عدو رہے رونے کو ہم رہے

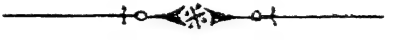

۱۵۔ اہلِ حرم کا قید سے چھوٹ کر حضرت سکینہؑ کی قبر پر رخصت کے واسطے آنا۔

جب قبرِ سکینہؑ پہ حرم آئے سوم کو
مرقد پہ گلِ لختِ جگر لائے سوم کو
یوں گردِ لحد بیٹھ کے چلائے سوم کو
سامانِ سوم بھی نہ ہوا ہائے سوم کو

نادم ہیں تری روح سے ہم آج سکینہؑ
اے سورۂ الحمد کی محتاج سکینہؑ

ہی ہی ترا حق ہم سے ادا ہو نہیں سکتا
اس قبر پہ سامانِ عزا ہو نہیں سکتا
نیت میں جو ہے شوقِ بکا ہو نہیں سکتا
کچھ فاتحہ خوانی کے سوا ہو نہیں سکتا

مظلومی کا مرنا ہے غریبی کا سوم ہے
ماں بہنیں تہیدست ہیں بی بی کا سوم ہے

اے فاطمہؑ کی پوتی شہ تشنہ کی جائی
کنبہ کی تری موت نے کی عقدہ کشائی
بازو بھی رسن سے کھلے اور لوٹ بھی پائی
ہاتھ آیا سرِ بادشہِ کرب و بلائی

حاکم نے دیا زیور و اسباب حرم کو
اک تم نہ ملیں اور تو سب کچھ ملا ہم کو

کس نحس گھڑی کان سے اُترے تھے یہ گوہر
پھر تم کو پہننا نہ ہوا ان کا میسّر
ہی ہی تمہیں کب لایا تھا زنداں میں مقدّر
جو مُردہ ہی زنداں سے نکلا ترا باہر

کُنبے سے چھُٹی جب، تو چھُٹی قیدِ محن سے
دم نکلا بدن سے تو گلا نکلا رسن سے

اس نوحہ سے بانوؑ کو رہی تاب نہ اصلا
بالین لحد گر پڑی اور بولی وہ دُکھیا
ماں آئی ہے آواز دے اے عاشقِ بابا
یہ تیسرا دن ہے کہ نہیں بی بی کو دیکھا

کچھ حال کہو اپنا کہ دل میرا حزیں ہے
صدقے گئی اب درد تو کانوں میں نہیں ہے؟

ہی پیشِ نظر بی بی کا ہر چیز پہ ہٹنا
وہ بلوے میں منہ پھیر کے کُرتے کا اُلٹنا
وہ شمر سے ڈرنا وہ گلے میرے لپٹنا
بڑھنا وہ غم و رنج کا اور عمر کا گھٹنا

مرنے تلک آواز یہ آیا کی دہن سے
فریاد کہ چھلتا ہے گلا میرا رسن سے

مجکو قسمِ مرگِ شبابِ علی اکبرؑ
دل کو تری فرقت میں تسلّی نہیں دم بھر
نیند آگئی بن ماں کے تمہیں قبر میں کیونکر
ہے ہے نہ سُلایا مجھے پہلو میں برابر

حضرت کی جُدائی کا بڑا رنج و قلق تھا
بابا ہی کا حق تم پہ تھا مادر کا نہ حق تھا

ہی ہی، کسے اب لیکے مدینہ کو میں جاؤں
ہی ہی، کسے اب ناقہ پہ پہلو میں بٹھاؤں

ہی ہی کسے اب جا کے میں صغرا سے ملاؤں
ہی ہی کسے اب سر شہِ والا کا دکھاؤں

سجادؑ کو صحت کی دعائیں نہیں دیتیں
واری! سرِ سرور کی بلائیں نہیں لیتیں

سر ننگے پھری ہائے غضب میں سرِ بازار
زنداں سے گئی بیڑیاں پہنے ہوئے دربار

استادہ رہی روبروے تختِ ستمگار
یہ حال مرا دیکھ کے تم ہو گئیں بیزار

دیکھے جو حقارت سے بندھے ہات ہمارے
غصے ہوئیں بی بی نہ رہیں سات ہمارے

لو میں ہی گنہگار سہی منہ سے تو بولو
جاتی ہوں مدینے کو بغلگیر تو ہو لو

پہلو میں مرے بیٹھ کے پھر باپ کو رو لو
ہے آخری دیدار مرا آنکھوں کو کھولو

کس طرح لحد میں تمھیں اب چین پڑا ہے
سب قافلہ لوٹا ہوا ملنے کو کھڑا ہے

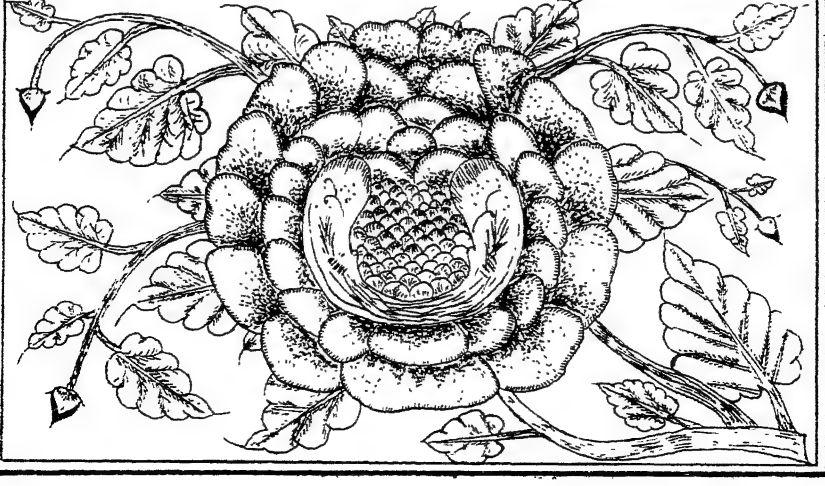

مناظرِ قدرت[1]

صبح کا سماں

بوے بہشت آتی تھی بادِ نسیم سے
گویا جہاں میں آئی تھی باغِ نعیم سے
عنبر کی بو خجل تھی گلوں کی شمیم سے
شبنم کے دُرِ خوش آب تھے دُرِ یتیم سے

ایسی ہوا موافقِ گلزار ہو گئی
جو تندرست نرگسِ بیمار ہو گئی

تازہ کیا نسیمِ سحر نے چمن کا رنگ
لالہ مٹا رہا تھا عقیقِ یمن کا رنگ
تھا یاسمن کے پھولوں میں دُرِّ عدن کا رنگ
غنچہ کی بو سے اُڑتا تھا مشکِ ختن کا رنگ

کھِل کھِل کے پھول نافوں کی صوت مہکتے تھے
ذکرِ خدا میں مرغِ خوش الحاں چہکتے تھے

[1] ہم نے بیان کیا ہے کہ مرزا صاحب کے کلام میں ہر رنگ کا جلوہ موجود ہے چنانچہ ہر عنوان کے متعلق ہم نے اُن کا صاف اور شستہ کلام انتخاب کیا ہے جیسا کہ میر انیس کا رنگ ہے۔ لیکن صبح وغیرہ مناظرِ قدرت کے بیان میں اُنھوں نے اپنے طرزِ خاص کو چھوڑ کر سلاست اور روانی پر توجہ نہیں کی۔ اسلیے ہمنے اُنکے طرزِ خاص کا کلام ہی منتخب کر لیا ہے تاکہ کوئی عنوان خالی نہ رہے۔

یہاں پر اسقدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ مناظرِ قدرت کا سماں دکھانے میں جیسے میر انیس کے کلام میں صاف۔ شستہ۔ اور مبیاختہ اشعار پائے جاتے ہیں، مرزا دبیر کے ہاں نہیں ملتے۔ اسلیے کہہ سکتے ہیں کہ مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنے میں میر انیس لاجواب شاعر ہیں۔ ۱۲

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے
اسپند مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیِ طورِ صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافورِ صبح نے

لیلائے شب کے حسن کی دولت جو لُٹ گئی
افشاں جبیں سے نجمِ درخشاں کی چھُٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح
سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا، پہنا کتانِ صبح
چرخِ چہارمی پہ گیا خطبہ خوانِ صبح

رخ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرمِ سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

آیا عروج پر شہِ گیتی ستانِ مہر
پرچم کُشا ہوا علمِ زرفشانِ مہر
لی روز نے پناہ بزیرِ نشانِ مہر
اور لشکرِ شعاع نے تانی سنانِ مہر

نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈالکر
مغرب میں پھینکی رات کی پُتلی نکالکر

ذرّوں میں نورِ مہر در آیا قمر قمر
لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
بڑھ کر نقیبِ نور پکارا سحر سحر
فرمان نجوم و بدر کو پہونچا بدر بدر

برقع جو اُٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبحِ ملمّع نقاب کا

خورشیدِ آسماں نے جو اُلٹا نقاب کو
بے نور کر دیا ورقِ ماہتاب کو
معدوم کر کے چشمِ خلائق سے خواب کو
دکھلا دیا سحر نے رخِ بے حجاب کو

پرتو پڑا جو روشنیِ آفتاب کا
دریا میں قمقمہ ہوا روشن حباب کا

جاروب لیکے خطِ شعاعی کی آفتاب
میداں کو جھاڑنے نکل آیا بصد شتاب
یعنی کہ ہوں میں خاکِ درِ ابنِ بوتراب
خدمت اس آستانِ مبارک کی ہے ثواب

از بس کہ روزِ قتلِ شہِ نامدار تھا
موجِ نسیمِ صبح کو بھی اضطرار تھا

ہنگامِ صبح عابدِ شب زندہ دار ماہ
چلنے لگا لپیٹ کے سجادۂ سیاہ
دن آیا مہر کی جو لیے ساتھ سجدہ گاہ
تسبیحِ اختراں ہوئی پنہاں دمِ پگاہ

بیٹھے ہوئے تھے سبطِ نبیؐ جا نماز پر
جھکتے تھے بار بار زمینِ نیاز پر

مرنے پہ مستعد تھے عزیزانِ باوقار
لکھا ہے رخ پہ رنگِ شہادت کی تھی بہار
ہاتوں میں سبحہ، مستعدِ ذکرِ کردگار
آتی تھی فاطمہؑ کی یہ آواز بار بار

اب روشنی تمام ہے ہر اک چراغ کی
یہ آخری بہار ہے زہراؑ کے باغ کی

خورشید نے برہم جو کیا دفترِ انجم
سالارِ قمر لے کے چلا لشکرِ انجم
ذرّوں کو تجلّی نے کیا ہمسرِ انجم
زائل صدفِ شب سے ہوئے گوہرِ انجم

انگشتریِ صبح کا خورشید نگیں تھا
کیا خوب نگیں تھا کہ جہاں زیرِ نگیں تھا

منشیِ سحر، مہر سے لیکر قلمِ زر
لکھنے لگا معزولی و منصوبیِ لشکر
فردِ سیہ شب کو کیا خارجِ دفتر
منصوب ہوا عاملِ روز اپنی جگہ پر

چہرہ نہ رہا دفترِ انجم میں کسی کا
پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا

اوراقِ فلک خطِ شعاعی سے محشّا
اطباقِ زمیں غیرتِ اوراقِ مطلّا
تھی سورۂ واللّیل کی تفسیر ہر اک جا
معنی جعل الشمسَ ضیاءً کے ہویدا

دنیا میں نہ ظلمت شبِ یلدا کی رہی تھی
پر ایک سیاہی رخِ اعدا کی رہی تھی

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب
خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب
تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب

آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھدی اُتار کے

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ بیضائے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

نکلا جو صید شب کو خدیوِ جہانِ صبح
ناوک شعاعِ مہر تھی، گردوں کمانِ صبح
سلطانِ شرق دوش پہ رکھے نشانِ صبح
شبدیز ابلقِ فلکی زیرِ رانِ صبح

عالم تھا محو، عالمِ نیّر فروز کا
تارِ شعاع، دام تھا عنقائے روز کا

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زُہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح
محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلّائے پیرِ صبح
پھر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح

کرتے تھے سب غروب کا سجدہ وہ دو کو
سیّارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

یوسفؑ غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا
یعنی غروب ماہِ تجلّی نشاں ہوا
یونسؑ دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع نیّرِ مشرق ستاں ہوا

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

سایہ جہاں جہاں تھا وہاں نور ہو گیا
پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینے سے دُور ہو گیا
باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامے میں

کیا روسفید فوجِ خدا ہے حضورِ صبح
آئی ہے اُنکے عقدِ عبادت میں حورِ صبح
رخ سے طلوعِ مہر، جبیں سے ظہورِ صبح
اک سمت اُن کا نور ہے، اک سمت نورِ صبح

سر سجدے میں، بدن ہیں قعود و قیام میں
کیا صبح کی بہار ہے فوجِ امام میں

پایا ہے روزگار نے انسے سراغِ صبح
خوشبو سے ان گلوں کی مہکتا ہے باغِ صبح
روشن ہے انکے نور سے ایسا دماغِ صبح
خورشید جھلملاتا ہے مثلِ چراغِ صبح

یہ حکمراں ہیں مشتری و ماہتاب پر
سکہ پڑا ہے اشرفیِ آفتاب پر

رات کا سماں

مغرب سے نمایاں ہوئی جسدم شبِ عاشور
کچھ صبحِ قیامت سے نہ تھی کم شبِ عاشور
دل خلق کا کرنے لگی برہم شبِ عاشور
زینبؑ کو ہوئی جامۂ ماتم شبِ عاشور

ظلمت کی ردا اسلیے ہر سمت پڑی تھی
سر کھولے ہوئے فاطمہؑ مقتل میں کھڑی تھی

جسوقت پڑا سکہ شبِ سیمِ قمر پر
پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر
قرمز کا خنجر جو چلا ترکِ سحر پر
بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر

کیواں علم۔ ایواں فلک۔ اور چاند نگیں تھا
آفاق سلیماں کی طرح زیرِ نگیں تھا

شب تھی کہ سیہ بختیِ کفار ہر اک سو
چشمِ سیہِ قہر تھی، یا ظلم کا گیسو

کجرو صفتِ نقشِ نگیں تھے جو وہ بدخو
آخر کو ہوئے شب کی سیاہی سے سیہ رو

روشن ہی سیہ کار وہ سب فوجِ جفا تھی
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

صد حیف کیا عدل زمانے نے فراموش
دریا تو دیا ظالموں کو بہرِ خورد و نوش

شبیرؑ کے اطفال تھے یاں پیاس سے بیہوش
دریائے رواں دامنِ شب سے ہوا روپوش

پیاسے تھے جو اطفالِ شہِ تشنہ گلو کے
تھی غم کی گرہ دل میں حبابِ لبِ جو کے

مشتاقِ نمازِ ابنِ علیؑ خیمے سے آیا
مہتاب نے سجادۂ مہتاب بچھایا (چاندنی ۱۲)

تسبیح ستاروں کی فلک نذر کو لایا
مولا نے بھی ایک ایک نمازی کو بلایا

فرمایا غنیمت ہی جو کچھ طاعتِ رب ہو
لاشے پہ نماز اپنے خدا جانیے کب ہو

وہ شب کا اندھیرا وہ بیابانکی سیاہی
گرمی کی وہ پیاس اور وہ پانی کی مناہی

آباد وہ گھر، اور وہ اکبار تباہی
یہ حادثہ اور آلِ نبیؐ، شانِ الٰہی!

گر فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے
پھر پیاس سے چونک اٹھتے تھے سوتے ہوئے بچے

سن سن کی صدا آتی تھی میدانِ بلا سے
غش ہوتے تھے اطفال رندوں کی صدا سے

اور خیمے میں بجھنا وہ چراغوں کا ہوا سے
پوچھے کوئی اس حادثہ کو آلِ عبا سے

اک ہاتھ سے ماں لیتی تھی اصغرؑ کی بلائیں
اک ہاتھ رکھے سینے پہ دیتی تھی دعائیں

گرمی کا سماں

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب
گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب
خطِ غبار سے ہے لپی ابریِ سحاب

چھالا ہی آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہی دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی
زنگت ہی برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی
حدّت ہی موج موج میں تیرِ شہاب کی

فوّارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ دست
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوزِ جگر سے مردمِ آبی ہیں نالہ کش
نوحہ ہی تین روز کے پیاسوں کا العطش

نزدیک ہی کہ زہد کو بے آبرو کریں
تردامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

اکثر منجموں نے لکھا ہے یہ ہمدگر
جس سال نامِ شہ پہ پڑا قرعۂ سفر
تھی اُس برس یہ شدّتِ گرما کہ الحذر
مثلِ چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر

جائے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمر زمینِ گرم تھی ذرّے سپند تھے

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخِ موج پہ مرغابیاں کباب
گلخن صدف تھے، دانۂ بریاں دُرِ خوش آب
آتش سے اپنی لعلِ بدخشاں تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانے کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورتِ عنقا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا

بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لبِ دریا
پر اوجِ امامت کا ہمارن میں ہے تنہا

کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس بڑی ہے

سرسام فلک کو ہوا ہے گرم ہوا سے
کافورِ قمر اُڑ گیا ہے دارِ شفا سے

شب ہو تو ملے شیر کو اک کفِ پا سے
گرمی یہ ہے اور عابدِ بیمار ہیں پیاسے

بالائے زمیں دھوپ کی زردی ہے عیاں ہے
گردوں کو ہے سرسام زمیں کو یرقاں ہے

مانند چنار آگ سے ہر نخل ہے روشن
اس دھوپ میں ہے خاک پہ سادات کا گلشن

خرمن کے لیے شعلہ ہے ہر دانۂ خرمن
ہفتاد و دو تن کشتہ ہیں اور زندہ ہے اک تن

چہروں پہ سپر روکے ستمگار کھڑے ہیں
اکبرؑ سپران کی تھے سو مقتول پڑے ہیں

لکھا ہے عجب فصل میں یثرب سے چلے شاہ
ان روزوں میں چلتا تھا مسافر نہ کوئی راہ

یہ دھوپ کی شدت تھی کہ العظمۃ للہ
پرواز سے تھا مرغِ تصور کو بھی اکراہ

لوں چلتی تھی ایسی کہ جلے جاتے تھے ذرّے

اسپند کی مانند نظر آتے تھے ذرّے

تپتی تھی زمیں آہنِ حدّاد کی مثال
شہبازِ نگہ کھول نہ سکتا تھا پر و بال
خرمن میں ہر اک دانہ سیہ تھا صفتِ خال
بے رنگِ شفق منہ فلکِ سبز کا تھا لال

اس فصل کی حدّت اگر آجائے بیاں میں
اغلب ہے کہ چھالے پڑیں خامے کی زباں میں

گیسو دکھا رہے تھے تباہی حواس کی — ولہ — کانٹے زباں کے تولتے تھے قدر پیاس کی
نبضیں چھٹیں شرر کی، سقر کانپنے لگے — ولہ — شعلے زباں نکال کے خود ہانپنے لگے
کیا دھوپ ہے کیا تابشِ خورشیدِ فلک ہی — ولہ — سایہ اسی گرمی سے سیہ آج تلک ہی
سایے کی تجسس میں بشر پھرتے ہیں ششدر — ولہ — سایہ پسِ دیوار و شجر بیٹھا ہے چھپ کر
سب لیتے پناہ اپنے ہی سایہ میں مقرّر — پر دھوپ نے سایہ ہی جلا ڈالا سراسر

ع - گرمی کی یہ حد تھی کہ ہوا ہانپ رہی تھی -

منظر

یعنی سین

اس کی تعریف ہم مؤلف کے الفاظ ہی میں بیان کیے دیتے ہیں۔ کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا جسکو انگریزی میں سین کہتے ہیں، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہی۔ عام واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہی کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہی، بخلاف اسکے سین اُس کیفیت کا نام ہی جو متعدد واقعات یا واقعہ کی متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہی۔ مثلاً اس شعر میں ؎

لُوں چلتی ہی خاک اُڑتی ہی، ہی ظہر کا ہنگام　　تنہا پہ چلی آتی ہی اُمڈی سپہِ شام

لوں کا چلنا، خاک کا اُڑنا، ظہر کا وقت ہونا۔ فوجوں کا اُمنڈنا۔ ہر چیز کو الگ الگ لیا جائے تو واقعہ ہی، اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سین ہی۔ اب ہم مرزا صاحب کے کلام سے چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مثال ۱۔ نزع کی حالت۔

حضرت علی اکبرؑ نزع کی حالت میں ہیں۔ امام حسینؑ انکے سرہانے موجود ہیں اُسوقت کی حالت

غیر حالت ہوئی اتنے میں علی اکبرؑ کی	اک نگہ یاس کی، سوئے پدر و مادر کی

منکا ڈہلنے لگا، اور تکیے سے گردن سرکی
سینے پر منہ سے انگوٹھی گری پیغمبرؐ کی

مُردنی چھاگئی رخسارۂ نورانی پر
موت کا آیا عرق چاندسی پیشانی پر

یٰسین پڑھ کے حمدِ الٰہی بیان کی
آسان موت کر گئے ہر نوجوان کی

ولہ

لو لگ گئی خدا سے پھری لو جو کان کی
بن بیاہے دوستوں پہ فدا اپنی جان کی

منکا خدا کی یاد میں تکیے پہ ڈھل گیا
تھرّا کے یا علیؑ کہا اور دم نکل گیا

حضرت عباسؑ کی حالتِ نزع

یہ کہتے تھے جو نزع کی حالت ہوئی طاری
تن کانپا۔ ہلیں اُنگلیاں بھی پاؤں کی ساری

گردن جو ڈہلی بھائی کو دیکھا کئی باری
اشک آنکھوں سے اور کلمہ زباں سے ہو جاری

جھپکی نہ پلک بھی کہ قضا کر گئے عباسؑ
آنکھیں سوے مولا رہیں اور مر گئے عباسؑ

یہ کہہ کے تبسم کیا پھر لب نہ ہلایا
آنکھوں کی سیاہی کو سفیدی نے چھپایا

سینے میں رُکی سانس، جبیں پر عرق آیا
منکا جو ڈہلا سر قدمِ شہ پہ جھکایا

غش ہو گئے شبیرؑ قضا کر گئے عباسؑ
تھرّا کے بدن رہ گیا اور مر گئے عباسؑ

حضرت اصغرؑ کی حالتِ نزع

کیا سِن تھا تیر کھاتے ہی بچہ بلک گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا

سوکھے گلے میں خون بھرا دم اٹک گیا
ٹوپی گری زمین پہ منکا ڈھلک گیا

ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے

جو نہیں معصوم کی گردن پہ لگا تیرِ جفا
منہ سے دودھ اور لہو ڈالکے تڑپا بچہ

ڈر گیا، سہم گیا، شہ کے گلے سے لپٹا
منہ پہ منہ رکھدیا شبیرؑ کے اور کچھ نہ کہا

نہ تو گردش ہوئی آنکھوں کو نہ منہ زرد ہوا
بازو اک بار ہلا ننھا سا اور سرد ہوا

پیاس کی شدت سے حضرت سکینہؑ کی بیہوشی اور نازک حالت کی تصویر

آگے جو بڑھے آپ نظر آئی قیامت
وہ پھول سی رنگت ہے نہ وہ چاند سی صورت

دیکھے نہ چچا کوئی بھتیجی کی یہ حالت
بند آنکھیں ہیں، یا سوتی ہے ماں باپ کی قسمت

قطرے عرقِ ضعف کے بالائے جبیں ہیں
بل کھائے ہوئے ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

مثال ۲-

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت

دو دو قدم پہ ہوتے ہیں لطفاں بجو اس
یوں قافلہ ہی گردِ علمدار حق شناس

اک پانی پانی کہتا ہی اور ایک پیاس پیاس
جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس

عباسؑ شانِ ساقیِ کوثر دکھاتے ہیں
اکدم میں ساری فوج کو پانی پلاتے ہیں

فرماتے ہیں حسینؑ غضب کی طپش ہے ہائے
کہتے ہیں خیر خواہ نہ وہ دن خدا دکھائے

کیا ہو جو ایسی دھوپ میں پانی نہ ہاتھ آئے!
مولا جواب دیتے ہیں اللہ ہی بچائے

پانی جو ہی تو منزلوں میں پیتے جاؤ گے
آتا ہے اک مقام کہ قطرہ نہ پاؤ گے

اب یوں کتب میں منزلِ آخر کا ہی بیاں
منزل دراز، رات سیہ، راہ بے نشاں

زہراؑ کا چاند اوّلِ شب کو ہوا رواں
جنگل مہیب، خارِ مغیلاں یہاں وہاں

تن غازیوں کے کانٹوں سے افگار ہو گئے
آلودہ خار سے گُلِ بے خار ہو گئے

سنبل صفت قبا ہوئی ہر گُل کی تار تار
زینبؑ، حسینؑ کے لیے ہو کے بیقرار

پلکوں کی طرح بھر گئے چشمِ زرہ میں خار
کہتی تھی، ڈھال روک لو مُنہ پر، بہن نثار

کانٹے غضب ہیں باگ اُٹھائے ہوئے چلو
اکبرؑ کو بھی سپر میں چھپائے ہوئے چلو

مثال ۳

صغیر السن بچہ نزع کی حالت میں

بانوؑ کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے
بچے کی نبض دیکھ کے ماں بیحواس ہے
نے دودھ ہے، نہ پانی کے ملنے کی آس ہے
پھرتی ہے آس پاس پہ جینے سے یاس ہے

کہتی ہے، کیا کروں میں، دُہائی حسینؑ کی
پُتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی

فریاد یا علیؑ میں کدھر جاؤں یا علیؑ
ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علیؑ
کس طرح انکے سانس کو بہلاؤں یا علیؑ
پانی کا قحط ہے میں کہاں پاؤں یا علیؑ

پچھلے کو آنکھ کھولی تھی، اب کھولتے نہیں
روتے نہیں، ہمکتے نہیں، بولتے نہیں

اب کس کی بامراد بڑھاؤنگی ہنسلیاں
ہے ہے کرخت ہوگئیں یہ نرم انگلیاں
تیور بدل بدل کے پھراتے ہیں پُتلیاں
لے لیکے اُلٹے سانس گراتے ہیں بجلیاں

باقی حواس پیاس سے معصوم کے نہیں
منہ میں انگوٹھے لیتے ہیں اور چوستے نہیں

رونا نہ جانتے تھے سدا مسکراتے تھے
پھیلا کے ہاتھ، گود میں یہ سب کی آتے تھے
گود سے میری جھولے میں جب لیٹ جاتے تھے
جاتی تھی میں جدھر یہ اُدھر منہ پھراتے تھے

کسکی نظر لگی، کہ میں نظروں سے گر گئی
وہ چاہ پیار اب نہ رہا، آنکھ پھر گئی

ہر دم سکینہؑ سامنے بھائی کے آتی ہے
ہاتوں میں لیکے اُنکے کھلونے دکھاتی ہے

سہلا کے ننھے تلوے یہ وکر سناتی ہے
من جاؤ بھائی جان سکینہ مناتی ہے

کہتی ہیں اماں، آنکھ بھی تم کھولتے نہیں
اللہ، ہم پکارتے ہیں بولتے نہیں

غصے سے آنکھ بند ہے، یا تشنگی سے آہ
خالق کی تم پہ مہر، علیؑ کی تمہیں پناہ
بے آپ کے پیا نہیں پانی، خدا گواہ
صدقے گئی، پھر اور ہوا مجھ سے کیا گناہ

تیروں سے مشک چھد گئی مجھ بیکس کی
پیاسی بہن سے لیلو قسم اپنی پیاس کی

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم
پھیلا رہے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دمبدم
چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم

قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانوؑ کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو
لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو
نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو

اکبرؑ کی لاش لے گئے ہیں قتلگاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہونگے راہ میں

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

سن سن کے یہ تھے سبطِ نبیؐ اشک بہاتے
اس مردے کو حضرت کبھی چھاتی سے لگاتے
گہ دودھ بھری باچھوں پہ لب اپنے جھکاتے
ڈھلکی ہوئی گردن کبھی ہاتھوں سے اٹھاتے

لو پھر گئی تھی کان کی، منکا بھی ڈھلا تھا

الفت سے مگر مُنہ سوئے شاہِ شہدا تھا

جب بند ہوئیں نرگسی آنکھیں بھی قضارا
مقتل کی طرف دیکھ کے حضرت نے پکارا

موقوف ہوا باپ کے چہرہ کا نظارا
لو اے علی اکبرؑ، علی اصغرؑ بھی سدھارا

گردن میں وہ چھوٹے سے تو ہاتھ اُسکے پڑے تھے
شہ گود میں مُردہ لیے حیران کھڑے تھے

پہونچا کے لاشِ اکبرؑ عالی وقار کو
ہچکی لگی تھی پیاس سے اُس گلعذار کو

لائے حسینؑ ہاتوں پہ اک شیرخوار کو
مُنہ کھولے دیکھتا تھا شہِ نامدار کو

ہلتے تھے ہونٹ بات سمجھ میں نہ آتی تھی
تالو لپک رہا تھا، زباں اینٹھی جاتی تھی

سن وہ کہ رحم کھائے ہر اک گبر اور یہود
ہونٹوں سے، رنگ غنچۂ سوسن کا تھا نمود

وہ منہ گلاب سا کہ پڑیں جسپہ سب درود
اور گورے گورے ہاتوں کی تھیں سب رگیں کبود

گھبرا کے سانس لیتے تھے آنکھیں بھر آتے تھے
یہ ضعف تھا انگوٹھے بھی چوسے نہ جاتے تھے

مثال ۴-

فوجوں کی آمد اور جنگ کی طیاری

تھا لشکرِ شاہِ شہدا میں تو یہ ساماں
پتھر پہ رگڑتا تھا کوئی خنجرِ براں

آمادۂ پیکار تھی واں فوجِ بدایماں
خوش ہو کے بجھاتا تھا کوئی زہر میں پکاں

گھیرے ہوئے دریا کو وہ سب فوجِ جفا تھی
تیاریِ قتلِ پسرِ شیرِ خدا تھی

للکار کے کہتے تھے وہ ظالم کہ ہے کیا دیر
کہتا تھا کوئی لشکرِ شبیرؑ کو لو گھیر
گو پیاس سے بیتاب ہیں اور جینے سے ہیں سیر
پر آئے نہ دریا کے کنارے پہ کوئی شیر

پانی خلفِ ساقیِ کوثر کو نہ دینا
اکبرؑ کا تو کیا ذکر ہے اصغرؑ کو نہ دینا

تھی نوفلِ ملعوں کی یہ ایک ایک سے گفتار
کاٹونگا میں ہی شانۂ عباسؑ علمدار
ازرق نے کہا مجھ سا نہیں کوئی ستمگار
حلقوم پہ قاسمؑ کے چلیگی مری تلوار

تڑپے گا یہاں لاشۂ نوشاہ کفن کو
گھونگٹ میں دلہن روئیگی فرزندِ حسنؑ کو

اور شمرِ ستمگار کی تھی سب سے یہ تقریر
تم سب سے زیادہ مجھے ہاتھ آئیگی جاگیر
خونِ شہِ بیکس کی ہے پیاسی مری شمشیر
یہ خنجرِ خونخوار ہے اور گردنِ شبیرؑ

دل آتشِ اندوہ سے حیدرؑ کا جلے گا
خنجر مرا زہراؑ کے کلیجے پہ چلے گا

ولہ

ناگہ عمر کے قصد پہ قرنانے کی فغاں
بیداد کی گواہی کو ہر سو اٹھے نشاں
چلائے ہاتھ مل کے جلا جل کہ الاماں!
نقارے سینے پیٹتے آگے ہوئے رواں

دی بوق نے ندا کہ دمِ شور و شین ہے
زہراؑ سے کہدو نوبتِ قتلِ حسینؑ ہے

خیمے میں دخترانِ علیؑ ہول کھاتی تھیں
پردہ اُٹھا کے وارثوں کو دیکھ جاتی تھیں
بہرِ دعا مصلّے برابر بچھاتی تھیں
گہ عالمِ ہراس میں زیور بڑھاتی تھیں

باجوں کے غل سے بچّوں کو دہشت جو ہوتی تھی
اصغرؑ کے دل پہ ہات رکھے بانوؑ روتی تھی

زینبؑ زمیں پہ لوٹ کے کرتی تھی یہ کلام
ہے ہے بچے گا کاہے کو بھائی مرا امام
فوجوں کا یاں سے تا درِ کوفہ ہے ازدحام
قاصد بلاؤ، نامہ لکھو، اور یہ دو پیام

گھیرا ہے سب نے فاطمہؑ کے نورِ عین کو
آؤ مدینے والو، بچالو حسینؑ کو

دیتی تھی یہ ندا کبھی، اماں دُہائی ہے
بی بی! ترے قمر پہ گھٹا غم کی چھائی ہے
کہتی تھی گاہ، نرغے میں زینبؑ کا بھائی ہے
بابا مدد کرو کہ بلا سر پہ آئی ہے

گاہے پکارتی تھی رسالت مآب کو
نانا گہن لگا ہے ترے آفتاب کو

مثال ۵۔

سفر کی طیاری

خط کوفہ سے آئے جو امامِ مدنی کو
پیغامِ اجل تھے وہ شہنشاہِ غنی کو
منظور کیا شہ نے غمِ بے وطنی کو
ناکامی و مظلومی و تشنہ دہنی کو

کہتے تھے مبارک ہمیں ایسا یہ سفر ہو
شاہِ شہدا، فاطمہؑ زہرا کا پسر ہو

اس کوچ میں اللہ بنائے مرے سب کام
انجامِ سفر بخشش امت کا ہو انجام
جمعیتِ دل کا ہو سبب گردشِ ایام
یوں گھر کو لٹاؤں کہ رہے حشر تلک نام

حاصل ہو وہ رتبہ جو کسی کو نہ ملا ہو
مرنے پہ لقب خلق میں شاہِ شہدا ہو

حسرت تھی کہ پہلوئے نبیؐ قبر کی جا ہو
اب دفن بھی ہوں یا کہ نہوں دیکھیے کیا ہو
قسمت میں یہ لکھا ہے کہ جب اپنی قضا ہو
سر دفن جدا ہو، تو بدن دفن جدا ہو

کھینچونگا پس از قتل بھی ایذائے سفر کو
بالائے سناں ہوئیگی گردش مرے سر کو

پھر خط لیے داخل ہوئے گھر میں شہِ ذیجاہ
مضمون سے اُسکے کیا ایک ایک کو آگاہ
فرمایا کہ درپیش ہے کوفہ کی مجھے راہ
آب و خورش اُٹھا ہے مدینے سے مرا آہ

آئینگے زیارت کو بشر چار طرف کے
اک شہر بساؤنگا میں نزدیک نجف کے

پھر زینبِ بیکس کو یہ رو رو کے پکارے
کیا کیا نہیں اس بھائی پہ احسان تمھارے
اب ساتھ چلو رونے کو لاشے پہ ہمارے
اسباب کے صندوق فراہم کرو سارے

ہم پر تو نہیں تازہ مصیبت یہ پڑی ہے
پر ساتھ ہے بچوں کا یہ تشویش بڑی ہے

بانوؑ سے یہ فرمایا کہ اے بانوئے خوشذات
اولاد نہ پیاری ہو تو تم میرے چلو سات
اکبر اسیر اور تمھیں ہونا ہے مہمات
شیریں سے بھی ہوئیگی اسیری میں ملاقات

سوغات میں کچھ اور تو کیا دیگی وہ تم کو

ہاں دیکھ کے سر ننگے ردا دے گی وہ تم کو

پھر جھولے میں صغرؑ سے کہا اے مرے ناداں
رکھوا دو کسی اونٹ پہ جھولے کو مری جاں

تم اپنے سفر کا نہیں کچھ کرتے ہو ساماں
ماں باپ کے گھر میں چھ مہینے کے ہو مہماں

گہوارے میں لیٹے ہوئے کیا ہنستے ہو گھر میں
اب چوسیو تم چل کے انگوٹھوں کو سفر میں

حضرت سے کہا مادرِ عباسؑ نے اُس دم
جیسے گئے اب، ویسے گئے بعدِ محرم

واری گئی گر قصد ہے کوفے کا مصمم
دیکھو تو میں واری کہ ہے کیا گرمی کا عالم

رخصت کرو قاسمؑ کو نہ ہمشکلِ نبیؐ کو
صدقے گئی تم بھیجدو عباسؑ علیؑ کو

امِ سلمہؑ بھی یہی رو رو کے پکاری
ضربت سرِ حیدرؑ پہ لگی تھی وہیں کاری

کوفے میں تو جانا ہی مناسب نہیں واری
آخر وہی کوفہ ہے وہی خلق ہے ساری

بن جائیگا سب کام یہیں حق کی مدد سے
صدقے گئی تم جاؤ نہ نانا کی لحد سے

امِ سلمہؑ سے یہ کہا شاہ نے رو کر
پر آپ کو معلوم یہ ہوئیگا مقرر

مانوں بسر و چشم کہا آپ کا مادر
محضر پہ مرے خون کے ہے مُہرِ پیمبرؐ

ابتک تو دعا دیتا تھا بیٹھا ہوا گھر میں
اب جاتا ہوں بخشانے کو امت کے سفر میں

یہ کہہ کے برآمد ہوئے گھر سے شہِ ابرار
تھرائے رواقِ نبوی کے در و دیوار

نقارہ بجا کوچ کا شبیرؑ کے اکبار
غل تھا کہ چلا لختِ دلِ حیدرِ کرار

زہراؑ و پیمبرؐ نے تو دنیا سے قضا کی
نوبت ہے یہ اب خاتمۂ آلِ عبا کی

رخصت کے لیے آتے تھے سب شہر کے سکّاں
پروانہ صفت ہوتے تھے شبّیرؑ پہ قرباں
سب پنجۂ فرقت سے کیے چاک گریباں
فرماتے تھے شہ دیکھ کے ماتم کا وہ ساماں

اُس دن بھی یونہیں روئینگے سب رنج و محن میں
جب لُٹکے مرا قافلہ آئے گا وطن میں

پھر ہمسفروں سے یہ کہا شہ نے بتکرار
میں جبر کسی دوست پہ کرتا نہیں زنہار
دشمن کی بھی ایذا کا نہیں میں تو روادار
جو چاہے چلے ساتھ جو چاہے کرے انکار

اکبرؑ کو مرے، لطفِ جوانی نہ ملے گا
یارو یہ سفر وہ ہے کہ پانی نہ ملے گا

وہ ساتھ چلے میرے جسے ہونا ہو برباد
بن بیٹوں کے ہو جائینگے واں صاحبِ اولاد
وہ ساتھ چلے میرے جو جنگل میں ہو آباد
وہ قصد کرے جسکو وطن کی نہ رہے یاد

محتاج ہوں بیکس ہوں نہ دولت ہے نہ زر ہے
اے دوستو تسلیم و رضا کا یہ سفر ہے

دنیا کا جو خواہاں ہو کرے ہم سے کنارا
عقبیٰ کا جو طالب ہو وہ دے ساتھ ہمارا
وہ آئے جسے رنج و مصیبت ہو گوارا
اب ایسی شہادت نہیں ملنے کی دوبارا

اس راہ سے نزدیک بہت باغِ ارم ہے
ہر ایک قدم باغِ جناں زیرِ قدم ہے

بعضوں نے تو یہ سُنکے کنارا کیا ہیہات
جو مرد تھے ابنِ شہِ مرداں کے چلے سات

منزل کو روانہ ہوئے سب اشترِ سادات
مرکب پہ ہوا جلوہ نما سیدِ خوشذات

دیکھا نظرِ یاس سے پھر روضۂ جد کو
اور دُور سے مجرا کیا نانا کی لحد کو

ناگہ دراز چرخ نے دستِ جفا کیا
شیرازۂ ریاضِ رسالت کو وا کیا
زیر و زبر مخمسِ آلِ عبا کیا
یعنی گھر اہلبیتؑ کا ماتم سرا کیا

غیر از حسینؑ سب سوئے دار البقا گئے
شبیرؑ بھی بلا و مصیبت میں آ گئے

جس دم وطن سے بیوطنِ آلِ عبا ہوئے
اور مبتلا بلا میں شہِ کربلا ہوئے
گویا یہ سوئے مرقدِ خیر الوریٰ ہوئے
لے قبر تجھ سے تیرے مجاور جدا ہوئے

ہر منزل و مقام پہ غازی ملول تھے
گرمی تھی، لو تھی، اور پیمبرؐ کے پھول تھے

اک روز چین سے نہ مدینے میں رہنے پائے
گرمی میں ننھے بچے لیے کربلا میں آئے
عاشور کو تو ظلم نئے چرخ نے دکھائے
نو لاکھ نے یورش کیا ستر دو تن پہ ہائے

پیاسوں کی روحیں تن سے تڑپ کر نکلتی تھیں
تیغیں گلوں پہ، برچھیاں سینوں پہ چلتی تھیں

وہ گرد وہ غبار، وہ شاہِ فلک جناب
وہ فوج کا گہن، وہ پیمبرؐ کا آفتاب
وہ صرصرِ خزاں، وہ چراغِ ابوتراب
وہ دھوپ، اور وہ تیغوں کا سایہ، وہ قحطِ آب

کاکل جوانؑ کی گرد سے آلودہ ہوتی تھی

رو رو کے روح فاطمہؑ اشکوں سے دھوتی تھی

مطلع

اے مومنو حسینؑ سے مقتل قریب ہے
شہرِ مدینہ دُور ہے جنگل قریب ہے
آخر ہے عمر منزلِ اوّل قریب ہے
زہراؑ کا چاند چھپتا ہے بادل قریب ہے

لینے کیواسطے ملک الموت آتے ہیں
شبیرؑ اپنے پاؤں سے مقتل کو جاتے ہیں

اتنے میں صبحِ منزلِ آخر عیاں ہوئی
لیکن یہ صبح سبطِ نبیؐ کو کہاں ہوئی
جس جا سواری رُک کے نہ آگے رواں ہوئی
حیراں سپاہِ خسروِ کون و مکاں ہوئی

چھ گھوڑے بدلے دوشِ نبیؐ کے سوار نے
لیکن قدم بڑھایا نہ اک راہوار نے

وہ رخش جس سے ہوش صبا کے اُڑا کریں
گر اک اشارہ خامسِ آلِ عبا کریں
طے راہِ شش جہت کو وہ شش بادپا کریں
پڑ جائیں بیڑیاں جو قضا کی تو کیا کریں

حیرت سے گھوڑے توسنِ تصویر بن گئے
نعلوں کے حلقے پاؤں کی زنجیر بن گئے

عباسؑ کو پکارے نہ آگے قدم بڑھاؤ
منزل یہی ہے، چھاونی پردیسیوں کی چھاؤ
ہمشکلِ مصطفےٰؐ کو ندا دی بڑھے نہ جاؤ
بیٹا قناتیں گھیرو، سراچے بھی سب لگاؤ

غرّے کو تو ہوا ہے ہمارا سفر تمام
دسویں کو ہوگا فاطمہؑ زہراؑ کا گھر تمام

نقّارہ نوبتی نے بجایا مقام کا
یعنی یہاں سے کوچ ہے دارالسلام کا
خیمہ بپا ہوا جو شہِ خاص و عام کا
بھیجا فلک نے دُور سے تحفہ سلام کا

کھولا یہ پردہ خیمۂ شہ نے جہان پر
اک عرش ہی زمین پر اک آسمان پر

مثال ۶-

گرمی اور گرمی کی شدت میں زن و مرد اور بچوں کی حالت

کعبے سے جب عراق کو فوجِ خدا چلی
شبیرؑ کی رکاب میں خیر النساؑ چلی
آلِ رسولؐ پاک سوئے کربلا چلی
مقتل سے پیشوائی کی خاطر قضا چلی

خورشید کی تپش سے مسافر ملول تھے
جنگل کی لُو تھی اور پیمبرؐ کے پھول تھے

اس فصل میں تباہ نبیؐ کا سفینہ تھا
کن آفتوں میں حکمتِ حق کا خزینہ تھا
آوارہ کوہ و دشت میں شاہِ مدینہ تھا
عابدؑ کو تپ تھی، زرد جمالِ سکینہؑ تھا

اصغرؑ کا حال گرمی سے تغیر ہوتا تھا
اور خشک شیر بانوئے شبیرؑ ہوتا تھا

تھا فرطِ محبت سے یہ عباسؑ کا احوال
گھبرا کے ہلاتے تھے کبھی شاہ کو رومال
تھے پہلوے حضرت میں بہت مضطرب الحال
سایہ کے لیے منہ پہ کبھی روکتے تھے ڈھال

رو کر کبھی کہتے مرے آقا کو بچانا
اس دھوپ سے یارب گلِ زہراؑ کو بچانا

شدت عطش سے خیمہ میں بچوں کی حالت

اور خیمہ میں تھا غلغلہ تشنہ دہانی
سب واعطشا کہتے تھے با اشک فشانی
پانی کے نہ ملنے سے جگر ہوتا تھا پانی
بے جان ہوئے جاتے تھے شبیرؑ کے جانی

سیدانیوں کے نازونکے پالے ہوئے بچے
تھے غش میں زبان منہ سے نکالے ہوئے بچے

اک سمت کو بیہوش تھا عباسؑ کا دلبر
اک جاتی تڑپتی شہِ مظلوم کی دختر
تھا غش میں کہیں باقرِ معصوم زمیں پر
دم توڑتا تھا ایک طرف جھولے میں اصغرؑ

پیاسوں کی فغاں سنکے جو پاس آتے تھے شبیرؑ
دیکھا جو نہ جاتا تھا تو پھر جاتے تھے شبیرؑ

غش پیاس سے دوبار سکینہؑ کو جب آیا
گھبرا کے علمدار کو میداں سے بلایا
وہ آئے تو لب خشک دکھا کر یہ سنایا
فریاد چچا پیاس نے ہے مجکو ستایا

سچ کہیے مجھے آپکے کہنے کا یقیں ہے
میں پیاسی ہوں کچھ تم کو قلق ہے کہ نہیں ہے

سب کنبہ میں مشہور تمہاری ہو نہیں پیاری
پر حیف ہے گر تم بھی خبر لو نہ ہماری
ماں باپ کی کہلا کے میں دکھ درد کی ماری
بن باپ کے بچونکی طرح کرتی ہوں زاری

شبیرؑ پدر جسکا ہو اور تم سا چچا ہو
افسوس وہ بچپن میں گرفتارِ بلا ہو

میدان کربلا کی ہولناکی کا سین

بیتابی و بیخوابی و ناکامی و ایذا،
وہ شدتِ غم اور وہ کفار کا بلوا،

کالی تو وہ شب، اور خطرناک وہ صحرا
وہ بولنا شیروں کا وہ بچوں کا دہلنا

مثال ۷۔

لڑائی کی طیاری

کہتا ہی تول کر کوئی شمشیرِ آبدار
اے تو سہی کہ چھیں لیں میدانِ کارزار
کہتا ہے کوئی بڑھ کے یہ اکبرؑ سے بار بار
کب تک کریں امام کے آنے کا انتظار

مثلِ امام آپ بھی مالک ہمارے ہیں
مشتاقِ اذن تابعِ فرماں تمھارے ہیں

کہتا ہی کوئی چوم کے عباسؑ کے قدم
مصروف ہیں جو شاہ عبادت میں کیا ہی غم
رن کی طرف حضور بڑھیں لیکے اب علم
دیکھیں تو آپ کرتے ہیں کیا کام آج ہم

لاکھوں کا ایک حملے میں منہ پھیر دیتے ہیں
کس طرح انسے طبل و علم چھین لیتے ہیں

اک نے کہا یہ بڑھ کے مناسب تو ہے حضور
بڑھیے تو اک قدم کہ گھٹے فوج کا غرور
کہتا ہی ہاتھ جوڑ کے یہ کوئی ذی شعور
کافی ہے حکم آپ کا بڑھنا نہیں ضرور

حضرت کا نام لیکے جو حملہ کرے غلام
مُردوں سے رن تو روحوں سے دوزخ بھرے غلام

زیرِ علم عزیزوں کے گلدستہ کی بہار
طوبیٰ کے سایہ میں چمنِ خلد آشکار
بو باس وہ کہ عطرِ جناں جسپہ ہو نثار
دل کھل رہے ہیں شوقِ شہادت سے غنچہ وار

کوئی تھا سبز پوش، کوئی سرخ پوش تھا
مرنے کی آرزو تھی، شجاعت کا جوش تھا

عباسؑ جھومتے تھے لیے دوش پر علم
اکبرؑ نگاہ کرتے تھے خیمے پہ دمبدم
قاسمؑ یہ کہہ رہے تھے کہ آلیں شہِ امم
پہلے سبھوں سے آج رضا رن کی لینگے ہم

مسلمؑ کے لال کہتے تھے فرصت نہ دینگے ہم
اس فوج سے قصاصِ پدر آج لینگے ہم

اور اک طرف کو حضرتِ زینبؑ کے لال فام
قہر و غضب سے کرتے تھے آپس میں یہ کلام
دیکھیں کہاں تلک یہ غرورِ سپاہِ شام
ہوئینگے کب محل سے برآمد شہِ انام

باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی، تیغیں سنبھال لو
جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو

سب نوعروسِ شوقِ شہادت سے ہمکنار
دنیا سے بیخبر، رہِ عقبیٰ سے ہوشیار
حوروں کا اشتیاق، شہادت کا انتظار
گہہ مدحِ پنجتنؑ، تو کبھی ذکرِ کردگار

تسبیح کا یہ ورد تھا اُن کی صفات میں
سر رشتۂ عبادتِ خالق ہی ہات میں

کہتا تھا کوئی ذوقِ شہادت میں جھوم کر
اپنے تو ہات میں ہی کفِ دست کی سپر
میداں میں اسپہ روکیں گے ہم خنجر و تبر
ہاتوں کے بعد ہونگے سپر سینہ و جگر

مظلوم کے رفیق ہیں غربت سے کام ہے
جرات سے کام کیا ہی شہادت سے کام ہے

بولا کوئی دلیر یہ گردن ہلا ہلا
ہوش و حواس چاہیے لڑنے میں ہو بجا

تیر - وکمان - وترکش - وتیغ وسپر ہی کیا
یہ قصد ہے جو ہو مددِ شاہِ لافتا

ہم تو سلاحِ جنگ نہ تن پر سنوارینگے
تیغیں اُنھیں کی چھینیں گے اور اُنکو مارینگے

کہتا تھا تیغ تول کے اک صاحبِ یقیں
کہتے تھے دل بڑھانے کو انصاً شاہِ دیں

یہ فوج شام کی نہیں یا آج ہم نہیں
مردوں کی بس یہ بات ہی واللہ آفریں

نیت تو ہی بخیر اب انجام نیک ہو
پھر موت زندگی ہی اگر نام نیک ہو

عمّامہ رکھّے ہاتوں پہ کرتا تھا اک دُعا
یہ صبر دے کہ لب نہ کریں پیاس کا گِلا

یا رب! تصدّق آلِ پیمبرؐ کی پیاس کا
ہمّت وہ بخش سر شہِ دیں پر کریں فدا

ہم ہوں رکابِ شاہ ہو جنّت کی سیر ہو
دنیا بخیر ہو چکی عُقبےٰ بخیر ہو

بولا کوئی حق اپنی طرف ہی تو کیا ہے غم
گر ہو گئے شہید ہوئے داخلِ ارم

یہ فوج ہی یہ تیغ ہی یہ رن ہے اور ہم
زندہ رہے تو یاورِ شاہنشہِ امم

لپٹے ہیں دامنِ شہِ عالی نہاد سے
دامن بھرے ہوئے ہیں ہمارے مراد سے

بڑھ کر کیا نقیب نے یہ فوج سے خطاب
جسکا جہاں مقام ہو حاضر ہو واں شتاب

ہشیار غازیو کہ برآمد ہوئے جناب
سُم ذوالجناح کے کوئی چومے کوئی رکاب

صحبت ہی مغتنم یہ شہِ مشرقین کی

اب روزِ حشر ہوگے جلو میں حسینؑ کی

صف بستہ اس طرح تھے جوانانِ سرخ فام
سبحہ میں جیسے دانے برابر رہیں تمام

یوں تھے رجوع شاہ کی جانب وہ نیکنام
دانوں کی بازگشت ہو جیسے سوئے امام

ذکرِ خدا سے عشق تھا اور حق کے نام سے
تھا کام اُن کو اوّل و آخر امام سے

مثال ۸-

بیکسی اور تنہائی

جب کربلا میں دفترِ ایماں اُلٹ گیا
یعنی جنابِ فاطمہؑ کا باغ کٹ گیا

سینہ بصورتِ ورقِ صبح پھٹ گیا
اک دم کی زندگی سے بھی دل شہ کا ہٹ گیا

خاموش ہے وہ مصحفِ ناطق کھڑا ہوا
اور خاک پر ہر ایک ورق ہے پڑا ہوا

بے سایہ دھوپ میں ہے شہنشاہ بحر و بر
سایہ شجر کا دور تک آتا نہیں نظر

ہے ریت مثلِ اخگرِ سوزاں زمین پر
تالاب اور جھیل پہ بیٹھے ہیں جانور

زہراؑ کے آفتاب پہ آفت کا وقت ہے
خورشیدِ شرعِ دیں پہ قیامت کا وقت ہے

ہیں تشنگی کے صدمے سے شبیرؑ بے قرار
سوکھی زباں پھیرتے ہیں ہونٹوں پہ بار بار

زخمِ بدن سے چھوٹ رہی ہے لہو کی دھار
کہتا ہے مڑ کے جانبِ قبلہ وہ ذی وقار

جو رنج تیری راہ میں ہو مجھکو چین ہے

تو خالقِ قدیر ہے بندہ حسینؑ ہے

اب کوئی دم کا خلق میں مہمان ہے حسینؑ
کاٹے گا شمر سر کو تو آئے گا مجکو چین
لیکن یہ عرض کرتا ہوں تجھ سے بشورِ شین
جب قتل ہوئے فاطمہؑ زہرا کا نورِ عین

اُمّت کو بخشنا نبیِ خافقین کی
اور کیجیو قبول شہادت حسینؑ کی

مطلع ثانی

برہم جو رن میں دفترِ فوجِ خدا ہوا
اور بیکسی میں فردِ امامِ ھدا ہوا
نورِ نگہ جدا ہوا، بازو جدا ہوا
شش ماہہ تک بھی راہِ خدا میں فدا ہوا

تدبیر فوج میں ہوئی قتلِ امام کی
پیاسے پہ دوپہر میں گھٹا چھائی شام کی

مانندِ آفتاب ہے یہ آشکار آہ
وہ فصلِ حار اور وہ نصف النہار آہ
لوٹی خزاں نے باغِ نبیؐ کی بہار آہ
بے کس ہوا امامِ غریب الدیار آہ

پیاسوں کے سوکھے حلق پہ تلواریں چل گئیں
روحیں تڑپ تڑپ کے بدن سے نکل گئیں

بیجاں ہوئے جو رن میں مددگارِ پنجتنؑ
کوثر پہ تشنہ لب گئے انصارِ پنجتنؑ
تاراج دفعتاً ہوا گلزارِ پنجتنؑ
اک دوپہر میں لُٹ گئی سرکارِ پنجتنؑ

تدبیر فوج میں ہوئی قتلِ امام کی
پیاسے پہ دوپہر میں گھٹا چھائی شام کی

وہ پیاس کا عروج وہ خورشید کا زوال
بے چتر و سایہ دھوپ میں تھا نورِ ذوالجلال
سینے میں داغ پیاروں کے دل کو غم و ملال
خالق سے عرض کرتے تھے یوں شاہِ خوشخصال

ابنِ بتولؑ، سبطِ رسالت پناہ ہوں
یارب گواہ رہیو کہ میں بے گناہ ہوں

واقف ہی تو کہ تارکِ دنیا ہوں اے کریم
مہماں ہوں اور نہر پہ پیاسا ہوں اے کریم

بچپن سے بہرِ ذبح مہیا ہوں اے کریم
قاتل ہیں چار لاکھ میں تنہا ہوں اے کریم

شوقِ وصال میں مرا دل سب سے سیر ہے
میں مستعد ہوں وقتِ شہادت میں دیر ہے

سب فوج قتل ہو گئی اک میں جیا تو کیا
پہلے تو پانی بند کیا اب دیا تو کیا

اب ظالموں نے رحم بھی مجھ پر کیا تو کیا
کُنبہ ترس کے مر گیا میں نے پیا تو کیا

بیچارگی کے وقت تو ہی چارہ ساز ہی
بندہ نیازمند ہے تو بے نیاز ہی

سب نورِ چشم سامنے آنکھوں کے مر گئے
قاسمؑ کو ماں پکار رہی ہی کدھر گئے

عباسؑ خاتمہ مرے لشکر کا کر گئے
اکبرؑ بھی نامراد جہاں سے گذر گئے

شش ماہہ سو رہا ہی مرا قتل گاہ میں
اچھی کمائی تھی کہ لُٹی تیری راہ میں

اکبرؑ کا سینہ نیزۂ کیں سے ہوا فگار
بازو کٹا کے مر گئے عباسؑ نامدار

بے شیر کے گلے سے ہوا تیرِ ظلم پار
پامال سبزہ ساں ہوا شبرؑ کا گلعذار

مہمان ہو کے رنج ہی کھایا حسینؑ نے
پانی نہ ماں کے مہر کا پایا حسینؑ نے

در پیش اب قیامتِ کبرا ہے الاماں
نرغے میں ابنِ فاطمہؑ زہرا ہے الاماں
سیراب ہیں وہ لوگ یہ پیاسا ہی الاماں
قاتل ہیں چار لاکھ یہ تنہا ہے الاماں

سب کے گلے کٹے، نہ پسر نے سپاہ ہے
باقی فقط رسولؐ کی اک بوسہ گاہ ہے

مطلع

گہوارۂ اجل میں جب اصغرؑ بھی سو چکا
اور باپ اُسکے ننھے سے لاشے پہ رو چکا
شہ بولے سب کا خاتمہ بالخیر ہو چکا
اکبرؑ کو کھو چکا علی اصغرؑ کو کھو چکا

صف بستہ کسکے قتل پہ اب اہلِ شام ہیں
اب جنگ بھی تمام ہے، ہم بھی تمام ہیں

مجھ سے ارادہ جنگ کا ہی دُور از قیاس
انساں لڑے تو اُس سے کہ جسمیں ہو کچھ حواس
اب فوج پاس ہے نہ علمدار میرے پاس
اسکے علاوہ بھوک ہی اور تین دن کی پیاس

فرزند کوئی قتل حضورِ نظر نہ ہو
وہ بے خبر ہوں سر جو کٹے، کچھ خبر نہ ہو

اب کس لیے فراتؑ کو گھیرے ہے یہ سپاہ
عباسؑ کو سکینہؑ نے کیا مشک دی ہی آہ
اب نہر علقمہ کی عبث روکتے ہیں راہ
سقّہ مرا تو قتل ہوا پیاسا، بے گناہ

کیوں تیغیں تیز کرتے ہیں شرم و حیا نہیں
کہدو کہ اب ادھر کوئی پیاسا رہا نہیں

قائل ہو تم بھی دل میں کہ ہیں بے قصور ہوں
روشن ہے سب پہ چشمِ پیمبرؐ کا نور ہوں
جو رنج ہے وہ کہہ نہیں سکتا، غیور ہوں
اسکا تو پاس کرتے کہ شرب سے دُور ہوں

پانی بھی بند، ظلم و جفا کا وفور بھی

آخر مرا گناہ بھی، کوئی قصور بھی

دریا کو تم نے چھین لیا، میں نے کچھ کہا
پانی دکھا دکھا کے پیا میں نے کچھ کہا
داغ اکبرؑ جواں کا دیا میں نے کچھ کہا
اب بے زباں کو قتل کیا میں نے کچھ کہا

صابر ہوں، بردبار ہوں میں کینہ ور نہیں
یارو مرے مزاج میں واللہ شر نہیں

سب متفق ستانے پہ اس بے خطا کے ہیں
آیا نہیں ہم آیۂ محکم خدا کے ہیں
جانے دو یہ بھی بندے تو ربِّ ہدا کے ہیں
جا روب کش تو روضۂ خیر الورا کے ہیں

ڈرتے ہو قہرِ حق سے نہ آہِ بتولؑ سے
اللہ! ایسے پھر گئے آلِ رسولؐ سے

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیرؑ
غیرِ اصغرؑ نہ رہا نورِ نگاہِ شبیرؑ
تھی فقط روحِ علیؑ پشت و پناہِ شبیرؑ
حق سے کہتے تھے کہ تو ہو گواہِ شبیرؑ

سر فدا کر کے شریکِ شہدا ہوتا ہوں
آج میں تیری امانت سے ادا ہوتا ہوں

ظہر تک سب رفقا شاہ کے مقتول ہوئے
تھے وہ مقبولِ خدا اور بھی مقبول ہوئے
یک قلم صرفِ خزاں فاطمہؑ کے پھول ہوئے
رو بقبلہ شہِ دیں شکر میں مشغول ہوئے

رو کے کہتے تھے کہ اکبرؑ نہیں عباسؑ نہیں
اب امانت کوئی خالق کی مرے پاس نہیں

اب نہ قاسمؑ مرا جیتا ہے نہ اکبرؑ باقی
نہ علمدار سلامت ہے نہ لشکر باقی

بھانجے ہیں نہ بھتیجے نہ برادر باقی
اب فقط سر مرا باقی ہے اور اصغر باقی

قتل اصغر ہو، مرا سر بھی جدا ہو جائے
اس امانت سے بھی شبیر ادا ہو جائے

یا خدا تجھ پہ میں صدقے مرا لشکر بھی نثار
دل فدا۔ جان فدا۔ روح فدا۔ سر بھی نثار
علی اکبر بھی نثار۔ اور علی اصغر بھی نثار
تجھ پہ باقر بھی فدا۔ عابدِ مضطر بھی نثار

میں نے جو کچھ ترے دربار سے پایا مولا
سب تری راہ میں خوش ہو کے لٹایا مولا

وہ کلیجے پہ دھرے ہاتھ پڑے ہیں اکبر
ہے وہ عباس دلاور وہ حسن کا دلبر
ایک اک پیارے کو قربان کیا گن گن کر
کی امانت میں خیانت نہ ذرا اے داور

تو نے دولت جو تھی مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت ترے بندے نے زمیں کو سونپی

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے بارِ خدا
ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطرِ عاشقِ جانباز ہے البتہ جدا
اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

درِ دنداں مرے نانا نے تجھے نذر دیا
لے گئیں نذر کو پہلوئے شکستہ زہرا
سر خرو ہے ترے دربار میں بابا میرا
دل کے ٹکڑے مرے بھائی نے کیے تجھ پہ فدا

آج شبیر بھی اُن سب کے مقابل ہو جائے
سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہو جائے

بندہ پرور! میں ہوں اک عبدِ غریب و احقر
بیکس و بے وطن و بے پدر و بے مادر
منزلِ ملکِ عدم میں تو مرا ہو رہبر
نہ تو اس راہ سے آگاہ، نہ منزل کی خبر

شوق بھی، رعب بھی مجکو تری درگاہ کا ہے
سامنا بندۂ ناچیز کو اللہ کا ہے

تین دن تڑپا ہی یاں پیاس کی شدت سے حسینؑ
اب ہو سیراب ترے قلزمِ رحمت سے حسینؑ
ڈر نہ جائے ملک الموت کی ہیبت سے حسینؑ
یا خدا کانپتا ہی قبر کی وحشت سے حسینؑ

آجتک ساتھ رہا بیٹے کا اور بھائی کا
سخت اندیشہ ہے اب قبر کی تنہائی کا

یاں تو یہ عاشق و معشوق میں ہوتے تھے کلام
ہائے اصغرؑ کا ہوا شور جو مابین خیام
ہوئی تشویش لگے دیکھنے ڈر ڈر کے امام
دیکھا سر پیٹ کے چلاتی ہے بانوؑ ناکام

ساتھ یہ ننھا مسافر بھی مرا چھوڑتا ہے
آؤ صاحب، مرا بچہ یہاں دم توڑتا ہے

جھومتے گھوڑے پہ شبیرؑ چلے خون میں تر
کبھی جھکتے تھے ادھر اور کبھی جھکتے تھے اُدھر
پہونچے دروازے پہ خیمے کے تو ٹھہرے سرور
تھام لے کون عناں، گھوڑے سے اُتریں کیونکر

شاہ یہ پیاسے تھے زینبؑ کو پکارا نہ گیا
بیٹھ کر گھوڑے سے راکب کو اُتارا نہ گیا

آیا دروازے پہ ناموسِ امامِ خوش خو
ہاتوں ہاتھ ابنِ یداللہؑ کو اُتارا رو رو
لیگئی جھولے پہ ہاتھ اُن کا پکڑ کر بانوؑ
حالِ اصغرؑ کا دکھا کر کہا، آقا دیکھو

مٹھیاں باندھنا آنکھوں کا بدلنا دیکھو

سانس اوکھڑی ہوئی اور منکے کا ڈھلنا دیکھو

جب اصغرِ بے شیر گئے نہر لبن کو
اور لوٹ چکی موت پیمبرؐ کے چمن کو
تعجیلِ شہادت کی ہوئی شاہِ زمن کو
کوئی نہ رہا، رو چکے ہفتاد و دو تن کو

سرکار کی رونق تھی، نہ دربار تھا باقی
لٹنے کو حرم مرنے کو سردار تھا باقی

فرماتے تھے ہاتوں پہ لیے لاشۂ اصغرؑ
مقبول ہو یا بارِ خدا ہدیۂ احقر
کس منہ سے ترا شکر کروں اے مرے داور
تو نے مرے اصغرؑ کو دیا رتبۂ اکبرؑ

جان اس نے مرے شیعوں کے بچوں پہ فدا کی
شش ماہے پہ بالکل ہے یہ تائید خدا کی

لشکر دیا کنبہ دیا گھر بھی دیا تو نے
سردار بھی تو نے کیا سر بھی دیا تو نے
ہمشکلِ پیمبرؐ سا پسر بھی دیا تو نے
یہ حوصلہ یہ دل یہ جگر بھی دیا تو نے

کیا فخر جو پیاروں کو رہِ حق میں دیا ہے
تیری ہی عنایت کو فدا تجھ پہ کیا ہے

مجھ میں تھی یہ قدرت کہ بھرے گھر کو لٹا دوں
بازو ہو جدا ہات نہ امت پہ اٹھاؤں
واں قتل ہو اکبرؑ، ادھر اصغرؑ کو میں لادوں
تڑپے یہ مرے ہاتوں پہ میں لب نہ ہلاؤں

یوں خوش کوئی ہنگامِ تباہی نہیں ہوتا
بندے سے یہ بے فضلِ الٰہی نہیں ہوتا

نادار ہوں میں حال مرا تجھ پہ ہے حالی
دربار ہے برتر، تری سرکار ہے عالی

دامن مرا خالی ہے مرے ہاتھ ہیں خالی
اب شرم ترے ہاتھ ہے اے خلق کے والی

کانپیں جو قدم ہاتھ پکڑ لیجیو میرا
ہدیہ کے لیے ہاتھ میں سر دیجیو میرا

اُمت نے بھلایا ہے مجھے، تو نہ بھلانا
تو پاک ہے دنیا سے مجھے پاک اُٹھانا
سب چھوڑ کے تنہا، ہوئے منزل کو روانا
یا بارِ خدا قبر کی وحشت سے بچانا

جب گورِ غریباں کا اندھیرا نظر آئے
ہر سمت کو جلوہ مجھے تیرا نظر آئے

نے گھر کی مجھے یاد ہے نے حبِ وطن ہے
ہر خار تری منزلِ الفت کا چمن ہے
نے قبر کی ہے فکر نہ پروائے کفن ہے
محتاج تری خلعتِ رحمت کا بدن ہے

مرضی ہو تو بے نام و نشاں ہو کے مروں میں
عابدؔ کو بھی باقرؔ کو بھی قربان کروں میں

یارب! مجھے راحت ہے، نہ زخموں کو شفا ہو
جو عضو ہیں بے درد اُنہیں درد عطا ہو
رگ رگ سے رواں خون ہو، ہر بند جدا ہو
جو آرزوئے دل ہے وہ پامالِ فنا ہو

مظلومی کے مرنے میں بہت اجر و جزا ہے
پانی نہ ملے تیغ کے نیچے تو مزا ہے

ایوبؔ نے دیکھے جو قلم زوجہ کے گیسو
کیسا وہ پریشان ہوئے جانتا ہے تو
جب گیسوئے سادات کھلیں اور بندھیں بازو
زندہ ہوں کہ مُردہ نہ مجھے غم ہو سرِ مو

ذلت کا مجھے رنج نہ عزت کی خوشی ہے
ہر حال میں بس تیری اطاعت کی خوشی ہے

گن لے یہی سب فوجِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے
یہ اکبرؑ و اصغرؑ ہیں، وہ عباسؑ جری ہے
کچھ میں نے امانت میں خیانت نہیں کی ہے
تنہائی میں دل تیری حمایت سے قوی ہے

قاسمؑ نہ محمدؑ نہ مرا عونؑ تھا یارب
یہ سب ترے بندے تھے مرا کون تھا یارب

غربت کا داغ یوسفِ کنعاں سے پوچھیے
لشکر کے قتل ہونے کو سلطاں سے پوچھیے
سامانِ یاس بے سر و ساماں سے پوچھیے
یہ سب ملال شاہِ شہیداں سے پوچھیے

غربت کا خاتمہ ہے شہِ مشرقین پر
مظلومیت برستی ہے نامِ حسینؑ پر

سب پر عیاں ہے بے سر و سامانیِ حسینؑ
فاقے میں آبِ تیغ، یہ مہمانیِ حسینؑ
وہ مرگِ اقربا وہ پریشانیِ حسینؑ
وہ روزنِ خدنگ وہ پیشانیِ حسینؑ

رونے کی جا ہے حال شہِ مشرقین کا
ستّر دو تن کا داغ اور اک دل حسینؑ کا

نکلے تھے کس گھڑی کہ وطن پھر نہ جانے پائے
فرزندِ نوجواں کی نہ شادی رچانے پائے
صغرؑا تھی منتظر نہ اُسے بھی بلانے پائے
دولہ بنانا کیسا نہ تربت بنانے پائے

ایسا کسی نبی کا نواسا نہیں ہوا
مہمان ذبح نہر پہ پیاسا نہیں ہوا

گرتی تھی لاش لاش پہ کس کس کا داغ اٹھائیں
بیٹی کی لیں خبر کہ بہن کو گلے لگائیں
میداں سے لاشے لائیں کہ پُرسے کو گھر میں جائیں
اکبرؑ کے غم میں روئیں کہ اصغرؑ کو رو نہیں لائیں

جسپر تباہی ایسی پڑے آہ کیا کرے
صابر حسینؑ سا ہو تو شکرِ خدا کرے

مثال ۹-

فوج کا داخلہ اور طیاری جنگ

ناگاہ اُٹھے خوابِ ضلالت سے ستمگار
چونکا عمرِ سعد کہ فتنہ ہوا بیدار
سرداروں کو بلوا کے پکارا یہ جفاکار
درپیش ہے شیرانِ عرب سے مجھے پیکار

نو لاکھ کو ایک ایک سے کب تابِ وغا ہے
بندے ہیں ادھر، اُن کی طرف آج خدا ہے

مشہور ہے ہر شہر میں شمشیرِ دو پیکر
یہ تحفۂ باری ہے سوئے حیدرؑ صفدر
طفلی میں یہ تھی طاقتِ دامادِ پیمبرؐ
دو انگلیوں سے چاک کیا کلۂ اژدر

سُنتے ہیں کہ غل نعرۂ تکبیر کے اُٹھے
جھولے سے جو اُٹھے تو اُسے چیر کے اُٹھے

جنگِ جمل و بدر و اُحد کر گئے یہ سر
صفین و سلاسل کی صفیں ہو گئیں ابتر
خندق میں جو لی میان سے شمشیرِ دو پیکر
جبریلؑ نے روکا تو قلم کر دیئے شہپر

پردے حسد و کبر کے بھی پھاڑ کے نکلے
خیبر سے جو نکلے تو علم گاڑ کے نکلے

شاہِ شہدا بھی ہیں اُسی شاہ کے دلدار
طاقت وہی بازو میں، وہی ہاتھ میں تلوار
ابنِ حسنؑ و اکبرؑ و عباسؑ علمدار
اُس فوج میں یہ تین بہادر ہیں نمودار

کچھ رشتے میں ہیں، اور کچھ اصحاب نبیؐ کے
بیٹے ہیں، بھتیجے ہیں، نواسے ہیں علیؑ کے

جب مار لیا ان کو تو انعام ملیں گے
جاگیر ہے کیا مال، بڑے کام ملیں گے

جامِ میِ عشرت سحر و شام ملیں گے
اس فتح سے سب کو بہت آرام ملیں گے

مارو گے اگر آج تم ان ناموروں کو
بھر دو نگارِ سرخ سے سب کی سپروں کو

مثال ۱۰۔ حضرت عباسؑ نہر سے مشک بھر چکے ہیں اور واپس آنا چاہتے ہیں، دشمن یہ دیکھ کر ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ حضرت عباسؑ اس کشمکش میں ہیں کہ آپ کو بچائیں یا مشک کو سنبھالیں۔ اُس وقت کی مضطربانہ کوشش کی تصویر

مشکیزہ بھرا نہر سے سقائے حرم نے
خود پانی نہ ہرگز پیا اُس بحرِ کرم نے

کاندھے پہ رکھا بازوئے سلطانِ امم نے
گھاٹوں پہ پرے باندھ لیے فوجِ ستم نے

غل تھا کہ مزا مشک کے بھرنے کا دکھا دو
دریا ہی میں سر کاٹ لو اور لاش بہا دو

بیتاب ہوئے پیاسوں کی اُلفت میں علمدار
اے امتیو! واسطۂ احمدِ مختار

ناچار سماجت سے یہ کرنے لگے گفتار
سر لو مرا، پر خیمے میں ہو آنے دو اکبر

زینبؑ لیے گودی میں سکینہؑ کو کھڑی ہے
پانی میں پلا آؤں اُسے پیاس بڑی ہے

میں کیا کہوں دریا سے علمدار کا آنا
گھوڑے کو کبھی روکنا، اور گاہ بڑھانا

جب تیرِ ستم کھانا تو رو کر یہ سُنانا
یا حیدرؑ کرّار مری مشک بچانا

ایک ایک قدم تھا یہ قلق جانِ حزیں پر
اب مشک چھدی اور گرا پانی زمیں پر

دہنے سے کماندار جو باہیں طرف آتے
ظالم جو اُدھر تیر لگاتے ہوئے جاتے

مشکیزہ کو یہ داہنے کاندھے پہ لگاتے
یہ مشک کو اس دوش سے اُس دوش پہ لاتے

مشکیزہ کا حافظ شہِ مرداں کا جگر تھا
سینے کے تلے تھا تو کبھی زیرِ سپر تھا

مثال ۱۱-

پردہ کا اہتمام

آوازِ دوربا ش کا ناگاہ غل اُٹھا
ڈیوڑھی سے پر کجاوۂ زینبؑ جہاں ملا

اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفٰےؐ
خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا

رو کی قنات اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر
عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر

گوربان عصا اُٹھا کے بڑھے جانبِ سیار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار

دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آئے اُدھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار

آوازِ غیر سُنکے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو دخترِ زہراؑ اُترتی ہیں

عفت کے جتنے مرتبے خیر النساؑ نے پائے
وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشا نے پائے

ہاں ہاں مسافرو، نہ کوئی غل مچانے پائے
ناقے پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حسنِ ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو

مثال ۱۲۔ عونؑ و محمدؑ میدانِ جنگ میں لڑ رہے ہیں، سیدانیاں دروازہ پر بدحواس کھڑی ہیں، حضرت **زینبؑ** فضہؑ سے پوچھتی ہیں کہ میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟ وہ جواب دیتی ہیں ؎

زینبؑ نے درِ خیمہ سے یاں ان کو جو دیکھا
پایا نہ کہیں بیٹوں کو چلائی وہ دکھیا
فضہؑ سے کہا بچے مرے قید ہوئے کیا
وہ بولی کہ کچھ سنتی ہو؟ کیا کہتے ہیں اعدا

لشکر کی صفیں چیر کے دو روز کے پیاسے
دریا پہ گئے ساقیِ کوثر کے نواسے

زینبؑ نے کہا کیوں گئے، دریا سے غرض کیا
پی لینگے جو پانی تو غضب اور بھی ہوگا
بھائی ہے مرا تین شب و روز کا پیاسا
فضہؑ انھیں آواز دے، یہ امر ہے بیجا

اک بوند بھی پانی کی اگر پی تو ستم ہے
اک دھار نہ میں دودھ کی بخشوں گی قسم ہے

لو ایسے ابھی سے ہوئے خود سر مرے جانی
یاں دودھ نہ اصغرؑ کو ملے وہ پئیں پانی
یاد اُن کو رہی اپنی فقط تشنہ دہانی
ماموں کی انہیں بھول گئی خشک زبانی

بے صبر مرے بیٹوں کو سب خلق کہے گی
پانی جو پیا آبرو اُن کی نہ رہے گی

کہدو کہ پیا پانی تو اب گھر میں نہ آنا
اب شکل بھی مجکو نہ دکھانا نہ دکھانا
اب سر بھی مرے بھائی کی خاطر نہ کٹانا
راحت کے عوض تم سے یہ صدمہ تھا اٹھانا

مرجاؤ گے تو گود میں لاشوں کو نہ لونگی
ماموں تمھیں روئینگے تو میں رونے نہ دونگی

مثال ۱۳- حضرت امام حسین علیہ السلام کا میدانِ کربلا میں داخلہ۔ رفقا کی شان و شوکت اور نوجوانوں کی سیر و تفریح۔ ؎

اب لکھتا ہوں آوارگیِ آہوئے زہراؑ
کعبہ سے ہوا کوچ جو آہوئے حرم کا
ہمراہ تھے ننھے پسرؑ اور موسمِ گرما
وہ دھوپ کہ جس میں ہوں سیہ آہوئے صحرا

اشک آنکھوں سے جاری، تو عرق عضوِ بدن سے
کس دھوپ میں نکلے تھے حسینؑ اپنے وطن سے

کہتے تھے کہ اب کاہیکو دیکھیں گے کسی کو
صغراؑ کو مدینہ کو نہ قبرِ نبوی کو
آتی تھی صدا ماں کی حسینؑ ابنِ علیؑ کو
امت کو بھی اے لال ستانا تھا تجھی کو

بابا کو ترے خلد کے گلشن سے نکالا
یثرب سے تجھے اور مجھے مدفن سے نکالا

القصہ اُسی دھوپ میں کی قطع جو سب راہ
اور پہونچے قریں دشتِ بلا کے شہ ذیجاہ
لکھا ہے یہ راوی نے کہ منزل تھی اخیر آہ
منزل پہ نہ پہونچے تھے کہ شب ہوگئی ناگاہ

تاریکیِ شب نے جو چھپایا تھا قمر کو
معلوم نہ تھا قافلہ جاتا ہے کدھر کو

وہ صبح سے پردیسیوں کا دھوپ میں آنا
وہ رات کا وقت اور وہ منزل کا نہ پانا
گھوڑوں کا شبِ تار میں وہ ٹھوکریں کھانا
اور سبطِ نبیؐ کا یہ غریبی سے سُنانا

اس راستہ میں بارِ گراں دوش پہ سر ہے
اے قبر بتا مرقدِ شبیرؑ کدھر ہے

واں بچوں نے محمل میں جُدا دھوم مچائی
اُس رات کی دہشت سے سکینہؑ کو تپ آئی
رستہ نہ شتربانوں کو دیتا تھا دکھائی
سب بی بیاں کہتی تھیں دوہائی ہے دوہائی

مادر کے گلے سے نہ جُدا ہوتے تھے بچے
ماں نادِ علیؑ پڑھتی تھی اور روتے تھے بچے

تاریکیِ شب وہ تھی کہ العظمۃ للہ
گُم ہو گیا خود چرخ پہ مشعل کو لیے ماہ
تھا روزِ ابد طول سے اُس رات کے کوتاہ
رستہ میں اندھیرا تھا مثالِ دلِ گمراہ

آتی تھی نظر ایک کی صورت نہ کسی کو
رستہ نہ ملا قافلۂ آلِ نبیؐ کو

شہ بولے حرم اُتریں کہ رستہ نہیں ملتا
جاؤنگا خدا صبح کو لے جائے گا جس جا
یہ سُن کے پیادہ ہوئی سب عترتِ مولا
ناگہ سحرِ منزلِ آخر ہوئی پیدا

سجّادہ بچھا، ہونے لگا شورِ اذاں کا
سر جُھک گیا سجدے میں امامِ دوجہاں کا

پڑھ پڑھ کے نمازِ سحری مونس و غمخوار
چلنے کو کمر باندھ کے فوراً ہوئے تیار
حضرت نے وظیفہ میں اشارہ کیا اکبرؑ
پردیسیو ہی خیر تو، کیوں کستے ہو رہوار

پوچھو تو زمینداروں سے، یہ کونسی جا ہے

اگر ہو یہی منزل تو غرض کوچ سے کیا ہے

باندھیں لگامیں غازیوں نے نیزے گاڑ کر
اور فرش زین پوش کیے گرد جھاڑ کر
جنگل بسایا چرخ نے بستی اُجاڑ کر
بولے علیؑ کفن کا گریبان پھاڑ کر

جنگل میں اہلبیتؑ رسالت کا گھر ہوا
آخر مرے حسینؑ کا پہلا سفر ہوا

وہ وقتِ صبح اور وہ بیابان کی ہوا
وہ چھاونی حسینؑ کے لشکر کی جابجا
وہ مرکبوں کے بولنے کی چارسو صدا
وہ خیمہ - وہ سراچہ - وہ بے چوبہ خوشنما

اُڑنا پھریروں کا، وہ لچکنا نشان کا
وہ ابر ڈھال کا، وہ مہِ نو کمان کا

بستر پہ کوئی آیا کوئی سیر کو گیا
کوئی سپر کو زیرِ بغل رکھ کے سو گیا
مصروف اک تلاوتِ قرآں میں ہو گیا
آکر فرات پر کوئی منہ ہاتھ دھو گیا

عباسؑ سبز پوش کھڑے تھے فرات پر
جس طرح خضر چشمۂ آبِ حیات پر

کہتے تھے دل شگفتہ یہاں غنچہ وار ہے
آبِ رواں ادھر تو اُدھر سبزہ زار ہے
گر بیچ میں ہو قبر مری پھر بہار ہے
دریا میں شور تھا یہی تیرا مزار ہے

صحرا میں لوحِ قبر شہِ نیک ذات ہے
عباسؑ آبرو مری اب تیرے ہات ہے

مدّاحِ کربلا تھے رفیقانِ شاہِ دیں
کہتے تھے کیا لطیف ہے واللہ یہ زمیں

مطلق ملال قطعِ مسافت کا اب نہیں
آب و ہوا ہے کوثر و فردوس کی یہیں

صحرا ہے یا کہ قدرتِ ربِّ غفور ہے
ہر خار باغِ خلد ہے، ہر ذرّہ حور ہے
آفتاب ۱۲

بر پا ہوئے جب خیمۂ سرور لبِ دریا
پھرنے لگے عباسؑ دلاور لبِ دریا

اُترے حرمِ ساقیِ کوثر لبِ دریا
مُنہ دھونے لگے بیٹھ کے اکبرؑ لبِ دریا

شہ نے کہا دریا تو بہت ہم سے قریں ہے
پانی مگر اس نہر کا قسمت میں نہیں ہے

منزل سے جو آئے تھے رفیقِ شہِ ابرار
دامن سے ہوا دیتے تھے چہرہ کو ہر اک بار

سونلا گئے تھے گرمیِ خورشید سے رخسار
پھر پھر کے لبِ نہر یہی کرتے تھے گفتار

میدان ہے سبزہ ہے ترائی ہے ہوا ہے
خیمہ تو بہت خوب جگہ آج ہوا ہے

اللہ کرے یاں تو کوئی روز ہو رہنا
کہتے تھے حبیبؑ ابنِ مظاہر یہ کیا کیا

گھر بھول گیا ہم کو، یہ کیا خوب ہے صحرا
کیا جانیے حضرت کا ارادہ ہے کہاں کا

دو روز مقام اُن کو یہاں مدِّ نظر ہے
اس دشت سے بھی کوچ کی دسویں کو خبر ہے

اصحاب وفادار تو کرتے تھے یہ گفتار
پوشاک بدلتا تھا کوئی شاہ کا غمخوار

دریا پہ گڑا تھا علمِ سیدِ ابرار
کوئی تو سپر کھولتا تھا اور کوئی تلوار

مشکیزوں میں بھر بھر کے کوئی لاتا تھا پانی

دریا میں کوئی گھوڑوں کو پلواتا تھا پانی

آواز ارکبوا جو ملائک سناتے ہیں
تعقیب کی دعائیں مگر پڑھتے جاتے ہیں

دیگر

غازی نماز پڑھ کے مصلے اٹھاتے ہیں
بہر سلام خیمۂ مولا کو آتے ہیں

در پر دھرے جبینوں کو سب خوشخصال ہیں
اک آسماں ہے اور بہتر ہلال ہیں

دیکھو خشوع کو تو ہے لرزاں بدن تمام
واقف نہیں ریا سے کہ کس شے کا ہے یہ نام

پونچھو رجوع قلب تو دل ہے سوئے امام
جسکو نماز کہتے ہیں وہ یہ ہے والسلام

روشن ہے ان کا اوج عبادت جہان پر
سجادے ہیں زمیں پہ نماز آسمان پر

ہے دست بوس ایک کی شمشیر آبدار
کوئی خیال حور شہادت سے ہمکنار

در نجف کا سبحہ کسی کے گلے کا ہار
کوثر پہ آنکھ ایک جری کی پیالہ وار

کہتے ہیں راہ حق میں شرف کی کمی نہیں
اس راہ میں جو خاک نہ ہو آدمی نہیں

سمجھے ہیں نامرادی دنیا کو یہ مراد
ہر عضو میں ہے دل کی طرح سے خدا کی یاد

غم ان کے دل میں شاد ہے، دل انکا غم میں شاد
قرآن پڑھنا ختم ہے ان پر دم جہاد

بازوئے جنگ مثل ترازو تلے ہوئے
خود رحل زیں پہ گود میں قرآں کھلے ہوئے

مثال ۱۴۔ تمام رفقا کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ کی بیکسی اور دشمنوں کا نرغہ۔

تھا اک تو ضعیفی کے سبب ضعف سراپا
کمزوری و ناطاقتی و سستیِ اعضا
اور اُسپہ عزیزوں کا غم اور داغِ احبّا
اور تین شب و روز کی وہ پیاس کا صدمہ

عاشور کو دیکھی یہ جفا فوجِ شقی کی
جو غم سے ہوئی ریش سفید ابنِ علیؑ کی

آنکھوں کی بصارت غمِ اکبرؑ سے ہوئی کم
اور پشت و کمر ماتمِ عباسؑ نے کی خم
جنبش نہ زباں کو تھی یہ تھا پیاس کا عالم
اور زرد تھا صدموں سے رُخِ سیدِ عالم

جو زورِ بدن آگے تھا فرق اُس میں بڑا تھا
اک فرق مگر یادِ خدا میں نہ پڑا تھا

بیدست لبِ نہر ہیں عباسؑ دلاور
ریتی میں ہے صد پارہ تنِ قاسمِ مضطر
بے گور و کفن خاک پہ زینبؑ کے ہیں دلبر
لپٹا ہوا سوتا ہے برادر سے برادر

زخمی جگر اکبرؑ کا ہے لب پیاس سے واہیں
گویا کہ پیمبرؐ بھی شریکِ شہدا ہیں

تھے دامنِ شبیرؑ میں سونے کے جو خوگر
گردوں نے اُڑا ہائی ہے اُنھیں خاک کی چادر
ہے ریگِ بیابانِ بلا لاشوں کا بستر
نے غسل نہ کافور نہ ہے قبر میسّر

پر ایک مزار اصغرِ ناداں کا بنا ہے
پھل تیر کا بالائے لحد پھول کی جا ہے

اُمڈی ہے گھٹا ظلم کی یا چھائے ہیں بے پیر
لب مثلِ صدف کھولے ہیں زخمِ تنِ شبیرؑ

باراں کے بھی قطروں سے برستے ہیں سوا تیر
بجلی کی عوض گرتی ہے برقِ دمِ شمشیر

بدلی ہے ہوا صرصرِ بیداد چلی ہے
اس مینھ کا سزاوار حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

جز رحمتِ حق اور کوئی شہ کے نہیں پاس
ہر سمت سے دل سیر، ہر امید سے بے آس
سو طرح کی تشویش ہے، سو طرح کے وسواس
ہر چار طرف دیکھ کے کہتے ہیں بصد یاس

محشر میں دکھانا ہے تمہیں منہ مرے جد کو
اے مومنو بیکس ہے حسینؑ آؤ مدد کو

ہے کوئی مسلماں کہ ہمیں جانکے پیاسا
اس دھوپ میں پانی ہمیں پلوائے ذرا سا
ہے کوئی، سمجھ کر مجھے احمدؐ کا نواسا
دے اکبرؑ مہرو کی جدائی میں دلاسا

پونچھیں مرا دکھ، ایسے بھی یاں صاحبِ دیں ہیں
ہم بے کس و تنہا ہیں گنہگار نہیں ہیں

حضرت کے قریب آنکے کہتے ہیں یہ جلاد
مظلوم حسینؑ آپ عبث کرتے ہیں فریاد
گھر اپنے عزیزوں کے تو تم کر چکے برباد
نادان ہے کوئی جو کرے آپ کی امداد

جو آکے مددگارِ شہنشاہِ امم ہو
پہلے سرِ شبیرؑ سے سر اُس کا قلم ہو

کیوں آپ ہیں غیروں سے طلبگارِ حمایت
ہے آپ میں تو فاطمہؑ کے شیر کی طاقت
قبضے میں ہے تیغِ کمرِ شاہِ ولایت
موقوف ہے کس دن کے لیے زورِ امامت

چرچا ہے یداللہؑ کی خیبر شکنی کا
کیا زور نہیں آپ میں شمشیر زنی کا

فرماتے ہیں شبیرؑ کہ ہاں سچ ہی یہ گفتار
تھی شہرۂ آفاق مرے باپ کی تلوار
کاٹے ہیں مگر شیرِ خدا نے سرِ کفار
تم لوگوں کو نانا کی رسالت کا ہی اقرار

احمدؐ کا پسر ہو کے تمہیں تنگ کروں میں
تم اپنے ہو پھر اپنوں سے کیا جنگ کروں میں

یہ بات سن کے اور ہوئے تیغ زن دلیر
آکر قریب سب نے لیا شاہِ دیں کو گھیر
دل ابنِ فاطمہؑ کا ہوا زندگی سے سیر
نیزوں میں آگیا اسدِ کبریا کا شیر

چھاتی تمام ظلم کے تیروں سے چھن گئی
جنگل میں کیا نبیؐ کے نواسے پہ بن گئی

کوئی رفیق تھا دمِ مشکل نہ غمگسار
لاشوں کو چشمِ یاس سے تکتے تھے بار بار
ٹوٹے تھے اک غریب پہ لاکھوں ستم شعار
ہر سمت تھا یہ شور کہ لو تشنہ لب کو مار

دشمن ہر اک تھا فاطمہؑ کے نورِ عین کا
غیر از خدا نہ دوست تھا کوئی حسینؑ کا

وہ دھوپ وہ عطش وہ جراحت وہ قحطِ آب
دل ناریوں کے ظلم سے سینہ میں تھا کباب
نیزوں سے دیتے تھے جو تکاں تن کو شیخ و شاب
ہل چل میں ہر قدم سے نکل جاتی تھی رکاب

رو رو کے شیرِ حق کا کبھی نام لیتے تھے
چھٹتی تھی گہ لگام کبھی تھام لیتے تھے

گردن غشی میں پشت کی جانب ہوئی جو خم
گھوڑے کی سمتِ راست جھکے سرورِ امم
نیزے جو پڑ گئے کئی، سینہ پہ یک قلم
دم میں اکھڑ گیا جگرِ فاطمہؑ کا دم

جھٹکا بدن میں دے کے ستمگر جو ہٹ گئے
گردن سے دو الحناح کی حضرت لپٹ گئے

نیزہ کا پشت پر جو کیا پھر کسی نے وار
سیدھے ہوئے تڑپ کے حسینؑ جگر فگار
سنبھلا گیا فرس پہ نہ پھر آہ زینہار
سوئے یمیں جھکے کبھی، گہ جانب یسار

غش نے زمیں کی سمت جو ڈالا حسینؑ کو
روح الامیں نے آکے سنبھالا حسینؑ کو

جب قتل ہوئی تشنہ دہاں فوجِ حسینیؑ
اور ہو گئی کوثر پہ رواں فوجِ حسینیؑ
پوچھا جو کسی نے ہی کہاں فوجِ حسینیؑ
شہ بولے گئی سوئے جناں فوجِ حسینیؑ

دنیا سے کیا کوچ رفیقانِ وطن نے
چھوڑا تنِ تنہا مجھے ہفتاد و دو تن نے

سب مر گئے میرے لیے، میں جیتا ہوں ہیہات
ساتھ آئے مدینے سے، یہاں چھوڑ دیا سات
لشکر تو مرا کٹ گیا، باقی رہے سادات
لوٹیں گے مرے قتل کے بعد انکو بھی بدذات

زینبؑ پہ بھی گو قید کا اک تازہ تعب ہے
پر ظلم سکینہؑ پہ طمانچوں کا غضب ہے

عباسؑ کا پھر نام لیا اور یہ پکارے
لو بھائی سکینہؑ تو حوالے ہی تمہارے
ہشیار کہ اُسکو نہ طمانچہ کوئی مارے
اکبرؑ کے تصور میں کہا اے مرے پیارے

گر چاہو کہ ممنون کرو شیرِ خدا کو

آفت میں بچا لیجیو زینبؑ کی ردا کو

یہ کہتے تھے اور گھوڑے پہ غش ہوتے تھے ہر بار
مظلوم کو گھیرے ہوئے تھے لاکھ ستمگار
تیغوں کے تلے تھا جگرِ احمدِ مختار
اک جسم پہ تیر و تبر و نیزہ کے تھے وار

چلاتے تھے در پر حرمِ شاہ دوہائی
سیّد پہ یہ بیداد ہے اللہ دوہائی

وہ تیروں کی بوچھار وہ تیغوں کا چمکنا
اور شہ کا غریبی سے وہ جلّاد کو تکنا
وہ سینہ میں پیکان کی نوکوں کا کھٹکنا
وہ چہرہ پہ عمّامہ کا کٹ کٹ کے لٹکنا

گہ ہوش میں تھے اور کبھی غش ہوتے تھے شبّیرؑ
خود اپنی مصیبت پہ کھڑے روتے تھے شبّیرؑ

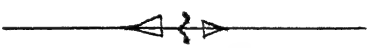

مومنو بیکس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ
سخت آفت میں گرفتار ہے مظلوم حسینؑ
کیا سراسیمہ و ناچار ہے مظلوم حسینؑ
دل شکستہ جگر افگار ہے مظلوم حسینؑ

نیزے کاری ہیں لگے زخم پہ شمشیروں کے
نیزوں کے زخم میں پیوستہ ہیں پھل تیروں کے

تن سے گر کھینچتے ہیں ایک بھی پیکان شبّیرؑ
اتنے عرصہ میں لگاتے ہیں عدو سینکڑوں تیر
کھا کے تیروں کو اگر کرتے ہیں قصدِ تکبیر
پاس سے نیزہ لگاتے ہیں وہیں بے پیر

ایک پیکان جو سینہ سے گذر جاتا ہے
خون کے روکنے کو دوسرا تیر آتا ہے

کیا رحیمی ہے کہ غصّہ نہیں آتا ہے ذرا
کیا کریمی ہے کہ سر کرتے ہیں اُمّت پہ فدا

کیا تحمل ہے کہ ہر زخم پہ ہے شکرِ خدا
کیا شجاعت ہی کہ لاکھوں میں کھڑے ہیں تنہا

تیر بھی نیزے بھی سینہ پہ لیے جاتے ہیں
پر دعا نانا کی اُمت کو دیئے جاتے ہیں

دل کا یہ حال ہے پژمردہ ہوا جاتا ہے
ایک دریا ہی کہ زخموں سے بہا جاتا ہے
ایک دم میں جو کوئی بارِ غش آجاتا ہے
کوئی برچھی کوئی تلوار لگا جاتا ہے

نیزہ ایک ایک جگر میں جو قریبِ دل ہی
سانس کی آمد و شد سینہ میں کیا مشکل ہی

قتل کی اپنے خبر دیتے ہیں شاہِ خوش خو
کبھی کہتے ہیں کہ اب چرخ سے برسیگا لہو
اب کوئی آن میں کھولے گی مری ماں گیسو
اب کوئی دم میں کٹے گا کسی سیّد کا گلو

کسی پیاسے کے سر و تن میں جُدائی ہوگی
اب کوئی آن میں فیصل یہ لڑائی ہوگی

اب کوئی دم میں لٹے گا کسی مظلوم کا گھر
کسی بیکس کی بہن ہوئیگی اب ننگے سر
حیف صد حیف کہ بن باپ کی ہوگی دختر
شمر کے ہاتھ سے کھائیگی طمانچے منہ پر

قتل کے بعد کٹیں گے کسی ناچار کے ہات
بے گنہ آج بندھیں گے کسی بیمار کے ہات

اشقیا کہتے تھے کیا فکر ہے اس کی ہم کو
تمہیں سیّد تمہیں بیکس ہو امامِ خوشخو!
ظلم گذرے گا یہ سب تم پہ کہا ہے جو جو
گر بلا آئے تو آئے، جو قیامت ہو تو ہو

آپ گر ذبح تہ تیغِ جفا ہوئیں گے
فاطمہؑ روئے گی کچھ ہم تو نہیں روئیں گے

مطلب اس کہنے سے یہ ہے کہ نہ سر ہوئے قلم
سو یہ امید نہ تم ہم سے رکھو حق کی قسم

رو رہے ہیں کہ پلا دے کوئی پانی اس دم
تشنۂ خوں ہیں بھلا دینگے تمہیں پانی ہم

آپ صابر ہیں تو پھر خوف ہی کیا مرنے کا
روئیے آپ کوئی رحم نہیں کرنے کا

شہ نے فرمایا خدا سے ڈرو کیا کہتے ہو
اپنے دل پر تو بھلا ہاتھ رکھو تم للہ

حاشا للہ کہ پانی کی نہیں ہے مجھے چاہ
یوں ہی مہمان کو پردیس میں کرتے ہیں تباہ

یہ تو سمجھو کوئی ناحق بھی بھلا روتا ہے
ٹکڑے اکبرؑ کی جدائی سے جگر ہوتا ہے

جسکا مرتا ہی پسر سب اُسے سمجھاتے ہیں
مبتلا دُکھ میں جو ہو اُسپہ ترس کھاتے ہیں

یا کہ اس طرح سے ایذا اُسے پہونچاتے ہیں
یا کہ پانی کے لیے بھی اُسے ترساتے ہیں

یہ گلہ تم سے نہیں پانی دیا یا نہ دیا
حیف اکبرؑ کا بھی تم نے مجھے پُرسا نہ دیا

سامنے احمدِ مرسل کے اگر میں مرتا
نہ مسلماں۔ نہ نبی زادہ۔ نہ مہماں اپنا

کیا مرے نانا کو تم دیتے نہ پُرسا میرا
نہ مسافر مجھے تم سمجھے نہ سیّد جانا

گھر سے بُلوا کے مجھے ذبح کے قابل سمجھے
تم سے محشر میں مرا خالقِ عادل سمجھے

کس کو دنیا میں نہیں ہے مرے رتبہ کی خبر
آتے تھے میری عیادت کے لیے پیغمبرؐ

عہدِ طفلی میں مجھے عارضہ ہوتا تھا اگر
میری صحت کے لیے رکھتے تھے روزے اکثر

میں تو اُمّت پہ فدا کرتا ہوں سر کو اپنے

مجھ پہ صدقے کیا نانا نے پسر کو اپنے

مثال ۱۵ - شب عاشور مدینہ میں حضرت صغرا کا دل یکایک بیقرار ہوگیا اور چونکہ وہی رات امام حسینؑ کی شبِ شہادت تھی اور اہلبیتؑ کو درد انگیز مصیبت کا سامنا تھا اس لیے ان واقعات نے جناب صغرا کے دل میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا اُسوقت اُنکے اضطراب اور انتشار کی تصویر

ناگاہ[1] مدینے میں قیامت کی شب آئی
گذرا جو نواں روز شہادت کی شب آئی
صغرا کے لیے سخت ہلاکت کی شب آئی
نانی کو پکاری یہ کس آفت کی شب آئی

بے نور ستارے بھی ہیں اور چرخِ بریں بھی
اے لو در و دیوار بھی ہلتے ہیں زمیں بھی

للہ، نواسی کے کلیجے کو سنبھالو
عباسؑ چچا جان کی ماں کو بھی بلالو
اس رات سے میں ڈرتی ہوں چھاتی سے لگالو
قرآن مرے پڑھنے کا ہاتوں پہ اُٹھالو

مرجاؤنگی اس شب کے اندھیرے سے دہل کر
روضے پہ نبیؐ کے رہو اس رات کو چل کر

کیا جانے مسافر مرے اسوقت کہاں ہیں؟
اُترے ہیں کہیں یا اس اندھیرے میں رواں ہیں
پانی بھی ملا ہے اُنھیں یا تشنہ دہاں ہیں
اللہ غریبوں کا نگہباں وہ جہاں ہیں

روشن رہیں دنیا میں چراغ آلِ عبا کے

[1] یہ بند الفاظ کی فصاحت - بندش کی صفائی اور زبان کی روانی کے لحاظ سے عنوان فصاحت میں صفحہ ۵۲ پر بھی درج کیے گئے ہیں - یہاں خوبیِ مضمون و معنی کی مناسبت سے لکھے گئے -

دل میرا بجھا جاتا ہی جھونکوں سے ہوا کے

کیوں آج پرندے نہیں لیتے ہیں بسیرا
ان طائروں کے اُڑنے سے ہوش اُڑا ہے میرا
کیا انکے سلیمانؑ کو دشمن نے ہے گھیرا
دیکھیں ہمیں دکھلاتا ہے کیا کل یہ اندھیرا

بالکل غضب و قہر الٰہی کی ہے آمد
کیا جانیے کس گھر پہ تباہی کی ہے آمد

مثال ۱۶ - اہلبیتؑ کے لٹے ہوئے قافلہ کا مدینہ میں داخلہ

ان روزوں میں جس درجہ ہو ماتم تو بجا ہی
کونین کی شہزادیوں پر ظلم و جفا ہے
سر حضرتِ شبیرؑ کی بہنوں کا کھلا ہی
اور طوقِ گرانبار میں عابدؑ کا گلا ہے

رستہ میں ٹھہرنے بھی نہیں پاتے ہیں عابدؑ
پہنے ہوئے زنجیر چلے جاتے ہیں عابدؑ

اس حال کی میں کھینچتا ہوں مومنو تصویر
یثرب میں ہی یوں داخلہ عترتِ شبیرؑ
ہمراہ نہیں کوئی مگر عابدِ دلگیر
منہ اہلِ مدینہ کا ہی فق حال ہی تغیر

سر ننگے وہ سب قافلۂ آلِ نبیؐ ہے
فریاد میں مانند جرس روحِ علیؑ ہے

نکلا تھا مدینے سے جو ابنِ شہِ مرداں
تھے ہودج و محمل میں حرم شاہ کے پنہاں
اب آئے ہیں سب آلِ نبیؐ باسرِ عریاں
جانے کی تو وہ شان تھی اور آنے کی یہ شاں

یہ قافلہ کیوں بیکس و ناچار نہ ہووے
شبیرؑ سا جب قافلہ سالار نہ ہووے

انبوہِ خلائق سے مدینہ میں ہے محشر
در پر کوئی روتا ہے کوئی بام کے اوپر
ہے چاک گریباں کوئی اور کوئی کھلے سر
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں سب شہر کے باہر

امّ سلمہؑ خاک پہ بیہوش پڑی ہے
دروازہ پہ صغرؑا بھی عصا تھامے کھڑی ہے

ہر ایک نے صغرؑا سے چھپایا ہے یہ احوال
ایک ایک کا منہ تکتی ہے وہ صاحبِ اقبال
کہتی ہے کہ اے لوگو کہو مجھ سے تو یہ حال
کون آتا ہے کھولے ہیں جو سب بیبیوں نے بال

گھر کس کا لٹا قتل ہوا کون یہ رن میں
جو خاک سی اُڑتی ہے ہر اک سمت وطن میں

جب اُسنے سنی مادرِ مظلوم کی زاری
دوڑی گئی محمل کے قریب اور یہ پکاری
اے والدۂ ماجدہ تسلیم ہماری
اصغرؑ کو دکھا دو ہمیں ٹھہراؤ سواری

کہدو کہ تمنا ترے ملنے کی بڑی ہے
بیمار بہن ہاتوں کو پھیلائے کھڑی ہے

صغرؑا تو ابھی کرتی تھی یہ درد کی گفتار
ناگہ نظر آیا شہِ مظلوم کا رہوار
سب اُس کی طرف دیکھ کے چلائے یہ اکبارؑ
گھوڑے ترے قربان کہاں ہے ترا اسوار

ہیہات یہ تیروں سے چھنا جامہ ہے کس کا
یہ غرق بخوں زین پہ عمّامہ ہے کس کا

ناگاہ صدا زینبؑ بیکس کی یہ آئی
اے اہلِ وطن احمدِ مرسل کی دُہائی
لوٹی گئی پردیس میں زہراؑ کی کمائی
بھائی سے چھڑا کر مجھے تقدیر ہے لائی

فریاد کہ بیواری ہو آئی ہے زینبؑ

شبیرؑ سے ماں جائے کو کھو آئی ہے زینبؑ

میں وہ ہوں کہ اکبرؑ سا پسر جسکا موا ہے
میں وہ ہوں کہ پردیس میں سر جسکا کھلا ہے

میں وہ ہوں کہ پردیس میں گھر جسکا لٹا ہے
میں وہ ہوں کہ رسّی میں بندھا جسکا گلا ہے

بے جرم و خطا مورد تعزیر ہوئی ہوں
بازاروں میں اور شہروں میں تشہیر ہوئی ہوں

جب مدینے میں شہیدوں کے عزادار آئے
ہو کے بیکس حرمِ احمدِ مختار آئے

ننگے سر بال کھلے مضطر و ناچار آئے
غل ہوا پھر کے وطن میں شہِ ابرار آئے

مژدہ اے اہلِ وطن سیدِ کونین آیا
قبر میں فاطمہؑ کی روح کو اب چین آیا

جب سے کوفہ کو سدھارے تھے شہ جن و بشر
اب یہ سب کوچہ ہیں عباسؑ ہیں اور ہیں اکبرؑ

ہر گلی کوچہ میں آتی تھی اداسی سی نظر
گھٹنوؤں گھٹنوؤں گلیوں میں پھرینگے اصغرؑ

گو مدینہ میں ہر اک سمت کو ناشادی ہے
پھر کوئی دن میں وہی رونق و آبادی ہے

پر یہ حیرت ہے بڑی دل کو ہمارے بخدا
گنبدِ قبرِ نبیؐ کس لیے ہے کانپ رہا

آج تو روزِ خوشی ہے کہ پھرے شاہِ ہدا
قبر سے فاطمہؑ کے رونے کی آتی ہے صدا

بے سبب قبرِ حسنؑ بھی نہیں تھرائی ہے
کچھ نہ کچھ سبطِ پیمبرؐ پہ بلا آئی ہے

اتنے میں شہرِ مدینہ میں اٹھا شیون و شین
ہائے آقا کوئی کہتا تھا کوئی ہائے حسینؑ

اک طرف کانپتی تھی قبرِ رسول الثقلین
اک طرف گور میں تھی فاطمہ زہرا بیچین

خود بخود خاک پہ عمامے وہاں گرتے تھے
لوگ سب شہر کے گھبرائے ہوئے پھرتے تھے

مومنو حالتِ جانکاہ سنو اُس کی ذرا
جسکا مظلوم پدر تشنہ دہن قتل ہوا
لُٹکے پردیس سے آیا ہے یہ کُنبہ جس کا
کون وہ دخترِ شبیرؑ جنابِ صغرا

شاہ کی حسرتِ دیدار نہ کم ہوتی تھی
آنکھیں کھولے ہوئے بابا کی طرف روتی تھی

شدّتِ ضعف سے تھا سانس کا لینا مشکل
دردِ سر۔ شدتِ اعضا شکنی۔ سوزشِ دل
نہ قضا آتی تھی نے ہوتی تھی صحت حاصل
دل تڑپتا تھا سدا صورتِ مرغِ بسمل

شدّتِ تپ میں وہ بستر پہ پڑی سوتی تھی
بیٹھی بالین پہ امِّ سلمہؑ روتی تھی

واقعہ نگاری

لائق مؤلف نے واقعہ نگاری کی جو تعریف لکھی ہے وہ درست اور صحیح ہے۔ لیکن ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "اردو شاعروں نے جو مثنویاں لکھیں وہ مورّخانہ نہیں بلکہ عاشقانہ تھیں، اسلیے اصلی واقعات کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی"۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عشقیہ مضامین میں اصلی واقعات نہیں ہوتے اسلیے اُردو مثنوی گویوں کو اُن کے اظہار کی چنداں ضرورت پیش نہیں آئی۔ حالانکہ جیسے اصلی واقعات تاریخی مضامین میں پیش آتے ہیں اُسی قسم کے واقعات عشقیہ مضامین میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

مثلاً احباب کی جدائی۔ معرکہ آرائی۔ فتح و شکست۔ سفر و حضر۔ بیماری و موت قید و بند۔ صدماتِ مفارقت۔ یاس و ناامیدی۔ جدائی اور انتظار۔ وقت اور موسم کا سماں۔ باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا۔ عیش و عشرت کے جلسوں کا سماں وغیرہ وغیرہ پس جو قادر الکلام شاعر ہیں اُنھوں نے عشقیہ مضامین میں بھی اُن کو ظاہر کر کے واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ خود مؤلف لکھتے ہیں کہ "میر حسن نے اپنی مثنوی میں اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہے" حالانکہ وہ بھی عشقیہ مثنوی ہے۔

میر صاحب نے واقعہ نگاری میں جو کمال حاصل کیا ہی اُسکو ہم دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں۔ فی الحقیقت بقول مولف وہ فطرت اور معاشرتِ انسانی کے بہت بڑے رازداں ہیں اسلیے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی اُنکی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ جو مثالیں میر انیس صاحب مرحوم کے کلام سے اُنھوں نے لکھی ہیں بہت خوب اور لاجواب ہیں، اُن کے دیکھنے کے بعد ناظرین مرزا دبیر صاحب کے کلام سے بھی واقعہ نگاری کے متعلق ذیل کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

مثلاً حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے وقت جناب زینبؑ اُن سے ملنے کو خیمہ سے نکلی ہیں تو جیسا کہ شرفا کی عورتوں کی حالت ایسی پریشانی میں ہوا کرتی ہی کہ قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ زمین نظر نہیں آتی۔ ہجوم تفکرات میں خیال کہیں ہوتا ہی آنکھیں کسی طرف ہوتی ہیں۔ قدم جلد اُٹھاتی ہیں تو گر پڑتی ہیں آہستہ چلتی ہیں تو مطلب کے فوت ہو جانے کا ڈر ہی۔ ان تمام مضطربانہ حالتوں کو جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر واقع ہوا کرتی ہیں اس طرح ادا کیا ہی۔

دہڑکا یہ ہی کہ ذبح نہ ہو جائیں شاہِ دیں	چلتی ہیں جلد، اور زمیں سوجھتی نہیں
واں لڑکھڑائیں، اور یہاں منہ کے بھل گریں	آنکھیں کہیں، خیال کہیں، اور دل کہیں

اسی مضمون کو دوسرے مرثیہ میں لکھا ہی کہ اضطراب میں اہلِ حرم خیمے سے باہر نکل آئے ہیں۔ عصمت وعفت کا تقاضا قدم بڑھانے سے مانع ہوتا ہی لیکن جذبِ محبت پھر بڑھنے کی تاکید کرتا ہی۔ اس موقع پر نیچرل حالت کی تصویر اور واقعہ کی اصلی صورت کھینچنے کے لیے یہ ضرور ہی کہ اس کشمکش کے موقع پر جو اضطرابی حالت پیش آسکتی ہی وہ دکھائی جائے چنانچہ اُس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہی ؎

سر پر فلک گرا تھا پہ اُٹھتے نہ تھے قدم	منہ فق، حواس باختہ، گردن جھکی سے خم

یا مثلاً جب حضرت سکینہؑ نے پانی ملنے کی دعا کی ہے اور سب بچوں کو آمین کہنے کے واسطے بلا لیا ہے، تو حضرت بانوؑ جناب اصغرؑ کی طرف سے جو صرف چھ مہینے کے بچے تھے، دعا و مناجات کی رسوم ادا کرتی ہیں۔ الفاظ نے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے ؎

بانوؑ نے سنی جب یہ سکینہؑ کی مناجات	پھیلا دیئے اصغرؑ کے بھی قبلہ کی طرف ہات
کہنے لگی، اے کُل کے برآرندۂ حاجات	صدقے ترے، سُن لے مرے معصوم کی بھی بات

بے شیر مناجات میں ہے ہاتھ اُٹھا کے
پانی یہ طلب کرتا ہے ہونٹوں کو ہلا کے

یا مثلاً جب شمر نے یزید سے حضرت قاسمؑ کی لڑائی اور اُن کی شمشیر شرربار کی شعلہ فشانی کا تذکرہ کیا تو یکایک معرکۂ جنگ کا ہولناک سماں اُس کی نگاہوں کے سامنے چھا گیا۔ ایسے موقعوں پر قاعدہ ہے کہ انسان جب کسی واقعے سے بے حد مرعوب اور خوف زدہ ہو جاتا ہے تو ایسی بہکی ہوئی اور بے سروپا باتیں کرنے لگتا ہے جو خلافِ عقل اور خلافِ عادت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس بدحواسانہ حالت کو اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

اکدم میں لاکھ بار بروے زمیں گری	کیوں اے یزید، یاں تو وہ بجلی نہیں گری؟

یا مثلاً جب ہند یکایک قید خانے میں داخل ہوئی تو دربانوں نے اہلِ حرم سے کہا کہ تمہاری آہ و زاری سے بادشاہ کی بیوی کے خوابِ راحت میں خلل آیا اب وہ خفا ہو کر قید خانہ میں آتی ہے کہ تم سب کو قتل کر ڈالے اُسوقت اہلِ حرم خصوصاً چھوٹے

بچّوں کی پریشانی اور بدحواسی کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ؎

یہ ذکر تھا جو ہند وہاں آئی یہ بیہوش
عابدؑ سے کہا بانوؑ نے واری گئی خاموش
اک اک کے پسِ پشت ہوا شرم سے روپوش
بچّے تو یہ سہمے کہ ہوئی پیاس فراموش

منہ ڈھانپ لیے خوف سے، کُرتوں کو اُلٹ کر
اور سانس نہ لی بیووں کے سینوں سے لپٹ کر

ان اشعار میں جہانتک کہ الفاظ مساعدت کر سکتے تھے۔ ندامت۔ پریشانی اور گھبراہٹ کی تصویر اُتار دی گئی ہے۔ اس مصرع میں۔ ع۔ بچّے تو یہ سہمے کہ ہوئی پیاس فراموش۔ منتہائے تشویش کی تصویر جن لفظوں میں کھینچی ہے اُسکا لطف اربابِ ذوق خود جان سکتے ہیں۔

یا مثلاً جب حضرت علی اکبرؑ پیدا ہوئے اور جنابِ زینبؑ اُن کو حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں لائیں تو اُنھوں نے علی اکبرؑ کی طرف سے جو صرف چند روز کے تھے آداب و سلام کے معمولات ادا کرائے ہیں۔ اس موقع پر مستورات کا دستور ہے کہ بچّے کا ہات اُس کی پیشانی پر رکھ کر، کہتی ہیں کہ دیکھو یہ تمہیں سلام کرتے ہیں۔ اس حالت کو بعینہٖ ادا کیا ہے ؎

اکبرؑ کو بر میں لے کے مثالِ دل و جگر
خوش خوش گئی حضورِ شہِ دیں وہ خوش سیر
ہاتھ اُسکا اپنے ہاتھ سے رکھ کر جبین پر
بولی نگاہ روبرو اے شاہِ بحر و بر

ننھا سا ہاتھ چاند سے ماتھے پہ دھرتے ہیں
ہمشکلِ مصطفےٰؐ تمہیں تسلیم کرتے ہیں

یا مثلاً جب جناب عبداللہؑ ابن جعفرؑ نے امام حسینؑ کو صلاح دی کہ اہلِ حرم

کو ہمراہ نہ لیجائیں تو اُن کی بیوی حضرت زینبؑ نے اظہارِ خفگی فرمایا کہ اگر تم اپنے بیٹوں کی محبت کے خیال سے ایسا کہتے ہو تو میں اُن کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤنگی لیکن میں بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ بیٹوں نے یہ سُنا تو خیال ہوا کہ کہیں حضرت ہم کو چھوڑ نہ جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ؎

یہ سُنتے ہی زینبؑ کے پسر آنکھ بچا کر	شبیرؑ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے آکر

یا مثلاً جب حضرت علی اکبرؑ لڑتے لڑتے تھک گئے اور تین دن کی پیاس میں تشنگی نے غلبہ کیا تو اس خیال سے کہ دریا کا نظارہ شاید جلتے ہوئے قلب و جگر کو کچھ تسکین دے، نہر کو دیکھتے ہیں۔ اس حالت کو اس طرح ادا کیا ہی ؎

کوسوں کہیں نظر نہ پڑا سایۂ شجر،	دریا کو دیکھنے لگے اُٹھ اُٹھ کے زین پر

یا مثلاً جب حضرت سکینہؑ کو شدتِ عطش سے غش آگیا ہی تو اُسوقت اُن کی نازک حالت کی تصویر کھینچی ہی ؎

قطرے عرقِ ضعف کے بالائے جبیں ہیں	بل کھائے ہوئے ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

یا مثلاً جب محب اہلبیتؑ ابنِ عفیف کی گرفتاری کیواسطے فوج ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے گھر میں گھس آئی ہی تو اُن کی کمسن لڑکی کی بدحواسی اور منت و زاری کے موقع پر لکھتے ہیں۔ ؎

ننھے سے ہاتھ جوڑے ہوئے سبکو تکتی تھی	سکتہ تھا مارے خوف کے کچھ کہہ نہ سکتی تھی

امام حسینؑ رسول اللہؐ کے پاس کھڑے ہوئے لباسِ عید رنگوا رہے ہیں اُسوقت اُن کی حالت لکھی ہی ؎

پیشِ نبیؐ تھا طشت میں حلّہ پڑا ہوا	کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے نواسا کھڑا ہوا

یا مثلاً جب تشنہ لب بچّوں نے سُنا کہ حضرت عبّاسؑ نہر سے پانی بھر کر خیمے کی طرف آتے ہیں تو اُنکے اضطراب اور عجلت کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

ہاتھوں میں کٹورے لیے سادات کے پیارے	ڈیوڑھی پہ کھڑے کرتے تھے دریا کے نظارے

یا مثلاً جب حارث حضرت مسلمؑ کے صاحبزادوں کی تلاش کے بعد گھر میں تھکا ماندہ واپس آیا ہی تو اُس کے غصّے اور غضب کو اس طرح ظاہر کیا ہی ؎

فرش پر رکھ کے قدم، سر سے پٹک دی دستار	ڈھال پھینکی کہیں جھنجلا کے، کسی جا تلوار

جب وہ صاحبزادوں کو اپنے گھر میں ڈھونڈتا ہوا اُس حجرہ میں پہونچ گیا جہاں وہ موجود تھے تو صاحبزادوں کی پریشانی۔ خوف و اضطراب کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

تیغ چمکانے لگا بچّوں کے سر پر وہ لئیم	اُٹھ کے تعظیم کی مظلوموں نے جُھک کر تسلیم

خوف سے بند تھے منہ، بات نہ کی جاتی تھی
استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی

یا مثلاً امام حسینؑ کی شہادت کے وقت خیمہ میں بچّوں کی خراب حالت ظاہر کی ہے۔ ؎

کچھ گود میں، کچھ خاک پہ دامان پڑے ہیں	کچھ اُنگلیاں پکڑے ہوئے بیوؤں کی کھڑے ہیں

یا مثلاً جب امام حسینؑ جناب علی اکبرؑ کی لاش کو دیکھ کر بیساختہ گھوڑے سے کودے ہیں تو اُنکے اضطراب کو اس طرح بیان کیا ہی ؎

دستور ہی سواروں کا، جسدم اُترتے ہیں	پہلے جُدا رکابوں سے وہ پاؤں کرتے ہیں

حضرت نے پاؤں بھی نہ نکالے رکاب سے

لاشے پہ جست کرکے گرے اضطراب سے

اب ہم ہر قسم کی واقعہ نگاری کی چند مثالیں درج کرتے ہیں -

۱ - حضرت امام حسینؑ کا کربلا میں داخلہ، دشمنوں کی روک ٹوک، رفقائے امام کی برہمی امام علیہ السلام کی صلح پسندی اور درگذر وغیرہ وغیرہ -

اب خامۂ نقاشِ غمِ حضرتِ شبیرؑ
یوں کھینچتا ہے شاہ کے احوال کی تصویر
جب بادیۂ کرب و بلا پر شہِ دلگیر
پہونچے مع فوج و حرمِ صاحبِ تطہیر

بجنے لگے نقارے نزولِ شہِ دیں کے
رُتبے تھے سوا تختِ سلیماں سے زمیں کے

کیا شانِ ورودِ شہِ دیں کا کہوں انداز
حشمت تھی خداداد تجمل تھا خدا ساز
آگے تھے سواری کے نقیبانِ خوش آواز
اور زیبِ چپ و راست رفیقانِ سرافراز

تھا فوجِ حسینیؑ سے عیاں اوجِ حسینیؑ
قربانِ جلال و حشمِ فوجِ حسینیؑ

گھیرے ہوئے تھے خرد و کلاں شاہ کو سارے
ہوں گردِ قمر چھوٹے بڑے جیسے ستارے
کملائے ہوئے پھول سے رُخ دھوپ کے مارے
حسرت سے، محبت سے، رُخِ شہ کے نظارے

کس حسن سے سب گردِ شہِ جن و بشر تھے
شہ غیرتِ خورشید تھے وہ رشکِ قمر تھے

خورشید علم کا تھا ہر ایک شہر میں شہرہ
ہو جسکے مقابل نہ کبھی مہر کا مہرہ
جوزا کی طرح نورِ علم کا تھا جو دُہرہ
خورشید تھا رایت پہ فدا انجمِ زہرہ

عاشق تھا علمدار جو سلطانِ امم کا
شقہ سرِ شبیرؑ پہ کھولا تھا علم کا

جب زیب دہِ منزلِ اوّل ہوئے شبیرؑ
گھوڑا نہ چلا آگے تو پیدل ہوئے شبیرؑ
ہاتف نے کہا واردِ مقتل ہوئے شبیرؑ
امت کے جو عقد تھے وہ سب حل ہوئے شبیرؑ

عاشور کو اقلیمِ شہادت ہو مبارک
اور حشر کو امت کی شفاعت ہو مبارک

غرّہ تھا محرم کا جو وارد ہوئے مولا
ٹھہرا کے سواری کو رفیقوں سے یہ پوچھا
کیوں اے مرے پردیسیو خوش آیا یہ صحرا
برپا یہاں سب خیمے ہوں، وہ بولے کہ اچھا

پر کتنے دنوں قصدِ قیام اے شہِ دیں ہے
شہ نے کہا تا حشر مقام اپنا یہیں ہے

وہ بولے جہاں تم چلو ہیں ساتھ تمہارے
مولا! یہ غلام آپ کے بے عذر ہیں سارے
پھر کود پڑے گھوڑوں سے اور زین اُتارے
خیمے بھی بپا ہو گئے دریا کے کنارے

وہ خیمہ تھا یا عرشِ معظم تھا زمیں پر
تھا اوجِ زمیں خیمۂ افلاک بریں پر

یہ ذکر تھا باہم کہ ہوئی شام نمایاں
اور بیٹھ گئے خیمے کے دروازے پہ دربان
تھے خیمے میں سب اہلِ حرم ششدر و حیراں
کرسی پہ مکیں متصلِ درشہِ ذیشاں

سلطانِ دو عالم کو جو تشویش بڑی تھی
زینبؑ عقبِ پردۂ دروازہ کھڑی تھی

ناگاہ سوئے خیمہ ہوئی آمدِ اعدا
ہر سمت تھی آوازِ دف و نوبت و قرنا

آواز دی زینبؑ نے کہ یا سیدِ والا
حضرت کی سلامی کی یہ نوبت ہے اُدھر کیا

یہ لوگ ہیں پردیسیوں کے لینے کو آئے
پیغامِ ضیافت ہیں تمھیں دینے کو آئے

شہ بولے قضا آئے گی لینے کو ہمارے
اور بھائی سے فرمایا یہ کیوں آتے ہیں بارے

عباسؑ گئے پاس، تو اعدا یہ پکارے
دریا کے کنارے سے کرو خیمے کنارے

نہر اپنے عمل میں ہے، کہ ملکِ شہِ دیں ہے؟
کیوں قبضہ کیا شہ نے، یہ کوثر تو نہیں ہے

عباسؑ نے فرمایا کہ یہ تم نے کہا کیا
یہ کون مروّت ہے، بھلا خلق یہ کیسا

واللہ کہ ہے مہر میں زہراؑ کے یہ دریا
اس پر بھی کسی نے یہاں پانی نہیں روکا

شر کرنا بشر سے نہیں زیبا ہے بشر کو
ہم لوگ اِدھر اُترے ہیں، تم اُترو اُدھر کو

ہم نہر کے مختار نہیں، لو تمھیں مختار
مشکیزے بھی ساتھ آئے ہیں پانی نہیں درکار

مہمان کو ہے آب و غذا دینا سزاوار
اور تم نہیں دریا پہ بھی رہنے کے روادار

پردیسیوں سے خلق کرو دھیان کدھر ہے
اصغرؑ چھ مہینے کا ہے اور پہلا سفر ہے

اعدا نے کہا صاف، یہ ہم کو نہیں منظور
لُٹ جائیگا ورنہ ابھی خیمے کو کرو دور

عباسؑ نے فرمایا کہ کثرت پہ ہو مغرور
ایسا تو کسی کا میں نہیں دیکھتا مقدور

لُوٹو تو بھلا خیمہ حسینؑ ابنِ علیؑ کا
دیکھو تو نشاں بھی نہیں رکھتا ہوں کسی کا

منزل کے اُٹھے دھوپ میں پردیسی ہیں آتے
لازم تھا تمھیں آنکے منہ بات دکھلانے
مہمان سمجھ کر ہمیں دعوت بھی کھلاتے
سو اسکے عوض خیمے جو دریا سے اُٹھاتے

کل صبح کو خیمہ بھی اُٹھا لینگے یہاں سے
تکلیف مگر ہوئیگی اب نقلِ مکاں سے

سیدانیاں طاعت میں ہیں اوسوتے ہیں اطفال
بیمار بھتیجہ مرا بستر پہ ہے بے حال
وہ بولے یہ اظہار فقط عذر پہ ہے دال
ہم خیمہ و مسند کو کرینگے ابھی پامال

یہ کہہ کے کیا نیزوں کو خم اہلِ جفا نے
شمشیر علم کی خلفِ شیرِ خدا نے

یہ دیکھ کے کر کسی سے اُٹھے سبطِ پیمبرؐ
چلائے کہ ہاں ہاں مرے غازی مرے صفدر
بھائی! مری مظلومی و غربت پہ نظر کر
دکھلا تو مرے صبر کی تلوار کے جوہر

کیا ہوگا جو تو آج نہ اُمت سے لڑیگا
کچھ فرق نہ حیدرؑ کی شجاعت میں پڑیگا

بھائی یہی نہ ہم کو ستاتے ہیں ستائیں
خیمہ کو اُٹھاتے ہیں اُٹھانے دو اُٹھائیں
اب آپ نہ برہم ہوں تحمل کریں آئیں
زینبؑ ہے کھڑی ڈیوڑھی پہ پینے کو بلائیں

سُن سُن کے یہ غل غش ہوئی جاتی ہے سکینہؑ
لو آؤ بھی جانے دو بلاتی ہے سکینہؑ

میں صابر و مظلوم ہوں تم غازی و صفدر
میں صبر میں ایوبؑ ہوں تم زور میں حیدرؑ
وہ آپ کا جوہر ہے یہ شبیرؑ کا جوہر
خیمہ کے اُٹھانے سے تو یہ غم ہے برادر

اُس دم تو جگر آپ کا صدمہ سے ہلیگا

جب ساتویں تاریخ سے پانی نہ ملیگا

عباسؑ پھرے کانپتے پیشِ شہِ والا
کی عرض وہی خوب ہے جو مرضیِ آقا
ہی کام ہمیں آپ سے، دریا سے غرض کیا
پر آپ کے فدوی کا بھی دعویٰ نہیں بیجا

یہ آپ نے بھی میں نے بھی حیدرؑ سے سُنا ہی
دریا کی ترائی تو مرے دفن کی جا ہی

شہ نے کہا بیشک ہی یہی آپ کا مدفن
اے بھائی مگر جیتے ہی جی یا پسِ مُردن
تم دوست خدا کے ہو، کرو خاطرِ دشمن
لو خیمہ اُٹھاؤ کہ حرم کرتے ہیں شیون

اُٹھنے لگا خیمہ تو حرم بولے یہ کیا ہے
زہراؑ کی ندا آئی کہ پہلی یہ جفا ہے

سوتے ہوئے بچوں کو تو فضہؑ نے جگایا
اور بانوؑ نے گہوارے سے اصغرؑ کو اُٹھایا
پر مسندِ شبیرؑ کو جس وقت بڑھایا
وسواس سے دل حضرتِ زینبؑ کا بھر آیا

جو پوچھتا تھا دیکھ کے اسبابِ حرم کو
کہتی تھی کہ مہماں نہ کیا نہر نے ہم کو

ریتی پہ کیا شہ نے بپا خیمۂ پُرنور
در پیش رہے ایسے ہی غم تا شبِ عاشور
آئی شبِ عاشور تو مولا ہوئے مسرور
کہتے تھے کہ ہو جائینگے کل سارے قلق دُور

خیمہ میں رفیقوں کے بھی اک جشن بپا تھا
سامانِ قضا، شوقِ وغا، ذکرِ خدا تھا

سُن کر شہِ مرداں کے نواسوں کی یہ گفتار
تحسین اُنھیں کرتی تھی زینبؑ جگر افگار

ناگاہ خبر لائے یہ حضرت کے خبردار
خیمہ کی طرف آتے ہیں کوفہ کے کچھ اسوار

یہ حکم ہی اُن کو پسرِ سعدِ لعیں کا
خیمہ لبِ دریا سے اُٹھا دو شہِ دیں کا

گھبرا گئے سُن کر یہ خبر سرورِ دلگیر
عبّاسؑ سے فرمایا کہ اے بازوئے شبیرؑ

ہاں جا کے ہو تم سدِّ رہِ لشکرِ بے پیر
پر میری طرح کیجیو مظلومی سے تقریر

امّت کا مرے نانا کی دل تنگ نہ کرنا
دیتا ہوں سکینہؑ کی قسم جنگ نہ کرنا

یہ سُنکے چلے خیمہ سے عبّاسؑ علمدار
دیکھا تو سوئے خیمہ بڑھے آتے ہیں کفّار

عبّاسؑ نے للکار کے فرمایا کہ ہشیار
یاں آنا مناسب نہیں چل جائیگی تلوار

کچھ پاس بھی تم لوگوں کو ہے آلِ نبیؐ کا
اب آگے تو خیمہ ہے حسینؑ ابنِ علیؑ کا

جبریلؑ بھی بے حکم کبھی یاں نہیں آیا
سر تن سے قلم پاؤ گے گر پاؤں بڑھایا

غصّے میں جو عبّاسؑ علمدار کو پایا
ڈر ڈر کے یہ اُس لشکرِ روبہ نے سُنایا

تم نے پسرِ سعد سے بھی پوچھ لیا ہے
یاں حکم اُترنے کا تمھیں کس نے دیا ہے؟

عبّاسؑ نے فرمایا یہ تقریر ہی بے جا
کیسا پسرِ سعد ہمیں اُس سے غرض کیا

آقا ہیں ہمارے پسرِ فاطمہ زہراؑ
فرمانے سے اُنکے یہاں خیمہ کیا برپا

دریا کا تو کوثر سے کہیں مرتبہ کم ہے
کوثر پسرِ فاطمہؑ کے زیرِ قدم ہے

وہ بولے، نہیں یہ پسرِ سعد کو منظور
خیمہ پسرِ فاطمہؑ کا نہ سے ہو دُور

عباسؑ نے فرمایا کہ کیا اُسکا ہی مقدور
شاید کہ وہ کچھ فوج کی کثرت پہ ہے مغرور

یہ دل میں نہ سمجھے اسدؑ اللہ نہیں ہی
ہمسا بھی دلاور کوئی واللہ نہیں ہی

کیا سمجھا ہے شبیرؑ کو وہ بیکس و بے یار
اب بھی شہِ بیکس کے بہتر ہیں مددگار

مہمانوں سے کرتے ہیں اسی طرح کی گفتار؟
وہ بات کرو جس سے رضامند ہو غفار

واللہ کہ اک میرے برادر کا ستانا
زہراؑ کا ستانا ہی پیمبرؐ کا ستانا

تم ہو کے مسلمان یہ باتیں نہ سناؤ
ہو جاؤ جو کافر تو شہِ دیں کو ستاؤ

منظور جہنم ہو تو زہراؑ کو رولاؤ
ہم ابنِ علیؑ ہیں ہمیں غصہ میں نہ لاؤ

ارشاد سے شہ کے ہے یہ گفتار ہماری
کونین میں مشہور ہے تلوار ہماری

وہ بولے کہ یہ عذر نہ مانیں گے تمہارے
یہ کہہ کے بڑھے خیمہ کو نامرد وہ سارے

عباسؑ نے کی تیغ علم غصہ کے مارے
اصحاب یہ جا کر درِ خیمہ پہ پکارے

جلد آئیے یا شاہ خیامِ نبوی سے
اب نوبتِ شمشیر ہی عباسؑ علیؑ سے

شہ جلد برآمد ہوئے خیمہ سے بصد یاس
بھائی کو پکارے، کہ یہ کیا کرتے ہو عباسؑ

امت مرے نانا کی ہی نانا کا کرو پاس
عباسؑ نے کی عرض حسینؑ آئے جو نہیں پاس

کچھ آپ نے تقریر سُنی فوجِ لعیں کی؟

دریا پہ مناہی ہے خیامِ شہِ دیں کی !!

شہ بولے اسی بات پہ غصے ہو برادر
تلوار کرو میان میں ہے صبر ہی بہتر
یہ غصہ ہے تو ہو گی شہادت مری کیونکر
یہ ظلم ہی کیا، ظلم تو اب ہوئینگے مجھ پر

کاٹیں گے جو باغی چمنِ شیرِ خدا کو
تم زندہ نچھوڑو گے کسی اہلِ جفا کو

گر یہ نہیں دریا پہ اترنے کے روادار
ریتی پہ کرو خیمے، عبث کرتے ہو تکرار
قسمت میں تو پانی نہیں اے مونس و غمخوار
گر نہر ہوئی پاس تو کیا تم کو سروکار

میں دشکنی امتِ جد کی نہ کروں گا
گر ان کی خوشی یہ ہے تو پیاسا ہی مروں گا

۲- حضرت عباسؑ کا میدان میں جانا اور شمر کا منصب وغیرہ کی ترغیب دینا

حضرتِ عباسؑ نے برہم ہو کر جواب سخت دیا دشمنوں نے خبر اڑا دی کہ عباسؑ ادہر آگئے اہلبیتؑ اور خاصکر حضرت عباسؑ کی بیوی پر اُسوقت جو اثر ہوا اور جو باتیں ہوئیں اُن کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ ؎

عباسؑ تو یاں شمر سے کرتے تھے یہ گفتار
اور فوج میں غل تھا کہ ملا ہم سے علمدار
لو ٹوٹ گئی اب کمرِ سیدِ ابرار
اے لشکریو لوٹ پہ خیمہ کی ہو تیار

زینبؑ کی ردا چھین لو شبیرؑ کے آگے
پھر قتل کرو بھائی کو ہمشیر کے آگے

یاں متصلِ خیمہ کھڑے تھے شہِ ابرار
عباسؑ کے فرزند کو فرما رہے تھے پیار

یہ غل جو اُٹھا لشکرِ کفار سے اک بار
پوچھا علی اکبرؑ سے یہ کیا شور ہی دلدار؟

معذور بصارت سے ہم اے نورِ نظر ہیں
تم اپنے چچا جان کو دیکھو تو کدھر ہیں

اکبرؑ[1] نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی
نرغہ میں کھڑا ہے اسد اللہ کا جانی
ہی بے ادبی گر میں کہوں اپنی زبانی
آپس میں یہ کہتے ہیں مگر ظلم کے بانی

بیعت بھی ہم اب لینگے شہنشاہِ امم سے
عباسؑ دلاور سا جواں مل گیا ہم سے

پردے[2] سے لگی سنتی تھی زینبؑ یہی گفتار
اکبرؑ کو پکاری کہ یہ کیا کہتے ہو دلدار!!
بہتان ہی، تہمت ہی، غلط کہتے ہیں کفار
ایسا نہیں، عباسؑ تو ایسا نہیں زنہار

کیا مکر و فریب آتے ہیں اس فوجِ لعیں کو
عباسؑ سے کرتے ہیں یہ بدظن شہِ دیں کو

حضرت کو سنا کر تو یہ کہتے ہیں ستمگار
عباسؑ سے واں اور ہی کچھ ہوتی ہی گفتار
منظور ہی آپس کا نفاق اُن کو، سو دشوار
سردار نہ ایسا ہی، نہ ایسا ہے علمدار

اک جان دو قالب ہیں یہ افضالِ خدا سے
یہ اُن سے پھرینگے، نہ وہ شاہِ شہدا سے

[1] اس بلاغت کو دیکھو کہ حضرت علی اکبرؑ اس جھوٹی خبر کو کسقدر پس و پیش کے بعد زبان پر لائے یعنی میں تو اپنی زبان سے اس خبر کو بیان کرنا بھی بے ادبی سمجھتا ہوں۔ مگر دشمن ایسا ایسا کہہ رہے ہیں ۱۲

[2] کیسی بلاغت ہی۔ عورتوں کے استقلال پر نظر کرو، حضرت زینبؑ کس استقلال اور یقین کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کہ ہرگز ایسا نہیں سکتا۔ تینوں بندوں میں حضرت زینبؑ کے کلام سے اس خبر کا یقین کرنا تو الگ رہا کسی فقرہ سے ایک خفیف سا شبہ بھی پایا نہیں جاتا ۱۲

شہ نے کہا خاموش ہو بنتِ اسد اللہ
جو کہنا ہو آہستہ کہو غل نہ کرو آہ
کیا تم نہیں عباسؑ کی باتوں سے ہو آگاہ
گر کان تک اُسکے یہ خبر پہونچے گی ناگاہ

پانی بھی ملے گا تو نہ پھر آئے گا عباسؑ
غیرت سے گلا کاٹ کے مر جائیگا عباسؑ

یہ کہہ کے گیا خیمے میں لختِ دلِ زہراؑ
دیکھا کہ ہے واں بیبیوں میں بھی یہی چرچا
ہے غرقِ عرق زوجۂ عباسؑ سراپا
فرزند کھڑا روتا ہے اُسکو نہیں پروا

بے ہوش بدن کا ہے نہ کچھ سر کی خبر ہے
وہ سب سے جدا بیٹھی ہے اور زانو پہ سر ہے

بالائے زمیں بیٹھ گئے سیدِ ابرار
تھیں جمع جو سب بیبیاں کی اُنسے یہ گفتار
شکوہ کوئی عباسؑ کا کیجو نہ خبردار
عباسؑ مرا اور مری جاں کا ہے مختار

مجھ سے نہ بُرائی مرا محبوب کرے گا
جو حق میں کریگا وہ مرے خوب کرے گا

زینبؑ[1] سے کہا روتی ہو کیا آؤ مرے پاس
عباسؑ کی جانب سے ہمیں کچھ نہیں وسواس
مانگو یہ دعا اے بہن اسوقت بصد یاس
میں روؤں نہ عباسؑ کو روئے مجھے عباسؑ

آباد ہو وہ، اور سفرِ خلد کروں میں
عباسؑ دلاور کی بلا لیکے مروں میں

[1] یہ بھی عجیب بلاغت ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو جناب عباسؑ کی وفاداری اور سچی محبت کا اسقدر یقین واثق ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ عباسؑ اُنکے بعد زندہ رہیں تاکہ اہلِ بیت علیہم السلام کے حافظ و معین ہوں اور اُن کو دشمنانِ دین کے ظلم و ستم سے بچاتے رہیں۔

عباسؑ تو ہی رحم دل اور صاحبِ اولاد
وہ ہونے نہ دیگا مرے ناموس کو برباد
عابدؑ پہ کرینگے جو ستم یہ ستم ایجاد
عباسؑ سے دیکھی نہیں جائیگی وہ بیداد

غیروں کو یتیموں پہ ترس آتا ہی زینبؑ
عباسؑ تو بھائی مرا کہلاتا ہی زینبؑ

یہ سنتے ہی دل زوجۂ عباسؑ کا تڑپا[1]
شرمائی ہوئی شہ کے قریب آئی وہ دکھیا
اور بولی کہ اے وارثِ ذریتِ زہراؑ
یہ حرف نہ تم اپنی زبان سے کہو آقا

والی مرا قربانِ امامِ دوجہاں ہو
فرزند مرا آپ کے سائے میں جواں ہو

خاطر سے علمدار کی کہتی نہیں یہ بات
فرماؤ تو فرزند کے سر پر میں رکھوں ہات
وارث مرا بچپن سے شہِ پاک کے ہی سات
حضرت کی غلامی ہی اُسے فخر و مباہات

والی مرا تم سے نہیں پھرنے کا بُلا لوں
اس بات پہ جیسی کہو سوگند میں کھا لوں

پھر جا کے درِ خیمہ پہ رو کر یہ پکاری
غیرت سے موئی جاتی ہی لونڈی یہ تمہاری
صاحب مرے ٹھہرائی ہی کیوں تم نے سواری
پھر پیاس سے غش ہو گئی شبیرؑ کی پیاری

یہ شمرِ لعیں قاتلِ شاہِ شہدا ہے
صدقے گئی دشمن سے بھلا مشورہ کیا ہے

[1] زوجۂ حضرت عباسؑ کی زبان سے دونوں بندوں پر نظر کرو۔ وہ کس استقلال اور یقین کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میرا والی ہرگز آپ سے پھر نہیں سکتا۔ اُنکے کلام کے ایک ایک فقرہ سے پایا جاتا ہی کہ اُن کو اپنے شوہر کی وفاداری اور خلوصِ عقیدت کا ایسا پختہ اور مستحکم یقین ہی کہ کسی فقرہ سے بطور فرضِ محال بھی کسی قسم کے شک و شبہ کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

یہ شمر وہ ہے جس سے یداللہ تھے بیزار
نفریں اسے کرتے تھے سدا احمدِ مختار
شبیرؑ کے سینے پہ یہی ہوئے گا اسوار
زہراؑ کے کلیجے پہ یہی پھیرے گا تلوار

خونِ شہِ مظلوم کا پیاسا یہ لعیں ہے
تم بات کرو اس سے غضب ہے کہ نہیں ہے

نے ہم کوئی اسکے ہیں نہ یہ کوئی ہمارا
ہم کو ہی وہ پیارا جسے شبیرؑ ہی پیارا
جز سبطِ نبیؐ کون ہے دنیا میں تمھارا
ہی بعدِ خدا ہم کو شہِ دیں کا سہارا

پہلے تو دعا کرتی تھی تم پھر کے گھر آؤ
پر اب یہ تمنا ہے کہ کٹوا کے سر آؤ

۳- شمر دربارِ یزید میں داخل ہوتا ہی یزید اُس سے شہدائے کربلا کی شجاعت وغیرہ کے حالات دریافت کرتا ہی۔ شمر ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ ؎

القصہ انجمن میں حرم بے نقاب آئے
پر کانپتے ہوئے صفتِ آفتاب آئے
بزمِ شراب و رقص میں عصمت مآب آئے
نذرِ یزید کے لیے سب شیخ و شاب آئے

تھا شمر کو خیال جو حاکم کے چین کا
زینبؑ کے آگے نذر دیا سر حسینؑ کا

بولا یزید دیکھ کے سر کی شکوہ و شاں
سیّد کا سر یہی ہی؟ کہا شمر نے کہ ہاں
شہزور تھا سپاہِ حسینیؑ کا ہر جواں
اطفال شیر خوار بھی تھے شیر بیگماں

رن میں انگوٹھے چوستے جھولے سے آتے ہیں

پیکاں گلے پہ کھاتے ہیں اور مسکراتے ہیں

بولا وہ مسکرا کے کہ ابتک سُنا نہیں
اُس نے کہا مبالغہ اس میں ذرا نہیں

شیرِ خدا کا زور تجھے یاد کیا نہیں؟
اژدر کو گاہوارہ میں چیرا تھا یا نہیں؟

کیا سن تھا، کے برس کے جنابِ امیرؑ تھے
کُل دو مہینے کے شہِ گردوں سریر تھے

اُس نے کہا ارے وہ امامِ انام ہیں
اس نے کہا کہ یہ بھی عزیزِ امام ہیں

دریا دلی میں شک نہیں گو تشنہ کام ہیں
سر دفترِ شکوہ و جلال انکے نام ہیں

بالکل چُنے ہوئے شرفائے مدینہ تھے
سر حلقہ نامداروں میں مثلِ نگینہ تھے

بولا ادب سے جوڑ کے پھر ہاتھ وہ شریر
قاسمؑ کی حرب و ضرب کا سُن حال اے امیر

یہ قیدیوں کے ساتھ ہی جس کی دُلہن اسیر
مہر اس سے بخشوا لیا اور والدہ سے شیر

مہدی لگائے خون میں سب لال ہو گئے
سہرا بندھا تھا سر پہ کہ پامال ہو گئے

تصویر اُن کی آنکھ کے آگے ہی اس گھڑی
وہ قہر کی نگہ وہ رگِ ہاشمی کھڑی

گرمایا باد پا تو ہوا ڈر کے گر پڑی
یہ خوف یاد ہی کہ ہرن بھولے چوکڑی

ٹھہرا نہ آسمان بھی اُتنی زمین پر
رہوار تھا ہوا پہ سوار اُسکا زین پر

چمکا کے راہوار کو چمکارنے لگے
آوازِ قہر سے ہمیں للکارنے لگے

تاکا دل اور تیرِ نگہ مارنے لگے
جو منچلے ادھر تھے وہ جی ہارنے لگے

تیغِ حسنؑ بوجہِ حسن لی نیام سے
لشکر میں آئے مثلِ علیؑ دھوم دھام سے

پھر تو خدا خدا تھا سبھوں کی زبان پر
قبضہ تھا ایک تیغ کا سارے جہان پر

تکبیر سُن کے ہاتھ دھرے ہمنے کان پر
اک برق تھی کہ کوند گئی ہر مکان پر

اک دم میں لاکھ بار بروے زمیں گری
کیوں اے امیر، یاں تو وہ بجلی نہیں گری؟

بھالا سنبھالا جس نے وہ تھرّا کے گر پڑا
ٹوکا جو ہوشیار کو غش کھا کے گر پڑا

کھینچی کمان جس نے وہ چلّا کے گر پڑا
روکا جو بھاگتے کو تو گھبرا کے گر پڑا

چل پھر سے بادپا کے ہوا تھک کے گر پڑی
تلوار یہ چلی کہ قضا تھک کے گر پڑی

بولا یزیدیاں تو مرے ہوش جاتے ہیں
اُس نے کہا بجا ہے یوں ہی سُنتے آتے ہیں

جو ایسے شیر ہوتے ہیں کم چوٹ کھاتے ہیں
خاوند کے نصیب سے ہم فتح پاتے ہیں

غالب نہ اُس پہ کوئی کسی چال سے ہوا
بسمل فقط امیر کے اقبال سے ہوا

اُس نے کہا کہ ہاں مجھے بتلا تو کیا ہوا
سائل چچا سے مرکے وہ یوسف لقا ہوا

بولا کہ غلبہ پیاس کا وقتِ وغا ہوا
مرنا تھا بس کہ شیث بڑھا یاں چھپا ہوا

برچھی غضب کی سینہ پہ موقع سے چل گئی
لے کر انی کلیجے کو باہر نکل گئی

بسمل کیے تھے اُس نے بہادر کئی جواں
چلّایا ابنِ سعد سواروں کو ناگہاں

ہاں بسملوں کے خون کے ہیں مدعی کہاں
نامِ حسنؑ مٹا ہی یہ لاشے کا ہی نشاں

ہاں غازیو! سمندوں کی باگوں کو تھام لو
لاشے کو پائمال کرو انتقام لو

نکلا زبانِ شمرِ لعیں سے جو یہ سخن
بیووں میں تڑپی ایک ضعیفہ اور اک دلہن
ماں سے کہا سکینہؑ نے ہی ہی مری بہن
کھلوا دو ایک دم کو مرے ہاتھ نے رسن

اسدم سنبھال لوں میں جگر اماں جائی کا
بی بی! بیان ہے یہ مرے دولہ بھائی کا

سن لو، جگر پہ نیزے کے کھانے کا ذکر ہی
دنیا سے دولہ بھائی کے جانے کا ذکر ہی
لاشہ پہ بابا جان کے آنے کا ذکر ہی
جو ذکر ہی بہن کے رُلانے کا ذکر ہی

حاکم کو کاش آئے حیا اس بیان سے
دولہ کے دفن کرنے کو کہدے زبان سے

حاکم پکارا خیر سُنا آگے کیا ہوا
بولا ورود حضرتِ عباسؑ کا ہوا
سر پر علیؑ کا سبز پھریرا کھلا ہوا
کوثر کا رخ کیے ہوئے، سقّہ بنا ہوا

اک حملے میں وہ نہر پہ تھا سب کنارے تھے
رو کر سکینہؑ بولی وہ عمّو ہمارے تھے

سُنتے ہی ذکرِ حملہ عباسؑ اُس گھڑی
درباریوں کو شیر کی آمد نظر پڑی
بیساختہ امیروں کی صف ہوگئی کھڑی
بولا یہ شمر اُن سے بھی قسمت فقط لڑی

یاں نام سُن کے رعب سے سب تھرتھراتے ہیں
اُنکے جگر سراہیے جو لڑکے آتے ہیں

حاکم نے سوئے شمر اشارہ کیا کہ ہاں
وہ ملتمس ہوا کہ خلاصہ کروں بیاں
بدر و حنین و خیبر و صفین و نہروان
ہیں ان کی جنگ میں بھی یہی معرکے عیاں

یکتا ہیں یہ علیؑ کی طرح سے خدائی میں
مہر و وفا میں، خلق و کرم میں، لڑائی میں

ہر حال میں مطیعِ امامِ عرب رہے
چوگرد خیمہ کے یہ شہادت کی شب رہے
دریا میں بھی حسینؑ کے کیا کیا ادب رہے
مجکو ترے نمک کی قسم تشنہ لب رہے

دم بھر نہ چھوڑتے تھے شہِ نیک ذات کو
بنتے تھے سایہ دن کو تو پروانہ رات کو

اکبرؑ کا پھر بیان کیا اُس نے بر ملا
بولا یہ نوجوان تھا سب گھر کا لاڈلا
زینبؑ نے لاکھ ضبط کیا پر نہ بس چلا
منہ سے نکل گیا مری گودی کا تھا پلا

اُس نے کہا درست ہی برچھی جو کھائی تھی
لاشہ پہ پیٹنے کو یہی بی بی آئی تھی

پہونچا کے لاشِ اکبرِ عالی وقار کو
لائے حسینؑ ہاتھوں پہ اک شیر خوار کو
ہچکی لگی تھی پیاس سے اُس گلعذار کو
منہ کھولے دیکھتا تھا شہِ نامدار کو

ہلتے تھے ہونٹ بات سمجھ میں نہ آتی تھی
تالو لپک رہا تھا زباں اینٹھی جاتی تھی

سن وہ کہ رحم کھائے ہر اک گبر اور یہود
منہ وہ گلاب سا کہ پڑیں جسپہ سب درود
ہونٹوں سے رنگ غنچۂ سوسن کا تھا نمود
اور گورے گورے ہاتھوں کی تھیں سب رگیں کبود

گھبرا کے سانس لیتے تھے آنکھیں پھراتے تھے

یہ ضعف تھا انگوٹھے بھی چوسے نہ جاتے تھے

آخر بیان بچے کا نام و نسب کیا
اُسکے لیے حسینؑ نے پانی طلب کیا
آگے نہ پوچھو حرملہ نے کیا غضب کیا
تیرِ جفا سے قتل اُسے تشنہ لب کیا

گردن پہ تیر لگتے ہی معصوم ڈر گیا
ہمکا پدر سے ملنے کو بس اَور مر گیا

زانو پہ ہاتھ مار کے یہ بولا وہ شریر
بچے کا کیا قصور تھا مارا جو اُس کو تیر
اُس نے کہا خوشی کے لیے تیری اے امیر
حاضر ہے سر بھی باچھوں میں اب تک بھرا ہے شیر

بولا یزید عذر و سماجت کروں گا میں
لا بے خطا کے سر کی زیارت کروں گا میں

ننھا سا سر اُٹھا کے جو لایا وہ ناگہاں
بانوؑ نے لیکے سر کی بلائیں یہ کی فغاں
حاکم بھی کم سنی پہ تمہاری ہے مہرباں
چُپکے نہ رہیو وقتِ سفارش ہے واری ماں

کہدو زبان ننھی سی پیارے اگر کھلے
حاکم ردا اُڑھا مری دائی ہے سر کھلے

دیکھا بہت یزید نے شش ماہے کا جمال
وہ بھولی بھولی شکل وہ بکھرے جھنڈے وبال
آنکھوں کو ڈبڈبا کے کیا شمر سے مقال
پھولوں کے ساتھ ہو گئیں کلیاں بھی پامال

میرے تو ہوش دیکھ کے یہ سر بجا نہیں
بتلا کبھی کڑا تھا ترا دل بھی یا نہیں

---

۴ - فوج آراستہ ہو رہی ہے اور علم لا کر رکھا گیا ہے - عونؑ و محمدؑ جو امام علیہ السلام

کے بھانجے اور حضرت زینبؑ کے صاحبزادے ہیں علم کے استحقاق کے دعویدار ہیں لیکن حضرت زینبؑ اُن کو سمجھاتی ہیں کہ امام علیہ السّلام سے اس منصب کی درخواست نہ کریں۔ حضرت امام حسینؑ جناب عبّاسؑ کو علم دیتے ہیں شمر حضرت زینبؑ کے صاحبزادوں کو بہکاتا ہے۔ اور وہ اُس کو جواب سخت دیتے ہیں۔ ؎

اب دیکھیے کسے یہ حسینیؑ علم ملے
کس خضرِ تشنہ لب کو یہ ابرِ کرم ملے
پردیس میں قبالۂ باغِ ارم ملے
لکھنے کو فردِ بخششِ امّت قلم ملے

کس کا یہ حق ہے معرکۂ کارزار میں
اک پاؤں سے کھڑا ہے علم انتظار میں

فوجِ خدا میں بھی ہیں طلبگار جابجا
سرگوشیاں ہیں گوشوں میں بار جابجا
یوسفؑ ہے ایک اور خریدار جابجا
مشتاق ہیں عزیز اور انصار جابجا

اک عہدۂ جلیل یہ ہے مشرقین میں
دیکھیں کسے نصیب ہو عہدِ حسینؑ میں

ہرچند سب پہ شاق ہے امید و انتظار
پر تابعِ رضا حسینیؑ ہیں جاں نثار
زینبؑ کے یادگار علم کے ہیں ورثہ دار
لیکن بڑا یہ کہتا ہے چھوٹے سے بار بار

بھائی! علم کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیو
حضرت کو اور علم کو برابر نہ دیکھیو

فضہ کو حکم دیتی ہیں زینبؑ کہ رنمیں جا
طالب کہیں علم کے نہوں میرے دلربا
دادا ہے جعفرؑ اُن کا تو نانا ہے مرتضیٰؑ
کہیو رضا حسینؑ کی منصب سے ہے سوا

آقا کے جو شرف ہیں وہ معلوم ہیں تمھیں
مانگا علم تو دودھ نہ بخشونگی میں تمھیں

کس دن کیواسطے طلبِ رایتِ ظفر
یہ دوپہر رولائے گی زینبؑ کو عمر بھر

واری بہت جیوگے جواب تم تو دوپہر
دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہے سفر

گھر سے تمھیں حسینؑ کے صدقہ کو لائی ہوں
میں بے نشان ہونے کو یثرب سے آئی ہوں

پھر سارے ناصرانِ شہِ کربلا بڑھے
مشتاقِ منصبِ علمِ مصطفا بڑھے

پڑھنے کو سب عبارتِ حکمِ خدا بڑھے
لیکن نہ بازوے شہِ گلگوں قبا بڑھے

دونوں قدم زمینِ ادب میں گڑھے رہے
سر خم کیے کھڑے تھے جہاں، واں کھڑے رہے

شبیرؑ نے لیا علمِ شافعِ امم
فرمایا تم کو شرم تھی، سو آپ آئے ہم

عباسؑ کی طرف کو بڑھے خود کئی قدم
لو بھائی لو خدا نے تمھیں کو دیا علم

حمزہؑ کی ارث پائی ہمیں نذر دیجیے
ہاتھوں پہ رکھ کے سر وہ پکارے کہ لیجیے

پھر نذر دے کے عونؑ و محمدؑ ملک شیم
تھی فکر یہ کہ فدیۂ اوّل ہوئے نہ ہم

اک گوشہ میں کھڑے تھے کئی گردنوں کو خم
ہوتے ہیں آگے فوج کے سب حاملِ علم

سبقت نصیب حضرتِ عباسؑ ہوگئی
تھی آس پہلے مرنے کی اب یاس ہوگئی

جاسوس نے عمر کے جو دیکھا یہ ماجرا
جا کر کہا عمر سے، خداوند کچھ سنا؟

بولا وہ کیا، کہا کہ مبارک کرے خدا
واں تفرقہ سپاہِ حسینی میں پڑ گیا

منصب جو اپنے جد کا نہ پایا خفا ہوئے
جعفرؑ کے پوتے فوجِ خدا سے جدا ہوئے

گردن اُٹھا کے کہنے لگا شمرِ بد شعور
ہاں سچ تو ہی کھڑے ہیں الگ سب سے وہ غیور
اُس نے کہا کہ اُن کا ملا لینا ہی ضرور
تجھ کو ہی جوڑ توڑ کا اپنے بہت غرور

ہاں ہدیۂ یزید کو زینبؑ کے لال لا
دو لختِ دل حسینؑ کے دل سے نکال لا

سینے پہ ہاتھ رکھ کے پکارا وہ بد شیم
یہ بھی ہی کوئی کام، ابھی لائے اُن کو ہم
اچھے سے اچھے اُسنے چنے جلد دو علم
پٹکوں میں جنکے نصب جواہر تھے یک قلم

دو کشتیاں تھیں، ایک میں تو سر جام تھے
اور ایک میں چُنے ہوئے میوے تمام تھے

خم ہو کے نیم قد یہ کیا شمر نے کلام
اے وارثانِ حیدرؑ و جعفرؑ مرا سلام
یہ آن بان مان گئے رستمانِ شام
واللہ آج تم پہ ہے جرأت کا اختتام

یہ بانکپن نظر میں کھپا، جی میں گڑ گیا
سکّہ دلوں میں آپ کی عزّت کا پڑ گیا

حیراں ہیں سب یہ آپ کے ماموں نے کیا کیا
تم کو نہ حاملِ علمِ مصطفیٰؐ کیا
منصب تمھارا بھائی کو اپنے عطا کیا
لشکر سے اُنکے آپ اُٹھ آئے بجا کیا

سمجھیں نہ جب بزرگ تو خُردوں کو چارہ کیا
الفت خدا کی دین ہی اس میں اجارہ کیا

یہ سُن کے آپ میں نہ محمدؑ رہے نہ عونؑ
دو عرش کانپے، یا تہ و بالا ہوئے دو کون
غصّے سے سرخ ہو گیا یاقوتِ رخ کا لون
شیرِ خدا کے شیر جو بھیریں سنبھالے کون

تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں
آدھی سروہیاں کمروں سے نکال لیں

نعرہ کیا علیؑ کے نواسوں نے یک بیک
بس بس زیادہ منہ سے نہ اب واہیات بک
چُپ نابکار چُپ، سرک اوبے ادب سرک
تیرے فریب و مکر سے اب کانپ اُٹھے فلک

بہکا اُنھیں خدا کو جو پہچانتے نہ ہوں
ظالم یہ اُن سے کہہ جو تجھے جانتے نہوں

اُن کو علم ملا تو ہمیں کو ملا علم
خاطر ہماری ایسی ہے اُن سے کہیں جو ہم
ادنیٰ کو بخشدیں علمِ خسروِ امم
پر ہم تو خوش ہیں اب کہ شرف دو ہوئے بہم

سردار ایک ماموں، علمدار دوسرا
ہم سا بھی ہے جہاں میں نمودار دوسرا

کلثومؑ یاں کھڑی تھیں پسِ پردہ بیقرار
اُن سے کہا دلیروں نے یہ ہو کے شرمسار
یوں تو ہر ایک وقت ہے بندہ قصوروار
پر اس گھڑی قصور نہیں اپنا زینہار

اماں کے دل میں شک جو پڑا ہو نکال دو
دونوں کو اُنکے پاؤں پہ لیجا کے ڈال دو

---

۵ - حضرت زینبؑ کو جب یہ حال معلوم ہو گیا کہ اُنکے صاحبزادوں نے شمر سے بات چیت کی تو وہ برہم ہوئیں کہ شمر سے کیوں کلام کیا اُسوقت

کی گفتگو اور حضرت زینبؑ کی آزردگی۔

دوڑی وفورِ طیش سے خود زینبؑ حزیں
فرمایا میں تو آئے کو تھی ننگے سر وہیں

کیا مشورہ تھا شمر سے؟ وہ بولے کچھ نہیں
فرمایا خوب! لوگوں میں چرچا ہے پھر یونہیں

شمرِ لعیں نے صلح جو ٹھیرائی ہوئیگی
مرضی تمہاری تھوڑی بہت پائی ہوئیگی

مالک سے اپنے پوچھ لیا تھا، جواب دو
زینبؑ نے تم کو اذن دیا تھا جواب دو

اکبرؑ سے اسکا ذکر کیا تھا جواب دو
اس دن کو میرا دودھ پیا تھا؟ جواب دو

اب سوچ ہے نجات جو دنیا سے پاؤنگی
جنّت میں فاطمہؑ کو میں کیا منہ دکھاؤنگی

ہی ہی مجھے تو اور ہی وسواس اب ہوا
شاید علم نہ ملنے کا تم کو تعب ہوا

عبّاسؑ کو ملا جو علم، کیا غضب ہوا
گذرا جو ناگوار، خلافِ ادب ہوا

آئے کوئی بلا نہ پدر کی کمائی پر
قربان تم ہوئے مرے عبّاسؑ بھائی پر

قدرت خدا کی اپنے بزرگوں سے آن بان
تم کو بھی اب ہوئی یہ لیاقت خدا کی شان

منہ پر حضور کہتے ہو اور چھوٹے ماموں جان
اور پیٹھ پیچھے ہائے غضب ہمسری کا دھیان

دونوں جہاں میں موردِ الزام کر دیا
تم نے ہمارے دودھ کو بدنام کر دیا

قبلہ کو ہاتھ اُٹھا کے پکارے وہ مہ لقا
امّاں بربِّ کعبہ کہ خادم ہیں بے خطا

سُن لیجیے حضور تو پھر ہو جیے خفا
جن کو حضور پالیں گی وہ ہونگے بیوفا

چاروں ملک جو مالکِ تقدیر سے پھریں
ہم دونوں بھائی حضرتِ شبیرؑ سے پھریں

قرآں پہ ہاتھ رکھنے کو موجود ہیں غلام
قرآں ہمارا کیا ہے سرِ اقدسِ امام
اکبرؑ سے پوچھ لیجیے نہ، اے فلک مقام
کھل جائے جھوٹ سچ کی حقیقت ابھی تمام

خدمت علم کی سیفِ خدائے جو پائی تھی
پہلے تو اُن کو نذر ہمیں نے دکھائی تھی

منہ سوکھتا ہی کہتے ہوئے چھوٹے ماموں جان
غربت میں اُن کی جان کو اللہ کی امان
ہم خاکِ پا ہیں اُنسے بھلا ہمسری کا دھیان
اُنسے نہ ضد نہ ہٹ ہی ہمیں اور نہ آن بان

وہ باپ کی جگہ ہیں، بجائے امام ہیں
وہ نائبِ حسینؑ ہم اُن کے غلام ہیں

شمرِ زباں دراز پہ تھا اختیار کیا
کچھ یاد بھی نہیں کہ بکا نابکار کیا
کاذب کے قول و فعل کا ہی اعتبار کیا
ہم تو وہی ہیں آپ کو پھر اضطرار کیا

ایسے دیئے جواب کہ نقشہ بگڑ گیا
جیتا زمیں میں صورتِ قارون وہ گڑ گیا

زینبؑ پکاری میں تو ہوئی سب میں سرنگوں
ہی ہی ہر ایک رنج سے ہی رنج یہ فزوں
اک تیغ سے بہائیگا یہ پنجتنؑ کا خوں
سر کھولوں شیرِ حق کو پکاروں دُہائی دوں

الفت جو تھی حسینؑ علیہ الصلوٰت کی
کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی

۶ - جناب حرؑ شہادت پا چکے ہیں حضرت زینبؑ اپنے بیٹوں کو اُن کی مثال دیکر شہادت کی ترغیب دیتی ہیں، اُن کی فہمائش آزردگی اور دیگر واقعات

پھر عونؑ و محمدؑ کو قریب اپنے بُلایا
اور لاش ہر اُول کی دکھا کر یہ سُنایا
سردارِ دو عالم کے عوض سر جو کٹایا
دیکھو یہ شرف حرِؑ وفادار نے پایا

اس موت میں جینے کا مزہ مِل گیا حرؑ کو
شبیرؑ کے ملنے سے خدا مِل گیا حرؑ کو

پہچانو تو پیارو، یہ فرشتہ ہی کہ حرؑ ہی؟
یہ وہی بہادر ہی کہ غلطاں کوئی دُر ہی
رُخ مہر سے اللہ کی رشکِ مہ و خور ہی
شبیرؑ کا بندہ ہوا دوزخ سے بھی حُر ہی

کیا خوب دمِ جنگ نصیب اُسکا لڑا ہی
یہ مُردہ ہی یا چودھویں کا چاند پڑا ہی

کیا تختۂ تن پر جبینِ زخم کھلے ہیں
کیا خدمتِ شبیرؑ کے پھل اُسکو ملے ہیں
نے پیاس کے شکوے ہیں نہ فاقوں کے گلے ہیں
اب آٹھ بہشت اُس کی شہادت کے صلے ہیں

جو مرد ہیں، وہ نام پہ سر دیتے ہیں پیارو
سر دیتے ہیں اور تاجِ شرف لیتے ہیں پیارو

اور ہائے پسر کی جو صدا آتی ہی واری
ماں حرؑ کی نہیں روتی ہی نانی یہ تمہاری
بیٹوں نے کہا پرورش آقا کی ہی ساری
دنیا میں خدا رکھے، یہ فیض اُنکا ہی جاری

سردار ہیں حور و ملک و جن و بشر کے
بندے ہیں یہ مختار ہیں اللہ کے گھر کے

زینبؑ نے کہا شرط ہی خدمت بھی بلا لوں
ہاتھ آتی ہی بے جہد یہ دولت بھی بلا لوں

کی حرؑ نے غلامی بھی رفاقت بھی بلا لوں
ایسوں ہی کو ملتی ہے یہ عزّت بھی بلا لوں

گو عام ہے بخشش پسرِ شیرِ خدا کی
پر حرؑ نے وفا کی توشہِ دیں نے عطا کی

میں صبح سے سمجھاتی ہوں تم کو نہیں کچھ دھیان
منہ دیکھتے تم رہ گئے حرؑ ہو گیا بیجان
یہ موت کا بازار ہے یہ قتل کا میداں
کوشش کرو دیکھو نہیں پھر ہو گے پشیماں

سب جنسِ شہادت کے لیے لڑتے ہیں پیارے
تیغوں پہ خریدار گرے پڑتے ہیں پیارو

کِسدن کے لیے سیکھا ہے نیزوں کا ہلانا
گر آج ہی بھالا کسی شامی پہ نہ تانا
کیا بھول گئے تیر کا تودے پہ نگانا؟
ماموں کے حریفوں کو کرو آج نشانا

چو رنگ لگاتے تھے ہر اک روز وطن میں
اک دو کو بھی چو رنگ نہ تم نے کیا رن میں

کیوں پوچھوں میں اکبرؑ کو بلا کر کہ یہ کیا ہے
شاگردوں کو اپنے یہی تعلیم کیا ہے
بابا کو تمہارے لکھوں کیا قہر کی جا ہے
صاحب کے پسر جیتے ہیں حرؑ قتل ہوا ہے

اولاد سے گر چرخ یونہیں شاد کریگا
کاہے کو کوئی خواہشِ اولاد کریگا

دکھلاؤ ہنر نیزے کے اس دم تو بجا ہے
اب تیر کا پلّہ نہ دکھایا تو خطا ہے
شہ قدر شناس اور یہ میدانِ وغا ہے
اک دم میں یہاں خاتمۂ آلِ عبا ہے

اب نیزہ ہے اور سینۂ اکبرؑ ہے دوہائی
اب تیر ہے اور گردنِ اصغرؑ ہے دوہائی

یہ سُن کے لگے کہنے وہ غیرت سے لرز کر
بس والدہ صاحب کہ چھری چلتی ہے دلبر
کب آپ کے ارشاد سے فدوی ہوئے باہر
کب ماموں نے فرمایا کہ صدقے نہ کیا سر

آقا جو رضا دیں تو وفا اپنی دکھا دیں
تیغوں سے گلے برچھیوں سے سینے ملا دیں

غصے نہ ہو سر تیغوں سے کٹواتے ہیں اماں
لو قبضۂ حیدر کی قسم کھاتے ہیں اماں
دنیا سے پُر ارمان چلے جاتے ہیں اماں
میدان سے دولھا ابھی بن آتے ہیں اماں

حضرت نہ خفا ہوں نہ خفا ہوں نہ خفا ہوں
لو دودھ نہ تم بخشیو گر ہم نہ فدا ہوں

تلوار کی موت اپنے بزرگوں کا ہے جوہر
مرتے ہوئے پی لیتے ہیں آبِ دمِ خنجر
رن مردوں کی جاگیر ہے اور خانۂ زیں گھر
تیغوں کی چمک چھانوں ہے اور دھوپ ہے بستر

دل اپنا کفن اور جنازے سے غنی ہے
تابوتِ رواں گھوڑے ہیں جوشن کفنی ہے

زخمی ہو جو سر، نانا کا ورثہ ہے سراسر
گر شانے کٹیں، ہاتھ لگے رتبۂ جعفرؑ
دنداں ہوں شکستہ، تو ملے ارثِ پیمبرؐ
ہو چاک جو سینہ، تو دلِ حمزہؑ میں ہو گھر

کیوں اماں ہم ایسے ہیں کہ جو موت سے ڈر جائیں
جب کہیے گلے نیچوں سے کاٹ کے مر جائیں

ماموں تو بھلا قبلہ و کعبہ ہیں ہمارے
اُنکے تو غلاموں سے ہمیں سر نہیں پیارے
بچوں کی عوض ہم کو کوئی جان سے مارے
سُنکر کہا زینبؑ نے میں قربان تمہارے

اللہ ہو خوش تم سے مجھے خوش کیا تم نے

جو جو مرے دل میں تھا، وہ سب کہہ دیا تم نے

۷۔ حضرت علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں جانے کے لیے پھوپی اور ماں سے اجازت طلب کرتے ہیں اُن دونوں کا اضطراب اور سوال و جواب

تیاریِ گلگشتِ جناں کرتے ہیں اکبرؑ
باغ اپنی جوانی کا خزاں کرتے ہیں اکبرؑ
امّت پہ تصدق دل و جاں کرتے ہیں اکبرؑ
ماں باپ کی غربت پہ فغاں کرتے ہیں اکبرؑ

بانوؑ کے کلیجے میں ہے ناسور ابھی سے
آنکھیں شہِ بیکس کی ہیں بے نور ابھی سے

بادل کی طرح رن میں عدو چھائے ہوئے ہیں
مولا سرِ تسلیم کو نہوائے ہوئے ہیں
اسوقت حرم خیمہ میں گھبرائے ہوئے ہیں
ہمشکلِ نبیؐ بہرِ وداع آئے ہوئے ہیں

عبّاسؑ کے ماتم کو تو موقوف کیا ہے
اس چاند کو ہالے کی طرح گھیر لیا ہے

برہم ہیں یہ ماتم کی صفیں دیکھ کے ہر سو
خالی ہے جو خیمہ تو بھرے آتے ہیں آنسو
سر ننگے جو کنبہ ہے تو بل کھاتے ہیں گیسو
عبّاسؑ سا مہ رو ہے نہ قاسمؑ سا ہے گلرو

حیراں ہیں کہ دربارِ پدر ہو گیا خالی!
رن بھر گیا گھر والوں سے گھر ہو گیا خالی

منّت ہے کنیزوں کی کہ اے بانوؑ کے گلفام
کیوں فرش بچھا دیں؟ کوئی دم کیجیے آرام
یہ کہتے ہیں مظلوموں کو آرام سے کیا کام
مٹتا ہے جنابِ علیؑ و فاطمہؑ کا نام

نیند آج کی کھوئینگے تو آرام ملے گا

اب قبر میں سوئینگے تو آرام ملے گا

اکبرؔ کی ہر ایک بات پہ تھراتی ہی بانو
ماتھے پہ شکن دیکھ کے غش کھاتی ہی بانو
کچھ سوچنے لگتے ہیں تو گھبراتی ہی بانو
تکتے ہیں جو رن کو تو موئی جاتی ہی بانو

اک ہاتھ کلیجے پہ دھرے ایک جبیں پر
آنکھوں کو جھکائے ہوئے بیٹھی ہی زمیں پر

اکبرؔ کی گذارش ہی کہ منگوائیں سواری
ماں کہتی ہی لو کیوں نہ رضا دونگی میں واری
پوری ہوئیں جو جو کہ مرادیں تھیں ہماری
گھر بھر گیا بچوں سے دلہن دیکھی تمہاری

کیا دیکھ کے دل خوش مرا ہوتا ہی بلالوں
پہلو میں دلہن گود میں پوتا ہے بلالوں

پالا تھا اسی دن کے لیے تو، کہ جدا ہو
آنکھوں کی نہ عینک ہو نہ پیری کی عصا ہو
ہم ڈھونڈیں دلہن، اور تمہیں شوقِ قضا ہو
کچھ بات سمجھ کر کرو ناحق نہ خفا ہو،

ہاں کرتی ہوں واری نہ نہیں کرتی ہوں واری
نازک ہی مزاج آپ کا میں ڈرتی ہوں واری

کافی ہی تری چاہ جو پانی نہ ملے گا
دل باغ ہی گر داغ جوانی نہ ملے گا
ڈھونڈونگی تو کیا کیا مجھے جانی نہ ملے گا
پر احمدِ ثانی! ترا ثانی نہ ملے گا

انصاف نہ دو ہاتھ سے ہم شکلِ نبی ہو
دیکھو کہیں مجھ سے نہ کوئی بے ادبی ہو

اکبرؔ نے یہ کی عرض کہ خادم کا ادب کیا
بستے بھی ہیں لٹتے بھی ہیں گھر سا عجب کیا
ہم تو ہیں پُر ارمانِ ازل، عیش و طرب کیا
فرمائیے دنیا میں شجر پھلتے ہیں سب کیا

کیا آپ نے تقدیر کو پھرتے نہیں دیکھا
بجلی کو کسی باغ پہ گرتے نہیں دیکھا

کچھ بانوئے بے کس کو جواب اسکا نہ آیا
فرزند کا منہ دیکھ کے سر اپنا جھکایا
دروازہ پہ گھوڑا علی اکبرؑ نے منگایا
آداب بجا لا کے پسر نے یہ سنایا

کپڑے بھی بدلواؤ نہ تکلیف اگر ہو
لیکن نہ ابھی حضرتِ زینبؑ کو خبر ہو

وہ بولی یہ مشکل ہے یہ دشوار ہے واری!
بچپن سے وہی رکھتی ہیں پوشاک تمہاری
اتنے میں وہاں آکے سکینہؑ یہ پکاری
وہ سن بھی چکیں آئی ہے ڈیوڑھی پہ سواری

غش آگیا ہے ہوش میں آلیں تو وہ آئیں
سب جا کے کلیجے کو سنبھالیں تو وہ آئیں

بولے علی اکبرؑ تمہیں کہہ آئیں پھوپی سے
بیزار ہوئی ہونگی وہ ہمشکلِ نبیؐ سے
بتلاؤ تو کیا جا کے کہا بنتِ علیؑ سے؟
وہ بولی کہ بھیا مجھے تم پیارے ہو جی سے

کہہ آئی میں اُنسے کہ کہیں جاتے ہیں بھائی
اماں کو بڑی دیر سے رُلواتے ہیں بھائی

ناگاہ نمودار ہوئیں زینبؑ غمناک
چہرے پہ ملے خاک گریبان کیے چاک
اک خادمہ بغلوں میں لیے بقچہ پوشاک
تن کانپتا تھا سرخ تھا غصہ سے رخِ پاک

کہتے تھے حرم غیظ میں یہ بنت علیؑ ہے
یا فاطمہؑ ہنگامۂ محشر میں چلی ہے

اکبرؑ کے سنانے کو یہ کہتی تھی زباں سے
اے عونؑ و محمدؑ تمہیں لاؤں میں کہاں سے

جو کام کیا پوچھ کے مجھ سوختہ جاں سے
اب قدر ہوئی پیاروں کی جب چھٹ گئے ماں سے

کیا جانکے دم بھرتی تھی ہمشکل نبیؐ کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

بانوؑ نے کہا کان میں اکبرؑ کے خبردار
جو چاہیں یہ فرمائیں نہ تم بولیو زنہار
اسوقت جلالِ شہِ مرداں کے ہیں آثار
واری میں رضا دینے کا کر جاؤنگی انکار

سیدانیاں بھی دیکھ کے آمد کو ڈری ہیں
خالی یہ لرزنا نہیں غصے میں بھری ہیں

پاس آکے کہا زینبؑ بیکس نے برقت
لو بھائی یہ ملبوس یہ اکبرؑ کی امانت
بچپن کے بھی کرتے ہیں جوانی کے بھی خلعت
اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت

تم والدہ ان کی ہو پدر سرورِ دیں ہیں
یہ آج کھلا ہم کوئی اکبرؑ کے نہیں ہیں

جو بات ہو سچ، اُسکا بُرا ماننا کیا ہے
قابل مرے ہاتھوں کے یہ پوشاک بھلا ہے
میں نے ابھی بیٹوں کا لہو منہ پہ ملا ہے
یہ پیرہنِ ثانیِ محبوبِ خدا ہے

کیوں ہات سے میرے تمہیں وسواس نہ آئے
اکبرؑ کو قسم دو کہ مرے پاس نہ آئے

وہ بولی کہ جو کہیے سزاوار ہے بانوؑ
دائی ہے نہ مادر ہے نہ مختار ہے بانوؑ
اکبرؑ ہیں جو انمرگ عزادار ہے بانوؑ
ہے ہے! عجب آفت میں گرفتار ہے بانوؑ

یہ تم نے نہ پوچھا کہ بنی کیا مرے جی پر
حضرت بھی خفا ہوتی ہوئی آئیں مجھی پر

پھر رونے لگی بیٹھ کے واں زینبؑ نا چار
ہمشکلِ نبیؐ لپٹے یہ کہتے ہوئے اک بار
میری پھوپی اماں مری مالک مری مختار
میں تو ہوں غلام آپ کا کیوں آپ ہیں بیزار

ہم چاہتے ہیں تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ! اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو
دم رکتا ہے باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو
ماں بیٹھی ہے وہ، جاؤ گلے اُسکو لگالو
بانوؑ کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو

میں پیار نہیں کرتی میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ میں تمہاری پھوپی اماں نہیں ہوتی

جیتی رہیں بھابی وہ ہیں مختار تمہاری
میں کاہے کو ہونے لگی حقدار تمہاری
جاؤ نہ، سواری تو ہے تیار تمہاری
یوں مجھ سے نظر پھر گئی اک بار تمہاری

کس سے کہوں کیا خونِ جگر پیتی ہوں ہے ہے
دل پر تو چھری چل گئی اور جیتی ہوں ہے ہے

زینبؑ نے بہت آپ کو اکبرؑ سے چھڑایا
اکبرؑ نے انہیں منت و زاری سے منایا
آنسو جو تھمے، مطلبِ دل اپنا سنایا
زینبؑ نے کہا لو وہی مذکور پھر آیا

میں سمجھی تھی ناشاد کو اب شاد کروگے
سچ مچ علی اکبرؑ مجھے برباد کروگے

میں تیغ سے کٹتے یہ گلا دیکھ سکونگی
جو سن نہیں سکتی وہ بھلا دیکھ سکونگی
اس باغ پہ بارانِ بلا دیکھ سکونگی
اس چاند سے منکے کو ڈھلا دیکھ سکونگی

آنسو مرے پونچھے تھے تو رلوانے کی خاطر

کیوں لال! یہ منظر تھا بچھڑ جانے کی خاطر

اکبرؑ نے کہا آپ کی الفت کے میں قرباں
اب چند قدم کیجیے تکلیف پھوپی جاں
اک غم کا مرقع تمہیں دکھلاؤں گا اس آں
پھر آپ قسم دینگی کہ مرجاؤ پُر ارماں

پوچھا وہ مرقع کہاں اے حق کے ولی ہے
کی عرض پسِ پشت خیامِ نبوی ہے

بڑھکر علی اکبرؑ نے قنات ایک اُٹھائی
گردن جو وہاں آنکے زینبؑ نے جھکائی
دیکھا کہ کمر پکڑے ہوئے روتے ہیں بھائی
بیساختہ چلائی کہ اللہ دوہائی!

اس غم کے مرقع کے میں قربان یہی ہے؟
رو کر کہا اکبرؑ نے پھوپی جان یہی ہے

للہ سرِ پاک کے نہوانے کو دیکھو
فاقے سے مرے باپ کے تھرانے کو دیکھو
تنہا یہاں رونے کے لیے آنے کو دیکھو
ویران شہیدوں کے جلو خانے کو دیکھو

جو دم ہی غنیمت ہے، کچھ اب حال نہیں ہی
روکا جو مجھے، فاطمہؑ کا لال نہیں ہی

پھر تو یہ پکاری وہ یداللہ کی جائی
سیدانیو! دولہ کو سنوارو اجل آئی
پوشاک نئی ہاتھوں پہ رکھ کر کوئی لائی
معراج تنِ پاک پہ اُس حامیہ نے پائی

پھاڑا علی اکبرؑ نے گریبان قبا کا
اور نوحہ کیا ہائے چچا ہائے چچا کا

نکلا وہ مرادوں کا چمن ہونے کو تاراج
ارمان پکارے کہ ملے خاک میں ہم آج
پہونچا گئے در تک حرمِ صاحبِ معراج
دوڑا عقبِ خیمہ سے کونین کا سرتاج

حضرت نے جو پوچھا کہ فدا ہوتے ہو ہم پر
فرزند نے سر رکھدیا بابا کے قدم پر

پھر سوئے فلک دیکھ کے شہ نے یہ سُنایا
ایسا مجھے اس امّتِ بیدیں نے ستایا

بندہ کو گواہی تری کافی ہے خدایا
نانا کی زیارت سے بھی اب ہاتھ اُٹھایا

سر کاٹا مرے قافلے والوں کا سفر میں
تصویرِ نبیؐ کی بھی نہ چھوڑی مرے گھر میں

اس شکل کا میں اور کوئی بیٹا نہیں رکھتا
بندہ، کوئی جز خالق یکتا نہیں رکھتا

پر تیرے حضور اس کی بھی پروا نہیں رکھتا
سب کچھ ہی عنایت سے تری کیا نہیں رکھتا

گر درد دیا ہی تو تحمّل بھی دیا ہے
مالک مرے جو تو نے کیا خوب کیا ہے

۸۔ عونؑ و محمدؑ زخمی ہو کر خیمہ میں آئے ہیں اور قریبِ مرگ ہیں۔ حضرت زینبؑ یہ دردناک منظر دیکھکر بہت صبر کرتی ہیں، لیکن آخر کار ضبط نہیں ہو سکتا اور بہ مینِ جگر خراش کرتی ہیں ؎

فضّہ یہ کہہ رہی تھی کلیجہ کو تھام تھام
کچھ سوچ کر ٹھہر گئے واں سیّدِ انام

شہ پہونچے لاش لے کے قریبِ خیام
رو کر کیا یہ اکبرؑ و عباسؑ سے کلام

لے جاؤ ان کو تم مری خواہر کے سامنے
ہم جائینگے نہ زینبؑ مضطر کے سامنے

لاشوں کو لیکے خیمہ میں آئے وہ رشکِ ماہ
اہلِ حرم کا حال ہوا دیکھ کر تباہ

بنت علیؑ کی لاشوں پہ جسدم پڑی نگاہ
سجدہ میں جھک گئی جگرِ ضیغمِ الہ

بیٹوں نے ہاتھ اُٹھائے جو تسلیم کے لیے
دیکر دعا کھڑی ہوئیں تعظیم کے لیے

پھر پڑ گئی جو اکبرؑ و عباسؑ پر نظر
دیکھا کہ دونوں روتے ہیں تھامے ہوئے جگر
چلائی اور تڑپنے لگی گر کے خاک پر
اکبرؑ بتاؤ جلد برادر گئے کدھر

خیمہ میں جو پھوپی کی کمائی کو لائے ہو
مقتل میں کھو کے کیا مرے بھائی کو آئے ہو

لیجاؤ دونوں لاشیں مجھے اسنے کام کیا
مجکو کوئی عزیز نہیں بھائی کے سوا
مرجاؤنگی تڑپ کے میں اے ابنِ مرتضیٰؑ
بھائی جواب دو مجھے بھائی کو کیا کیا

کھویا کہاں نشانِ علیؑ و بتولؑ کو
عباسؑ! تم سے لونگی میں سبطِ رسولؐ کو

غش کھا کے پھر زمیں پہ گری بنتِ مرتضیٰؑ
کہرام اُٹھا یہ خیمہ میں زینبؑ کی قضا
گھبرا کے دوڑے خیمے کو مظلومِ کربلا
آئے جو صحنِ خیمہ میں دیکھا یہ ماجرا

لاشوں کے گرد بیویں ہیں حلقہ کیے ہوئے
کلثومؑ گود میں ہے بہن کو لیے ہوئے

گھبرا کے پوچھا شاہ نے ہمشیر کیا ہوا
بیٹوں کی لاش دیکھ کے کیا غش ہی آگیا
غش میں سُنی جو شاہ کی زینبؑ نے یہ صدا
جان آگئی بدن میں پکاری کہ میں فدا

کچھ غم نہیں جو قتل ہر اک لال ہو گیا
دیکھا نہ تھا جو آپ کو یہ حال ہو گیا

شہ بولے اے بہن مری الفت یہ کب تلک
کی عرض ہاتھ جوڑ کے جیتی ہوں جب تلک
بولے، گلے لگایا نہ لاشوں کو اب تلک
تحسین کا سخن بھی نہ تم لائیں لب تلک

اُٹھو گلے لگاؤ کہ لڑ بھڑ کے آتے ہیں
ہم دیکھنے کو عابدِ مضطر کے جاتے ہیں

یہ کہہ کے پھر وہاں سے چلا حق کا وہ ولی
تھرّا کے اُٹھی بنتِ علیؑ کہہ کے یا علیؑ
آئی جو پاس لاشوں کے زہراؑ کی لاڈلی
وہ آہ کی کہ سب کے دلوں پر چھری چلی

پھر ہو سکا نہ ضبط دلِ پاش پاش سے
گر کر زمیں پہ لپٹی وہ دونوں کی لاش سے

شفقت سے بار بار گلے سے لگاتی تھی
لیتی تھی گہ بلائیں کبھی صدقے جاتی تھی
آنکھوں سے آنکھیں ملتی تھی آنسو بہاتی تھی
بوسے لبوں کے لیتی تھی اور رنج کھاتی تھی

کہتی تھی واہ پیارو بڑا کام کر چلے
ماموں پہ صدقے ہو کے مرا نام کر چلے

ایسا تمھیں نہ جانتی تھی بنتِ مرتضیٰؑ
جی بھر کے تم کو پیار نہ مینے کبھی کیا
جب چاہا بے قصور بھی میں نے گھڑک لیا
پیارو! خدا کے واسطے بخشو مری خطا

جنت میں سامنا جو ہو اماں بتولؑ کا
شکوہ نہ اُن سے کیجیو مجھ دل ملول کا

پیارو! وہاں چلے ہو جہاں کا نشاں نہیں
رہبر نہیں، رفیق نہیں کارواں نہیں
بچے ہو، ساتھ باپ نہیں اُمّاں نہیں
زخموں سے چور چور ہو تاب و تواں نہیں

منزل تلک غضب کی ہے تنہائی راہ میں

بھائی سے ہوشیار رہے بھائی راہ میں

پوچھے درِ بہشت پہ گر خازنِ جناں
تم کون ہو، کہاں سے ہوا ہے گذر یہاں؟
ہاں افصح العرب کے نواسو! نثار ماں
اُس دم کہیں نہ پیاس سے لکنت کرے زباں

کہنا کہ ہم شبیہِ پیمبرؐ کے بھائی ہیں
شبیرؑ کے غلام ہیں، اور کربلائی ہیں

غش میں سُنا جو دونوں نے زینبؑ کا یہ بیاں
گھبرا کے آنکھیں کھول کے بولے وہ نیمجاں
اے اماں جان، جاتے ہیں اب ہم سوئے جناں
حُرمت کا آپ کی رہے خالق نگاہباں

یہ کہہ کے منہ پھرائے تو چہرے بدل گئے
تسلیم کی اشاروں سے اور دم نکل گئے

زینبؑ کو جو قسمت نے یہ سامان دکھایا
مادر ہی کا تو دل تھا وہ آخر کو بھر آیا
فرزندوں کے مُردوں کو کلیجہ سے لگایا
پھر دونوں کے لاشوں کو ہلا کر یہ سُنایا

وہ بات جو سمجھاتے تھے مجھ تشنہ دہن کو
ماموں سے بھی کہدو کہ نہ اب جائیں وہ رن کو

میں نے جو سُنا نہر پہ تم دونوں سدھارے
ہی ہی تمہیں کیا کیا نہ کہا غصہ کے مارے
بخشو مجھے اب پاؤں میں پڑتی ہوں تمہارے
تم ماموں کے پیارے ہو تم اللہ کے پیارے

دانستہ تو کچھ ماں نے نہیں تم سے کہا تھا
پر کیا کروں قابو نہ مرا دل پہ رہا تھا

تم دونوں نے تو ہاتھ نہ پانی سے لگایا
اور حیف کہ دل کو مرے وسواس آیا

اس بات پہ میں نے تمہیں گھر میں بلایا
اور گود میں لاشوں کو نہ الفت سے اُٹھایا

خدمت میں قصور اور نہیں ماں نے کیا ہے
گر ہے تو یہی پالنے والی کی خطا ہے

۹- شیریں کو خبر ہوئی کہ امام حسین علیہ السلام مع تمام خاندان کے اُسکے گھر تشریف لاتے ہیں، وہ مہمانی کا سامان کرتی ہے۔ اُس کی ہمسایہ عورتیں اُس کی خوش قسمتی پر مبارکباد دیکر اہلِ حرم سے اپنا اشتیاقِ قدمبوسی ظاہر کرتی ہیں۔ ؎

پہونچی قریب قلعۂ شیریں کے جب سپاہ
چلائے در پہ جاکے یہ شیریں کے خیرخواہ
شیریں! مبارک، آیا مدینہ کا بادشاہ
شیریں پکاری سچ ہے؟ وہ بولے خدا گواہ

برق نمود وہ مدنی قافلے کی ہے
گھر گھر خبر حسینیوں کے داخلے کی ہے

سُنتے ہیں ہم رکاب میں ساری خدائی ہے
بہرِ جہاد نکلے تھے سو فتح پائی ہے
بندی بھی ایک فوجِ حسینی میں آئی ہے
زینبؑ تری خوزادی بھی تشریف لائی ہے

بازار ساتھ ہے شتروں پر خزانہ ہے
سامانِ سلطنت ہے بڑا کارخانہ ہے

شیریں اور اُسکے شوہر میں اس مسرت کے متعلق گفتگو ہوتی ہے شیریں اُس سے خطاب کرکے کہتی ہے۔ ؎

وہ بولی قابل اُنکے نہ کھانا ہے نہ مکاں
فرش اُن کا عرش ہے تو غذا میوۂ جناں

لونڈی کو سرفراز کرینگے شہِ زماں
سامان تھوڑا تھوڑا میں کرتی ہوں سب یہاں

جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو
لونڈی کے گھر میں آتے ہیں وعدہ وفائی کو

ہمسائیاں کھڑی ہوئیں ہر سو کہ ہم بھی آئیں
دن رات مانگتے تھے اسی روز کی دعائیں
بیکونسے گھر کو جھاڑیں، تو فرش آنکھوں سے بچھائیں
صدقے کیا تھا، جو سر و ساماں کہو وہ لائیں

پوچھو تو اغنیا سے، یہ دولت بھی پائی ہے؟
آئے حسینؑ اب ترے گھر میں خدائی ہے

آیا ہے جن کی شان میں قرآں وہ آتے ہیں
کعبہ کے ہیں جو قبلۂ ایماں وہ آتے ہیں
جنکے گدا ہیں قیصر و خاقاں وہ آتے ہیں
فطرس ہے جنکا بندۂ احساں وہ آتے ہیں

شیریں! خدا کے پیاروں کے پیارے حسینؑ ہیں
مالک ہمارے اور تمہارے حسینؑ ہیں

تم سے سفارشوں کے ہیں امیدوار ہم
پائیں سلامِ حضرتِ زینبؑ کی بار ہم
دیکھیں تمہاری بی بی کے عزّ و وقار ہم
ایراں کی شاہزادی ہے کیسی نثار ہم

ہمسایہ کے حقوق ادا آج کیجیو
ہم کو بُلا کے رتبۂ معراج دیجیو

اُس نے کہا میں سعی کو حاضر ہوں حذر کیا
پر میری بیبیوں کا چلن سب سے ہے جدا
ارماں امیر زادیوں کو کوفے میں رہا
مہماں کسی کے گھر نہ گئیں بنتِ مرتضےٰ

تم سب کا اشتیاقِ زیارت سُناؤں گی
زینبؑ کا حکم ہوگا تو بیشک بُلاؤں گی

پر ہاتھ جوڑتی ہوں کہ تنہا ہی آئیو
لڑکوں کو اپنے ساتھ خدارا نہ لائیو
پردہ نہ دختران علیؑ کا بھلائیو
مجکو عتاب آل نبیؐ سے بچائیو

یارب ہنسی خوشی مرے سب میہماں رہیں!
میں دمبدم فدا ہوں، وہ مہرباں رہیں

بیت الحرم وہ گھر تھا کہ تھی آمد حرم
ہر سنگ فرش تھا حجر الاسود حرم
آئینوں سے حلب تھا تو گلدستوں سے ارم
ہر شے قرینے سے تھی، زیادہ کہیں نہ کم

نظارۂ حسینؑ کے ارماں دکھا دیئے
پلکوں کی چلمن آنکھوں کے پردے لگا دیئے

مسند بچھائی بہر شہنشاہ مشرقین
تکیے پر ہما کے لگائے بزیب و زین
کیا جانتی تھی ہوگا یہاں ماتم حسینؑ
سن پایا تھا صغیر ہے بانوؑ کا نور عین

دالان میں درست کیا گاہوارے کو
بولی میں خود جھلاؤنگی بی بی کے پیارے کو

گھر کو بنا سنوار چکی جب وہ نیک نام
حجرے میں پھر سلیقے سے کھانے چنے تمام
شربت صراحیوں میں بھرا دھو کے سارے جام
ہی ہی نہ یہ خبر تھی کہ پیاسے موئے امام

میوے چنے طباقوں میں اکبرؑ کے واسطے
کوزوں میں دودھ بھر دیا اصغرؑ کے واسطے

۱۰- حضرت شہر بانوؑ کی اہل حرم سے رخصت۔

بے شمع کربلا میں جو قندیل دیں ہوئی
تاریک و تار بزم زمان و زمیں ہوئی

کعبے کی شکل، فاطمہؑ ماتم نشیں ہوئی
بیتاب روحِ مرشدِ روح الامیں ہوئی

غل تھا ستونِ عرشِ امامت گرا دیا
یعنی چراغِ بزمِ نبوّت بجھا دیا

دنیا میں تو علامتِ محشر تھی آشکار
مقتل میں ذوالجناحِ شہِ دیں تھا بے سوار

پھرتا تھا گردِ لاشۂ شبیرؑ بار بار
جیسے پسر کی لاش پہ مادر ہو بے قرار

کہتا تھا اے حسینؑ کہاں تجکو پاؤں میں
بے تیرے خیمہ گاہ میں کس طرح جاؤں میں

جب ذوالجناح نے یہ کیا نوحہ ایکبار
آئی صدا یہ لاش سے اے میرے راہوار

پہونچا چکا تو منزلِ مقصد پہ اپنا بار
خیمہ میں جا، کہ بانوؑ کو ہے تیرا انتظار

خدمت ادا کی راکبِ دوشِ رسولؐ کی
تجھ پر سوار ہوگی بہو اب بتولؑ کی

یہ سُنکے خیمہ گہ کو چلا اسپِ باوفا
زینبؑ کھڑی تھی منتظرِ شاہِ کربلا

ناگاہ خالی پشت وہ گھوڑا نظر پڑا
تیروں کے پھل ہیں زین میں پیوستہ جابجا

ہے تنگ تو کٹا ہوا اُس خوش خرام کا
اور خاک پر لٹکتا ہے تسمہ لگام کا

زینبؑ اُٹھا کے پردے کو چلائی ایکبار
اے اسپِ بے سوار کہاں ہے ترا سوار

تو نے بھی بھوکے پیاسے سے کی دوری اختیار
سچ ہے نہیں غریبوں کا کوئی رفیق و یار

آیا نہ رحم کچھ تجھے آقا کے حال پر
کیا بیکسی کا وقت ہے زہراؑ کے لال پر!!!

ٹکرا کے سر کو خاک پہ بولا وہ راہوار
کیا پوچھتی ہو بیکسیِ شاہِ نامدار
میں بے سوار ہو گیا مارا گیا سوار
جب زخم کھائے نہصد و پنجاہ یک ہزار

اُس دم تمہارے بھائی کو غش آیا زین پر
مجھ سے کہا کہ ٹیک دے گھٹنے زمین پر

زینبؑ نے پوچھا گھوڑے سے پھر کیا ہوا
صدمہ یہ گرتے گرتے ہوا وا مصیبتا!
اُس نے کہا کہ ظلم ہوا اور غضب ہوا
سب زخم شہ کے پھٹ گئے دریائے خوں بہا

اکبرؑ نہ تھے جو اُن کو بٹھاتے سنبھال کر
غش ہو گئے حسینؑ لہو مُنہ سے ڈال کر

اصغرؑ کی قبر نئی سی شہ کے حضور ہے
حق میں مرے یہ حکمِ امامِ غیور ہے
اکبرؑ ہے پاس، لاشۂ عباسؑ دُور ہے
اے گھوڑے پردہ داریِ بانوؑ ضرور ہے

کہلا کے بے سوار کسے منہ دکھاؤں میں
بانوؑ کو تم وداع کر دیا نسے جاؤں میں

یہ سُنکے پیٹنے لگیں سیدانیاں تمام
زینبؑ سے ہاتھ باندھ کے پھر یہ کیا کلام
اور الوداع کہنے لگی بانوئے امام
بچوں کی میرے رہنا نگہبان صبح و شام

بانوؑ کا کیا ہے، پالنے والی ہے دائی ہے
زینبؑ تمہارے بھائی کی یہ سب کمائی ہے

اوّل تو تین روز سے اُن پر ہے قحطِ آب
بچوں پہ میرے کیجیو الطاف بیحساب
اب مانسے بھی بچھڑتے ہیں ہے ہے یہ دل کباب
صدقے گئی یتیموں کی ہے پرورش ثواب

کچھ ساتھ لے چلی ہوں نہ کچھ ساتھ لائی تھی

دولت علیؑ کے گھر میں یہی میں نے پائی تھی

اکبرؑ کو آپ دیکھیے گھونگٹ میں روتی ہے
دولہ چھٹا پدر چھٹا بن ماں کی ہوتی ہے
اک سمت کو سکینہؑ جدا جان کھوتی ہے
یہ عاشقِ حسینؑ ہے زہراؑ کی پوتی ہے

اکبرؑ کی طرح آج سے پالو سکینہؑ کو
گودی میں میرے آگے بٹھالو سکینہؑ کو

پھر لیں بلائیں سر سے سکینہؑ کی تا بپا
تھا آخری جو پیار، کیا پیار خوب سا
ٹوپی پنہا کے زلفوں کو سلجھا کے یہ کہا
کڑھنا نہ میرے واسطے ہوتی ہوں میں جدا

اس سن میں حق نہ بیٹی کو ماں سے جدا کرے
تقدیر میں یہی ہو تو پھر کوئی کیا کرے

اپنی یتیم بیٹی کی غربت پہ میں نثار
اس تیسرے برس ہوئی بابا کی سوگوار
زینبؑ کو سونپے جاتی ہوں تمکو میں بیقرار
محکوم ان کی رہیو خبردار، ہوشیار

ترجیح اُن کے پیار کو ہے میرے پیار پر
سو مائیں صدقے زینبؑ عالی وقار پر

اب گوشِ دل سے واری نصیحت مری سنو
ہر ایک بات پر ہے تمہیں روٹھنے کی خو
ایسا نہ ہو کہ طور پھوپی سے یہی کرو
رتبہ سمجھ کے کیجیو تم اُن سے گفتگو

میں بنتِ یزدجرد، یہ زہراؑ کی پیاری ہیں
میں دائی تھی تمہاری یہ مالک تمہاری ہیں

اکبرؑ کو جب یہ روئیں تو پلّہ چھڑائیو
ننھے سے ہاتھ باندھیو قسمیں دلائیو
ہٹ کرکے ہر گھڑی نہ پھوپی کو ستائیو
سو جائیو زمیں پہ جو بستر نہ پائیو

نصیحت حضرت سکینہؑ کو

جو چیز دیں، سلام اُنھیں کر کے لیجیو
فرمائش اس غریب پھوپی سے نہ کیجیو

اب کھیلیو نہ غیروں کے بچّوں میں بیٹھ کر
ہاں کھیلیو تو دخترِ مسلمؑ سے ہمدگر

سب میں حقیر ہوتے ہیں بن باپ کے پسر
یعنی ہو تم بھی بے پدر اور وہ بھی بے پدر

پر کھیل میں بھی فکر رہے شور و شین کی
ماتم چچا کا کیجیو مجلس حسینؑ کی

واری پھٹا ہوا ہے تمہارا لباسِ تن
کہنا کریں نہ پہنونگی بابا ہے بے کفن

کھا کر ترس اگر تمہیں دے کوئی پیرہن
غربت سے رہیو جو کہ بزرگوں کا ہے چلن

بازاروں میں جو سر ہو تمہارا کھُلا ہوا
مُنہ پر اُلٹ کے ڈالیو کُرتا پھٹا ہوا

یہ بات کہہ کے دل میں اُٹھا درد بیقیاس
پہناؤں اپنی بیٹی کو یہ آخری لباس

فضّہ سے بولی بقچہ اُٹھا لا تو میرے پاس
پھر کون اسے پہنائیگا یاں سب ہیں بے حواس

بچّوں کو درد بے پدری لاعلاج ہے
بانوؑ کی لاڈلی پہ وہی وقت آج ہے

مرکب پہ پھر سوار ہوئی وہ بصد بکا
پہلو میں شہ کے سوتے ہیں ہمشکلِ مصطفےٰؐ

مقتل کو دیکھا دیدۂ حسرت سے اور کہا
جز داغ اور میرے مقدّر میں کچھ نہ تھا

کیا ہم بھی ہر طرف سے پُر ارمان جاتے ہیں
اصغرؑ بھی گھٹنیوں نہیں ملنے کو آتے ہیں

لو گو مرے صغیر کو لاؤ کروں میں پیار
جھاڑوں جھنڈولے بالوں کا سب گرد اور غبار

جنگل میں ڈر نہ جائے مرا طفلِ شیرخوار
اپنے پسر کی نئی سی میت پہ میں نثار

اصغرؑ کی لاش چاہیے میرے کنار میں
زینبؑ پکاری سوتے ہیں وہ تو مزار میں

ذوالجناحِ شہِ دیں خیمہ میں جسدم آیا
محشرِ تازہ ہوا اہلِ حرم میں برپا

روکے گھوڑے سے یہی کہتی تھی بنتِ زہراؑ
ذوالجناحِ شہِ مظلوم یہ کیا تو نے کیا

منہ رفاقت سے شہِ تشنہ کے موڑا تو نے
لاشہ تنہا مرے ماں جائے کا چھوڑا تو نے

کہا گھوڑے نے کہ اے خواہرِ شاہِ شہدا
آپ سے میں نے نہیں لاش کو تنہا چھوڑا

بلکہ خنجر بھی مرے آگے نہیں شہ پہ چلا
دے کے اسباب مجھے ایک جگہ بھیجا تھا

وہ تو ارشاد شہِ دیں کا بجا لایا ہوں
اور اب بانوؑ کے لینے کے لیے آیا ہوں

سُنکے یہ بانوؑ نے زینبؑ سے کہا بادلِ زار
آخری ملنا ہے، مل لو تو یہ لونڈی ہو سوار

لپٹی بانوؑ کے گلے زینبؑ عالی مقدار
اور کہا جاؤں کہاں اب میں خدائے غفار

تم بھی اس زینبؑ بیکس کی کمر توڑ چلیں
ننگے سر بلوے میں چھپنے کو ہمیں چھوڑ چلیں

اُس گھڑی بانوؑ سے رو کر یہ سکینہؑ نے کہا
اماں بابا تو موئے، ہوتی ہو اب تم بھی جدا

یہ تو کہیے کہ مجھے آپ نے کس کو سونپا
آہ بھر کر کہا بانوؑ نے کہ اندیشہ ہے کیا

باپ ماں سے جسے اس سن میں جدا کرتا ہے

پرورش اُن کی مری جان خدا کرتا ہے

کہہ کے یہ ہاتھ میں زینبؑ کے دیا ہاتھ اُسکا
جانیو عابدؑ بے کس کو بجائے بابا

اور کہا آج سے تم والدہ ان کو کہنا
فضل اللہ سے اب بھی ترا کنبہ ہے بڑا

سب کے ماں باپ زمانے میں یونہیں مرتے ہیں
وقت پڑتا ہی تو غیروں میں بسر کرتے ہیں

قید میں اپنی پھوپی سے نہ کوئی مانگیو چیز
یہ نہ کہہ بیٹھیو زہراؑ و علیؑ کی ہوں عزیز

پوچھے گر نام تمہارا کوئی اے اہلِ تمیز
کہیو زینبؑ کو بتا کر کہ میں ہوں انکی کنیز

کیا ہوا آج جو دُکھ تجھ پہ پڑا ہے بیٹی
نام تو تیرے بزرگوں کا بڑا ہے بیٹی

رزمیہ

رزم اُردو مرثیہ گوئی کا ایک اہم اور ضروری مضمون ہے، اور اُس کے بیان میں زور۔ جدّت اور ایجادِ مضامین کی بیحد کوشش کی جاتی ہے۔ بیشک شاہنامہ نے فارسی رزم کا درجہ عربی اور اُردو شاعری کی رزم سے بہت بڑھا دیا ہے، لیکن اُردو میں مرثیہ گویوں نے بھی اس مضمونِ خاص کے ادا کرنے میں جو جو کمالات دکھائے ہیں وہ اُن کی جولانی طبع اور قادر الکلامی کی روشن نظیریں ہیں۔ میر صاحب اور مرزا صاحب نے ہزاروں مرثیے نظم کیے اور ہر مرثیہ میں رزمیہ مضامین مثلاً لڑائی کی تیّاری۔ معرکہ کا زور شور۔ ہنگامہ خیزی۔ تلوار کی کاٹ چھانٹ۔ نیزوں کی لچک۔ کمانوں کا کڑکنا۔ گھوڑے کا خدوخال۔ ڈیل ڈول۔ سرعت۔ رجز۔ بہادروں کی میدانِ جنگ میں مبارزطلبی۔ معرکہ آرائی۔ ان سب مضامین کو اس خوبی اور صفائی سے بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ کا سماں پھر جاتا ہے پھر ہر مرثیہ میں ایک ہی مضمون کو مختلف اور گوناگوں طریقوں سے ادا کیا ہے اور یہ ان بزرگوں کی انتہا درجہ کی جولانیِ فکر اور زورِ طبیعت کی دلیل ہے، کیونکہ جس طرح اشعار میں ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین ایجاد و اختراع کرکے طبع آزمائی کرنا شاعر کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی مضمون اور مطلب کو مختلف پیرایوں اور متعدد

اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمالِ شاعری میں داخل ہے۔ اسلیے کہہ سکتے ہیں کہ اگر فارسی کو رزمیہ مضامین کے بیان میں شاہنامہ۔ اور سکندر نامہ پر بجا فخر ہے تو اُردو شاعری کو بھی مرثیوں کی نادر اور بیش بہا رزم پر ناز کرنا زیبا ہے۔ مولانا آزاد صاحب میر انیس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اُس میں چند میدان جنگ ہیں۔ رزمِ زنگبار۔ جنگِ دارا۔ جنگِ روس۔ جنگِ فُور۔ جنگِ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن ہیں۔ شاہنامہ کے ۶۰ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔ انھوں نے ایجادِ مضامین کے دریا بہا دیئے۔ ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمد نئی۔ رزم جُدا۔ بزم جدا۔ اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نئی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔" اب ہم مرزا صاحب کی رزم کے چند نمونے دکھاتے ہیں۔ ؎

سپاہیوں کی آمادگیِ جنگ (فوجِ امام حسینؑ)

کہتا ہے تول کر کوئی شمشیرِ آبدار	ولہ	اے تو سہی کہ چھین لیں میدانِ کارزار
تن تن کے صاف سینوں کی ڈھالیں سنبھال لیں	ولہ	آ دہی سر دہیاں کمروں سے نکال لیں
لاکھوں کا ایک حملہ میں مُنہ پھیر دیتے ہیں	ولہ	کس طرح اُنسے طبل و علم چھین لیتے ہیں
کوئی تھا سبز پوش کوئی سرخ پوش تھا	ولہ	مرنے کی آرزو تھی شجاعت کا جوش تھا
باگیں اُٹھاؤ گھوڑوں کی تیغیں سنبھال لو	ولہ	جب تک امام آئیں انھیں دیکھ بھال لو

چپ ہیں ابھی تو اذنِ وغا شہ نے گر دیا — ولہ — گھوڑے اُٹھائے اور تمہیں پامال کر دیا

ہم تو سلاحِ جنگ نہ تن پر سنوارینگے — ولہ — تیغیں نہیں کی چھینینگے اور انکو مارینگے

اس امر میں ہرگز کوئی قاصر بھی نہوگا — ولہ — آگے جو بڑھا پاؤں تو پھر سر بھی نہوگا

دیکھیں تو بھلا آئیں تو نو لاکھ سمٹ کر — ولہ — ہاں کہدیں جو ماموں تو صفیں کھدیں اُلٹ کر

سرکوبیِ افواجِ بد اعمال کرونگا — ولہ — چیونٹی کی طرح مورچے پامال کرونگا

جلنے سے ہاتھ دھوتے ہیں مرد اپنی بات پر — ولہ — اپنا تو آج مورچہ ہوگا فرات پر

دعوے ہیں آج حیدریوں کو بڑے بڑے — ولہ — چاہیں تو شرق و غرب کو لے لیں کھڑے کھڑے

مِلکر حسینیوں نے کہا اے شہِ امم — ولہ — اب کب تلک سکوت کہ رُکتا ہی اپنا دم

قرنا بجایا چاہتے ہیں بانیِ ستم — یاں صف کشی نہ مورچے نے طبل نے علم

بس اب تو ضبط اے شہِ ذیجاہ قہر ہے
شیروں کے مُنہ پہ چڑھتے ہیں روباہ قہر ہے

حملہ کا زور شور اور فوجوں کی ہل چل

جب رن میں شیرِ حق کا پسر حملہ ور ہوا — باہر نیام سے سرِ تیغِ دو سر ہوا
خورشید نے کہا کہ وہ شق القمر ہوا — آیا جو پیشِ تیغ وہ زیر و زبر ہوا

مولا بڑھے جو تیغِ دو پیکر کو تول کر
روح الامیں سپر ہوئے شہپر کو کھول کر

گہ بھاگنے کا مشورہ گمراہ کرتے تھے — دریا میں ڈوبنے کی کبھی چاہ کرتے تھے

پیشِ حسینؑ آکے کبھی آہ کرتے تھے
گہ دیکھتے تھے تیغ کو اور آہ کرتے تھے

کہتے تھے کچھ، تو کرتے تھے کچھ اضطراب میں
جس طرح کوئی بھولے سخن کہہ کے خواب میں

برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی ہی آمد
ہر مورچہ لرزاں ہی سلیماں کی ہی آمد
فرعونیوں پر موسیٰؑ عمراں کی ہی آمد
تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہی آمد

جن سیر کو نکلے تھے پہ ہیبت سے مُڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیماںؑ کے اُڑے ہیں

خورشید ہی دن کو مہِ نو شرم سے گھٹ کر
اغلب ہے کہ سیدھا فلکِ کج ہو اُلٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی پھٹ کر
اک سونے کا نگ بنگئی ہی دھوپ سمٹ کر

ثابت ہی کہ سیّارہ ہر اک ماند ہوا ہے
سیّارے ہیں کیا، شہر بدر چاند ہوا ہے

بے چرخ ہی نے دشت نہ کہسار نہ قلزم
وہ سکتہ ہی وہ گرد وہ رعشہ وہ تلاطم
ہر برج ہی گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم
جس طرح سے آندھی میں جُدا خوشوں سے گندم

خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اُڑتے ہیں مُہروں کے نگوں سے

دیتی ہی فقط بے خبری کی خبر آمد
یاں شور وہاں غل ادھر آمد اُدھر آمد
بالائے سر آفت ہی تو پیشِ نظر آمد
اب سینے میں دم کی نہ در آمد نہ بر آمد

ہر تن کو ہے دشوار بچانا دل و جاں کا

آنا شہِ والا کا ہے جانا دل و جاں کا

تن دیکھ کے شمشیرِ دوسر کانپ رہے ہیں
دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں

ہیں جن و پری قاف میں پر کانپ رہے ہیں
پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپ رہے ہیں

تلواروں کا زہرہ ہی صفِ جنگ میں پانی
دریا میں شرر چھپتے ہیں اور سنگ میں پانی

خیبر شکن کے لعل کی آمد ہی صف شکن
تیغِ خدا کی تیغ کا سایہ ہے تیغ زن

گرتی ہی فوج فوج پہ پڑتا ہی رن پہ رن
غلطاں کہیں قدم ہیں کہیں سر کہیں بدن

لے حوصلہ نہ بغضِ امام مبیں رہا
اب دل میں بھاگنے کے سوا کچھ نہیں رہا

فوجوں کی ابتری اور ہل چل

یکسر صفتِ بختِ سیہ ڈھالیں تھیں بیکار
برش نہ رہی تیغوں میں عاری ہوئے کفّار

تھی تن میں زرہ نامۂ عصیاں سے گرانبار
اور خوف سے خاموش تھے گویا لبِ سوفار

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند
تھا نیزوں کو رعشہ قدمِ پیر کی مانند

بیکار ہر اک دستِ ہنر تھا دمِ پیکار
تھا مثل رکابوں کے تہی قالبِ اسوار

شانوں کی طرح خشک ہوئے پنجۂ کفّار
اور سہم سے تھے ناوکِ خود رفتہ کماندار

دہشت سے سپر کرتے تھے شمشیر سے پہلے
ہاتوں سے کماں چھوٹتی تھی تیر سے پہلے

ترکش میں عدو ڈھونڈتے تھے نیزوں کو ہر آ
زہ کرتے تھے نیزوں کو کمانوں میں ستمگار

مانند سپر روکتے تھے چہرے پہ تلوار
تیغوں کی جگہ ڈھالوں کا کرتے تھے کبھی وار

اک نہر زرہ پوشوں کے خوں کی جو بہی تھی
موجوں کی طرح آپ زرہ کانپ رہی تھی

رجز — حضرت امام حسینؑ کی زبان سے پہلوانی اور بہادری کے عوض فضیلت اور شرف کا اظہار۔

دادا حسینؑ کا ہے ابو طالبؑ ولی
دنیا میں جس نے دیں کی طلب کبریا سے کی

جعفرؑ مرا چچا ہے وہ مقبولِ ایزدی
تیار جنگ پر جو رہا ہمرہِ نبیؐ

صدقے کیے جو ہاتھ رسولِ کبار پر
پائے خدا کے گھر سے جواہر نگار پر

میں ہوں نہالِ گلشنِ ناز و نعم کا پھول
مجھ پر ریاض کرتے رہے حیدرؑ و بتولؑ

درگاہِ حق میں عرض ہوا کی مری قبول
احمدؐ نے سجدہ کو مری خاطر دیا ہے طول

بچپن میں بات مجکو بڑی ہاتھ آئی ہے
میں نے نبیؐ کے دوش پہ معراج پائی ہے

جو چاہوں حق کے حکم سے میں ناتواں کروں
حوریں کریں قصور تو جاں کا زیاں کروں

کوثر مچائے شور تو ریگِ رواں کروں
طوبیٰ اٹھائے سر تو زمیں میں نہاں کروں

گرمی کرے شرر تو شرارت نکال دوں
جنت ہوا پہ آئے تو دوزخ میں ڈال دوں

شمشیرِ قہرِ حق ہوں میں اے شام کی سپاہ
جوہر عیاں ہیں تیغ کے ماہی سے تا بماہ

آفاق میں نہیں دمِ صمصام کی پناہ
قبضہ کے درمیان ظفر ہے خدا گواہ

تیغوں سے خنجروں سے خطر کیا فقیر کو
تلوار حق نے دی ہی جنابِ امیرؑ کو

ہم دل میں جب درآئینگے فوجِ شریر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ برنا و پیر کے
ٹکڑے کرینگے خنجر و شمشیر و تیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ کے

اک اک کی موت آج حسامِ دوسرے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

ہم وہ ہیں کہ گھر عرشِ معلّا ہے ہمارا
کعبے کی طرح پاک مصلّا ہے ہمارا
خضرِ رہِ فردوسِ تولّا ہے ہمارا
اور چاند بہشتوں کا، تجلّا ہے ہمارا

زندہ ہیں تو تصویر ہیں ہم نورِ خدا کی
مُردہ ہیں تو تسبیح ہیں ہم خاکِ شفا کی

اُس ماں کی کمائی ہوں جو مریم کا شرف ہے
اُس باپ کا بیٹا ہوں جو آدم کا شرف ہے
اُس بھائی کا بھائی ہوں جو عالم کا شرف ہے
نانا ہی وہ جو عرشِ معظم کا شرف ہے

اُس فوج کا سردار ہوں جو فوجِ خدا ہے
اُس گھر کا بقیّہ ہوں کہ جو آج لُٹا ہے

ڈھونڈو جو اماں حشر کی دامن ہی ہمارا
رضوانِ جناں خادمِ گلشن ہی ہمارا
خاک اس سے ہوئی پاک کہ مدفن ہی ہمارا
جنّت کا شرف یہ ہے کہ مسکن ہی ہمارا

؎ یعنی ہمارے نور کی ضیا بہشتوں کا چاند یعنی اُن کی روشنی ہی ۱۲

تعویذ ہوں بازوئے زبردستِ علیؑ کا
قرآن ہوں میں رحلِ دوزانوئے نبیؐ کا

موسیٰؑ کے لیے نہر کو پُل کر دیا ہم نے
اور بہرِ خلیلؑ آگ کو گُل کر دیا ہم نے
فرعون کو بے طبل و دُہل کر دیا ہم نے
ہر شہر میں تکبیر کا غُل کر دیا ہم نے

ہاروت کو اندوہ دیا ہم نے دہوئیں سے
یوسفؑ کو شہِ مصر کیا لا کے کنوئیں سے

میں ہوں مکین دوشِ نبیؐ ہر مکاں کا فخر
شیرِ خدا کا لال ہوں، نوشیرواں کا فخر
کوثر کی آبرو ہوں، اور اہلِ جناں کا فخر
کعبہ کا نور، عرش کا اوج۔ آسماں کا فخر

نام و نسب سے قدر، عجم اور عرب کی ہے
رونق ہماری ذات سے نام و نسب کی ہے

روشن پدر کا زور ہے دنیا پہ دین پر
ششدر تھے جبرئیلؑ کٹے جبکہ تین پر
چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک اُنگلی سے زین پر
گردوں کی ڈھال چیر کے رکھ دوں زمین پر

ہم نوبہار گلشنِ صبر و ثبات ہیں
ہم شہسوار توسنِ والعادیات ہیں

برجوں کو اپنی مہر سے شمس و قمر ملے
دریا کو اپنی چاہ سے لعل و گہر ملے
بے پر نے مس کیا جو ہمیں، بال و پر ملے
فطرس کے ذہن میں نہ یہ رتبے تھے، پر ملے

اس رتبہ کا اُسی پہ فقط خاتمہ ہوا

+ چونکہ فطرس پسر فاطمہؑ کا آزاد کیا ہوا تھا اسلیے اس عظیم الشان رتبہ کا اُسی پر خاتمہ ہوا، دوسرے کو ایسا شرف نصیب نہیں ہوا

آزاد کردۂ پسرِ فاطمہؑ ہوا

پیاسا ہوں پر خضر بھی ہوں آبِ بقا بھی ہوں
ہمسایہ بھی ہوں سایۂ ربّ العلا بھی ہوں
ہمراہ بھی خدا کے ہوں راہِ خدا بھی ہوں
راہِ خدا بھی ہوں بخدا رہنما بھی ہوں

حرزِ گلوے عیسیٰؑ عالی وقار ہوں
کُل کی دوا ہوں حکمتِ پروردگار ہوں

نور اپنا ہوگا جبکہ جُزو کُل نہوئینگے
ہم وہ چراغ ہیں جو کبھی گُل نہوئینگے
مر کر بھی کم ہمارے تجمل نہوئینگے
باغ اپنا ہوگا جب گُل و بلبل نہوئینگے

دن ہو کہ رات، خلق پہ سرگرمِ مہر ہیں
جس کو کبھی زوال نہ ہو ہم وہ مہر ہیں

عالم مرا مطیع، مطیع خدا ہوں میں
نانا کی شکل ہادیِ ہر دو سرا ہوں میں
بابا کی طرح خلق کا مشکل کشا ہوں میں
سیّد ہوں میں امام ہوں میں مصطفیٰ ہوں میں

مخدومِ خلق خادمِ ربِّ جلیل ہوں
میں وارثِ مسیح و ذبیح و خلیل ہوں

چاہیں تو ہم زمیں کو ابھی آسماں کریں
اعجاز انبیائے سلف کے عیاں کریں
عیسیٰؑ صفت رواں تنِ بیجاں میں جاں کریں
مثلِ خلیلؑ نار کو باغِ جناں کریں

موسیٰؑ کی طرح ساحروں کو پست کرتے ہیں
ہم اژدہا عصا کو سرِ دست کرتے ہیں

میں خاصِ حق ہوں۔ قبلۂ ہر خاص و عام ہوں
حاجت روائے خلق ہوں، شاہِ انام ہوں
احمدؐ کا میں نشان ہوں، حیدرؑ کا نام ہوں
مختارِ سلسبیل ہوں گو تشنہ کام ہوں

پشت و پناہِ شرعِ رسالت پناہ ہوں
میں ناخدائے کشتیِ دینِ الٰہ ہوں

امام حسینؑ کی زبان سے عام رجز کے قاعدہ کے لحاظ سے بعض بعض جگہ شجاعت اور زور و قوت کا بھی اظہار ہے۔ ؎

وارث ہیں ہم جناب شہِ ذوالفقار کے
کامل ہوئے ہیں جن سے ہنر کارزار کے
لی مرحبا فرشتوں سے مرحب کو مار کے
عنتر کو تر لہو میں کیا سر اُتار کے

یکتا تھا عبدود کا پسر اپنے ڈہنگ میں
پر کیسی مُنہ کی کھائی ہے خندق کی جنگ میں

گھوڑے پر سوار ہونا

رہوار پر سوار ہوئے تب امامِ دیں
اور نورِ شاہِ دیں سے مزیّن ہوا وہ زیں
تھا یوں میانِ زیں وہ پیمبرؐ کا نازنیں
جیسے خدا کی یاد ہو مومن کے دلنشیں

اُس زین پر حسینؑ تھا رونق فزا ہوا
یا رحل پر تھا مصحفِ ناطق کھُلا ہوا

عفت سرا سے جبکہ برآمد ہوئے جناب
عباسؑ لائے مرکبِ ابنِ ابوترابؑ
حاصل جُدا جُدا کیا ایک ایک نے ثواب
چومے عناں نے ہاتھ۔ گری پاؤں پر رکاب

دیگر

عباسؑ سے کیا زین مزیّن نظر آیا
پھر نورِ نگہ دیدۂ یعقوبؑ نے پایا

یوسفؑ بھی نہ یوں چشمِ زلیخا میں سمایا
یا عرش کے قالب میں خدا کا تھا وہ سایا

یوں زین پہ زینت تھی علمدارِ جری کی
جیسے دلِ مومن میں جگہ حُبِّ علیؑ کی

کیا نامِ خدا زین پہ ہیں انکے قرینے
قدرت کی انگوٹھی پہ جڑے حق نے نگینے

قرآنِ نور زیب دہِ رحلِ زیں ہوا
غل پڑ گیا کہ طور پہ موسےٰؑ مکیں ہوا

زنگیں گُلِ حیدرؑ نے کیا پھر چمنِ زیں
اک گُل سے بنا دامنِ زیں۔ دامنِ گلچیں

فنونِ جنگ

دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ

مولف لکھتے ہیں کہ فنونِ جنگ کے مقام پر مرزا صاحب یہ واقعات اس طرح لکھتے ہیں کہ یہ نہیں اندازہ ہوتا کہ حریفوں نے فنِ جنگ میں کیا ہُنر دکھائے۔ اس دعوے کے بُطلان کے واسطے ذیل کے پُرشان وشکوہ بند ملاحظہ ہوں۔ ؎

وہ بولا ہے قریب اجل، رہ امیدوار
یہ بولے تیر انیزہ۔ مری تیغِ آبدار

میں نیزہ کی لڑائی لڑونگا، لے ہوشیار
شمشیر و نیزہ چلنے لگا پھر تو ایک بار

ہر چند تیغ سے کہیں نیزہ بلند تھا
پر نیشکر کی طرح جُدا بند بند تھا

جب اُسکا نیزہ تیغ سے سب کر چکے قلم
پھر اپنا نیزہ ابنِ حسنؑ نے کیا علم

آگے بڑھا کے توسنِ چالاک و خوش قدم
للکار کر کہا کہ خبردار آئے ہم

نیزے پہ یوں اُٹھا لیا اُس نابکار کو
جنبش رکاب کو، نہ خبر راہوار کو

پھینکا جو خاک پر تو ہوئے استخوان شکست
دکھلا دیا زمانہ کا اُسکو بلند و پست

تھے نشہ شرابِ شجاعت سے جو کہ مست
ہتیار کھولنے کا کیا سب نے بند و بست

قاسمؑ کے رُخ سے نورِ شجاعت نمود تھا
بیٹوں کے غم سے چہرۂ ازرق کبود تھا

ازرق یہاں برابرِ قاسمؑ پہنچ گیا
وہ صرصرِ خزاں۔ یہ گلِ باغِ مجتبیٰؑ

قاسمؑ نے کی بلند جو شمشیرِ شعلہ زا
ازرق نے لی سپر صفتِ پشتِ اژدہا

اس تیغ نے عیاں برشِ ذوالفقار کی
دو، ایک ضرب میں سپرِ نابکار کی

سرگرمِ معرکہ ہوا۔ وہ ہو کے خشمگیں
مطلع سے دیں کے مقطعِ ایمان ہوا قریں

گرزِ ثقیل لاتا تھا سر پر جو اہلِ کیں
بچکر خفیف کرتا تھا اُس کو وہ مہ جبیں

اس عرصہ میں حملے کیے مرحب نے وہاں چار
پر ایک بھی اُس سختنی پر نہ لگا وار

مانندِ دل و چشم ہر اک عضو تھا ہشیار
عاری ہوئی تلوار، مخالف ہوا ناچار

جب تیغ کو جھنجلا کے رُخِ پاک پہ کھینچا
تلوار نے اُنگلی سے الف خاک پہ کھینچا

غازی نے کہا بس اسی فن پر تھا تجھے ناز
سیکھا نہ یداللّٰہیوں سے ضرب کا انداز

پھر کھینچی اس انداز سے شمشیرِ سرانداز
جو میان کے بھی منہ سے ذرا نکلی نہ آواز

یاں خوف سے قالب کو کیا میان نے خالی
واں قالبِ اعدا کو کیا جان نے خالی

مرحب سے مخاطب ہوئے عباسؑ دلاور
شمشیر کے مانند سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے کہ اک ضرب میں۔ دو ہو تو برابر
پر اس میں عیاں ہونگے نہ جوہر مرے تجھ پر

لے روک مرے وار ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کروں گا، ابھی اظہارِ ہنر ہے

مکّے کی سپر لے کے مقابل ہوا دشمن
بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہر فن
یہ سینہ۔ یہ بازو۔ یہ کمر اور یہ گردن
یہ خود۔ یہ چار آئینہ۔ یہ ڈھال۔ یہ جوشن

کس وار کو وہ روکتا۔ تلوار کہاں تھی
آنکھوں میں تو پھرتی تھی۔ نگاہوں سے نہاں تھی

مرحب نے نہ پھر ڈھال نہ تلوار سنبھالی
اک ہاتھ سے سر ایک سے دستار سنبھالی
ظالم نے سناں غصّہ سے اک بار سنبھالی
اس شیر نے شمشیر شرربار سنبھالی

تانی جو سناں اُس نے علمدار کے اوپر
نیزہ یہ اُڑا لے گئے تلوار کے اوپر[1]

اُس تیغ نے سرکش کے جو ترکش میں کیا گھر
غل تھا کہ گرا برجِ[2] کبوتر میں وہ اژدر
پر تیروں کے کٹ کٹ کے اُڑے مثلِ کبوتر
مرحب ہوا مضطر۔ صفتِ طائرِ بے پر

[1] حضرت عباسؑ دشمن کے نیزہ کو اپنی تلوار کے اوپر اُڑا کر لے گئے یعنی اُسکو تلوار سے قطع کر ڈالا ۱۲
[2] برجِ کبوتر اُس عمارت کا نام ہے جو ایران میں بلند خانہ دار خاص کبوتروں کے واسطے جنگل میں (بقیہ بر صفحہ ۴۵۶)

بڑھ کر کہا غازی نے بتا کس کی ظفر ہے
اب مرگ ہی اور تو ہی۔ یہ تیغ اور وہ سر ہے

نامرد نے پوشیدہ کیا رُخ کو سپر سے
خنجر تو اُدھر سے چلا اور تیغ اِدھر سے

اور کھینچ لیا خنجرِ خونخوار کمر سے
اُسوقت ہوا چل نہ سکی بیچ میں ڈر سے

اللہ رے شمشیرِ علمدار کے جوہر
جوہر کیے اُس خنجرِ خونخوار کے جوہر

اس کے بعد پہلوان کے مع مرکب پارہ پارہ ہو جانے کا ذکر بڑی صفائی و خوبی سے فرما کر سلسلۂ بیان شروع کیا ہے۔

جو زندہ تھے العظمۃ للہ پکارے
ڈر کر عمرِ سعد کو گمراہ پکارے

مُردوں کے جو سر نیزوں پہ تھے واہ پکارے
خوش ہو کے علمدار شہنشاہ پکارے

یاں تو ہوا یا حضرت شبیرؑ کا نعرہ
شبیرؑ نے ہنس کر کیا تکبیر کا نعرہ

پردے کو اُٹھا کر یہ بہن شہ کی پکاری
عباسؑ نے کی فتح، مبارک ہو میں واری

(بقیہ صفحہ ۴۵) بناتے ہیں۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ خانۂ کبوتر کو برج کبوتر کہتے ہیں۔ یہاں تلوار کو اژدر۔ ترکش کو برج۔ اور تیروں کو کبوتر قرار دیا ہے۔ برج کبوتر اکثر شعرا نے باندھا ہے۔ یغما جندقی کا کیا خوب شعر ہے ؎

چشمِ صیاد تو بر چنبر زلف از پے دل
شاہبازیست کہ بر برج کبوتر گذرد

یہاں بھی شاعر نے چشم کو شہباز۔ حلقۂ زلف کو برج۔ اور دل کو کبوتر قرار دیا ہے۔ عرفی شیرازی ؎

آشیانہ خراب کردۂ باز
پیش برج کبوتر اندازد

جوہر کرنے کے معنی ہیں مار ڈالنا۔ نیست و نابود کرنا۔ فنا کرنا۔ میر انیس کا مصرع ہے ع۔ جاتے ہو تو جوہر مجھے کرتے ہوئے جاؤ۔

اب کہتی ہوں میں دیکھتی تھی جنگ یہ ساری
عباسؑ کی اک ضرب میں ٹھنڈا ہوا ناری

مرحب کو تو خیبر میں یداللہؑ نے مارا
ہمنام کو ابنِ اسداللہؑ نے مارا

میداں میں علمدار کے جانیکے میں صدقے
اس فاقہ میں تلوار لگانے کے میں صدقے
باہم علم و مشک اُٹھانے کے میں صدقے
اس پیاس میں اک بوند نہ پانے کے میں صدقے

سقّا بنا پیاسوں کا مروت کے تصدّق
بے سر کیا شہزوروں کو قوّت کے تصدّق

اب فخریِ رازی یہ رقم کرتا ہے اخبار
ہمنامِ یزید ایک تھا اُس فوج میں سالار
ناگاہ ہوا آن کے وارد دمِ پیکار
ہمراہ لیے تین ہزار اور ستمگار

کہتا تھا کہ احمدؐ کے نواسے سے لڑونگا
سیّد سے مسافر سے میں پیاسے سے لڑونگا

یہ تازہ تلاطم ہوا کفّار میں پیدا
اب جی نہیں بچنے کا حسینؑ ابنِ علیؑ کا
ہمراہ بجاتے دُہل و دف بڑھے اعدا
قرنا نے کیا شور تو محشر ہوا برپا

جنبش تھی زمیں کو تو تزلزل تھا فلک کو
تھے ساٹھ غلامان زرہ پوش کمک کو

زینبؑ جو یتیموں کو لیے بیٹھی تھی مضطر
نقّارے کی آواز گئی کان کے اندر
گھبرا کے چلی آئی وہاں خیمے کے در پر
دیکھا صفِ لشکر ہے بسانِ صفِ محشر

رُخ سیّدِ والا کی طرف سب کے پھرے ہیں

اک جان سے شبیرؑ ہزاروں میں گھرے ہیں

زینبؑ نے کہا دیکھ کے یہ ماجرا کیا ہے
یہ کون مقابل مرے بھائی سے ہوا ہے
تنہا پہ ہجوم سپہِ جور و جفا ہے
اس سیدِ بیکس کا مددگار خدا ہے

خواہر کو قریب اپنے بلاتے نہیں شبیرؑ
خیمے میں بلاتی ہوں تو آتے نہیں شبیرؑ

کرتی تھی یہاں زینبِؑ دختر یہ تقریر
کیا دیکھتے ہیں آنکھ اٹھا کر وہاں شبیرؑ
آتا ہے ادھر مستعدِ جنگ وہ بے پیر
گھوڑے سے یہ فرمانے لگے سرورِ دلگیر

مونس مرے اسوقت رفاقت کی گھڑی ہے
حرمت پہ ترے شاہ کی بات آن پڑی ہے

رہوار نے کی عرض بصد منت و زاری
ہو جائیگی اب ختم رفاقت مری ساری
تیغِ اسد اللہؑ کمر سے یہ پکاری
برش تو ذرا دیکھیے اسوقت ہماری

ہاتوں نے کہا شیر سے زہراؑ کے پلے ہیں
پاؤں نے کہا ہم نہ ٹلیں گے نہ ٹلے ہیں

گھوڑے کی عناں روک کے ظالم یہ پکارا
شبیرؑ کو ہے سامنا درپیش ہمارا؟
حضرت نے بھی لی میان سے شمشیرِ قضا را
خود ہو گئی قوت ہمہ تن محوِ نظارا

ہمت نے کہا اب ہمہ تن ناز ہوئی میں
جرأت نے کہا خلق میں ممتاز ہوئی میں

شہ بولے کہ میں حجتِ حق ہوں پے کفار
سبقت میں نہیں کرنے کا، کر شوق سے تو وار
حیراں ہوا شبیرؑ کی جرأت پہ وہ غدار
اس ابرِ سخاوت پہ برسنے لگی تلوار

گہ فرق پہ گہ دوش پہ اور گاہ کمر پر
شہ روکتے تھے حضرتِ حمزہؓ کی سپر پر

جب یکصد و ہفتاد چلی ضرب مکرّر
گھوڑے نے کہا شہ سے کہ جاتا ہوں عدو پر
صارم صفتِ برق ہوئی ہاتھ میں مضطر
آئی یہ ندا غیب سے اے سرورِ اطہر

توضیح تو کی معنیِ تسلیم و رضا کی
جرات بھی دکھا دو اسے ضرغامِ خدا کی

تب شہ نے کہا دیکھ، کہ آئی مری باری
گویا ہوا نازل غضبِ حضرتِ باری
وہ برق جو چمکی تو ہوا ہو گئے ناری
دنیا کی بلا آ کے مجسّم ہوئی ساری

پہلے تو چمک کر گئی افلاک کے اوپر
افلاک سے آئی سرِ ناپاک کے اوپر

جب خود پہ بیٹھی تو وہیں تا بہ سر آئی
پھر سینے کو لیتی ہوئی وہ تا کمر آئی
دو کر چکی راکب کو تو مرکب میں در آئی
اللہ رے برّش کہ زمیں پر اُتر آئی

تھا شور کہ کیا زورِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے
حقّا کہ یہ سر دفترِ اولادِ نبیؐ ہے

گھوڑا

گھوڑے کا خدوخال

گھوڑے کا خدوخال۔ ڈیل ڈول۔ چہرہ مہرہ

اللہ رے نزاکت فرسِ غنچہ دہن کی
آتی ہیں نظر صاف رگیں گُل سے بدن کی
سیرت ہی اگر شیر کی صورت ہے ہرن کی
رانوں میں ٹھہرتا نہیں بو سونگھ کے رن کی

دُھن ہی کہ گذر جائے حدِ چرخِ بریں سے
ہر جست میں یہ قصد کہ اُڑ جاؤں زمیں سے

معشوقیت اُسکے رگ و ریشہ میں بھری ہی
اس چال سے پامال سرِ کبکِ دری ہی
گرمی وہ ہی جو سردِ نسیمِ سحری ہی
ہوش اُڑتے ہیں پریوں کے عجب تیز پری ہی

ہی برق خجل، حال ہے یہ تیز روی کا
رفرف کا گماں، شک ہی براقِ نبوی کا

چلنے میں یہ شمشیر ہی پلّہ میں یہ ہے تیر
لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں یہ تدبیر
جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر
چھپنے میں یہ ہی خواب عیاں ہونے میں تعبیر

مضموں ہیں بہت، پر کوئی دلچسپ نہیں ہے
اسرار ہی اعجاز ہے یہ اسپ نہیں ہے

آہو سُم۔ و عقاب دُم۔ و ہمسرِ ہما
ضیغم جبیں۔ و فیل تن۔ و برقِ تیز پا
سیلِ جبال افگن و طوفانِ قہر زا
فرمانِ غیب حکمِ قدر نائبِ قضا

راکب دمِ وغا جسے زیر و زبر کرے
یہ اُس کے سر پہ موت سے پہلے گذر کرے

کھنچتی نہیں پر توسنِ چالاک کی تصویر
عامل میں نہیں ہوں جو ہوا کو کروں تسخیر
آتا ہی نہیں ذہن میں کیا کیجیے تدبیر
دل آپ کو حیرت زدہ عقل آپ کو دلگیر

ہرگز صفتِ اسپ ہنرمند نہ ہوگی

اس شیشۂ دل میں یہ پری بند نہو گی

کم تیغِ دو پیکر سے نہ تھی اُس کی لڑائی
گر خون سے تھا ناخنِ شمشیرِ حنائی
مہدی لہو کی پانووں میں تھی اُسنے لگائی
تھی وضع حسینانہ دمِ جنگ بنائی

سلمائے عجم تھا نہ وہ لیلائے عرب تھا
پر ناز و کرشمہ جسے کہتے ہیں وہ سب تھا

ہی رعد ہوا میں تو یہ ہے کبک ادا میں
یہ موج ہی دریا میں یہ بجلی ہے ہوا میں
یہ حور ہی فردوس میں بلقیس سبا میں
آہو ہی تگاپو میں تو ہے شیر وغا میں

دل اس پہ سلیمانؑ کا پروانہ ہوا ہے
کہیے جو پری کہتا ہے دیوانہ ہوا ہے

گھوڑا ہی، مگر شیر کا بالکل ہے قرینہ
ٹاپوں سے کچلتا ہے یہ اشرار کا سینہ
گرمی کے سبب بہتا ہی پٹھوں سے پسینہ
ہر قطرہ ہے یوں جیسے کہ خاتم پہ نگینہ

اللہ رے ضیا آنکھ جھپکتی ہے قمر کی
بوندیں نہ کہو، صاف یہ پاکھر ہے گہر کی

شوخی میں پری حسن میں ہی حورِ بہشتی
طوفان میں راکب کے لیے نوحؑ کی کشتی
کب ابلقِ دوراں میں یہ ہی نیک سرشتی
یہ خیر ہی وہ شر ہے، یہ خوبی ہی وہ زشتی

صحرا میں چمن، فصل بہاری ہی چمن میں

رہوار ہی اصطبل میں، تلوار ہے رن میں

گھوڑے کی تیزی اور چل پھر

رانوں سے بہادر کے فرس رشکِ صبا ہی
سرعت میں کہیں برقِ جہندہ سے سوا ہی
بجلی ہی کسی جا تو کسی صف میں ہوا ہی
سرعت میں جو آہو تو اسد وقتِ وغا ہی

مہمیز کی حاجت اُسے زنہار نہیں ہے
اللہ کی قدرت ہی، یہ رہوار نہیں ہے

اُسکے رہوار کی سرعت کا کروں کیا میں بیاں
برق وش رشکِ صبا، غیرتِ طاؤسِ جناں
ہو پری تیز پری دیکھ کے اُس کی حیراں
منزلوں تختِ سلیماں سے بھی آگے ہو رواں

نقشِ پا اُسکا کسی نے جو نہیں دیکھا ہے
توسنِ روح اگر اُسکو کہوں زیبا ہے

لاکھوں کمال اُس میں ہیں کہیئے کہاں تلک
راکب کا اُسکے عزم جو ہو آسماں تلک
پہونچے ابھی نہ دستِ تصوّر عناں تلک
ہو آئے اتنے عرصہ میں یہ لامکاں تلک

شیریں ادا وہ رخشِ پری رو ہی زیرِ راں
کوڑے کا دھیان لائے جو راکب تو یہ کہاں
چلنے میں چھوڑ دیتا ہے یہ حدِّ آسماں
یعنی کہ تازیانے کی صورت ہے کہکشاں

رہوارِ سبک خیز بھی ہر سمت تھا جولاں
صرصر کی طرح سے کبھی یاں تھا تو کبھی واں

بھرتا تھا طرارے جو فرس برق کی عنواں
بھرتی تھی دمِ سرد صبا ہو کے پریشاں

رہوار کے آگے کوئی جادو نہیں چلتا
سائے کے برابر کوئی آہو نہیں چلتا
ساتھ اُسکے فلک وقتِ تکاپو نہیں چلتا
اس چال سے صرصر کا بھی قابو نہیں چلتا
بجلی سے تک و تاز میں ممتاز ہے گھوڑا
جاں باز ہے راکب تو قدم باز ہے گھوڑا

بولا کوئی چالاکیِ رہوار تو دیکھو
بجلی کی تڑپ گرد ہے رفتار تو دیکھو
اک کہنے لگا شانِ علمدار تو دیکھو
شان ایک طرف ۔ جلوۂ رخسار تو دیکھو
کس قہر سے ہر ایک کو للکار رہے ہیں
کس پیار سے رہوار کو چمکار رہے ہیں

تھی نرم روی پاسِ شہِ عرش نشیں سے
پر اُس میں بھی لیتا تھا سبق روح امیں سے
اور گرم جو ہوتا تھا وہ حکمِ شہ دیں سے
پھر اُٹھتی تھی بجلی عوضِ گرد زمیں سے
جب گرم ہوا موت کا نقشہ نظر آیا
مثلِ ملک الموت ۔ اِدھر آیا ۔ اُدھر آیا

چالاکیِ رہوار سے مردم تھے مکدّر
ابرو کی طرح رکھتا تھا نعل آنکھوں کے اوپر
گہ پھرتا تھا پُتلی کی طرح آنکھوں کے اندر
گہ مثلِ نگہ صاف نکل جاتا تھا باہر
کچھ تیغ کے سائے میں تو دم لیتے تھے اعدا

پر گرمیِ توسن سے تو جاں دیتے تھے اعدا

حضرت عونؑ و محمدؑ کے گھوڑے

دیکھا نہ سُنا ہم نے سمندوں کا یہ دستور
وہ کہتا تھا میں رعد ہوں، یہ کہتا تھا میں صور
وہ کہتا تھا میں طور ہوں یہ کہتا تھا میں نور
وہ کہتا تھا لیلے ہوں تو یہ کہتا تھا میں حور

وہ کہتا تھا دیکھ آیا ہوں میں گاوِ زمیں کو
یہ کہتا تھا میں پھاندتا ہوں عرشِ بریں کو

وہ کہتا تھا بجلی ہوں، یہ کہتا تھا ہوا ہوں
وہ کہتا تھا نکہت ہوں، یہ کہتا تھا صبا ہوں
وہ کہتا تھا سودا ہوں، یہ کہتا تھا بلا ہوں
وہ کہتا تھا عنقا ہوں، یہ کہتا تھا ہما ہوں

وہ کہتا تھا واقف ہے قمر کبکِ دری ہوں
یہ کہتا تھا شاہد ہے سلیمانؑ میں پری ہوں

شبدیزِ فلک سامنے انکے کمری ہے
آنکھوں میں وہ شوخی ہے کہ شیشوں میں پری ہے
نبض ان کی شرر، سانس نسیمِ سحری ہے
سایہ ہے ہما نقشِ قدم کبکِ دری ہے

چلنے میں اگر نرم روی مدِ نظر ہو
آنکھوں میں پھریں اور نہ مردم کو خبر ہو

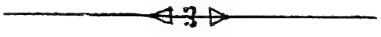

مضمونِ ذوالجناح نیا باندھتے ہیں ہم
پائے قلم سے پائے صبا باندھتے ہیں ہم
آج اپنی شاعری کی ہوا باندھتے ہیں ہم
کھلتا نہیں یہ عقدہ کہ کیا باندھتے ہیں ہم

یال اک طرف کو، دُم ہے وہ حسن و جمال میں
چوٹی کے آرہے ہیں مضامیں خیال میں

اُس توسنِ چالاک کا اب وصف ہو کیونکر | ولہ | چلنے میں وہ تھا تند ہوا سے بھی فزوں تر

اس تیزی سے جاتا تھا وہ رہوار زمیں پر
سائے کو بھی گرنے نہیں دیتا تھا کہیں پر

اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب | لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بیتاب
خورشید و سحاب و فلک و انجم و ہفتات | لرزاں و ہراساں و سراسیمہ و بیخواب

ساتھ اُسکا دیا جائے ہوا سے نہ پری سے | شہبازِ نگہ باز رہے تیز پری سے
جنّت کی ہوا میں جو یکایک ہوا جولاں | رہوار پری بن گیا زیں تختِ سلیماںؑ
سرعت کی جو قسمت ہوئی منظورِ قضا کو | نو جزو تو اُسکو دیئے اک جزو ہوا کو
ہی برق شرر خیز اگر جلوہ کناں ہے | ہی ابرِ گہر ریز اگر قطرہ زناں ہے
اور توسنِ شبیرؑ تو ہے توسنِ اعجاز | آہو روش و برق خرام و شرر انداز
کہتا تھا فرس ڈھونڈھ تو لے کوئی کہاں ہوں | آنکھوں میں تو پھرتا ہوں نگاہوں سے نہاں ہوں[1]
اُڑنے سے ہی ثابت کہ پر و بال بہم ہیں | شانوں میں تو پیدا نہیں پر زیرِ قدم ہیں
کیا تیز قدم اسپِ شہِ عرش نشیں ہے | اللہ کی قدرت ہے یہ رہوار نہیں ہے
پھر آیا عالمِ بالا سے یوں سوئے جنگاہ | کہ جیسے دیدۂ مردم سے جست کرے نگاہ
جولانیِ فرس کو کروں کیا میں آشکار | آہو کی طرح ہوتے ہیں مضمون بھی فرار

[1] میر انیس صاحب۔ مانندِ تصوّر کبھی یاں تھا کبھی واں تھا ؛ آنکھوں میں تو پھرتا تھا یہ نظروں سے نہاں تھا

ڈھونڈو تو بھلا نقشِ سمِ نعل کہیں ہے	دنیا میں جگہ پاؤں کے رکھنے کی نہیں ہے
سرعت یہ ہی گر آئینہ خانے میں رواں ہو	ہرگز نہ کسی آئینہ میں عکس عیاں ہو
چالاک ہے اس درجہ عقابِ علی اکبرؑ	آرام نہیں مدح کے حرفوں کو ورق پر
قدغن ہی شاعروں پہ اُسکا جہان میں	ساکن حروف آئیں نہ میرے بیان[1] میں

ع - جانے میں رسولوں کی دعا آنے میں تاثیر۔

ع - اللہ کی قدرت ہی نہ چھل بل نہ چھلاوہ۔

ع - فردوس کی ہوا میں اُڑا حرؑ کا بادپا

ع - شعلہ تو وہ نہ تھا پہ ہوا سے بھڑکتا تھا

تلوار واقعی مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری یہی ہی اور ہر مرثیہ گو تلوار کی صفت میں زورِ طبیعت سے کام لیا کرتا ہی۔ مگر مرزا صاحب نے خاص طور پر اس موقع پر اپنے کمالات کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قابلِ داد و تحسین ہیں۔ مؤلف کی نارسا طبیعت پر افسوس آتا ہی کہ وہ ان نادر مضامین کی لطافت کا احساس

[1] اسی کے ہم مضمون میر انیس کا یہ لاجواب شعر ہی ؎ اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر ؛ ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر ؛ دونوں کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہی کہ میر صاحب کے شعر میں زیادہ بلاغت پائی جاتی ہی۔ مرزا صاحب کا مضمون ہی کہ گھوڑے کی شاعروں کو تاکید ہے کہ میری تعریف کرتے وقت حروفِ ساکن کا استعمال نہ کرو۔ لیکن میر صاحب فرماتے ہیں کہ اسکی ثنا کے وقت حروف ساکن زبان پر آہی نہیں سکتے گو شاعر ایسا قصد بھی کرے۔ یہ مضمون نہایت پُر لطف ہے ۱۲۔

نہیں کر سکے۔ مرزا صاحب کے جو جو بند اُنھوں نے اعتراض کی غرض سے انتخاب کیے ہیں۔ درحقیقت اُن میں واقعیت کا پہلو کم ہی حاصل یہ ہی کہ نازک خیال شعرا جب ایسے باریک اور لطیف مضامین لکھ کر اپنی رسائیِ طبیعت اور بلندیِ فکر کا اظہار کرتے ہیں۔ تو بعض اوقات واقعیت سے دور جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ "مرزا صاحب ہمیشہ اس عالم میں لامکاں تک پہونچ جاتے ہیں" یا اُن کے کلام میں ہمیشہ تلوار کی تعریف میں اسی قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ بالکل غلط اور مہمل خیال ہی۔ اس ہمہ داں شاعر کے کلام میں ہر انداز اور ہر قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ لیکن اگر چشمِ بد بیں عمدہ کلام کی طرف سے آنکھیں بند کرلے تو اسکا علاج ہمارے پاس موجود نہیں۔ بہرحال ہم اُس قسم کے اشعار لکھتے ہیں۔ جس انداز کے مصنّف نے میر انیس صاحب کے انتخاب کیے ہیں اور جن میں واقعیت اور اصلیّت کا جوہر ہر جگہ نمایاں ہی۔ مؤلف خود انصاف کرلیں کہ ہمارا دعویٰ کہانتک راستی پر مبنی ہے۔

تلوار کا سراپا

سب سے پہلے دیکھو تلوار کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں۔

چھل بل تھی۔ چھلاوہ تھی۔ طلسمات تھی اسرا	چالاک۔ سبکبار۔ طرحدار۔ نمودار
نیزہ کہیں۔ خنجر تھی کہیں اور کہیں تلوار	بجلی تھی کسی جا، تو کہیں نور کہیں نار

سیماب تھی۔ سیلاب تھی۔ طوفاں تھی۔ ہوا تھی
شعلہ تھی۔ شرارہ تھی۔ قیامت تھی بلا تھی

پھل وزن میں تھا پھول، تجلّی میں نخلِ طور	گرمی میں محض نار، تو نرمی میں صاف نور

تلواروں میں عامل کی طرح سیف زباں تھی
نمرودیوں کے واسطے یہ تیغ دھواں تھی

ولہ

آسیب تھی آفت تھی بلائے دوجہاں تھی
بجلی کی طرح گاہ یہاں - گاہ وہاں تھی

ہر وار میں جوہر کی عجب جلوہ گری تھی
چم خم میں مہِ نو - تو کرشمہ میں پری تھی

ہیبت سے تزلزل میں سماتا بہ سمک ہے
شور آبِ دمِ تیغ کا زخموں کو نمک ہے

ہفت آئینۂ چرخ سے پار اس کی چمک ہے
بجلی کی تڑپ ہی کبھی شعلے کی لپک ہے

گہ مرگ مفاجات ہی اور گاہ قضا ہے
گہ ابر ہی گہ رعد ہی گہ سیلِ فنا ہے

شمشیر تھی کہ ناخنِ مشکل کشا تھی وہ
الیاسِ بحرِ فتح کہ خضرِ فنا تھی وہ

دستِ قضا تھی یا کہ اجل کا عصا تھی وہ
زخموں کے تنگ کو چو نسے خوب آشنا تھی وہ

بے بار کیوں خمیدہ سرِ ذوالفقار تھا
اعدا کے سر پہ تن تھے یہی اُسپہ بار تھا

وہ تیغ کی سج اور وہ قبضے کی سجاوٹ
معشوقوں کی صورت، سرِ اعدا سے لگاوٹ

دم - کس - چم و خم - فتح کا عکس حسن کا جوہر
بھاری تھی ہزاروں پہ وہ اک تیغِ دوپیکر

کیا خوبیاں شمشیرِ دوسر میں تھیں سراسر
ہلکی تھی مگر ہاتھ میں ناخن کی برابر

کی پھر تو علم شاہ نے تیغ شہِ مرداں — ولہ — وہ برقِ دو دم جس سے خجل برقِ درخشاں
تیغِ دو زباں صاعقہ افگن سرِ میداں — خود جوہرِ شمشیر بنے دیدۂ حیراں

گو تیغ میں شعلے تھے مگر آب بھی کیا تھی
کیا معجزہ تھا آتش و آب ایک ہی جا تھی

اُس تیغ سے مکّاروں کو مہلت وہاں کب تھی — ولہ — تلوار نہ تھی - قہرِ خدا - برقِ غضب تھی

منظور جو اُس تیغ کو اکبرؔ کی رضا تھی — ولہ — گہ ابر تھی - گہ برق تھی - گہ سیلِ فنا تھی

اُس تیغ سے برباد عناصر کی بنا تھی — ولہ — خود آگ تھی خود خاک تھی خود آب و ہوا تھی

تھی راست گو وہ تیغ یہ روشن جہاں پتھا — ولہ — جتنا لہو پیا تھا وہ جاری زباں پتھا

جوہر نہ تھے وہ تیغِ شہِ خوشخصال میں — ولہ — دن کو چمک رہے تھے ستارے ہلال میں

ع - اک جلوہ ہی اُس تیغ کا برقِ فلکِ پیر،
ع - یہ تیغ ہے یا ناخنِ شہبازِ قضا ہے،

تلوار کا کاٹ

تلوار کا کاٹ

جس صف پہ گری صاف صفائی نظر آئی — جس غول پہ چمکی تو ہوا غل کدھر آئی
چھٹی جو پرے پر تو لہو میں یہ بھر آئی — اک اک کو خبر بھی نہ رہی اپنی - پرائی

لہرا کے جو بیٹھی - تو جگر کاٹ کے اُٹھی
ناگن کی طرح شبنمِ خوں چاٹ کے اُٹھی

بجلی سی گری تیغِ شرر بار سروں پر — تھی خود پہ ہر بار - تو ہر بار سروں پر

کٹ کٹ گئے جس وقت چلا دار سروں پر
تھی خود پہ ہر بار۔ تو ہر بار سروں پر

ہل چل میں نہ تھا ہوش کسی کو سر و پا کا
چلاتے تھے خود سر یہ طمانچہ ہے قضا کا

صورت میں مہِ نو۔ تو چمک مہر سے افزوں
لب تشنہ تھی ایسی کہ ہزاروں کا پیا خوں

وہ باڑ کہ اک دم میں بہا خون کا جیحوں
ہر وار میں تھا رنگ لڑائی کا دگرگوں

کشتوں سے بیابانِ بلا پاٹ رہی تھی
ہل ہل کے لعینوں کے گلے کاٹ رہی تھی

اعدا کے پرے خون میں بھر جاتی تھی تلوار
دو کر کے سپر تا بہ کمر جاتی تھی تلوار

جوں سیل سروں پر سے گذر جاتی تھی تلوار
حاضر تھی قضا ساتھ، جدھر جاتی تھی تلوار

سر پر جو پڑی تیر گئی دامنِ زیں تک
اُتری سرِ زیں سے تو گئی گاوِ زمیں تک

کی پھر تو علم شاہ نے تیغ شہِ مرداں
تیغِ دو زباں صاعقہ افگن سرِ میداں

وہ برقِ دو دم جس سے خجل برقِ درخشاں
خود جوہرِ شمشیر بنے دیدۂ حیراں

گو تیغ میں شعلے تھے مگر آب بھی کیا تھی
کیا معجزہ تھا۔ آتش و آب ایک ہی جا تھی

جس سر پہ یہ ٹھہری تو وہ سر تن پہ نہ ٹھہرا
توسن کا قدم دشت کے دامن پہ نہ ٹھہرا

تن زین پہ اور زین بھی توسن پہ نہ ٹھہرا
اور شرع میں خوں۔ تیغ کی گردن پہ نہ ٹھہرا

قانونِ عدالت عملِ تیغِ نکو تھا

جو منکرِ یکتائیِ حق تھا وہی دو تھا

خود رفتہ ہوئے بھاگنے کے قصد میں بے پیر
ترکش میں رکھیں تیغیں، نیاموں میں رکھے تیر
جی کر کے جو ٹھہرے بھی دمِ دار و دمِ گیر
قبضے کے بدل ہات میں پکڑا سرِ شمشیر

تیروں کے عوض ہاتھ فقط جوڑ رہے تھے
ہاتوں سے کماندار کماں چھوڑ رہے تھے

میداں سے صفیں بھاگ گئیں فوجِ لعیں کی
بس رہ گئیں ماتھے پہ صفیں چینِ جبیں کی
ضربت تھی غضب دستِ جنابِ شہِ دیں کی
ہر بار لچکتی تھی کمر گاوِ زمیں کی

چھپتی تھی زمیں شہپرِ جبریلؑ امیں میں
جبریلؑ فلک میں تو فلک عرشِ بریں میں

اللہ رے رعبِ تیغ زہے شوکت و جلال
چمکی جدھر صفیں کی صفیں ہو گئیں نڈھال
دشمن کے فرق پر جو گئی برق کی مثال
گھبرا کے تیرہ روزوں نے آگے بڑھائی ڈھال

غل پڑ گیا سپر کو بچا تیغِ شاہ سے
بجلی کو لاگ ہوتی ہے رنگِ سیاہ سے

جس مورچہ میں لیلیِ تیغِ دو سر گئی
چنگے بھلوں کو سایہ سے دیوانہ کر گئی
ہر صف نے خاک اڑائی ادھر سے اُدھر گئی
پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پر جو لڑ کھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی

تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھیے، یہ جنکے سر پڑی

اُٹھی۔ گری۔ بلند ہوئی۔ پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

پھول اُڑ گئے جو ڈھالوں کے خرمن سے جا ملی
پھر سر تھا سو قدم پہ جو گردن سے جا ملی
رگ رگ الگ الگ ہوئی جس تن سے جا ملی
کڑیاں جُدا ملیں۔ جو یہ جوشن سے جا ملی

تاثیرِ چشمِ زخم، بدوں کو دکھا گئی،
مثلِ نظر، بدن کو لگی، اَور کھا گئی

تیغِ دو سر کو سر پہ بٹھاتے تھے خاص و عام
یعنی بلند صاحبِ جوہر کا ہے مُقام
چُپ تھے۔ حضورِ تیغ زباں آورانِ شام
کیا مُنہ جو کوئی اہلِ زباں سے کرے کلام

برچھی نے بحث کی نہ خدنگ و حسام نے
سب کی زبان بول گئی اُسکے سامنے

پہلو کے پاس آکے جو سن سے نکل گئی
بے زخم کھائے جان بدن سے نکل گئی
چھوڑی نہ کوئی بات دہن سے نکل گئی
ڈوبی زمیں میں چرخِ کہن سے نکل گئی

تارے کہیں۔ قمر کہیں۔ چرخِ بریں کہیں،
مچھلی کہیں تڑپتی تھی، گاوِ زمیں کہیں

جس صف کے سر پہ تیغ دو پیکر نظر پڑی
وہ صف کی صف زمین پہ بے سر نظر پڑی
جب سرکشوں کی، تیغ دو سر پر نظر پڑی
اُٹھے جہاں سے موت برابر نظر پڑی

پتھرا کے آنکھ رہ گئی، مردم کو غم ہوا
جو عین اُس کے دم پہ چڑھا وہ عدم ہوا

ہر اک سپر نڈھال تھی دہشت سے وار کی
ششدر تھا چار آئینہ۔ جب آنکھ چار کی

نرمی عیاں تھی کڑیوں سے سنبل کے تار کی
کڑیاں زرہ سے اُٹھ نہ سکیں ذوالفقار کی

مہتاب تھا کہ پرتوِ صمصامِ پاک تھا
رخت حیات مثلِ کتاں چاک چاک تھا

لشکر کو مثلِ وعدۂ لیلےٰ نہ تھا قرار
دل سے شکستِ توبۂ مجنوں تھی آشکار
جان اس طرف رواں تھی، قرار اُس طرف ذرا
قالب سے روح بھاگ گئی، دل تو درکنار

روئیں تنوں کا طنطنہ و زورِ تن گیا
ہر عضو بھاگنے کے لیے پاؤں بن گیا

چال اُس پری کی عاملوں کو مات کر گئی
بھاگا وہاں سے سایہ، جہاں یہ ٹھہر گئی
کھیلی قضا کے ساتھ کہ ہستی گذر گئی
سر پر چڑھی تو شیشۂ دل میں اُتر گئی

آگے بڑھی جو دل پہ یہ قبضہ کیے ہوئے
غل تھا پری وہ اُڑ گئی شیشہ لیے ہوئے

کیسی زمیں، فلک سے یہ ہر دم گذرتی تھی
پر حدِ شرع سے قدم آگے نہ دھرتی تھی
خونِ عدو نجس تھا۔ سو پرہیز کرتی تھی
ناخن بھی اپنا تیغِ دو پیکر نہ بھرتی تھی

بے جرم معرکے میں یہ خار اشگاف تھی
لشکر کا خوں کیا تھا مگر پاک صاف تھی

بو کی طرح دماغوں میں آئی۔ چلی گئی
مثلِ ہوا سروں میں سمائی۔ چلی گئی
مانندِ شعلہ باگ اُٹھائی چلی گئی
آندھی کی طرح۔ آگ لگائی چلی گئی

سینے میں صاف آتی تھی، اور صاف جاتی تھی
انداز دم کی آمد و شد کا دکھاتی تھی

آنکھوں میں کوند جاتی تھی پیشِ نظر نہ تھی
صف کونسی تھی رن میں کہ زیر و زبر نہ تھی
کچھ انتہائے برّشِ تیغ دوسر نہ تھی
یہ کون مبتدا تھی کہ جس کی خبر نہ تھی

یاں تھی تو واں نہ تھی، جو ادھر تھی اُدھر نہ تھی
پر یہ نہ کچھ کھُلا کہ کدھر تھی۔ کدھر نہ تھی

اک دم میں برابر۔ ادھر آئی اُدھر آئی
یاں دم لیا۔ واں سر۔ ادھر آئی۔ اُدھر آئی
ہر سو ہوا محشر۔ ادھر آئی۔ اُدھر آئی
ڈر کر صفِ لشکر۔ ادھر آئی۔ اُدھر آئی

جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی
آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی

سر کو نہ خبر یہ تھی کہ دستار کہاں ہے
رہوار نہ واقف تھے کہ اسوار کہاں ہے
حیراں تھی ہر اک چشم کہ تلوار کہاں ہے
پیدا ہی شرر برقِ شرر بار کہاں ہے

چھائی جو سرِ دست یہ صمصام کی بدلی
رُت پھر گئی رنگت سپہِ شام کی بدلی
بدلی نے ہوا گردشِ ایّام کی بدلی
غُل تھا کہ نگہ کفر سے اسلام کی بدلی

گرنے میں جھڑی لگ گئی بیداد گرونکی
پڑنے لگی بوچھار جہنّم میں سرونکی

اللہ رے دماغ اُسکا کسی سر پہ نہ ٹھیری
سر ایک طرف۔ گنبدِ مغفر پہ نہ ٹھیری
بینیِ ستمگار کے ممبر پہ نہ ٹھیری
بالائے سپر۔ پھُولوں کے بستر پہ نہ ٹھیری

یہ بیٹھنا کب تھا ادھر آئی۔ اُدھر آئی

جس سر پہ رکھا پاؤں - زمیں پر اُتر آئی

کہتے تھے ستمگار - زہے تیغ علمدار
چھل بل ہی - چھلاوہ ہی طلسمات ہے اسرار
سمجھیں اگر آسیب کہاں اُسکے یہ کردار
کہیے جو پری تیز پری اُس سے یہ دشوار

بھاگیں کہ لڑیں بات کوئی بن نہیں آتی
یوں مرگِ مفاجات بھی فورن نہیں آتی

ناگاہ دیا تیغ کو اکبرؑ نے یہ فرماں
گرمی میں دکھا دے مجھے برسات کا ساماں
یہ سُنکے اُٹھا آبِ دمِ تیغ سے طوفاں
سر خاک پہ گرنے لگے جوں قطرۂ باراں

منظور جو اُس تیغ کو اکبرؑ کی رضا تھی
گہ ابر تھی گہ برق تھی گہ سیلِ فنا تھی

گہ سر پہ کبھی شانے پہ، اور گاہ جگر پر
گہ سینے پہ گہہ قلب پہ اور گاہ کمر پر
گہہ شعلہ فگن ہوتی تھی بڑھ بڑھ کے سقر پر
گہ تھی دُمِ ماہی پہ کبھی ماہ کے سر پر

ہمشکلِ نبیؐ اپنا اگر ہات نہ روکیں
وار اُسکا کبھی ارض و سماوات نہ روکیں

تھرّا رہے تھے کون و مکاں خوف سے اُسکے
تھے زرد رُخِ پیر و جواں خوف سے اُسکے
ہر مُنہ میں ہوئی بند زباں خوف سے اُسکے
قالب سے رواں ہو گئی جاں خوف سے اُسکے

ہنگامۂ محشر تھا عیاں تیغِ دو دم سے
مرنے کے سوا کچھ نہ بنا فوجِ ستم سے

سینے میں گئی - لیتی ہوئی دم نکل آئی
گہ دل کی خبر لینے کو - زیرِ بغل آئی

کی قطع کلائی ۔ مگر اُسکو نہ کل آئی
جس جسم کو یہ چھو گئی اُس کی اجل آئی

ٹھیرے ہوئے چال اسکی فلک دیکھ رہے تھے
گھبرائے ہوئے جن و ملک دیکھ رہے تھے

گہ مثلِ نگہ چشمِ لعیں سے نکل آئی
گہ چینِ جبیں بنکے جبیں سے نکل آئی
مانندِ ہوا دامنِ زیں سے نکل آئی
گردوں میں چھپی اور زمیں سے نکل آئی

باندھی وہ ہوا جس سے بگولے ہوئے ناری
شرمائے جلے آگ ببولے ہوئے ناری

غصّے سے زرہ پوشوں کے سر پر اگر آئی
چار آئینے میں عکس، وہ جوشن میں در آئی
شیشے میں پری جال میں مچھلی نظر آئی
مُنہ دیکھ کے چلائی اجل میں کدھر آئی

قالب نہ زرہ میں تھا نہ دم اہلِ ستم میں
دم بھاگنے کے واسطے ٹھہرا تھا قدم میں

جلادِ فلک کہتا تھا ہاں شیرِ علیؑ کے
کیا حوصلے میداں میں نکالے مرے جی کے
یہ زور یہ قوّت نہیں حصّے میں کسی کے
ہاں سر نہ رہے جسم پہ ایک ایک شقی کے

اب تاب نہیں ہے تنِ افواجِ ستم میں
شہزادے ہوئی فتح لڑائی کوئی دم میں

لو تیغ زنو! اپنے سر و خود سے ہشیار
کھنچتی ہے حُسامِ کمرِ حیدرِ کرّار

؎ یعنی چار آئینہ میں تو تلوار کا عکس ظاہر ہوا اور وہ خود جوشن میں سما گئی ۔ پس چار آئینہ میں اُسکا عکس اسطرح تھا گویا شیشے میں پری ہے اور خود تلوار کا جوشن میں سمانا ایسا تھا گویا جال میں مچھلی نظر آرہی ہے ۔ ۱۲

اس فاقے میں دکھلاتا ہوں حملے تمہیں دو چار
سر پر اجل آپہونچی خبردار خبردار

کھولونگا شجاعت کے ہنر پیر و جواں پر
باندھونگا سرِ فوج سے پُل آبِ رواں پر

تھا شور وہ تڑپی وہ گری فوج پہ آکر
وہ جسم میں ڈوبی وہ تری خوں میں نہا کر
چمکی وہ زمیں میں، وہ پھری چرخ پہ جا کر
وہ خود پہ بیٹھی، وہ اُٹھی سر کو گرا کر

وہ پے کیا پیدل کو۔ وہ اسوار کو کاٹا
وہ تنگ میں در آئی وہ رہوار کو کاٹا

آندھی کی طرح آئی اُڑائے سرِ اعدا
کوندی صفتِ برق جلائے سرِ اعدا
دریا کی طرح اُمڈی۔ بہائے سرِ اعدا
بیٹھی روشِ گرد چھپائے سرِ اعدا

اس تیغ سے برباد عناصر کی بنا تھی
خود آگ تھی۔ خود خاک تھی۔ خود آب و ہوا تھی

اُس تیغ سے تھا ہر صفِ لشکر میں تلاطم
تھا نوحؑ کے طوفاں کا سمندر میں تلاطم
ہر شہر میں۔ ہر کوچے میں۔ ہر گھر میں تلاطم
دوزخ تہ و بالا تھا تو کوثر میں تلاطم

بتلاتے تھے زندے یہ کرامت ہی کرامت
چلاتے تھے مُردے یہ قیامت ہی قیامت

حرص و ہوا کی طرح سروں سے نکل گئی
آرام کی طرح جگروں سے نکل گئی
دکھلا کے اپنا بل کمروں سے نکل گئی
چار آئینوں سے اور سپروں سے نکل گئی

بے جسم شے کا کاٹنا تیغوں کی خو نہ تھی

برش سے اُسکی ڈھال کے پھولونمیں بو نہ تھی

جب یہ ملی کمر سے - کمر بند تھا جُدا
روح و بدن کے ربط کا پیوند تھا جُدا
محشر تھا یہ کہ باپ سے فرزند تھا جُدا
مانندِ دردِ عیش کا ہر بند تھا جُدا
یعنی لفظ درد ۱۲

کس تیغ کے وہ مُنہ سے ہو بات اس سے جو ہوئی
زخمی کے لب سے آہ جو نکلی تو دو ہوئی

چینِ جبیں کی طرح جبیں سے نکل گئی
پائی جو راہ تنگ تو زیں سے نکل گئی
زین اک طرف یہ حدِّ زمیں سے نکل گئی
جب سر اُٹھایا، چرخِ بریں سے نکل گئی

گردن سے سر لیا کبھی قالب سے دم لیا
بس دم لیا تو تیغِ دو دم نے یہ دم لیا

اک وار میں سواروں کی صف سے یہ پار تھی
مثلِ اجل پیادوں کے سر پر سوار تھی
گہ پیش و پس تھی، گاہ یمین و یسار تھی
جو اسکے سامنے تھا یہ خدمت گزار تھی

حیراں برش نے اسکی ہر اک تیغ کو کیا
چار آئینہ میں اپنے ہی سایہ کو دو کیا

جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے
دکھلائے دو ہلال شہِ مشرقین نے
لی دادِ حرب فاطمہؑ کے نورِ عین نے
کی مدحِ حرب فاتحِ بدر و حُنین نے

یہ ہیبتِ جہادِ شہِ نیک خو ہوئی
خود ذوالفقار میان سے کھنچتے ہی دو ہوئی

حیرت کا نقشہ چہرۂ کفّار بن گیا
رہوار ہر سوار کا دیوار بن گیا

تصویر کا سوار ہر اسوار بن گیا
دلّالِ مرگ سب کا خریدار بن گیا

لڑتے نہ بھاگتے نہ ٹھہرتے بنی اُنھیں
جاں سے بدن سے سر سے گذرتے بنی اُنھیں

شمشیر تھی کہ ناخنِ مشکل کشا تھی وہ
دستِ قضا تھی یا کہ اجل کا عصا تھی وہ
الیاسِ بحرِ فتح کہ خضرِ فنا تھی وہ
زخموں کے تنگ کوچوں سے خوب آشنا تھی وہ

بے بار کیوں خمیدہ سرِ ذوالفقار تھا
اعدا کے تن پہ سر تھے یہی اُس پہ بار تھا

چشم و دہن میں مثلِ نگاہ و زباں گئی
شکلِ نیام قلب کے یہ درمیاں گئی
آئی یہاں وہاں سے یہاں سے وہاں گئی
اور یہ نہ کچھ کھلا کدھر آئی کہاں گئی

کوئی نہ ذکرِ عیش میں نے فکرِ قوت میں
اُنگلی کی طرح سب کی زباں تھی سکوت میں

وہ تیغ میں ہوں کفر سے کی جسنے زمیں صاف
ولہ
رن صاف کیے ظالموں سے خانۂ زیں صاف
صاف اُنسے ہوں جن سے ہیں جنابِ شہِ دیں صاف
دشمن جو اماں مانگے تو کرتی ہوں نہیں صاف

پوشیدہ کوئی بدمزگی میں نہیں رکھتی
گردن کا جو نام آئے لگی میں نہیں رکھتی

تیغ کی زبان سے

اُس تیغ کے الف[+] کی چمک تا بقاف تھی
ولہ
جس صف کے بیچ میں یہ در آیا وہ صاف تھی
اللہ رے دغا آنکھ نے دیکھی نہ چمک بھی
ولہ
پُتلی تو سناں لگیئی جھپکی نہ پلک بھی

[+] تیغ چونکہ سیدھی ہوتی ہے اسلیے اُسکے قد کو الف سے تشبیہ دی ہے۔

ظاہر تھی کبھی اور کبھی آنکھوں سے نہاں تھی	ولہ	قدرت تھی خدا کی، کبھی یاں تھی کبھی واں تھی
ہلتی تھی زمیں گاوِ زمیں کانپ رہی تھی	ولہ	ساتھ اُسکے جو پھرتی تھی اجل ہانپ رہی تھی
بے وجہ نہ وہ قہر سے گرتی تھی زمیں پر	ولہ	جبریلؑ کے پر ڈھونڈتی پھرتی تھی زمیں پر
بل کھاتی تھی گہ اژدرِ خونخوار کی صورت	ولہ	اعدا کے گلے میں تھی کبھی ہار کی صورت
بھاگیں کہ لڑیں، بات کوئی بن نہیں آتی	ولہ	یوں مرگِ مفاجات بھی فوراً نہیں آتی
صورت الف کی پھل میں جو سیفِ خدا کے تھی	ولہ	آگے اجل کے چلتی تھی، درپے بقا کے تھی
حق تو یہ ہی، کہ مسئلہ داں تیغِ شاہ تھی	ولہ	سر چڑھ کے سب کے لڑتی تھی اور بیگناہ تھی
اعدا ہی نہ کمزور تھے شبیرؑ سے لڑکر	ولہ	چلتی تھی کوئی تیغ بھی تو ہاتھ پکڑکر
قدرت کا طلسمات وہ تیغِ شہِ دیں تھی	ولہ	ہر جا تھی ہر اک سمت تھی اور پھر نہ کہیں[1] تھی

تلوار کا میان سے جُدا ہونا

بادل سے مہِ تیغِ دوپیکر نکل آیا	بیضے سے ہما کھولے ہوئے پر نکل آیا
شیشے سے پری، غار سے اژدر نکل آیا	شق ہو[2] کے قمر برج سے باہر نکل آیا

بپھرے ہوئے دو شیر نئے ڈھنگ سے نکلے
دو آئینۂ فتح نما زنگ سے نکلے

[1] میر انیسؔ ؎ ہاں ہاں کا شور تھا کسی لب پر نہیں نہ تھی ؛ جلوہ تھا ہر مقام پہ اور پھر کہیں نہ تھی۔
[2] چونکہ ذوالفقار کے دو پھل تھے اسلیے اسکو اُس قمر سے جو شق ہوگیا ہو اور میان کو برج سے تشبیہ دی ہے، یہی صورت ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں ہے۔

نکلی غلافِ نور سے تفسیرِ جوہری یا حجلہ سے عروس نے کی جلوہ گستری	ولہ	یا آکے دستِ بوسِ سلیمانؑ ہوئی پری یا تھی یہ شاخِ میوۂ طوبیٰ ہری بھری
		اس ہاتھ سے مرادیں تھیں جو جو وہ مل گئیں باچھیں خوشی سے تیغ کے قبضے کی کھل گئیں
باہر نیام سے سرِ تیغِ رواں ہوا اژدر نکل کے غار سے شعلہ فشاں ہوا	ولہ	یا آستین سے یدِ بیضا عیاں ہوا بے پردہ مہرِ خسروِ کون و مکاں ہوا
اکبرؑ نے بھی غلاف سے لی تیغ دُور سے	ولہ	اک شمع نکلی پردۂ فانوسِ طور سے
کیا ہاتھ میں شمشیرِ علیؑ بر محل آئی مشتاقِ یوسفؑ میں نہ عاشق کو کل آئی	ولہ	قبضے میں اجل، پنجہ میں تیغِ اجل آئی بیساختہ حجرے سے زلیخا نکل آئی
خالی نیام سبز ہوا ذوالفقار سے یا برق کوندتی ہوئی ابر بہار سے	ولہ	یا عندلیبِ سدرہ اُڑا شاخسار سے یا شہسوارِ فتح کا نکلا غبار سے
ٹھہری نہ پھر نیام میں یوں تیغِ آبدار	ولہ	جیسے سخی کے کیسے میں زر کو نہ ہو قرار
شمشیر بھی غلاف سے باہر نکل پڑی	ولہ	غرفے سے حورِ خلد کھلے سر نکل پڑی
ع - پھل میان سے نکلا کہ ضیا کاہکشاں سے		

تلوار کے جوہر

مالک تھی دو زبان کی تیغِ شہِ انام		جوہر کلام اُسکا تھا، پر پیچ کا کلام
اللہ رے آبداریِ شمشیرِ آبدار	ولہ	ڈوبی لہو میں اور ہوئی آلودۂ غبار

پر دھونے کو نہ پانی کی حاجت تھی زینہار | خود آبِ تیغ تیغ کو دھوتی تھی بار بار

گر کر اُٹھی تو اَور بھی جوہر چمک گئے
مینھ کھُل گیا برس کے ستارے چمک گئے

جوہر سے سب کے بال بدن پر کھڑے ہوئے | ولہ | غل تھا ہلال میں ہیں ستارے جڑے ہوئے
مرتے ہیں رعبِ تیغ سے ہم بے لڑے ہوئے | | جوہر کے پیچ سے ہیں بلا میں پڑے ہوئے

جوہر کا سلسلہ تھا مگر مچھلیوں کا جال | ولہ | یہ سیف خود پھڑکتی تھی اُس میں پے جدال

جوہر نے جب چمک کے شرارے دکھا دیئے | ولہ | پھر دن کی دھوپ رات کے تارے دکھا دیئے

جلو میں فتح و ظفر، پشت پر قضا و قدر | ولہ | قضا کا جال برابر لیے چلے جوہر

ناگاہ آئے پشت پہ کچھ پیشوائے شر | ولہ | تیغِ علیؑ نے دیدۂ جوہر سے کی نظر+

دیکھے نہیں کسی نے یہ جوہر حسام میں | ولہ | کہتے تھے سب کہ تیغ ابھی ہے نیام میں

سب کے گلے سے ملتی تھی لیکن رُکی ہوئی | ولہ | جوہر یہ تھے کہ بوجھ سے تھی خود جھکی ہوئی

کیا تیغِ آبدار تھی جوہر سے خوش جمال | ولہ | منجھدھار میں کھڑی تھی پری کھولے سر کے بال

ہوئے اُسے قیام نہ ہرگز نیام میں | ولہ | گر قید ہوئے آپ نہ جوہر کے دام میں[1]

ع - چشمِ جوہر سے لعینوں کی جو تھی جوئندہ+

---

[1] میر انیس ؎ بجلی نے کہیں میان میں آرام لیا ہے ؛ زنجیر نے جوہر کی اُسے تھام لیا ہے
+ میر انیس - ع - وہ دیدۂ جوہر سے جفا کاروں کا تکنا -

رزم کے بیان میں عشقیہ الفاظ کا استعمال

رزم کے بیان میں چونکہ میر صاحب مرحوم کے کلام میں عشقیہ الفاظ کا استعمال ہوا ہے، اسلیے شکر ہے کہ مؤلف نے اُسکے جواز کا فتوے دیکر اُردو مرثیہ گویوں کو گرانبارِ احسان بنادیا ہے۔ لیکن اس موقع پر وہ اُن کو بالکل آزاد اور خودسر بنادینا بھی نہیں چاہتے اسلیے ایک سخت شرط لگادی ہے کہ "رزم میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا استعمال وہیں تک جائز ہے جہانتک کلام کا اثر نہ جانے پائے اور کلام میں ابتذال نہ آجائے"۔ مگر مشکل تو یہ آپڑی ہے کہ ابتذال کا معیار مولوی صاحب کے مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں، اُنھیں کا مذاق اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل۔ پست اور سوقیانہ ہے۔ اہلِ زبان کی اس موقع پر کچھ چل نہیں سکتی۔ جیسے اُنھوں نے ایک موقع پر لکھدیا کہ میر صاحب نے کمتی کا جو لفظ استعمال کیا ہے یہ اراذل اور انفار کی زبان ہے، حالانکہ پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ یہ لفظ محلاتِ شاہی میں بولا جاتا تھا۔ بہرحال مولوی صاحب کا یہ فتویٰ ہم کو بھی تسلیم ہے، سوا۔۔۔ اس فقرہ کے کہ اس طرز میں مرزا دبیر صاحب نے بھی میر انیس کی تقلید کرنی چاہی مگر کلام کا یہ رنگ ہوگیا، اس کے بعد ایک شعر بڑی جستجو کے بعد تلاش کرکے یا خود تصنیف کرکے تحریر کردیا ہے جو یہ ہے۔ ؎

جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی　　غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

استغفراللہ۔ نہیں معلوم یہ شعر کس مسخرے کا ہے جو نہایت بیجا اتہام و افترا سے مرزا صاحب کی طرف منسوب کردیا۔ یہ ٹیپ نہ مطبوعہ ہے نہ قلمی مرثیوں نظر سے گذری ہے، شاید مؤلف نے خود تصنیف کرکے مرزا صاحب کے نام سے درجِ کتاب کردی ہے۔

اب ہم مرزا صاحب کے وہ اشعار نقل کرتے ہیں جن میں عشقیہ الفاظ اور تشبیہات کا نہایت خوبی کے ساتھ استعمال فرمایا ہے اور منصف مزاج مولف سے اُنکی نفاست ورنگینی کی داد چاہتے ہیں - ان اشعار میں نہ کلام کا اثر جانے پایا ہے نہ ابتذال آیا ہے - مثلاً

تلوار	جانے میں شبِ وصل کی ساعت نظر آئی	آنے میں یہ عاشق کی طبیعت نظر آئی
	سب کے گلے سے ملتی تھی، لیکن رُکی ہوئی	جوہر یہ تھے کہ بوجھ سے تھی خود جھکی ہوئی
	آگے بڑھی جو دل پہ یہ قبضہ کیے ہوئے	غل تھا پری وہ اُڑ گئی شیشہ لیے ہوئے
	کیا تیغِ آبدار تھی جوہر سے خوش جمال	منجدھار میں کھڑی تھی پری کھولے سر کے بال
	اُٹھی گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی	پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی
	شمشیر بھی غلاف سے باہر نکل پڑی	غرفہ سے حورِ خلد کھلے سر نکل پڑی
گھوڑا	سلمائے عجم تھا نہ وہ لیلائے عرب تھا	پر ناز و کرشمہ جسے کہتے ہیں وہ سب تھا

سلام

اُردو شاعری میں سلام غزل کا قائم مقام ہے۔ جس طرح غزل میں ہر شعر کا مضمون علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور تسلسلِ بیان سے مطلب نہیں رکھا جاتا حتیٰ کہ دو شعروں کے مضمون میں بھی تسلسل نہیں پایا جاتا، ایک شعر میں زلفِ محبوب کی تعریف ہے تو دوسرے میں ہجر کے مصائب کا ذکر ہے، یہی سلام کا بھی حال ہے۔ جس طرح غزلوں میں عشقیہ اور رندانہ مضامین کے علاوہ بعض عام اخلاقی اور تمدنی مضامین بھی نظم کیے جاتے ہیں، اسی طرح سلاموں میں مرثیت سے علیحدہ ہو کر مختلف جذباتِ انسانی مثلاً حسرت و غم۔ صبر و رضا۔ قناعت و توکّل۔ یاس و ناامیدی۔ حبِّ وطن۔ قومی ہمدردی۔ بے ثباتیِ دنیا۔ شکایتِ اربابِ زمانہ۔ یادِ ایّامِ شباب اور اس کے سوا دیگر مختلف مضامین کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جنکو اگر سلام سے علیحدہ کر دیں تو غزل کے اشعار میں مل سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض شعرا کے کلام میں سلام کے اشعار ایسے رنگین اور دلچسپ ہوتے ہیں کہ غزل کا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ میر مونس صاحب کو اس طرزِ خاص میں شہرت حاصل ہے، میر انیس صاحب مرحوم کے سلاموں میں بھی ایسے دلچسپ اور رنگین اشعار پائے جاتے ہیں، لیکن مرزا صاحب کے کلام پر ازبسکہ مرثیت کا رنگ ہمیشہ غالب رہتا ہے اسلیے سلاموں میں اُن کی توجہ فقط الفاظ کی سادگی و صفائی اور مضمون کی درد انگیزی پر رہتی ہے۔ اور مرثیت کے مضامین

کے علاوہ عام رنگین مضامین کے اشعار اُن کے سلاموں میں کم ملتے ہیں - اب ہم مرزا صاحب کے دو چار سلام نقل کرتے ہیں -

مجرا اُسے مدام جو راہِ رضا میں تھا
خنجر تھا جب گلے پہ وہ شکرِ خدا میں تھا

عابدؑ نے دفن کر کے شہیدوں کو یہ کہا
حصّہ نہ اس مریض کا خاکِ شفا میں تھا

پیاروں کی موت، گھر کی تباہی، عطش کا غم
کیا شاہ پر وفورِ بلا کربلا میں تھا

عبّاسؑ نے بھی خوب نباہی حسینؑ سے
جو عشق ابتدا میں، وہی انتہا میں تھا

اے چرخ کیوں حسینؑ کا خیمہ اُٹھا دیا
دریا تو مہرِ حضرتِ خیر النساؑ میں تھا

افسوس اے دبیرؔ نہ طالع رسا ہوئے
دل اس برس بھی آرزوئے کربلا میں تھا

ایضاً

سلامی خاک ہوا، خاک سے غبار ہوا
ابو تراب کی تربت پہ یوں نثار ہوا

ہجومِ غم میں سلامی جو اشکبار ہوا
ہر ایک تارِ مژہ موتیوں کا ہار ہوا

گلے میں باپ کے باہیں تھیں لاشِ اصغرؑ کی
خزاں ہوا جو وہ گل تو گلے کا ہار ہوا

بلند کیوں نہ ہوا آفتابِ محشر آہ
علیؑ کے لال کا نیزے پہ سر سوار ہوا

ہوئی نہ شمع میسّر جو شہ کی تربت کو
تو داغِ دل ہی چراغِ سرِ مزار ہوا

دبیرؔ سبطِ رسولؐ خدا کے صدقے سے
ترا سلام یہ نایابِ روزگار ہوا

ایضاً

نام پر شاہ کے پانی جو پلا دیتے ہیں
میرِ کوثر اُنھیں مجرائی دعا دیتے ہیں

فاطمہؑ کہتی ہے دنیا میں یہ آباد رہیں
شہ کا پرسا مجھے سب اہلِ عزا دیتے ہیں

کربلا میں کوئی مدفون اگر ہو تو حسینؑ
خاک کو مرتبۂ خاکِ شفا دیتے ہیں

چشمِ سجادؑ اگر ضعف سے بھی ہوتی ہے بند
اشقیا پاؤں کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

بوسہ لیکر لبِ سوفار کا کہتے تھے حسینؑ
بھوک اور پیاس میں کیا تیر مزا دیتے ہیں

دیکھ کر لاشوں کو شہ کہتے تھے اے پیرِ فلک
یوں کہیں خاک میں گلزار ملا دیتے ہیں

رو کے کہتی تھی سکینہؑ کہ ہمیں قید کیا
لوگ زنداں سے یتیموں کو چھڑا دیتے ہیں

کیا سخی ہیں شہِ دیں بخششِ امت کے لیے
جان بھی دیتے ہیں اور گھر بھی لٹا دیتے ہیں

یہ سلامِ شہِ مظلوم کہا خوب دبیرؔ
دیکھیں انعام میں مولا مجھے کیا دیتے ہیں

ایضاً

ہے عکسِ گیسو و رخِ اکبرؑ کہاں کہاں
سنبل کہاں کہاں ہے، گلِ تر کہاں کہاں

کوفے میں۔ کربلا میں۔ بقیعہ میں۔ طوس میں
مدفون ہوئے بتولؑ کے دلبر کہاں کہاں

گلزار میں جناں میں۔ ختن میں۔ تتار میں
پھیلی ہے نکہتِ گلِ حیدرؑ کہاں کہاں

گل میں شفق میں۔ لعل میں۔ خورشیدِ صبح میں
ہے رنگِ خونِ کشتۂ خنجر کہاں کہاں

صفین میں جمل میں۔ احد میں۔ تبوک میں
تنہا لڑے ہیں حیدرِ صفدر کہاں کہاں

فرقِ عدو میں۔ سینے میں۔ جوشن میں زین میں
در آئی ذوالفقارِ دوپیکر کہاں کہاں

بستی میں جنگلوں میں۔ ترائی میں کوہ میں
شہ کو لیے پھرا ہے مقدر کہاں کہاں

غربت میں۔ گھر میں۔ قبر میں۔ محشر میں اے دبیرؔ
آئے مدد کو ساقیِ کوثر کہاں کہاں

ایضاً

بیت جنت میں ملے، نظمِ سلام ایسا ہو
روئیں سب مجرئی، پُر درد کلام ایسا ہو

سرِ شہ نیزہ پہ تھا سارے سروں کے آگے
بعدِ مُردن بھی امامت تھی امام ایسا ہو

لاشہ ہائے شہدا دیکھ کے شہ کہتے تھے
لشکر اک دن میں کسی کا نہ تمام ایسا ہو

ہو گیا نقشِ نگیں مُہرِ نبوت کا حسینؑ
مُہر ایسی ہو نگیں ایسا ہو۔ نام ایسا ہو

حرؑ جو شبیرؑ پہ صدقے ہوا زینبؑ نے کہا
یا الٰہی مرے بیٹوں کا بھی نام ایسا ہو

بے ردا آلِ نبیؐ! پردے میں ناموسِ یزید!!
خاص کی قدر وہ ہو، رتبۂ عام ایسا ہو!!

زینبؑ خستہ جگر تھامنے کو آئی رکاب
کیوں فلک بیکس و مظلوم امام، ایسا ہو

ایضاً

مجرئی شہ کو نہ کیوں خلقِ خدا یاد کرے
جو خدا کو تہِ شمشیرِ جفا یاد کرے

مجرئی ہند کو پھر میری بلا یاد کرے
درِ دولت پہ اگر شیرِ خدا یاد کرے

کس طرح خاک اُڑا کر نہ دمِ سرد بھرے
باغِ زہراؑ کی خزاں کو جو صبا یاد کرے

اپنے ہر شیعہ سے مولا کی یہ فرمائش ہے
جو پیئے پانی، مرا خشک گلا یاد کرے

ق

دیکھ کر چہرۂ اکبرؑ یہ پکارے اعدا
کون یوسفؑ کو حضورؐ اسکے بھلا یاد کرے

رُخ ہے وہ گلشنِ قدرت کہ بوقتِ گلگشت
دل عنادل کا نہ اک گُل کی صفا یاد کرے

گر نگہ خضرؑ کی ہو آبِ ذقن سے سیراب
پھر نہ وہ ذائقۂ آبِ بقا یاد کرے

چشم وہ چشم کہ نظارہ کرے اُسکا اگر
نرگسِ باغِ جناں کو نہ صبا یاد کرے

واہ کیا نور ہے۔ کیا حسن ہے اللہ اللہ!
ایسے بندوں کو نہ کیوں جلد خدا یاد کرے

ایضاً

مجرائی قحطِ آب بھی تھا اور غذا نہ تھی
پر بیچو اس فاقے میں فوجِ خدا نہ تھی

آزار سے گناہ کے ممکن شفا نہ تھی
جز خاکِ پاکِ مجرئی اُس کی دوا نہ تھی

مجرائی کیا غضب ہے کسی کو حیا نہ تھی
بلوے میں سر پہ آلِ نبیؐ کے ردا نہ تھی

تعمیر اس لیے کیا کعبہ خلیلؑ نے
قابل کوئی ولادتِ حیدرؑ کے جا نہ تھی

تشبیہِ اشکِ ماتمِ شہ نے دیا شرف
آگے یہ آبروئے دُرِ بے بہا نہ تھی

آئیگی حشر میں لبِ سوفار سے صدا
بانوؑ کے بے زبان کی یارب خطا نہ تھی

ہی ہی طمانچہ شمر نے مارا یتیم کو
رونا یتیم کا تو کچھ ایسی خطا نہ تھی

عابدؑ پکارے گورِ غریباں بنا کے، آہ
بیمار کے نصیب میں خاکِ شفا نہ تھی

رعشہ۔ ورم۔ بخار۔ غشی ضعف۔ دردِ سر
عابدؑ کو اتنے عارضے تھے، اور دوا نہ تھی

ہیہات چوبِ بید سے کھولے لبِ حسینؑ
بے رحم کو یہ دست درازی روا نہ تھی

آئے حسینؑ لاشۂ اکبرؑ پہ کس گھڑی
ساقط تھی نبض، روح بدن سے روانہ تھی

سائل ہوا بخیلوں سے پانی کا وہ کریم
حرفِ طلب سے جس کی زباں آشنا نہ تھی

ہیہات اُسکو شمر نے پہنائیں بیڑیاں
جس ناتوان کو خبرِ دست و پا نہ تھی

پھر اس زمیں میں فکر کرونگا میں اے دبیر
اسوقت اختیار میں طبعِ رسا نہ تھی

ایضاً

حشر میں جوہریِ اشکِ عزادار ملے
مجرئی مول میں قصرِ دُرِ شہوار ملے

شیرِ خاتونِ قیامت کی جسے دھار ملے
مجرئی قہر ہے اُس حلق سے تلوار ملے

دی جگہ آبلوں میں تا نہ خلش غیر کو ہو
پائے سجادؑ کو رستے میں جہاں خار ملے

سرِ شہ دیکھا۔ چھڑی ہونٹوں کے اوپر دیکھی
رنج زینبؑ کو نہ کیا کیا سرِ دربار ملے

متفق حبِّ علیؑ پر ہوں جو سب اہلِ جہاں
ایک بھی پھر نہ قیامت میں گنہگار ملے

حشر میں نذرِ غمِ شاہ کا بدلہ ہوا خوب
جسنے یاں اشک دیئے واں دُرِ شہوار ملے

ہند آئی جو محل سے سرِ دربارِ یزید
اک رسن میں کئی سادات گرفتار ملے

کیوں نہ گل چاک گریباں ہو زمیں سے پیدا
خاک میں فاطمہؑ زہرا کا جو گلزار ملے

شہدا کہتے تھے قربانِ حسینؑ و عباسؑ
ایسے کس فوج کو سردار و علمدار ملے

شام تک راہ میں عابدؑ کو تمنا یہ رہی
دم میں لیلوں جو کہیں سایۂ دیوار ملے

رن میں بازارِ شہادت جو قضا نے کھولا
سر بکف جنس شہادت کے خریدار ملے

دی دعا ماں نے یہ عباسؑ کو ہنگامِ سفر
جا تجھے مرتبۂ جعفرِ طیار ملے

درِ شہ خوابِ اجل کے لیے پاؤں جو دبیر
آنکھ کھل جائے کہ اب طالعِ بیدار ملے

ایضاً

کینہ دلِ مجرائی سرور میں نہیں ہے
یہ آئینہ اسکندر میں نہیں ہے

جو فکرِ سلامِ شہِ صفدر میں نہیں ہے
اے مجرئی خلد اُسکے مقدر میں نہیں ہے

بانو نے کہا شادیِ اکبرؑ کی ہوں مشتاق
ہی دل میں وہ حسرت جو مقدر میں نہیں ہے

اکبرؑ کے سراپا کی ثنا کرتے تھے اعدا
حقا یہ ضیا نیرِ اکبر میں نہیں ہے

کیا نکہتِ رخسار ہی کیا شوکتِ رفتار
وہ گل میں نہیں ہی، یہ صنوبر میں نہیں ہے

سیبِ ذقن و موجِ لبِ خشک کا ثانی
طوبیٰ میں نہیں، چشمۂ کوثر میں نہیں ہے

ہی نامۂ صغرا میں جو مضمونِ نقاہت
پرواز کا مقدور کبوتر میں نہیں ہے

زینبؑ نے کہا حرؑ کی ضیافت میں کروں کیا
فاقے کے سوا کچھ بھی مرے گھر میں نہیں ہے

مانگا شہِ مظلوم نے پانی جو دمِ ذبح
قاتل نے کہا آب بھی خنجر میں نہیں ہے

ہی ہائے حسینؑ کی صدا سنگ زنی میں
اس غم سے شرر کونسے پتھر میں نہیں ہے

ایضاً

سلامی شاہ کے غم میں جو اشکبار ہوئے
گہر سے بھی گہر اشک آبدار ہوئے

عزیزو! سنگدلی شمر کی، حسینؑ کا صبر
یہ دونوں واقعے دنیا میں یادگار ہوئے

لبِ فرات عجب بیکسی و غربت سے
ق
شہید مسلمِ بیکس کے گلعذار ہوئے

نہوگا بھائی کا بھائی پہ بعدِ مرگ یہ پیار
بہے جو نہر میں لاشے تو ہمکنار ہوئے

کھلے جو زخم شہیدوں کے مثلِ باغ جناں
خزاں کے بعد وہ گُل غیرتِ بہار ہوئے

ہر ایک دانۂ تسبیحِ کربلا ہے گواہ
کہ بوترابؑ کے سب لال خاکسار ہوئے

جبین سجدے میں گردن پہ تیغ، لب پہ شکر
خدا کی راہ میں شبیرؑ یوں نثار ہوئے

کہیں وہ دن ہو کہ مژدہ سُنے یہ سب سے دبیر
چلو کہ مہدیؑ دیں آج آشکار ہوئے

ایضاً

مجرئی ہے سوگوارِ ماہِ حیدرؑ چاندنی
اشک ہیں شبنم بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی

مجرئی فرشِ نجف سے کب ہو ہمسر چاندنی
چاندنی جھاڑو تو جھڑتی ہے زمیں پر چاندنی

نا کمالِ چاردہ معصوم روشن سب پہ ہو
چودھویں شب کو رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی

شمر نے چاہا کہ حضرت سے جدا عباسؑ ہوں
یہ نہ سمجھا چاند سے چھوٹے گی کیونکر چاندنی

مال و زر کا کیا بھروسہ چاہیے فکرِ مآل
فی المثل ہے چار دن کی اے تونگر چاندنی

ابروے ماہِ بنی ہاشم سے روشن تھا جہاں
بدر سے اس ماہِ نو میں تھی فزوں تر چاندنی

خاکساروں کا ہر اک دھبّہ سے دامن پاک ہے
گرد آلودہ نہیں ہوتی زمیں پر چاندنی

بارہا لکھا ہے شب کو حسنِ رخسارِ حسینؑ
روشنائی میں مرکّبؔ کی ہے اکثر چاندنی

ہوتے ہی طالع کیا ماہِ جوانی نے غروب
چار دن بھی دیکھنے پائے نہ اکبرؑ چاندنی

بے سوادوں کو نہیں تمیزِ حسن و قبحِ نظم
جانتا ہے کور سائے کی برابر چاندنی

ہر مہینے دشمنانِ دیں سے ہے سرگرمِ جنگ
چرخ پر رکھتی ہے ماہِ نو کا خنجر چاندنی

مرکّب اس مقام پر یہ صنعت ہے کہ مرکّب کے معنی بھی لکھنے کی روشنائی کے ہیں ۱۲ مولف

روضۂ حضرت کے گلشن میں اگر گلچیں بنے
بھر لے دامن میں گُلِ خورشیدِ انور چاندنی

روضۂ پُر نور مولا میں بچھائی ہے اگر
مہر کے چشمے میں دُھوائے ماہِ انور چاندنی

ایضاً

جو کہ مصروفِ سلامِ شہدا رہتا ہے
گو وہ رہتا نہیں پر نام سدا رہتا ہے

اے فلک بعدِ فنا کاٹے گئے دستِ حسینؑ
اک نہ اک ظلم ترے گھر میں نیا رہتا ہے

شمر کہتا تھا یہی ماں ہے علی اکبرؑ کی
جس کا اک ہاتھ کلیجے پہ دھرا رہتا ہے

ق

رو کے یہ ہند کی بیٹی نے سکینہؑ سے کہا
سر ترا کس لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے

وہ لگی کہنے یتیموں کی نشانی ہے یہی
کُرتا بے وارثی بچوں کا پھٹا رہتا ہے

باپ مارا گیا، بھائی موئے، زنداں میں پھنسی
اس مصیبت میں بھلا ہوش بجا رہتا ہے

طوفِ کعبہ کا تجھے شوق ہے ازبسکہ دبیرؔ
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما رہتا ہے

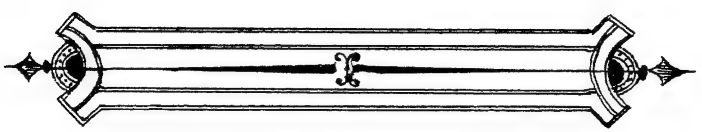

رباعیات

مؤلف نے میر انیس مرحوم کی چند رباعیاں لکھی ہیں جن میں کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہی یا کوئی مضمون بندی اور صنعت ہے، اسی طرح مرزا صاحب کی بھی بکثرت رباعیاں ہیں جن میں اُنھوں نے نہایت خوبی اور لطف کے ساتھ نفیس اور دلکش مضامین، اور عقیدت و معرفت و اخلاق کے مطالب نظم کیے ہیں۔ ہر ایک رباعی میں علاوہ خوبیِ مضمون کے صفائی۔ شگفتگی۔ گرمی اور تاثیر پائی جاتی ہی۔ اُن میں سے چند رباعیاں نمونہ کے طور پر یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

گھر خلد میں مجلسوں کے جانے سے ملا ہر چشم کے چشمے سے یہ جاری ہے صدا	قصرِ گہر اشکوں کے بہانے سے ملا کوثر مردم کو اس بہانے سے ملا
بلبل! یہ زمانہ ایک گُل کا نہ ہوا بندوں کو عبث خیالِ یکتائی ہے	محکوم اُمرا و رُسُل کا نہ ہوا اللہ پہ اتّفاق کُل کا نہ ہوا
یارب، ہے ترا حسینؑ آقا میرا تہلیل ہو جب روح، کروں ذکرِ حسینؑ	ہو دامنِ کربلا مصلّا میرا ڈھلکے اسی تسبیح میں منکا میرا

مر کر بھی نہ چین زیرِ افلاک ملا
اک تارِ کفن نہ گرد سے پاک ملا
اے خانہ خراب قبر، تیری خاطر
کھویا گو نقدِ جاں بھی، کیا خاک ملا

دریائے ثواب میں تلاطم کیسا
مجلس میں تاخّر و تقدّم کیسا
باقی ہے غبار اشکباروں میں دبیر
ہوتے ہوئے پانی کے تیمّم کیسا

جامع سپاروں کا جو رحمٰن ہوا
چودہ معصوموں کا ثنا خوان ہوا
سورے مصحف کے ایک سو چودہ ہیں
کامل چودہ سے مِل کے قرآن ہوا

پہونچا جو کمال کو وطن سے نکلا
قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل
پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا
باقی سامانِ عیش فانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر
اتنا بھی نہ اس کنوئیں میں پانی نکلا

پیری سے جو دالِ قد میں خم اور ہوا
دم تیز روِ ملکِ عدم اور ہوا
سمجھو نہ عصا، سوے عدم جانے کو
دو پاؤں تو تھے۔ ایک قدم اور ہوا

بن ٹھن کے ہزار بار آئی دنیا
پر چشمِ علیؑ میں نہ سمائی دنیا
جب تا درِ خیبر کو اُٹھایا تھا بلند
نظروں سے اسی طرح گرائی دنیا

افضل حیدرؑ کو ہر بشر سے پایا
ہمنام خدائے بحر و بر سے پایا
پہلے تو علیؑ ملے خدا کے گھر سے
پھر ہم نے خدا کو اُن کے گھر سے پایا

رہ جاتا ہوں انگشت بدنداں ہو کر
حیدرؑ کو کہا ابر، سخنداں ہو کر!!
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی، مگر
وہ دیتا ہے رُو رُو کے، یہ خنداں ہو کر

اندھیر ہے، خیر میں ریا کرتے ہیں
غیروں کو مثالِ روشنی فائدہ ہے

برباد نکوئی کی جزا کرتے ہیں
مانندِ چراغ خود جلا کرتے ہیں

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل

مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
اسواسطے کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

اے تربتِ پاک، دم ترا بھرتے ہیں
کھُل جاتا ہی عشق، آکے انشاء اللہ

کُشتے اکسیر کی ہوس کرتے ہیں
اے خاکِ شفا تجھی پہ ہم مرتے ہیں

پیشِ امرا طالبِ زر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی مثال

سجدے سے سوا مجرے میں سر جھکتے ہیں
ہے مال جدھر سوا اُدھر جھکتے ہیں

گنجینۂ حبِ شاہِ دیں ہے دل میں
حاسد کو ہی پیچ و تاب کیوں موج کی شکل

گرد اسکے ولائے مومنیں ہی دل میں
یاں مثلِ حباب کچھ نہیں ہے دل میں

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش

ڈھانپا جو کفن سے مُنہ دکھایا تجھ کو
جب خاک میں مِل گئے تو پایا تجھ کو

احمدؐ نے کہا علیؑ سے ہر جا تم تھے
عرش ایک طرف، پردۂ اسرار سے بھی

معراج میں تا عرشِ معلّا تم تھے
یوں آتی تھی آواز کہ گویا تم تھے

کہنے سے اذاں کے دین سب ملتا ہے
اعداد محمدؐ و علیؑ کے گن لو
۹۲ ۱۱۰

پر نامِ علیؑ نہ لو تو کب ملتا ہے
جب دونوں یہ باہم ہوں تو رب ملتا ہے
۲۰۲

جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا

تکیہ ہے جسے حق پہ تو نگر وہ ہے
دل جسکا ہے آئینہ، سکندر وہ ہے

معزور ذلیل و خوار ہر چشم میں ہے
اعزاز فروتنی کا پر چشم میں ہے
سب پر روشن ہی خاکساری کا شرف
سرمہ جو ہوا سنگ تو گھر چشم میں ہے

افسوس مری قدر نہ جاہل سمجھے
سمجھایا، تو نقطۂ مقابل سمجھے
معنی ہیں یہی نزاعِ لفظی کے دبیر
خاموش جو ہم ہوئے تو قائل سمجھے

کم مایہ سبک پیشِ جہاں ہوتا ہے
میزاں سے بدیہی یہ عیاں ہوتا ہے
خوردوں سے تواضع ہی بزرگی کی دلیل
جھکتا ہے وہ پلّہ جو گراں ہوتا ہے

مصرع ہیں مرے نہال گلشن کے لیے
اور خار ہیں چشم و دلِ دشمن کے لیے
ہی باعثِ آزار فروغ اپنا دبیر
آفت ہی ہوا کی شمعِ روشن کے لیے

حاصل یہیں نقدِ آرزو ہوتا ہے
قطرہ دریائے آبرو ہوتا ہے
جھکتا ہے جو روسیہ بھی تو مثلِ نگیں
اُٹھتے اُٹھتے سفید رو ہوتا ہے

اعتراضات

یعنی اعتراضات مولّف بر میر انیس

یہ وہ مقام ہی جہاں بڑے بڑے دلچسپ منظر ناظرین کی نگاہ کے سامنے پھر جائینگے اور قابل مولف کی طبیعت کے ذاتی خاصّہ کا بآسانی پتہ چل جائیگا۔ یہاں مولّف نے اپنے ہیرو پر اُسی بیباکی اور قابلِ افسوس جرأت کے ساتھ اعتراضات کیے ہیں جس قابلِ اعتراض دلیری کے ساتھ مرزا صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی شان میں غیر مہذب الفاظ تحریر کیے ہیں۔ اگرچہ دنیا میں کوئی انسان سہو اور خطا سے خالی نہیں لیکن خطا اور غلطیوں کے بھی مدارج ہوا کرتے ہیں۔ جس مشہور اور جادو نگار انشا پرداز کی قابلیّت کو بیشمار تجربوں کے بعد پبلک نے تسلیم کر لیا ہی، اگر اُس کی طرف منسوب کیے ہوئے کلام میں صرف ونحو اور لغت کی معمولی غلطیاں پائی جائیں تو اُن کے تسلیم کرنے میں ایک منصف مزاج اور تجربہ کار مبصّر کو نہایت تامّل ہوگا کہ آیا یہ الفاظ واقعی اُسی شخص کے قلم سے نکلے ہیں یا محرّفین کی عنایت ہے۔ لائق مولف نے میر انیس صاحب کے کلام میں جو غلطیاں بیان کی ہیں وہ اسی قبیل سے ہیں جنکو دیکھکر انیسے تو درکنار دبیر سے بھی بیحد ملول و مکدّر ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہی کہ اس موقع پر بھی ہم کو اپنے لائق بزرگ سے اختلاف کرنا پڑا، کیونکہ ہماری انصاف پسند طبیعت

کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ہم میر انیس جیسے یکتائے زمانہ شاعر کے کلام میں اُن معمولی غلطیوں کے قائل ہو جائیں جنکا ایک نومشق شاعر کے کلام میں بھی نظر آنا ناممکن ہو۔ آپ لکھتے ہیں کہ "میر انیس کے کمال کا میری برابر کوئی معترف نہوگا تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ اُن کا کلام فروگذاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے"۔ اگرچہ اس فقرے سے آپنے اپنے ناظرین کو تھپکایا ہے اور اپنی منصف مزاجی (کانشنس کے خلاف) دکھائی ہے، لیکن اس میں آپ سے ہم بھی متفق ہیں کہ الانسانُ مرکّب من الخطاء والنّسیان۔ بااینہمہ ہمارا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ اُن کا کلام ایسی معمولی اور ادنیٰ درجہ کی فروگذاشتوں اور غلطیوں سے ضرور پاک ہے جو آپ نے اُن کے سر تھوپی ہیں۔

اگر خدانخواستہ ان غلطیوں کو مان لیا جائے تو اُنکے کلام کا پایہ بہت گھٹ جاتا ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں۔ ایسے مشہور اور باکمال شعرا کی غلطیاں اگر ہمارے کانوں میں پہونچیں تو منصفانہ اُصول یہ ہے کہ ہم پہلے غلطیوں کو غور سے دیکھیں اور سوچیں کہ آیا اس رتبہ اور شان کا شخص ان غلطیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے یا نہیں، اگر نہیں ہو سکتا تو پھر ہم کو سوچنا چاہیے کہ ان غلطیوں کی کچھ تاویل ممکن ہے یا نہیں۔ یعنی الفاظ میں تحریف اور خلط تو نہیں ہو گیا۔ کاتب کی غلطی تو نہیں۔ اگر یہ تاویلیں ممکن ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تحریف یا کاتب نے ظلم کیا ہے اگر یہ تاویلیں بھی ممکن نہوں تو خیال کرنا چاہیے کہ یہ اُسکا کلام نہیں، کیونکہ ایسا باکمال شاعر معمولی اور مضحکہ انگیز غلطیاں ہرگز نہیں کر سکتا۔ ہم کو افسوس ہے کہ میر صاحب کے بارے میں مولف نے بااینہمہ حسنِ اعتقاد اس اصول سے کیوں عدول کیا اور ایسے ہمہ داں اور لاجواب شاعر کی نسبت کیونکر اُنکے پُر اعتقاد دل نے معمولی اعتراضوں کو قبول کر لیا، باوجودیکہ بآسانی اُن کی تاویل ہو سکتی تھی۔ الحق سلامتِ طبع اور استقامتِ ذہن جو کجی اور ناراستی کی

طرف نہ جائے ایک خداداد نعمت ہے ہر شخص کو نہیں مل سکتی۔

اعتراضات نسّاخ و مولف بر میر صاحب

قابل مولف اس موقع پر پہلے وہ اعتراضات تحریر کرتے ہیں جو عبدالغفور خاں نسّاخ نے میر صاحب پر قائم کیے ہیں اور اُن کو مولف نے بھی صحیح تسلیم کر لیا ہے، کیونکہ وہ خود آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ان اعتراضات کے علاوہ نسّاخ نے اور بھی بہت سے اعتراض کیے ہیں، لیکن چونکہ وہ صحیح نہ تھے قلم انداز کیے گئے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ نسّاخ کے جو اعتراضات اُنھوں نے تحریر کیے ہیں وہ اُنکے اعتقاد میں بھی صحیح ہیں ورنہ وہ بھی دوسرے غلط اعتراضوں کی طرح قلم انداز کر دیئے جاتے۔ اب ہم اس موقع پر اُنکے تمام اعتراضات اور پھر اُن کے مفصّل جوابات تحریر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

پہلا اعتراض

گویا کہ تھا شبیہ علم سر بسر نشاں		ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پُر نور اور نشاں	

اعتراض۔ اس شعر میں سر بسر کا قافیہ۔ اور ہے اور یہ بالکل غلط ہے۔

جواب

جواب۔ مولّف نے اس اعتراض کو صحیح سمجھ کر درج کتاب کیا ہے۔ کیا اُن کا اعتقاد سے بھرا ہوا دل قبول کر سکتا ہے کہ جس عالی دماغ اور ہمہ داں شاعر کی مدح سرائی میں اُنھوں نے قلم توڑ دیئے ہیں وہ اتنا بھی نہ جانتا تھا کہ سر بسر اور اور کا قافیہ ناجائز ہے۔ میرے خیال میں ایک طفلِ مکتب بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ پس یقیناً اصل مصرع پر کمال بیدردی سے تصرّف کی چھری چلائی گئی ہے۔ ضرور اصل مصرع یوں ہے۔ ع

ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پُر نور و زر نشاں۔ افسوس ہے کہ مولف کو بایں دعویِ لیاقت کتابت کی غلطی کا بھی علم نہوا اور یہ شعر جائز اعتراضات کے ضمن میں درج کر دیا۔

دوسرا اعتراض

۲۔ اکثر جگہ شائیگاں[۲] قافیے ہیں۔ مثلاً اس بند میں ؎

۲ ایطا کو فارسی میں شائیگاں کہتے ہیں۔ یعنی قافیہ میں کسی کلمہ کی تکرار کہ اُن دونوں کلموں کے ایک معنی ہوں۔

ناگاہ بڑھی فوج ہوا جنگ کا ساماں	اور گھٹنے لگی طاقتِ جسمِ شہِ مرداں
شہزادے پہ پڑنے لگا جب تیر کا باراں	تلوار علم کرکے کہا یا شہِ مرداں

اسکا جواب مجیب نے تو یہ دیا ہی کہ بجاے شہ مرداں، شہ ذیشاں تھا، لیکن قابل مولّف لکھتے ہیں کہ "اس قسم کی تاویلات پر اعتبار کرنا مشکل ہی" گویا اُنکے خیال میں اعتراض صحیح اور جواب غلط ہی۔ گویا میر انیس ایطا کے بھاری سقم سے بھی ناواقف تھے کسقدر زیادتی ہے۔

جواب

جواب۔ مجیب کا قول صحیح ہی۔ حقیقت میں اس موقع پر میر صاحب کے مرثیہ میں شہِ ذیشاں ہی ہی۔ چنانچہ مدت سے میں نے مختلف مرثیہ خوانوں کی زبان سے ہر مرتبہ شہِ ذیشاں ہی سُنا ہی۔ اور میر صاحب کی مطبوعہ جلد میں بھی شہِ ذیشاں چھپا ہوا ہے، پھر آپ لکھتے ہیں کہ "اگر ایسا ہی سمجھا جائے تو جہاں جس لفظ پر اعتراض ہو یہ کہدیا جائیگا کہ یوں نہیں یوں تھا"، بیشک جو غلطی ایسی صریح اور فاش ہو کہ ایک نومشق بھی نہ کرسکتا ہو ایسے مواقع پر اگر تاویل کی گنجائش ہو تو ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ یہ لفظ مصنّف نے اس طرح نہ کہا ہوگا بلکہ اصل میں یوں ہوگا۔ اکثر چھاپوں کی کتابوں میں بیشمار غلطیاں ہیں مگر کیا وہ مصنّفین کی جانب منسوب ہوسکتی ہیں۔ اگر ایسا ہو تو ایک طوفان بے تمیزی برپا ہو جائے گا۔

نوٹ بقیہ صفحہ ۴۹۹۔ لیکن اگر معنی مختلف ہوں ایطا نہیں ہی بلکہ صنعت تجنیس ہی۔ ایطا یا شائگاں دو قسم کا ہوتا ہی خفی و جلی۔ ایطا خفی یہ ہی کہ تکرار قافیہ کی ظاہر نہ ہو۔ مثلاً آب و گلاب کو اگر ہمقافیہ کریں تو اگرچہ گلاب میں بھی آب موجود ہی مگر وہ گُل کے ساتھ ایسا متحد ہوگیا ہی کہ گویا ایک جداگانہ لفظ معلوم ہوتا ہے ایطا جلی وہ ہی کہ اُسمیں تکرار ظاہر ہو جیسے دردمند اور حاجتمند۔ کہ مند کا زائد اور مکرّر ہونا ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۳۹۔

غلط جواب

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس مرثیہ میں تو سرے سے اعتراض ہی غلط ہے۔ کیونکہ شہِ مرداں سے ایک جگہ حضرت امام حسینؑ اور دوسری جگہ حضرت علیؑ مراد ہیں اسلیے قافیہ مکرر نہیں" آپکے جواب پر سخت افسوس بلکہ ہنسی آتی ہے۔ باوجود اسلامی تاریخ سے اسقدر ذوق و شوق رکھنے کے ہنوز آپ کو مداحانِ اہلبیتؑ کی اعتقادی اصطلاحات سے بھی اسقدر اجنبیت ہے۔ شاید آپ کا خیال ہوگا کہ جس مقام پر شہِ مرداں سے امام حسینؑ مراد ہیں وہ اپنے لغوی معنوں میں ہے۔ یعنی "مردوں اور بہادروں کے سردار" اور جہاں حضرت علیؑ مراد ہیں وہاں جناب امیرؑ کا وصفی لقب ہے جو آپکے واسطے بطور علم مخصوص ہوگیا ہے۔ لیکن یہ تاویل غلط ہے۔ بیشک شہِ مرداں اپنے لغوی معنی بھی رکھتا ہے لیکن یہ وصفی لقب حضرت علیؑ کے واسطے خاص ہوگیا ہے اور ہم لوگ اس لفظ کو سوا جناب امیرؑ کے اور کسی معصوم کے واسطے استعمال نہیں کرتے اسکے علاوہ اور بھی ایسے الفاظ ہیں جو خاص جناب امیرؑ کے واسطے مخصوص سمجھے جاتے ہیں جیسے لفظ امیر المومنینؑ یا مرتضیٰؑ کہ ان کو بھی لغوی معنوں کے لحاظ سے دوسرے شخص پر استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ بھی جناب امیرؑ کے مخصوص القاب میں سے ہیں۔ پس ہماری رائے میں جواب بہت صحیح ہے میر صاحب نے یقیناً شہِ ذیشاں فرمایا ہے۔

حروف تقطیع میں گر جانے کا اعتراض

۶۔ پھر فرماتے ہیں کہ اکثر حروف تقطیع میں گر جاتے ہیں اسکے واسطے چند مثالیں بھی دی ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس خطا کو اسوجہ سے معاف کرتے ہیں کہ اساتذہ کے ہاں کثرت سے اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ آخر میں قابل مولف تقطیع میں حرفوں کے گرنے کی بحث کو اس فقرہ پر ختم کرتے ہیں کہ "ان کے سوا اور بہت سی

مثالیں ہیں جنکو تطویل[1] کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا"

تیسرا اعتراض

۹ - انہیں اعتراضات کے ضمن میں جنکو قابل مولّف اپنے خیال میں صحیح سمجھتے ہیں ایک یہ ہی کہ میر صاحب نے فرمایا ہی ع اُترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی - یعنی مولف کے خیال میں یہ میر صاحب کے الفاظ ہیں -

جواب

جواب - کونین کا عالی بالکل مہمل اور بے معنی لفظ ہی - اور یہ غلطی ایسی بیّن اور کھُلی ہوئی ہی کہ ایک طفلِ مکتب بھی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ میر انیس جیسے یکتائے عصر فاضل کی نسبت ہم ایسا خیال کریں - میر صاحب کی جانب ایسا مہمل لفظ منسوب کرنے سے ہمارا دل تو کانپتا ہی، لیکن مولّف کے دل کو کیا کہیں جنھوں نے باایں ہمہ حسنِ اعتقاد یہ مہمل لفظ میر صاحب کی طرف منسوب کر دیا - حقیقت میں یہ موازنہ انیس و دبیر کے مولّف ہی کا کام تھا ہمارا تو اعتقاد ہی کہ میر صاحب کا مخالف بھی اُن کی شان میں ایسی جرات نہ کر سکتا تھا ہم نے اکثر لوگوں کی زبان سے یہ مرثیہ سُنا ہی اور ہمیشہ کونین کا والی سُنا گیا ہی اور اسی طرح جلد میں بھی طبع ہوا ہی[+] - "کونین کا عالی" سے ہمارے کان مطلق آشنا نہیں - علاوہ بریں جس بند کے پہلے مصرع میں کونین کا عالی بیان کیا جاتا ہی، اُسکے چوتھے مصرع میں لفظ

---

[1] اس مقام پر انشا پردازی کی ایک فاش غلطی قابلِ ملاحظہ ہی - لفظِ لحاظ ایسے مقام پر بولا جاتا ہے جہاں کسی کام کے کرنے کا ذکر ہوتا ہے - مثلاً جب قصداً طول دینا منظور ہوتا ہی تو کہتے ہیں "ہم اس مضمون کو توضیح کے لحاظ سے بہ تفصیل بیان کرتے ہیں" لیکن جس مقام پر کسی کام کے نہ کرنے کا بیان ہوتا ہی تو وہاں لفظ خوف استعمال کیا جاتا ہی - مثلاً جب طول سے بچنا منظور ہوتا ہی تو کہتے ہیں "یہ مضمون تطویل کے خوف سے قلم انداز کیا گیا" پس مولّف اس فقرہ کو اس طرح پر کہتے "جنکو تطویل کے خوف سے قلم انداز کیا گیا" یا اگر لفظ لحاظ کا استعمال ضروری تھا تو اس طرح لکھتے - "جنکو اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کیا گیا" غور سے دیکھیے تو اُن کا فقرہ یہاں بالکل بے معنی ہی - جسکا یہ مطلب ہوا کہ قلم انداز اس لحاظ سے کیا گیا کہ تطویل ضرور ہو -

انشا پردازی کی غلطی

[+] جلد ۱ - صفحہ ۲۰ -

شہِ عالی بار دیگر موجود ہی۔ اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ پہلے مصرع میں عالی نہیں ہوسکتا ورنہ تکرارِ قافیہ لازم آتی ہی۔ ہم اس پورے بند کو نقل کیے دیتے ہیں۔ ناظرین خود فیصلہ کرلیں ؎

اُترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا والی	خاتم سے نگیں گر گیا زیں ہو گیا خالی
اس دُکھ میں نہ یاور تھے نہ مولا کے موالی	خود ٹیک کے تلوار کو سنبھلے شہِ عالی[1]

میر صاحب نے اس لفظ کو اَور بھی چند موقعوں پر استعمال کیا ہی۔ مثلاً ایک موقع پر حضرت عبّاسؑ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہی ؎

توبہ کرو یکساں ہوا میں اور شہِ عالی	میں بندۂ ناچیز وہ کونین کا والی[2]

پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

عاشق ہیں سب اُسکے جو ہی کونین کا والی	اثنا عشری۔ پنجتنی۔ شیعۂ عالی[3]

ایک موقع پر رجز میں حضرت علی اکبرؑ کی زبان سے لکھا ہی ؎

فردوس کے مختار ہیں کونین کے والی	ہیں نورِ خدا ہم سے کوئی جا نہیں خالی[4]

اعتراض

۱۰۔ رنگِ رخِ کفّارِ عرب ہوگیا فق سے

اعتراض۔ رنگ فق سے ہوگیا محاورہ نہیں۔

جواب

جواب۔ رنگ فق سے ہوگیا، اہلِ زبان کا محاورہ ہی۔ بہت سے شاعروں نے یہ محاورہ باندھا ہے۔ میر ضمیر صاحب مرحوم لکھنوی فرماتے ہیں۔ ع رنگِ رُخِ ناموسِ نبیؐ ہوگیا فق سے[5]۔

---

[1] ۱/۲۰ [2] ۵/۱۵۲ [3] ۱/۱۰ [4] ۱/۳۲۶ [5] جلد اول میر ضمیر صفحہ ۳۶۵

اعتراضات مولف پر میر انیس

یہانتک وہ اعتراض تھے جو نسّاخ نے کیے ہیں اور مولّف کی رائے میں بھی وہ صحیح تھے۔ اب نسّاخ کے اعتراضات کے علاوہ مولّف خود اپنی طرف سے بھی چند اعتراض قائم کرتے ہیں۔ چونکہ ہم اپنے اعتقاد میں میر انیس اور مرزا دبیر دونوں صاحبوں کے برابر معتقد اور اُنکے کمالات کے یکساں طور پر قائل و معترف ہیں اسلیے جس طرح ہم نے اُن اعتراضات کو تفصیل کے ساتھ رفع کیا ہی جو مولف نے مرزا صاحب پر لگائے ہیں، اسی طرح اُن اعتراضات کو بھی تفصیل و تشریح کے ساتھ رد کرتے ہیں جو اُنھوں نے میر صاحب پر قائم کیے ہیں تاکہ میر صاحب اعلی اللہ مقامہ جیسے بزرگ اور مقبول مداحِ اہلبیتؑ کی بھی کچھ تھوڑی بہت خدمت کرکے داخلِ ثواب ہوں۔ سُنا ہی کہ ان اعتراضات کے جوابات مختصر طور پر میر افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی بھی حیاتِ دبیر میں لکھ رہے ہیں۔

پہلا اعتراض

۱۔ بُت توڑ کے کعبہ کو صفا کر دیا کِسنے۔

اعتراض ۔ صاف کر دیا چاہیے۔

جواب

جواب ۔ لغت میں صفا کے معنی علاوہ صفائی کے، پاک۔ بے عیب بے کدورت کے بھی ہیں۔ یہاں یہ مطلب ہے کہ وہ کون ہی جس نے کعبہ کو پاک اور تمام کدورتوں سے صاف کر دیا۔ اس صورت میں مطلب بالکل صاف اور اعتراض غلط ہے صفا کو صاف کے معنوں میں اکثر مستند شعرا نے بلا تکلّف استعمال کیا ہی۔ جس کی چند نظیریں دی جاتی ہیں۔

ذوق دہلوی تعریفِ فیل میں ؎

اُس کی خُرطوم ہے گر طرّۂ لیلیٰ کی مثال	توہیں دندانِ صفا ساعدِ سلمیٰ کی صفت

ایضاً

کہ فیل کوہ۔ کجک تیشہ۔ فیلباں فرہاد
آنکس ۱۲

وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوئے شیر[1]

ایضاً۔ تعریف محبوب میں ؎

سینہ تا ناف صفا۔ آبِ گہر کا دریا

ناف اک عکسِ ذقن اُس میں بجائے زورق[2]

خواجہ آتش لکھنوی ؎

اک الف سے قد کے سودے میں ہوا آتش فقیر

چار ابرو کو صفا کر کے قلندر ہو گیا[3]

مرزا داغ دہوی ؎

آئینہ مُنہ پہ بھلا اور بُرا کہتا ہے

سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے
(یعنی صاف کہتا ہے)

رند لکھنوی ؎

صاف کر قلب اتقا کر کے

دیکھ اس آئینے کو صفا کر کے[4]

دیگر ؎

جمالِ دوست کا گر ہے مشاہدہ منظور

صفا رکھ آئینۂ دل کو آرسی کی طرح

شاہ حاتم اُستاد سودا ؎

صفا کر دل کے آئینے کو حاتم

دیکھا چاہے سجن گر آشکارا

مولوی حالی ؎

دھو کا ہُنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ

اور منہ سے دُرد کہہ کے دکھاتا ہے وہ صفا

ص ۳۶۷ ص ۳۷۵ ص ۶۳ ص ۱۳۵-۱۷۷ ص ۱۱۰ ص ۳۸

[1] دیوانِ ذوق [2] دیوانِ ذوق، دیوان آتش، دیوان رند، شاہ حاتم در ابیات، دیوان حالی

اسی طرح میر صاحب مرحوم نے اپنے شعر میں صفا کے معنی صاف کے لیے ہیں۔ کعبہ اور صفا میں جو مناسبت ہی اُس نے ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔

دوسرا اعتراض

۲۔ برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

اعتراض - پروانگی غلط ہی۔

جواب

جواب - یہاں کوئی تشریح نہیں کہ پروانگی کیوں غلط ہی۔ آیا یہ لفظ ہی غلط ہی یا اسکا محلِ استعمال غلط ہی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ شاید لفظِ پروانگی ہی پر اعتراض ہی۔ اگر ایسا خیال ہو تو بالکل غلط ہی۔ کیونکہ پروانگی بمعنی اجازت اُردو و فارسی میں برابر مستعمل ہے۔ شیخ حزیں کا ایک مصرع مشہور ہی۔ ع - دریں بزم رہ نیست بیگانہ را۔ اسکے جواب میں مرزا سودا کا مصرع ہی۔ ع کہ پروانگی داد پروانہ را۔

منشی دلگیر لکھنوی - ع ملی زینب سے جو پروانگیِ نالہ و آہ+

تیسرا اعتراض

۳۔ گرتے تھے طیورانِ ہوا کھولے ہوئے پر۔

اعتراض - طیور خود جمع ہی اس کی جمع الجمع نہ صحیح ہی نہ مستعمل۔

جواب

جواب - جمع الجمع کا استعمال فارسی۔ اُردو میں بہت مروّج ہی۔ چنانچہ اس قسم کے الفاظ کی بیحد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً امیر کی جمع امرا۔ اور اُس کی جمع الجمع امرایان بنا کر اہلِ زبان نے استعمال کیا ہی۔ خواجہ ہروی کہتے ہیں ؎

دیں باختہ و ہیچ بکف نامدہ دنیا		این مہمل چندے بعبارت امرایان	

(۲) یا مثلاً آل کی جمع آمال۔ پھر آمال کی جمع آمالہا بنائی گئی ہے۔ مرزا صائب فرماتے ہیں ؎

+ دلگیر جلد سوم صفحہ ۳۶۹۔

ہر چند صائب میروم سامانِ نومیدی کنم	زلفش بدستم میدہد سر رشتۂ آمالہا

(۳) یا مثلاً صورت کی جمع صُوَر۔ پھر صور کی جمع صورہا استعمال کی گئی ہے۔ حکیم خاقانی تحفۃ العراقین میں لکھتے ہیں ؎

اے رنگ آمیزِ ایں گُرہا	وے از تو نگارشِ صورہا

قاآنی کا ایک شعر ہے ؎

امامے کز وجودِ او جہاں برپا بود ورنہ	صورہا بازگشتے جانبِ نفس ہیولانی

(۴) یا مثلاً حقیقت کی جمع حقائق اور پھر جمع الجمع حقائقہا لکھتے ہیں۔ مولوی معنوی فرماتے ہیں ؎

ہنوز از کافِ کفرت آگہی نیست	حقائقہاے ایماں راچہ دانی

(۵) یا مثلاً واقعہ کی جمع وقائع اور جمع الجمع وقائعہا لکھتے ہیں۔ مولوی معنوی کا شعر ہے ؎

چو از شانِ نزولت آگہی نیست	وقائعہاے قرآں راچہ دانی

(۶) یا مثلاً صغیر و کبیر کی جمع صغار و کبار۔ اور جمع الجمع صغارہا و کبارہا شعرا نے نظم کی ہے۔ قاآنی لکھتے ہیں ؎

خطیبہا ادیبہا۔ اریبہا لبیبہا	قریبہا غریبہا۔ صغارہا کبارہا

اگر اُردو شعرا کی سند بھی مطلوب ہو تو پُرانا شاعر صفی دہلوی لکھتا ہے ؎

جاتے ہو تم فقط اغیار کے اقوالوں پر	غور کرتے نہیں عشاق کے احوالوں پر

اسیر لکھنوی ؎

اک غزل شکوۂ خوباں میں بھی لکھ اور اسیر	کس لیے درد بہت ہے ترے اشعاروں میں

مولوی شبلی صاحب نعمانی لکھتے ہیں[1]۔

ع۔ کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں۔ مظلمہ کی جمع مظالم۔ اور جمع الجمع مظالم ہا۔

ایضاً۔ ع۔ نتائجہائے امید گلیڈ اسٹوں بھی دیکھے ہیں۔ نتیجہ۔ نتائج۔ نتائجہا

ایضاً۔ ع۔ کہ ہم نے وہ مصائبہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں۔ مصیبت۔ مصائب۔ مصائبہا

غیاث میں ہے "بعض اساتذہ لفظ عربی را کہ جمع باشد باز بالف و ہ و ہمچنیں بالف و نون جمع کنند"

۴۔ جو خوبیاں کہ چاہییں وہ سب حصول ہیں۔

اعتراض۔ حصول کی بجائے حاصل چاہیے۔

جواب۔ یہ اعتراض بھی غالباً کم نظری کے سبب سے ہے۔ جس طرح اسم فاعل اکثر مصدر کے مقام پر آتا ہے جیسے قم قائماً اے قیاماً۔ اسی طرح مصدر کو اسم فاعل کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جیسے رجلٌ عدلٌ وصومٌ۔ اسی وجہ سے شعرائے متقدمین نے اکثر حاصل کی جگہ حصول کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کے کلام میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

میر تقی	ہم ان دنوں میں لگ نہیں پڑتے ہیں صبح و شام	ورنہ دعا کریں تو جو چاہیں حصول ہو
سودا	نوکری میں نہیں کچھ اُس کو حصول	کاٹے ہے میرے حق میں نت گل پھول
درد	گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول	دل سے اُٹھا خلاف اگر تو اُٹھا سکے
مصحفی	حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیہ	گیا ہو از پے تہدید شاعران شریر

[1] نظم مندرجہ اخبار وکیل ۶ جولائی ۱۹۱۳ء ۲ کلیات میر۔ ص ۹۶۔ کلیات سودا۔ ص ۱۴۳۔ دیوان درد۔ ص ۳۰۔ مصحفی در انتخابات ص ۳۰۵

اسیر	ہمسے نافہموں کو گلگشتِ چمن سے کیا حصول	نے زباں سوسن کی سمجھیں نے زبانِ عندلیب
مومن	مومن اے ہرزہ درا نالہ و افغاں سے حصول	ذکر کیا راہ پر آئے فلکِ ناہنجار
ذوق	کٹا کر اپنا سر نوکِ سناں پر تاج کرتے ہیں	حصول اسطرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں
آتش	حسن کے نظارہ سے ہوتی ہے کیفیت حصول	عشق رکھتا ہے ہمیں بے بادۂ گلنار مست
ناسخ	تقلید سے ہوا شرفِ ذات کب حصول	آئینہ ساز مثلِ سکندر نہو سکے
رند	حصول کچھ نہیں بلبل دُہائی دینے سے	سُنے گا نالوں کو گلچیں نہ باغباں فریاد
داغ	کوئی مراد جو چاہی حصول ہی نہ ہوئی	دعائے مرگ جو مانگی قبول ہی نہ ہوئی
امیر	ہوا ہو کوئی شعر شاید قبول	کہ اُس سے ہو عقبیٰ کی دولت حصول
شیفتہ	فانوسِ شیشہ و لگنِ زر سے کیا حصول	وہ ہی وہاں جہاں نہیں روغن چراغ میں

اب ہم اس کی چند نظیریں مستند مرثیہ گویوں کے کلام سے درج کرتے ہیں۔ میر انیس صاحب نے جو بڑے ذی علم اور وسیع النظر اور اُصولِ فصاحت و بلاغت کے ماہر تھے اور جنکا کلام عیوب شاعری سے پاک و صاف نظر آتا ہے، حصول بمعنی حاصل اکثر موقعوں پر لکھا ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

ضمیر	جتنی لطافتیں ہیں وہ اُن کو حصول ہیں کی عرض دو جہاں کی سعادت حصول ہو	کیونکر نہوں کہ باغِ محمدؐ کے پھول ہیں لونڈی کی عرض بھی مرے آقا قبول ہو

ص ۴۰ ص ۳۲ ص ۱۶۶ ص ۷۳ ص ۲۹۱ ص ۳۹

حوالہ جات معہ صفحہ - دیوان اسیر - مومن - دیوان ذوق - دیوان آتش - دیوان ناسخ - دیوان رند -

ص ۴ ص ۱۵۸ ص ۲۷۷ ص ۱۳۵

داغ در نظم شہر آشوب - امیر در محامد خاتم النبیین - شیفتہ در مقدمہ شاعری حالی - جلد میر انیس - میر ضمیر جلد ۱

فصیح	تیرے کرم سے دولتِ عقبیٰ حصول ہو	دیگر	تم بھی دعا کرو مرا مطلب حصول ہو
تعشق	طوف میں ہوتی ہیں دو کیفیتیں ساتھ حصول		سنگِ اسود کے نثار اور فدائے کعبہ

اسی طرح اور بھی بہت سے مصدر ہیں جن کو فاعل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً

فوق بمعنی فائق

(۱) فوق بمعنی فائق ۔

میر ضمیر	ہے سب پہ فوق حکم ترے بابا جان کا	یعنی سب پہ فائق

اظہار بمعنی ظاہر

(۲) یا اظہار بمعنی ظاہر

میر ضمیر	بھائی سے کہا کیجیے احوالِ دل اظہار	ایضاً	تارا سا ہوا پہلوے خورشید میں اظہار
عرفی	ندانم اے فلک انصاف میدہی یا نہ		گر از ہزار جفایت یکے کنم اظہار
قاآنی	چو عاشقے کہ کند رازِ دل بیار اظہار	منیر	کراہت اُسنے کی چہرے سے اظہار

احضار بمعنی حاضر

(۳) یا احضار بمعنی حاضر

قاآنی	شعر من ہمچو عزائم شدہ افسونِ پری		کہ پری وار کند سادہ رخاں را احضار

تواتر بمعنی متواتر

(۴) یا تواتر بمعنی متواتر

میر ضمیر	اتنے میں تواتر یہ خبر لائے خبردار	یعنی متواتر

نمود بمعنی نمودار

(۵) یا نمود بمعنی نمودار

فصیح	کہ یہ زخم اسلیے ہے چہرۂ حیدر پہ نمود	یعنی نمودار

اشکال بمعنی مشکل

(۶) یا اشکال بمعنی مشکل

ذوق	کھینچنی تصویر مجنوں کی ترے اشکال ہے	یعنی مشکل ہے

+ میر زا فصیح جلد دوم ص ۸ - منشی دیگر جلد پنجم ص ۲۵ - میر تعشق ۱/۲ میر ضمیر ۱/۳۳ - ایضاً ۱/۲۷۶ - قصائد عرفی ص ۱۷ - کلیات قاآنی ص ۱۲۴ - ایضاً ۱/۳۶۵

کبھی مصدر کو مفعول کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

منیر انیس	حالت ہی مگر سیدِ مظلوم کی تغییر	یعنی متغیر	
امیر مینائی	کافی ہی فقط خلق نہیں حاجتِ شمشیر	اقلیمِ دلِ خلق اشارے میں ہی تسخیر	یعنی مسخر
قاآنی	وے زخواندنِ شعرش بخویش کردم رام	بے بخواندنِ افسوں پری شود تسخیر	یعنی مسخر
۵	واللہ اُس سے زورِ عیاں لاتعد ہوا	قتل اُسکے ہاتھ سے عمرِ عبدود ہوا	

اعتراض - عبدود - لاتعد کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

جواب - جو شخص معمولی مسائلِ صرف و نحو اور علمِ لغت سے واقف ہو وہ بھی ایسا مہمل اعتراض نہیں کر سکتا۔ اب ہم مولوی شبلی صاحب جیسے فاضلِ عصر کو چند معمولی باتیں سمجھائے دیتے ہیں۔ سُنیے۔ عدّ بالفتح شمردن از باب نصر ینصر۔ لاتُعَدُّ اس باب کا مضارع منفی مجہول ہی۔ اصل میں لاتُعْدَدُ تھا جو بقاعدۂ ادغام لاتُعَدُّ ہو گیا۔ دال کی تشدید اور حرکت اُردو زبان کے استعمال میں حذف کر دی گئی ہی۔ جیسا کہ اکثر فارسی دانوں نے عربی الفاظ میں تغیّر کر دیا ہی جسکو تفریس کہتے ہیں۔ اسکے بہت سے اقسام ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہی کہ لفظِ مفرد۔ عربی۔ مشدّد الآخر کو اگر فارسی میں بعنوانِ فارسی ذکر کریں تو اُسے بہ تخفیف پڑھتے ہیں مثلاً لاتعدّ۔ غمّ۔ ہمّ۔ حدّ۔ خطّ۔ عوامّ۔ خواصّ۔ قدّ۔ جادّہ۔ ہدیّہ۔ خاصیّہ وغیرہم۔ مگر در صورت ترکیب عربی الاسلوب اصل کلمہ کی رعایت کرنا اور تشدید کو ظاہر کرنا انسب و اولیٰ ہی جیسا عوامّ الناس۔ خواصّ الملوک۔ اب عبدود کو دیکھنا چاہیے۔ دُ واؤ کے فتحہ اور ضمّہ دونوں حرکتوں کے ساتھ

تغییر بمعنی مفعول مصدر
تغییر بمعنی متغیر
تسخیر بمعنی مسخر
پانچواں اعتراض
جواب

صحیح ہے۔ منتہی الارب میں ہے ود بالفتح وبضمّ نام بت قوم نوح علیہ السّلام۔ منتخب اللغات میں ہے ود بالضم والفتح نام بتے۔ صاحب غیاث اللغات لکھتے ہیں۔ وَدّ بالفتح و تشدید نام بت قوم نوح علیہ السّلام کہ بصورتِ مرد بود۔ اگرچہ اہلِ لغت نے واو کی دونوں حرکتیں صحیح سمجھی ہیں لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ صاف طور پر بہ فتح واو ہی آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ واو کے فتح کو ترجیح حاصل ہے۔ سورۂ نوح میں ہے وقالوا لا تذرنّ آلہتکم ولا تذرنّ وَدًّا ولا سُواعًا ولا یغوثَ ونسرًا۔ اب فرمایئے کہ لا تُعَدُ اور عبدوُدُ کا قافیہ صحیح ہے یا نہیں۔ شاید مولف کو لا تُعَدُ کے عین کی حرکت۔ یا عبدوُد کے واو کی حرکت میں کچھ مغالطہ ہو گیا۔ سمجھ لیجیے کہ لا تعدُ کا عین اور عبدوُد کا واو دونوں مفتوح ہیں۔

چھٹا اعتراض

۶۔ کرّار ہے وہ شخص نہ غیر فرار ہے

اعتراض۔ فرار بہ تشدید را چاہیے۔

جواب

جواب۔ بیشک فرّار بہ تشدید را صحیح لفظ ہے لیکن شعرا اکثر الفاظ میں تصرّفات کر لیتے ہیں جنکو جائز سمجھا جاتا ہے چنانچہ اکثر مشدّد الفاظ کو مخفّف کر لیا ہے مثلاً مشّاطہ کو مشاطہ۔ نظّارہ کو نظارہ۔ نقّارہ کو نقارہ۔ کتّاں کو کتاں۔ دُکّان کو دُکان بھی بولتے ہیں۔ اسی طرح اسکا عکس مثلاً شکر کو شکّر کہنا۔ خیر یہ تو ایک معمولی بات تھی، لیکن تعجب خیز اور مضحکہ انگیز یہ امر ہے کہ قابل مولف کی طبیعت کو اسقدر رسائی نہوئی کہ اس مہمل اور بے معنی مصرع کی غلطی کو سمجھ سکتے۔ افسوس ہے کہ اُنھوں نے بے سوچے سمجھے یہ مہمل مصرع میر صاحب کے نام سے درجِ کتاب کر دیا۔ گو میر صاحب کی جلد میں اسی طرح چھپا ہے، لیکن مولف اپنے دماغ پر زور دیتے تو معلوم ہو جاتا کہ اس میں تحریف

ہوگئی ہے۔ چونکہ وہ ہمیشہ تحریف شدہ اشعار پر بھی اعتراض کرنے کے عادی ہیں، اور اس موقع پر اُسکے بے معنی ہونے کا کوئی اعتراض قائم نہیں کیا، اسلیے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اسکو بامعنی سمجھ کر درج کیا ہے۔ گویا اُن کی رائے میں سوا لفظ فرّار کے اور کوئی غلطی اس مصرع میں نہیں ہے۔ حالانکہ اگر ہم یہاں لفظ فرّار بہ تشدید را بھی مان لیں تو بھی یہ مصرع بالکل مہمل ہے۔ دیکھیے ایک جگہ تو لکھا ہے کہ "وہ شخص کرّار ہے" پھر کہا ہے "نہ غیر فرّار ہے"، یعنی "وہ غیر فرّار نہیں ہے"، قاعدہ ہے کہ نفی کی نفی اثبات ہوتی ہے۔ جیسے یہ کہیں کہ "فلاں شخص غیر کاتب نہیں ہے"، تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ وہ کاتب ہے۔ اسی طرح "غیر فرّار نہیں ہے" کے یہ معنی ہوئے کہ وہ فرّار ہے۔ تو یہ مطلب ہوا کہ ایک شخص کرّار بھی ہے اور فرّار بھی، یعنی اُس میں دو صفات متضادہ جمع ہیں۔

یہ مرثیہ جس میں یہ مصرع ہے میر ضمیر صاحب کی جلد میں بھی طبع ہوا ہے۔ اور میر انیس صاحب کی جلد میں بھی، صرف مطلعوں میں فرق ہے۔ میر صاحب کی جلد میں یہ مطلع ہے۔ ع شیرِ خدا کے وصف کہانتک رقم کروں۔ اور میر ضمیر کی جلد میں مرثیہ اس مطلع سے شروع ہوا ہے۔ ع۔ شفقت علیؑ پہ ختم سخاوت علیؑ پہ ختم۔ باقی تمام بندکیاں ہیں۔ تسلسل بیان اور روانیِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کی ابتدائی تصنیف ہے اور میر ضمیر کی جلد میں غلطی سے درج ہوگیا ہے۔ میر ضمیر کی جلد میں یہ مصرع اس طرح چھپا ہے۔ ع کرّار ہے وہ شخص نہ مردِ فرار ہے۔ اور یہی صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے اس صورت میں اگر فرار کو بہ تشدید را نہ سمجھیں تو بھی معنی درست ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ شخص کرّار ہے اور مردِ گریز نہیں۔ جیسے مردِ غیب۔ مردِ ہیجا وغیرہما مستعمل ہیں پس یہاں فرار بالکسر مصدر ہے نہ کہ فرّار ہم فاعل مبالغہ کا مخفف۔

۷۔ عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد۔

اعتراض۔ تغیری صحیح نہیں۔

جواب۔ یہاں یہ تشریح نہیں کہ تغیری کیوں صحیح نہیں ہے۔ اگر مولف کا یہ مطلب ہو کہ تغیر بروزن تفعیل بدو یا صحیح لفظ ہے از بسکہ اس میں ایک ی کم ہے اسلیے غلط ہے تو یہ اُن کی علمِ لغت سے نابلدی ہے۔ اگرچہ تغیر اصل میں بدو یا بروزن تحریر ہے لیکن اس میں ایک یا کا تخفیف کر دینا جائز ہے۔ صاحبِ غیاث لکھتے ہیں "تغیر بکسر یاء تحتانی اول۔ وسکون تحتانیِ ثانی، بروزنِ تشریف نہ بروزنِ فقیر۔ مگر فارسیاں یک یا را برائے تخفیف حذف کنند و ایں نوعے از تفریس ست از چراغِ ہدایت و بہارِ عجم" اور اگر یہ مطلب ہے کہ اُسکے آخر میں ی کا لانا غلط ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ مستند شعرا نے لفظِ تغیری کا استعمال کیا ہے۔ شیخ مصحفی فرماتے ہیں ؎

تاب و طاقت رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں	حاکمِ ضعف سے فرمانِ تغیری آیا[1]

میر ضمیر صاحب لکھنوی نے لکھا ہے۔ ع۔ واں سب پہ تغیری تھی یہاں سب پہ بحالی[2]

میر نفیس صاحب لکھنوی خلف میر انیس صاحب مرحوم جنکا شمار مستند شعرا، متاخرین میں ہوتا ہے اور جو علاوہ زبردست کمالاتِ شاعری کے اعلیٰ اوصافِ علمی سے بھی متصف تھے، ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

سامان امیری کا فقیری میں نہیں	انداز بحالی کا تغیری میں نہیں
نے جب تھا کمال کچھ نہ کچھ اب ہے کمال	ہم کیا تھے جوانی میں جو پیری میں نہیں

[1] آبحیات صفحہ ۳۰۰ [2] میر ضمیر جلد اول صفحہ ۲۷۵

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے الفاظ ہیں جو بغیر یا اور مع یا دونوں طرح مستعمل ہیں۔ مثلاً

(۱) بہبود۔ وبہبودی۔ ظہوری ع دل از غمہا بروں آمد نماند امید بہبودی [1]

(۲) یا بیداد اور بیدادی۔ سودا۔ ع کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی

(۳) یا نہاں اور نہانی۔ قاآنی۔ ع نے نے کہ دریں معجزہ رمزیست نہانی

(۴) یا پنہاں اور پنہانی۔ قاآنی ؎

بہر دو کون قناعت مکن کزیں دو بروں		ہزار عالم بے منتہاست پنہانی

مومن۔ ع کھولہ دل میں یہ راز پنہانی۔

۸۔ اس مژدہ کے سنتے ہی خوشی ہوگئی شیریں۔

اعتراض۔ خوش چاہیے۔

جواب۔ لفظ خوشی کو خوش کے معنی میں میر صاحب مرحوم نے اسکے علاوہ اور بھی اکثر مقامات پر لکھا ہے۔ اور دیگر شعرا نے بھی اس معنی میں نظم کیا ہے چند نظیریں دیجاتی ہیں ؎

آتش	بہار گلستاں کی ہے آمد آمد	خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
نسیم دہلوی	جسطرف دیکھیے دو تین پھڑکتے ہیں اسیر	کیوں نہ صیاد خوشی ہو چمن آباد ہیں سب
میر ضمیر	اے شیر ہے یہ کونسا آئین بندگی	تو یاں رہا ترائی کے اندر خوشی خوشی [2]
فصیح	اور تم کو خوشی کرنا واللہ عبادت ہے	

[1] دیوان ظہوری صفحہ ۶۳۰ [2] میر ضمیر جلد اول صفحہ ۲۶۹

دلگیر	خوشی ہو ہو کے وہ کرنے لگی سب گھر کی تیاری	

اور بھی اس قسم کے چند الفاظ روزمرّہ کے استعمال میں مستعمل و متداول ہیں۔ مثلاً جلدی بمعنی جلد ہر شخص استعمال کرتا ہے۔

جلدی بمعنی جلد

میر انیس	جلدی نکل چلو یہ ٹھہرنے کی جا نہیں	یعنی جلد نکل چلو
میر ضمیر	لو سکینہؑ ہی کو آغوش میں لاؤ جلدی	یعنی جلد

اس کے علاوہ فاضل مولّف نے میر صاحب مرحوم کی چند معنوی غلطیاں بھی درج کی ہیں جنکو تطویل کے خوف سے قلم انداز کیا گیا۔

میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ

اس مقام پر بھی قابل مولّف نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ افسوس ملک نے کیوں مرزا دبیر کو میر انیس کا مدِ مقابل بنا دیا۔ میرے خیال میں غالباً مرزا دبیر کا فضل و کمال دیکھ کر ملک نے ایسا فیصلہ کیا ہوگا۔ اگر ملک اور زمانہ بھی آپ کی طرح متعصب اور بے انصاف ہوتا تو شاید ایسا فیصلہ نہ کرتا۔ لیکن زمانہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کر سکتا، اور مقبولیتِ عام ایک خداداد بات ہے اس میں رنج و غم کرنے اور تاسّف و قلق کے ساتھ پیچ و تاب کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو اس امر میں آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے بقولِ ملک مرزا صاحب کو میر صاحب کا مدِ مقابل ظاہر کر دیا، ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ اپنے سوا تمام دنیا کو نافہم سمجھتے ہیں، تو اسکے فیصلے کی ہم کو ضرورت نہیں، ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کو ملک بھر تو میر انیس کا مدِ مقابل تسلیم کر چکا ہے لیکن مولّف کسی طرح نہیں مانتے، ایسی حالت میں اُنکے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے یا تمام دنیا کے فیصلہ کو۔ ایک مورّخ کے واسطے یہ امر نہایت نازیبا ہے کہ وہ طرفداری کے جوش میں آکر تمام دنیا کے خلاف اپنا راگ الگ ہی گائے۔ لیکن یہ عیب مولّف کی تمام تصانیف میں عام ہے کہ وہ جوش اور جذبہ میں ایسے متوالے ہو جاتے ہیں کہ سراسر غلط بیانی اور خلافِ واقعہ ہٹ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بجز آپ کے آج تک تمام لوگ ان صاحبوں کی نسبت یہ سمجھتے آئے ہیں کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر ست - اسی وجہ سے آجتک کسی نے ترجیح کے مسئلے کو حل کرنے کی تکلیف نہیں اُٹھائی - مگر آپنے فریقین میں چلوانا اور اسی پردہ میں اپنی تالیف بلکہ خود اپنے کو فروغ دینا چاہا ہے - لیکن یاد رہے کہ انیس و دبیر میں ہمیشہ باہم خلوص رہا کبھی شکر رنجی تک نہیں ہوئی تو پھر اُنکے معتقدوں میں کیوں ہو - میر انیس نے مرزا دبیر کی حیات میں انتقال فرمایا اور مرزا صاحب کو نہایت صدمہ ہوا چنانچہ ایک درد انگیز نظم لکھی جس میں تاریخ وفات کا یہ مادّہ لکھا ع طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس - اس سے ثابت ہوتا ہی کہ مرزا دبیر کے دل میں میر انیس کی کیسی وقعت تھی - جب بقول آپکے ملک نے دونوں کو مدِ مقابل تسلیم کرلیا ہی اور پبلک میں دونوں کے کمال کا درجہ ہم پلّہ ہی تو آپ موازنہ کے لیے باٹ ترازو کیوں لے بیٹھے - اب وہ لکھتے ہیں کہ مرزا دبیر کے متعلق ہم ہر ایک چیز بہ تفصیل لکھتے ہیں -

فصاحت

مرزا صاحب پر فصاحت کے متعلق اعتراضات

مولّف لکھتے ہیں کہ مرزا دبیر کے کلام میں وہ فصاحت و شستگی نہیں جو میر انیس کے کلام میں ہی اسکے یہ اسباب ہیں -

پہلی وجہ ثقیل الفاظ

(۱) مرزا صاحب ثقیل و غریب الفاظ استعمال کرتے ہیں - اُس کی چند مثالیں لکھی ہیں - مثلاً

ع - مستدعیِ شق القمر آکر ہوئے گمراہ -

ع ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور

ع مستجمع جمیع فضائل ۔ ملک سیر

ع بابا نے تو قلم کیے جبریل کے سہ پر

اس کے علاوہ اور بھی چند مثالیں دی ہیں ۔

جواب ۔ یہ الفاظ آپ کو ثقیل معلوم ہوتے ہونگے ۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ ہر قسم کا کلام ایک سانچے میں ڈھلا ہوا نہ کسی شخص کا ہو سکتا ہی نہ ہونا ممکن ہے جن شاعروں کا دائرۂ سخن متعدد مرثیوں یا قصائد تک محدود ہی وہ شاید ان معمولی فروگذاشتوں سے بچ سکتے ہوں لیکن جس شخص کو سیکڑوں واقعات بیان کرنے کی غرض سے بیشمار الفاظ اور جملے استعمال کرنے پڑے ہوں وہ ان مسامحات اور ادنیٰ فروگذاشتوں سے ہرگز بچ نہیں سکتا ۔ جس زمانہ میں صنائع و بدائع کو معراج کمال سمجھا جاتا ہو اور لوگ زبان کی صفائی و شستگی پر زیادہ توجہ نہ کرتے ہوں ایسے وقت میں ایک باکمال کے وسیع ذخیرۂ کلام میں سے چند الفاظ تلاش کر لینا تعجب کی بات نہیں ہی ۔ پُرگو شعرا کو جنکے کلام کا ذخیرہ لاکھوں اشعار تک پہونچ گیا ہو ایسی فروگذاشتوں سے بری رکھنا چاہیے ۔

زمانے اور زبان کا کلام

علاوہ بریں پہلے زمانہ اور زمانۂ حال کے محاورات میں بہت فرق ہو گیا ہی ۔ میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام میں جسقدر ابتدائی زمانہ کا کلام ہے اُسیقدر اوسط زمانے ۔ اور اُسی قدر کہنہ مشقی کا ہی ۔ دونوں صاحبوں نے اُردو زبان کی پستی اور بلندی کے زمانے دیکھے ہیں پس ابتدائی کلام میں آجکل کے محاورہ کے خلاف کوئی لفظ آگیا ہو تو ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ۔ خیال کرنا چاہیے کہ

مرثیہ گوئی ابتدا میں کیا چیز تھی اور انتہا میں کیا ہوگئی۔ خود مولف میر انیس کی بابت لکھتے ہیں کہ "میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اُن کی ابتدائے مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے اور شعرا بے تکلف اُنکو استعمال کرتے تھے"[1] دونوں صاحبوں کی آغاز شاعری کا کنارہ مصحفی۔ انشا۔ جرات وغیرہ سے ملا ہوا تھا اور چونکہ مرزا صاحب میر صاحب سے بہت پہلے کے شاعر ہیں اسلیے پُرانے محاورات کا میر صاحب کے کلام سے زیادہ اُنکے کلام میں پایا جانا قرین قیاس ہے۔ مرزا صاحب جس زمانے میں مرثیہ کہتے تھے اُس زمانہ میں اکثر الفاظ جو آجکل متروک ہیں مروّج تھے اور بہت سے ثقیل الفاظ جائز سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً اُدہر ادہر کی جگہ اُدہر ایدہر۔ اونکو کے عوض اون کوں۔ اُن سے کے بدلے اُن سے تی۔ زور کا لفظ بہت کے معنوں میں آئے ہے۔ جائے ہے۔ ٹک۔ بل بے۔ موصوف جمع ہو اور صفت لفظِ ہندی تو موصوف کی مطابقت کے لیے صفت کو جمع بولنا جیسے ع بیڑیاں منّت کی بھی پہنی تو ہمنے بھاریاں۔ فارسی جمع کو بے اضافت یا صفت کے لانا جیسے ع۔ رفتگاں کا بھی خیال اے اہلِ عالم چاہیے۔ چنانچہ مرزا صاحب کے ابتدائی کلام میں بھی اس قسم کے الفاظ موجود ہیں۔ پہلے زمانہ میں چومصرع مرثیے کہے جاتے تھے مرزا صاحب کا بھی شروع زمانہ کا ایک چومصرع مرثیہ موجود ہے۔

پس اوائلِ زمانہ کی تصانیف اور اوسط اور آخر زمانہ کی مشق میں تفریقِ مدارج ہونا لازمی ہے، اور یہی فرق مرزا صاحب کے کلام میں بھی دیکھا جاتا ہے، لیکن مطبع والوں کی بے پروائی نے ہر زمانہ کے کلام کو باہم مخلوط کر دیا۔ کاش تینوں زمانوں کی

[1] موازنہ صفحہ ۲۰۔

الحاق

بہار الگ الگ دکھائی جاتی تو نہایت دلچسپی ہوتی - اور غضب تو یہ ہے کہ صرف اسی ظلم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کے کلام کا بھی اُس میں الحاق کر دیا یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے ناقص کلام کو مرزا صاحب کا کلام سمجھکر لوگوں کو اعتراض کرنے کا موقع مِل گیا -

ازبسکہ دونوں صاحبوں کی شاعری کا ابتدائی زمانہ پُرانے شاعروں سے ملا ہوا ہے اسوجہ سے مرزا صاحب کی طرح میر صاحب مرحوم کا ابتدائی کلام بھی چند ثقیل الفاظ سے پاک نہیں ہے، چنانچہ بعض ثقیل الفاظ جو مولّف نے مرزا صاحب کے پُرانے زمانے کے مرثیوں میں سے پیش کیے ہیں وہ بعینہٖ میر انیس صاحب مرحوم کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں - مثلاً

مرزا صاحب - ع - ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور
میر صاحب - ع - کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور

مرزا صاحب - ع - مستجمع جمیعِ فضائل، ملک سیر
میر صاحب - ع - مستجمع جمیعِ صفاتِ کمال ہے

مرزا صاحب - ع - بابائے تو قلم کیے جبریل کے سہ پر
میر صاحب - ع - پیہم سہ روز جنگ سے سب نے کیا فرار

چند ثقیل الفاظ میر صاحب کے پُرانے مرثیوں میں اَور بھی پائے جاتے ہیں - مثلاً

ع - جز حق کے نہیں کوئی پرستش کا سزاوار
ع - ہشتاد و سہ بار اُنسے لڑے اہلِ شقاوت
ع - پہونچا خدا کا شیر بمیدانِ کارزار
ع - حیدرؑ نے بہرِ دفع ضرر سر پہ لی سپر

۲/۳۱ ۶/۸ ۱/۲۱۴

ع - تھے جمع واں بہت سے صنا دید بد صفات

ع - نیّت سہ روز روزے پہ روزے کی اُسنے کی

ع - آنکھیں رمد سے گو کہ نہ کھلتی تھیں مومناں

ع - تھا موعلیؑ کے ہاتھ کو جلدی فرشتگاں

ع - خوں جوشِ غضب سے ہوئیں چشمانِ منوّر

ع - چشمہ ہی یا محیط ہے - شط ہی کہ نہر ہے

دوسری وجہ بندش کی سستی

(۲) بندش کی سُستی اور ناہمواری - قابل مولّف کا قول ہی کہ "بندش کی چستی، ترکیب کی دلاویزی - الفاظ کا تناسب اور برجستگی وسلاست مرزا صاحب کے ہاں بہت کم ہیں"

جواب

مرزا صاحب کا نادر اور عالیشان کلام ہم مختلف عنوانات میں گذشتہ اوراق میں بہ تفصیل لکھ چکے ہیں؛ جس سے معلوم ہوسکتا ہی کہ ہر مضمون اور ہر کیفیت کے متعلق اس باکمال شاعر نے فصاحت وبلاغت کے جوہر دکھائے ہیں، اور ایک ایک لفظ گوہرِ شہوار سے زیادہ درخشاں اور مہر منوّر سے زیادہ پُرنور ہی - لیکن لائق مولّف کو یہ انوار ہرگز نظر نہیں آسکتے - مگر اس میں مرزا صاحب کا کیا قصور ہی، کیونکہ یہاں - ع چشمۂ آفتاب را چہ گناہ - والا مضمون صادق آتا ہی - اُنھوں نے اس عنوان کے تحت میں مرزا صاحب کے مرثیوں میں سے چند بند منتخب کیے ہیں جنکو وہ اپنے دعوے کی تائید میں پیش کرتے ہیں - لیکن ہر موقع پر اعتراض کی وجہ اور اُسکا سبب اسقدر بے ٹھکانے اور غلط بیان کیا ہی کہ اُن کی سخن فہمی کی قلعی بہت اچھی طرح کھُل جاتی ہی - اصل یہ ہی کہ اشعار کی لطافت وخوبی ایک وجدانی شے ہی اور اُسکا سمجھنا ذوقِ صحیح پر منحصر ہی اور اس کی مولّف میں

بہت کمی ہی۔ ان بندوں پر اعتراض کرتے ہوئے بعض مقامات پر نقص کی تشریح کرنے سے اُن کا قلم مجبوراً رُک گیا ہی اور اکثر کہدیا ہی کہ معانی میں بہت کم ربط ہی۔ فلاں مضمون کو فلاں سے کیا نسبت۔ اس لفظ کو اس سے کیا تعلّق۔ یہاں اس بات کا کیا موقع ہے احتیاجِ اظہار نہیں۔ خود ہی روشن ہی۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی شبلی صاحب اُن میں کوئی نقص معلوم نہ کرسکے اور عاجز آکر ایسے الفاظ کہنے لگے کہ خود ہی روشن ہی۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ مولوی اسلم جیراجپوری نے سچ لکھا ہے کہ "مولانا شبلی جب سے اس کوچہ میں آئے ہیں، یعنی موازنہ انیس و دبیر سے وہ اس امر میں برابر ناکامیاب ہوتے ہیں، جہاں اس قسم کی باریکیاں بیان کرنی ہوتی ہیں وہاں اُن کا قلم رُک جاتا ہی اکثر کہدیتے ہیں کہ احتیاجِ اظہار نہیں۔ خود ہی روشن ہی۔ تشریح کی حاجت نہیں۔ اور جہاں بیان کرتے ہیں مذاقِ صحیح سے بہت دُور جا پڑتے ہیں"۔ چونکہ ایسے موقعوں پر اُنھوں نے صرف اپنی خاص طبیعت اور اپنے خاص مذاق کا اظہار کیا ہی، اسلیے ان مقامات پر ہم خاموشی اختیار کرتے ہیں کیونکہ آپ کا مذاقِ سلیم جو کچھ ہی اُسکو ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور جب آپنے کسی نقص کی کوئی وجہ ہی نہیں لکھی تو اُسکا کیا جواب دیا جاسکتا ہی۔ لیکن جہاں آپنے اپنی قابلیت کے موافق نقائص کی وجہ بیان کی ہی اُن مقامات پر ہم کچھ لکھنا چاہتے ہیں جس سے ناظرین کو آپکے ذوقِ سخن فہمی کا اندازہ ہوجائیگا۔ لیکن قبل اسکے کہ ہم اُن اعتراضات کا جواب دیں ایک امر بطورِ تمہید سُن لینا چاہیے۔

مولوی اسلم جیراجپوری

مرزا صاحب کے کلام میں ذاکرین اور اہلِ مطابع کی عنایت سے دوسرے لوگوں کا

نقص میں رسائل

* رسالہ زمانہ، جون سنہ ۱۹۱۰ء

کلام اکثر الحاق ہوگیا ہے۔ ذاکرین نے کبھی مرزا صاحب کے شاگردوں کا کلام اور کبھی خود اپنی تصنیفات سے حسب ضرورت جو چاہا ملا دیا اور مرثیہ بنا لیا۔ بلکہ مصرعے اور بند تو الگ رہے۔ بعض اوقات پورے مرثیے الحاقی پائے جاتے ہیں مثلاً مرزا صاحب کی ایک جلد میں یہ مرثیہ چھپا ہوا ہی۔ ع۔ ہر آہ علم ہی یہ عزا خانہ ہی کسکا۔ حالانکہ یہ مرثیہ مرزا نظیر مرحوم کا بیان کیا جاتا ہی۔ اس مرثیہ کو ع۔ شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مرتضےٰ۔ اکثر لوگ شیخ گوہر علی مشیر مرحوم کا کہتے ہیں۔ اکثر مقامات پر کاتبوں کی عنایت سے الفاظ بدل گئے ہیں۔ جن کم علم کاتبوں نے اوّل اوّل نقلیں کیں بعض لفظوں کو کچھ کا کچھ سمجھ کر تصرّف کر لیا۔ یہیں سے تحریف کی ابتدا ہوئی پھر نقل در نقل مرثیوں میں اکثر الفاظ تبدیل ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ قلمی مرثیوں میں اور چھاپے کے مرثیوں میں بیحد اختلاف پایا جاتا ہی۔ اور قلمی مرثیے بھی باہمدگر مختلف ہیں۔ ملحقات کی شکایت مرزا صاحب اور میر صاحب دونوں کے خاندان کو یکساں طور پر ہی جیسا کہ بقول مصنّف تطہیر الاوساخ میر نفیس نے اس کی تصدیق کی ہی۔ مولوی شبلی صاحب کے اعتراضات کا اکثر حصّہ انھیں خرابیوں کی وجہ سے ہے۔ اُنھوں نے بندش کی سُستی اور ناہمواری، اور نیز آگے چل کر بلاغت کے موقع پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن کا جواب سُننے کے وقت ناظرین ان امور کو بھی پیش نظر رکھیں۔

پہلے غزل گو اور قصائد گو شعرا کو اپنے کلام کی صفائی۔ ترمیم و تنسیخ، اور نظر ثانی کا بہت بڑا موقع تھا اور وہ اس طرح کہ طبع کرانے سے پہلے اُسکو دیکھ لیتے تھے، جانچ لیتے تھے۔ اگر زمانہ کی رفتار کسی طرزِ بیان کو جو پہلے مطبوعِ خاص و عام تھا

مرثیہ گویوں کو نظر ثانی کا موقع نہ ملا

ناپسندیدہ ثابت کردیتی تھی تو وہ اُس کی تصحیح کردیتے تھے یا شعر کو خارج کردیتے تھے؛ جن باتوں پر نکتہ چینیاں شروع ہوجاتی تھیں وقتِ انطباع اُن پر غور کرلیتے تھے۔ پس اُن کے کلام کا شائع اور منتشر ہونا اُسوقت سمجھا جاتا تھا جب وہ چھپ کر شائقین کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس سے پہلے اُنکے قابو کی بات تھی۔ برخلاف اسکے مرثیہ گویونکی شاعری کی مقبولیتِ عام، قدردانوں کے جوش اور کلام کی اشاعت کی ضرورت نے ان لوگوں کو سخت مشکلات میں ڈال دیا، اور جو بات دوسرے شعرا کے قابو میں تھی وہ انکے ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ لوگ بھی آخر انسان تھے اور سہو ونسیان لازمۂ بشریت ہے لیکن انکے کلام کا دیگر شعرا کے کلام کی طرح صاف اور پاک ہونا قریب ناممکن کے ہوگیا کیونکہ ادھر مجلس سے پڑھکر اُٹھے اور اُدھر خفیہ طور پر مرثیہ کی نقلیں تمام ہندوستان میں پہونچ گئیں۔ ایک نقل کی ہزار نقلیں اور ایک نسخہ کے سیکڑوں نسخے ہوگئے۔ کسی نے طول کلام کو ناپسند کرکے بہت سے بند نکال ڈالے، کسی طباع نے موقع اور محل کے لحاظ سے اپنی خوانندگی کی ضرورت کے مطابق بیچ میں مطلع لگادیا، یا ربطِ کلام کے قائم رکھنے کے لیے مصرعوں میں ادل بدل کردیا، یا ضرورتاً دوسرے مرثیونکے بند لگالیے۔ نقل در نقل ہونے میں غلطی کتابت سے اکثر جگہ وہ الفاظ آگئے جو شاعر کے ذہن میں بھی نہ تھے، چنانچہ بعض الفاظ کو جن سے مفہوم شاعر یا مضمون شعر خبط ہوگیا ہے، قابل مولف نے اعتراض کی نگاہ سے دیکھا ہے، حالانکہ ان الفاظ کا قلمی مرثیوں میں پتہ بھی نہیں ہے۔

اُسپر غضب یہ ہوا کہ جسقدر ملک نے دونوں باکمال بزرگوں کی قدر کی اُسی قدر اُن کے خاندان کے ممبروں نے کلام کی تصحیح میں کاہلی سے کام لیا۔ اگر کوئی معتقدان صاحبوں کے

ممبران خاندان میر انیس کی بے توجہی

کمالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہی اور اُنکے خاندان سے صرف تصحیح کلام کی مدد لینا چاہتا ہی تو نہایت بے توجہی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ گویا مرحومین کا کوئی حق اُنکے وارثوں کے ذمے نہیں ہی۔ زمانۂ سلف سے کسی شاعر کا کلام ایسی کس مپرسی اور بے توجہی سے طبع نہیں ہوا جیسا ان دونو بزرگوں کا۔ کاغذ ناقص۔ خط ناکارہ۔ تحریر غلطیوں سے بھری ہوئی کوئی کسی طرح چھاپ رہا ہی۔ کوئی کسی طرح۔ مرزا صاحب کی جلدوں میں کسی مرثیہ میں بیس بند کم کسی میں تیس بند زیادہ، کبھی وہی مرثیہ میر انیس کے نام سے چھپا ہے۔ کہیں میر مونس کے نام سے۔ کہیں میر ضمیر کی جلد میں۔ غرض یہ افسوسناک خرابیاں دونوں صاحبوں کے مرثیوں میں اکثر مقامات پر نظر آتی ہیں۔

مرزا صاحب کے کلام پر اعتراضات کرنے سے قبل مولف لکھتے ہیں کہ "ہم چند بند اُن مرثیوں کے لکھتے ہیں جن میں سے بعض میر انیس کے جواب میں لکھے گئے ہیں" اس سے پہلے آپ لکھ چکے ہیں کہ "باوجود بہت سی جد وجہد کے مجکو یہ معلوم نہوا کہ خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونو کے ہاں قریب المعنیٰ پائے جاتے ہیں، اول کسنے کہے اور کسنے جواب لکھا" لیکن اب کہاں سے وحی آگئی جو فرماتے ہیں کہ "بعض مرثیے میر صاحب کے جواب میں لکھے گئے ہیں" اس متناقض کلام پر افسوس آتا ہی اور مجبوراً زبان سے نکل جاتا ہی کہ ..... را حافظہ نباشد۔

اب ہم تمام اعتراضات کے مفصل جوابات لکھتے ہیں۔

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے	اے طنطنۂ طبع جزو کُل کو ملا دے
اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے	اے زمزمۂ نطق، بلاغت کا صلا دے

اے بابے بیاں معنیِ تسخیر کو حل کر

اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر

اعتراض (۱) طنطنہ کو جزو کل کے ملا دینے سے کیا نسبت ہے (۲) زمزمۂ نطق سے بلاغت کا صلہ مانگنے کے کیا معنی؟ بیان کی بے کو تسخیر سے کیا خاص تعلق ہے؟ اسی طرح سخن کے سین کو قاف سے تا قاف عمل کرنے کے لیے کیا خصوصیت ہے۔

جواب

جواب ۔ طنطنہ کے معنی ہیں کرّ و فر۔ شان و شوکت ۔ پس مراد یہ ہے کہ اے پُر زور طبیعت کے کرّ و فر۔ ایسے شاندار اور پُر شوکت الفاظ بیان کر کہ زمین و آسمان میں تہلکہ پڑ جائے اور جزو کل میں لرزہ پیدا ہو جائے (۲) زمزمہ سُریلی آواز کو کہتے ہیں ۔ نطق کو استعارۃً ایک ذی روح چیز فرض کر لیا ہے اور چونکہ ذی روح میں آواز پیدا ہو سکتی ہے، اسلیے شاعر کہتا ہے کہ اے نطق تو اپنی گویائی سے میرے فصیح و بلیغ اشعار کا صلہ عطا کر، یعنی دادِ سخن دے ۔ باقی اعتراضات کی چونکہ کوئی وجہ نہیں لکھی اسلیے ہم بھی اُن سے قطع نظر کرتے ہیں۔

دوسرا اعتراض

بولا علم خامہ فلک پر میں گڑوں گا	سکّے نے ندا دی زرِ انجم پہ پڑوں گا
معنی نے کہا بیت میں آئینہ جڑوں گا	مضمون پکارا میں کسی سے نہ لڑوں گا

بندش یہ کھُلی دم میں فصاحت کا بھرونگی
چلّائی طبیعت کہ میں اصلاح کرونگی

اعتراض ۔ چوتھا مصرع گر گیا کیونکہ اوپر کے مصرعوں کی مناسبت سے موقع یہ تھا کہ اس میں بھی ایجابی دعویٰ کیا جاتا ۔ مضمون کا نہ لڑنا اگرچہ معنیً تعریف کی بات ہے لیکن یہاں لڑائی سے گریز کرنے کا موقع نہیں ۔ اخیر کا شعر خصوصاً اُسکا دوسرا مصرع کسقدر پھس پھسا اور مبتذل ہے۔ طبیعت کے چلّانے کا یہ کیا موقع ہے اور طبیعت کے لیے

چلّانا کتنا ناموزوں لفظ ہے۔

جواب۔ افسوس ہی کہ قابل مولف کی متعصب طبیعت نے اُن کو اس بند کی صنعت و خوبی پر متوجہ نہ ہونے دیا۔ اس میں ایک صنعت ہی جسکا نام تاکید المدح بمایشبہ الذم ہی۔ یعنی تعریف کی ایسے الفاظ سے تاکید کرنا کہ ظاہر میں ہجو پر دال ہوں لیکن فی الحقیقت مدح پر تاکید کرتے ہوں۔ جیسے کہتے ہیں کہ فُلاں شخص میں کچھ عیب نہیں ہی مگر یہ کہ ہمیشہ مفلس رہتا ہی بوجہ کثرتِ جود و سخا۔ اول تمام عیبوں کی اُس سے نفی کی، پھر "مگر" کا لفظ کہہ کر اُسکو مفلس بتایا جس سے معلوم ہوا کہ اُسکے عیوب بیان کرنے کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ مفلسی بھی ظاہراً و عرفاً ایک عیب ہی۔ مگر جب معلوم ہوا کہ مفلسی کثرتِ سخا کی وجہ سے ہی تو یہی مفلسی کمال ہُنر ہوگئی کیونکہ اس سے سخاوت میں اَور مبالغہ پیدا ہوگیا۔ یا جیسے یہ شعر ؎

نہیں ہی مجھ میں بُرائی کچھ اور اسکے سوا	کہ میں بُرا ہوں رقیبوں کی چشمِ بد میں میں

کسی کی آنکھ میں بُرا ہونا عرفاً ایک عیب ہی، لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ شخص رقیبوں کی آنکھ میں بُرا ہی تو ثابت ہوگیا کہ واقع میں اچھا ہی، کیونکہ رقیب حسد کی وجہ سے بُرا جانا کرتے ہیں باعتبار نفس الامر کے۔ یا یہ شعر ؎

ترا عدل سارے جہاں پر ہے، لیکن	رہے ہے ترا ظلم دائم ستم پر

دائم ظلم کا رہنا اسلوب ہجو کا ہی لیکن ستم پر ظلم رہنا کمال عدل ہی۔

اسی صنعت میں مرزا صاحب کا یہ بند ہی۔ پہلے علمِ خامہ نے کہا کہ میں آسمان پر گڑونگا۔ پھر سکّہ نے کہا کہ میں زرِ انجم پہ پڑونگا۔ لیکن مضمون نے کہا کہ میں کسی سے نہ لڑونگا لڑائی سے گریز کرنا بظاہر ایک امرِ قبیح ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ جو

لڑائی سے گریز کرتا ہی وہ مضمون ہی تو ثابت ہو گیا کہ واقع میں اُسکا نہ لڑنا اچھا ہے۔ علاوہ بریں اس بند کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ہر صفت اپنا اظہار ایک پہلو سے کر رہی ہی۔ مضمون بھی اپنا اظہارِ کمال نہ لڑنے سے کرتا ہی کیونکہ اُسکا لڑنا معیوب ہے

تیسرا اعتراض

میں کون ہوں صاحب علم کلکِ جہانگیر	نوبت زنِ نہ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاجِ سرِ لفظ و سخن و معنی و تحریر	خاکِ قدم محتشم و مقبلِ شبیر

اعتراض - پہلے تین مصرعوں کا جو انداز ہے چوتھا مصرع اُس سے کس قدر بیگانہ ہے۔

جواب

جواب - اس بند میں بھی وہی صنعت تاکید المدح بما یشبہ الذم ہی۔ ایک فصیح و بلیغ شاعر کا، جو ابھی اپنے پرشوکت کلام پر تعلّیاں کر رہا ہی، کسی کا خاکِ قدم ہونا عرفاً عجز و مذلّت پر دلالت کرتا ہی لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ محتشم و مقبل جیسے مقبول مداحانِ اہلبیتؑ کا خاکِ قدم ہی تو اُس کی شان و شکوہ میں اَور زیادہ ترقی ہو گئی۔

پہلے تین مصرعوں میں جو شاعرانہ افتخار کیا گیا ہی وہ بوجہ عام شاعری کے ہے۔ چوتھے مصرع میں اُس کی توضیح کر کے بتایا ہی کہ وہ شاعری مدّاحی اہلبیتؑ کی شاعری ہی اور پھر اُس کے رُتبہ کو اَور بڑھاتا ہی کہ میں باوجود ان صفاتِ کاملہ کے محتشم و مقبل مداحانِ اہلبیتؑ کا خاکِ قدم ہوں۔ اور یہی وجہ میری منزلت و قدر کی ہی۔ جسکے ضمناً یہ معنی ہوئے کہ عام شعرا کی شاعری خواہ کتنا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کرلے بااینہمہ اُسکا درجہ بلحاظِ فضل و شرف مدّاحانِ اہلبیتؑ کی شاعری سے پست اور ادنیٰ ہی رہتا ہی۔

چوتھا اعتراض

مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ	کہتا ہے سخن حضرتِ اُستاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تاثیرِ خداداد ہمیشہ	بھولے سے بتادوں تو رہے یاد ہمیشہ

بے لطفِ خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

اعتراض - جو چیز خداداد ہی اُسکے لیے ہمیشہ کی قید حشو محض ہی - چوتھا مصرع تیسرے مصرع سے بالکل بے تعلق ہی - اُستادی کا ذکر دوسرے مصرع میں ہے - اور اُس کے ساتھ اس مصرع کو ربط ہو سکتا ہے - ٹیپ کے دو مصرع بھی باہم بالکل بے تعلق ہیں

جواب - بعض نعمتیں خداوند کریم کی طرف سے خاص خاص موقعوں پر عطا کی جاتی ہیں اور پھر لے لیجاتی ہیں، پس یہ کہنا کہ جو چیز خداداد ہی اُسکے لیے ہمیشہ کی قید کی کیا ضرورت ہی کسقدر مہمل خیال ہی - قابل مولف کی رائے میں جو چیز ہمیشہ قائم رہتی ہی وہی خداداد ہوتی ہی لیکن جو چیز ہمیشہ قائم نہیں رہتی وہ خداداد نہیں ہوتی بلکہ کسی اور شخص کی عطیہ سمجھی جاتی ہی - اگر کوئی شخص ایک خاص وقت تک ذہن و حافظہ میں کامل ہو اور پھر یہ خداداد صفت اُس سے زائل ہو جائے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ یہ صفت خداداد نہ تھی کیونکہ خداداد ہوتی تو ہمیشہ قائم رہتی - مال و دولت، حشمت و اقبال، صحت و تندرستی ہمیشہ قائم نہیں رہتیں حالانکہ خداداد ہوتی ہیں - آپ کی باتیں بھی عجب مضحکہ خیز ہیں - اب تیسرے اور چوتھے مصرع کا تعلق سُنیے - شاعر کا یہ مطلب ہی کہ تاثیر (جو خداداد عطیہ ہی) ہر وقت میرے کہنے میں رہتی ہی اور کبھی مجھ سے جُدا نہیں ہوتی، اور چونکہ میرا کلام ہمیشہ با اثر ہوتا ہی اسلیے اسی اثر کا سبب ہے کہ جب کبھی کسی کو کچھ بتا دیا پھر وہ تمام عمر نہیں بھولا اور جو کچھ بتا دیا وہ نقشِ کالحجر ہو گیا - اب غور فرمائیے کہ تیسرے اور چوتھے مصرع میں کسقدر تعلق اور ربط ہی -

ٹیپ کے دونوں مصرعوں کا یہ تعلق ہی کہ خدا کی عنایت و کرم کے بغیر یہ کاملیت اور

ہمہ دانی (جو مجھ میں ہے) حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اس ہمہ دانی اور فضیلت پر بھی میری یہ حالت ہی کہ دوسرے لوگوں کی طرح چرب زبانی و لسانی سے تعلّیاں نہیں کیا کرتا۔ نہیں معلوم مولف کی سمجھ ٹیپ کے دونوں مصرعوں کے تعلّق کے سمجھنے میں کیوں قاصر رہی۔

چھٹوں اعتراض

مضمونِ تر و تازہ ہی چستی میں یگانا	ملبوسِ قلم کار نہ دوں ہے نہ پُرانا
اس دہیان کے آنے سے کرم شاہ کا جانا	خدّامِ ولا بولے کہ ہاں ہاتھ بڑھانا

لے ہدیۂ تائیدِ قدیرِ ازلی لے
لے خلعتِ تحسینِ حسینؑ ابنِ علیؑ لے

اعتراض ۔ پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں باہم کسقدر تفاوت ہی۔ دوسرا شعر پہلے شعر سے بالکل الگ ہو گیا ہی۔ دوسرے شعر کی بندش ایسی ہی کہ مطلب بھی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اسکا مشارٌ الیہ کون ہے۔

جواب

جواب ۔ ہمارے خیال میں نہیں آتا کہ پہلے اور دوسرے شعر کی ترکیب اور انداز میں کیا تفاوت ہی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مولف نے ایک کو دوسرے سے کیوں الگ سمجھا ہی۔ مولف کا یہ کہنا کہ "دوسرے شعر کی بندش ایسی ہے کہ مطلب آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا" ظاہر کرتا ہی کہ مطلب سمجھ میں تو آتا ہی مگر مشکل سے، خیر یہ بھی غنیمت ہے۔ اسکا مشارٌ الیہ پہلے شعر کا کُل مضمون ہی۔ مطلب شاعر کا یہ ہے کہ میرا مضمون تازگی و چستی میں بے مثل و یگانہ ہی اور ملبوسِ[1] قلم کار، یعنی میری شاعری

[1] یہاں ملبوسِ قلم کار سے اپنی شاعری سے استعارہ فرمایا ہی۔ ازبسکہ شاعری قلم کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے اسلیے اُسکو ملبوسِ قلم کار کہا۔ ۱۲

نہ تو ادنیٰ درجہ کی ہے نہ پُرانی شاعری۔ میرا رنگِ سخن معمولی رنگ نہیں ہے بلکہ اپنی تازگی۔ چستیِ بندش۔ اور جدّتِ مضامین میں ممتاز ہے۔ جب میں نے اپنے کلام کو اس پایہ کا سمجھا اور مجھے اپنی نازک خیالی۔ قوتِ فکر۔ اور حُسنِ بیان کا دعوےٰ ہوا تو اس دہیان کے آتے ہی یعنی اس خیال کے ساتھ ہی، میرا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ میرا جو کچھ بھی سرمایۂ ناز اور پایۂ کمال ہے یہ سب حضرت کے کرم کی بدولت ہے کیونکہ میں اُنکا مدّاح ہوں اور وہ جناب میری تائید فرماتے ہیں۔ اس خیال کے آنے پر جوشِ ولا نے بڑھکر کہا کہ ہاتھ بڑھا اور تائیدِ غیبی اور تحسینِ حسینؑ ابنِ علیؑ کا خلعت لے۔ اس میں کونسا پیچ تھا جو مولف کی سمجھ میں نہ آیا اور کونسی بے ربطی اور پیچیدگی تھی جس سے اس بند کے معنی سمجھنے میں دقّت واقع ہوئی۔ سوا اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ع۔

ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے است۔

حامی جو سلیمانؑ دو عالم نظر آئے	مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤسِ تصوّر کی طرح دل میں در آئے	شیشے میں پری زادِ معانی اُتر آئے

یا قوت بدخشاں سے دُر آتے ہیں عدن سے
لعل اُگلوں گا میں طائرِ سِدرہ کے دہن سے

اعتراض - حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے کیا تعلق ہے۔ تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے کس بنا پر ہے، اور پھر اسکے کیا معنی کہ عنقا سے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جس طرح طاؤسِ تصوّر دل میں اُتر آتا ہے، طاؤس دل میں نہیں اُترتا اور اگر تصوّر کے طاؤس ہونے کی بنا پر ہے تو مضمون کا عنقا خود دل میں اُتر سکتا ہے طاؤس کی مشابہت کی کیا ضرورت ہے۔ ٹیپ میں عجب بے ربطی ہے، شاعر لعل اُگلے گا لیکن طائرِ سدرہ کے دہن سے اُگلے گا

اسکے کیا معنی؟ شاید اُگلنے کو اُگلوانے کے معنی میں لیا ہے، یا اپنے آپ کو طائرِ سدرہ قرار دیا ہے۔

جواب۔ سلیمانِ دوعالم سے مراد شاعر کے ممدوح ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو جو نسبت دیو و پری۔ وحش۔ وطیور سے ہے وہی تعلق عنقا سے ہے کیونکہ وہ جن۔ وانسان و وحش وطیور سب کے بادشاہ تھے۔ بادشاہ کو جو تعلق اپنی رعایا سے ہوتا ہی وہی حضرت سلیمانؑ کو عنقا سے ہے۔ تصوّر کی تشبیہ طاؤس سے اسی بنا پر ہی جس بنا پر کہ شعرا وہم کی تشبیہ طائر سے خیال کی مرغ سے۔ نظر کی عنقا سے دیا کرتے ہیں۔ جیسے نلدمن میں فیضی کے اس شعر میں ہے

	اے در تگ و پوے تو ز آغاز		عنقاے نظر بلند پرواز	

بہت افسوس ہی کہ مولف کی سمجھ ایسی آسان بات کے سمجھنے سے قاصر رہی کہ عنقاے مضمون دل میں اس طرح اُتر آئے جیسے کہ طاؤسِ تصوّر دل میں اُتر آتا ہی۔ اگر جوشِ تعصّب ذرا بھی غور کرنے کی مہلت دیتا تو اس کوتاہی خیال کے اظہار کی نوبت نہ آتی۔ مدعا یہ ہی کہ جو بات مشکل سے مشکل تھی وہ آسان سے آسان طریقہ سے مجکو حاصل ہو گئی۔ اسلیے کہ اوّل تو مضمون جسکا ملنا بہت دشوار اور پھر مضمون کا بھی عنقا، مضمون بڑی مشکل اور محنت سے شاعر کو ملتا ہی اور مضمون بھی وہ مضمون جو عنقا ہو اور کسی کو نہ ملا ہو، کیا ایسے مضمون کا ہاتھ آجانا کوئی آسان بات ہی۔ اب دوسری صورت دیکھیے کہ طاؤس کثیر الحصول پرند، ہر جگہ موجود ہوتا ہی۔ بلند پرواز بھی نہیں کہ اُسکا قابو میں لانا مشکل ہو۔ نایاب بھی نہیں کہ اُس کی تلاش میں سرگردانی کرنی پڑے، پھر اُسپر یہ آسانی کہ تصوّر کا طاؤس کسی شے کا تصوّر دل میں آجانا ایسی آسان بات ہی کہ اُس سے آسان تر کوئی بات ہو نہیں سکتی، حتّیٰ کہ انسان کا دل کبھی تصوّر سے خالی ہی نہیں رہتا۔ تلوار کی تعریف کے ایسے مضامین

جو کسی نے نہیں لکھے انسان کے ذہن میں ایسی آسانی کے ساتھ نہیں آسکتے جیسے کہ تلوار کا تصوّر۔ پس شعر کا یہ مطلب ہوا کہ مضامین کے عنقا جنکا ہاتھ آنا بہت مشکل ہی میرے دل میں اس آسانی کے ساتھ اُتر آئے جیسے طاؤس کا تصوّر۔

ٹیپ میں مطلق بے ربطی نہیں۔ مطلب شاعر کا یہ ہی کہ میں اپنے ذہن سے وہ لعل اُگلوں گا جو طائرِ سدرہ کے ہیں یعنی جو طائر سدرہ کے منہ سے نکلے ہیں۔ یعنی وہ مضامینِ منقبت وفضائل لکھونگا جو حضرت جبریلؑ کی معرفت بذریعۂ وحی نازل ہوئے ہیں۔ اس مصرع کے مخفّفات کو بریکٹ میں ظاہر کیا جائے تو مطلب معلوم ہو جائیگا۔ یعنی (اپنے) ذہن سے (مدح اہلِ بیتؑ کے وہ) لعل اُگلونگا میں (جو) طائرِ سدرہ کے (منہ سے نکلے تھے) یہ مطلب بھی ہو سکتا ہی کہ فضائلِ اہلبیتؑ کے مضامین مدّاحانِ اہلبیتؑ کے دل میں بذریعۂ روح الامین القا ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت ابو عبداللہؑ سے منقول ہی قال ماقال فینا قائل بیت شعر حتّٰی یؤیّد بروح القدس۔ یعنی حضرت نے فرمایا کہ ہماری منقبت میں شاعر کوئی شعر نہیں کہتا مگر یہ کہ روح القدس (جبریل علیہ السّلام) اس کی تائید کرتے ہیں۔ پس ان فضائل کے لعل جو میرے دل میں بحیثیتِ مداح اہل بیتؑ حضرت جبریلؑ نے القا کیے ہیں میں اُن کو اپنی زبان سے ادا کرونگا۔

ساتواں اعتراض

کب شعلۂ خس نور کی قندیل کو پہونچے	اُڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہونچے
پشّہ کا نہ غل صورِ سرافیل کو پہونچے	بلبل نہ لب ولہجۂ جبریلؑ کو پہونچے

ارباب سخن پر جو سخن ور رہے ہمارا
القابِ سخن سنج سخن ور رہے ہمارا

اعتراض بے ربطی کو دیکھو شعلہ کا مقابلہ قندیل سے نہیں بلکہ قندیل کی روشنی سے ہو سکتا ہی۔ پرواز کو طنطنہ سے کیا نسبت ہی؟ بلبل کو جبریلؑ سے کیا مناسبت ہے لقب کی بجائے القاب باندھا ہے۔

جواب

جواب - نور کی قندیل سے مراد تمام قندیل کا مجموعہ ہی جس میں روشنی وغیرہ سب شامل ہی۔ جیسے محاورہ میں کہتے ہیں کہ "اس قندیل کی کیا اچھی روشنی ہی" از قبیل اطلاق المظروف علی الظرف۔ حالانکہ روشنی اور ضو قندیل میں نہیں بلکہ اُس کی شمع میں ہوتی ہی۔ اور نور کی قندیل تو سراپا نور ہوگی۔ پس مطلب یہ کہ شعلۂ خس اُس قندیل کو نہیں پہونچ سکتا جو ہمہ تن نور ہی نور ہی اسلیے یہ مصرع بہت درست اور فصیح ہی۔ مگس[۲] لاکھ بلند پروازی اور عروج حاصل کرے لیکن اُس کی بلند پروازی اور شان، کروفر اور شان وشکوہ فیل سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ بلبل[۳] کو جبریل[۴] سے یہ مناسبت ہے کہ بلبل ایک مشہور و معروف طائر ہی جسکے دلاویز نغمے دلچسپ اور تفریح بخش سمجھے جاتے ہیں اور جبریل[۵] کو بھی طائرِ سدرہ اور طوطی سدرہ وغیرہ کہا جاتا ہی۔ اسی مناسبت سے شیخ ناسخ کا یہ شعر ہی۔

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا　　روح القدس ہی نام مرے ہم صفیر کا

لقب[۶] کی عوض القاب اسوجہ سے لکھا گیا ہی کہ الفاظ القاب۔ اسباب۔ اصول احوال وغیرہم کو جمع ہیں مگر ان کو محاورہ میں مثلِ واحد استعمال کرتے ہیں اور اُنکے واسطے فعلِ واحد لایا جاتا ہی۔ اس کی چند نظیریں دی جاتی ہیں۔

القاب

القاب کی مثالیں

میر تعشق	مِلکے دیوار سے بیٹھی نرہی ضعف سے تاب		پہلے مد کھینچ کے آغاز کیا پھر القاب[۱]
منشی دلگیر	لکھا یہ عرضی میں القاب پھر بشیوں وشین		جناب قبلۂ کونین و کعبۂ دارین[۲]

[۱] ۳/۵۴　[۲] ۳/۲۵۵

میر مونس	خط میں القاب کیا بسطِ نبیؐ کو یہ رقم		قبلۂ کون و مکاں پشت و پناہِ عالم[1]
میر نفیس	القاب تھا کہ قبلۂ دیں کعبۂ جہاں		خورشیدِ آسمانِ شرف عیسیٔ زماں[2]

اسباب

اسباب کی نظیر

میر انیس ۔ آرام کی صورت نہ کوئی زیست کا اسباب ۔ سبب کی عوض اسباب باندھا ہے ۔

اصول

اصول کی مثال

مولوی شبلی صاحب ۔ "واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا اصول یہ ہے" اصل کی جگہ اصول باندھا ہے

احوال

احوال کی مثالیں

قاآنی	دو سرِ زلفِ پریشاں را باہم پیوست		یعنی امسالت آشفتہ نگردد احوال[3]
ایضاً	من چناں ساز شعر ساز کنم		کہ دگرگوں شود ورا احوال

میر انیس ۔ ع ۔ دنیا میں سدا ایک سا رہتا نہیں احوال

ایضاً ۔ ع ۔ تم لوگوں کے غم کھانے کا کھلتا نہیں احوال

ایضاً ۔ ع ۔ کھل جائیگا احوال دمِ جنگ تمھارا

ایضاً ۔ ع ۔ میں کیا کہوں ہوتا ہے جو اسدم مرا احوال ۔ دیکھو سب جگہ حال کی

[1] ۲/۲۷۸ [2] جلد میر نفیس [3] کلیاتِ قاآنی صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۸ -

عوض احوال باندھا ہے۔

احکام

میر صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ ناگاہ ہوا نیّرِ اعظم کو یہ احکام۔ حکم کی جگہ احکام باندھا ہے۔

آداب

میر انیس۔ ع۔ ناداں تھے جنھوں نے نہ کیا آپ کا آداب۔

ذوق ؎ میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو باعث یہ تھا کہ رہا مدِّ نظر عشق کا آداب مجھے[1]

دیکھو دونوں اُستادوں نے ادب کی عوض آداب باندھا ہے۔

عنایات

میر انیس۔ ع۔ کی ہم سے غریبوں پہ عجب لطف و عنایات۔

رند۔ ع۔ کب مرے حال پہ ساقی کی عنایات نہ تھی۔ دونوں جگہ عنایت کی جگہ عنایات لکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ روزمرہ میں جو الفاظِ جمع بجائے واحد مستعمل ہیں وہ سب صحیح و فصیح ہیں اور اسی قبیل سے لفظ القاب ہے۔

آٹھواں اعتراض

سرکار ہے ہر مجلسِ شبیرؑ ہماری	مضموں کی طرح بیت ہے جاگیر ہماری
آئینہ سکندر پہ ہے تسخیر ہماری	ہے مُہر سلیمانؑ کی تحریر ہماری

تنہا مہ و ماہی پہ نہیں سکّہ پڑا ہے
سورج کا نگینہ بھی انگوٹھی پہ جڑا ہے

اعتراض۔ بیت کا درجہ مضمون سے کم ہے، کیونکہ بیت کی جو خوبی ہے مضمون ہی کی وجہ سے ہے۔ اس بنا پر یہ تشبیہ کہ مضمون کی طرح بیت ہماری جاگیر ہے بے معنی ہے۔ جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر ہو گئی۔ ٹیپ کا اخیر مصرع بالکل بے معنی ہے، پہلے انگوٹھی سے کسی چیز کا استعارہ کرنا تھا، پھر سورج کا نگینہ جڑنا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ

[1] دیوان ذوق صفحہ ۲۴۷

ہات میں پہننے کی انگوٹھی پر سورج کا نگینہ جڑنا کسقدر لغو بات ہے۔

جواب۔ اس بند کا مضمون نہایت صاف اور درست ہے صرف سمجھ کا پھیر ہے پہلے شاعر کہتا ہی کہ ہم مضمون آفریں ہیں، اور چونکہ مضمون آفرینی ایک جداگانہ چیز ہے اور بیت یعنی شاعری ایک علٰحدہ چیز ہی (کیونکہ مضمون آفریں کے واسطے شاعر ہونا لازمی نہیں ہے) اسلیے وہ کہتا ہی کہ ہم مضمون آفریں ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں اس لحاظ سے مضمون کی طرح بیت بھی ہماری جاگیر ہی۔ یہ خیال غلط ہی کہ جب مضمون جاگیر ہو چکا تو بیت خود ہی جاگیر ہو جائیگی، کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص اعلیٰ درجہ کا مضمون آفریں تو ہو لیکن شاعر نہ ہو بلکہ اپنی مضمون آفرینی کو دوسرے پیرایہ مثل نثر نگاری و انشا پردازی وغیرہ میں صرف کرے۔

ٹیپ کا اخیر مصرع بھی درست اور بامعنی ہی اور اعتراض لغو ہی۔ انگوٹھی سے کسی چیز کا استعارہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں شاعر اپنی انگوٹھی کی شان و شوکت ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایسی ہی جسکا نگینہ سورج ہی۔ اس قسم کی تشبیہیں اکثر مستعمل ہیں جنکو بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

نواں اعتراض

قابل میں سخن کے ہوں سخن ہی مرے قابل	لیکن سخنِ شہرہ فگن ہی مرے قابل
رضوان کو جنت یہ چمن ہی مرے قابل	موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

شہرہ ہی یہ تائیدِ شہِ جن و ملک سے،
مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

اعتراض (۱) سخنِ شہرہ فگن نئی ترکیب ہی (۲) رضوان کو جنت، یہ چمن ہے مرے قابل، ناموزوں ترکیب ہے۔ یا تو یوں ہونا چاہیے کہ رضوان کو جنت چاہیے اور مجکو یہ چمن

یا یوں کہنا تھا کہ رضوان کے قابل جنّت ہی، اور میرے قابل یہ چمن، چوتھے مصرع کی ترکیب کا بھی یہی حال ہی (۳) ٹیپ کے دونوں مصرعے باہم متناقض ہیں، شہرہ بھی انتہا کا ہی اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہی، شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہی لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانہ مبارک تک پہونچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسلیے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا۔

جواب

جواب - اگر یہ مان لیا جائے کہ سخن شہرہ فگن نئی ترکیب ہے تو اس میں قباحت کیا ہی۔ کوئی ترکیب خاص اسالیب کلام میں منحصر و محدود نہیں ہی، نہ اسکا اختراع اور ایجاد کرنا ممنوع قرار پایا ہی۔ جتنے مرکّب الفاظ آج بولے یا لکھے جاتے ہیں جب تلاش کیجے گا تو اوّل اوّل کسی شاعر یا نثر نے ترکیب دی ہوگی۔ وہی شاعر یا نثر اُسکا موجد سمجھا جائیگا۔ اگر سخن شہرہ فگن مرزا صاحب نے پہلے پہل نظم فرمایا تو اس کے موجد مرزا صاحب ہوئے۔ سخن۔ شہرہ۔ فگن۔ ان میں سے کوئی لفظ غلط اور بے معنی تو نہیں ہی۔ رہا یہ امر کہ مرزا صاحب نے کیوں اسکو ایجاد کیا تو یہ کوئی ممنوع امر نہیں ہی۔ دیکھو مرزا غالب نے اپنی ایک کتاب کا نام ماہِ نیم ماہ تجویز کیا تھا اور اُن کو اپنی اس ترکیب پر ناز تھا۔ مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہِ چہاردہ اور ماہِ دوہفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ہی مگر جہانتک مجھے معلوم ہی ماہِ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا۔ یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ہے[1]

مرزا غالب کی ایجادیں

ایک موقع پر مولوی حالی صاحب یادگار غالب میں لکھتے ہیں "بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے ہیں جو نہ ان سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۱۔

نہ فارسی میں"، پس اگر سخنِ شہرہ فگن مرزا صاحب کی ایجاد ہو تو اُنکے لیے یہ امر باعثِ فخر و مباہات ہے۔

(۲) رضوان کو جنّت یہ چمن ہے مرے قابل۔ یہ مصرعے اس طرح بھی ہو سکتے ہیں۔ اور شاید اسی طرح ہونگے سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہی ؎

رضوان کے جنّت یہ چمن ہی مرے قابل		موتی کے صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل

یعنی رضوان کے قابل جنت ہی اور یہ چمن میرے قابل ہے۔ اسی طرح موتی کے قابل صدف، اور یہ عدن میرے قابل ہی۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ یہ چاروں مصرعے مرزا صاحب نے اوّل اوّل لکھے تھے مگر پھر ان کو بدل دیا اور یہ مصرعے فرمائے ؎

مدّاحِ سلطانِ زمن ہم کو مبارک		رضوان کو جنّت یہ چمن ہم کو مبارک
موتی کو صدف اور یہ عدن ہم کو مبارک		جبریلؑ کو وحی اور یہ سخن ہم کو مبارک

شہرہ ہی یہ تائیدِ شہِ جن و ملک سے
مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

چنانچہ یہ بند اُس مرثیہ میں جو ۱۸۸۰ء کے قریب مطبع حسینی اثنا عشری میں طبع ہوا تھا اسی طرح چھپا تھا۔ اور قلمی مرثیہ میں بھی یوں ہی موجود ہی۔ واللہ اعلم۔

(۳) تیسرا اعتراض آپ کا یہ ہی کہ جب شہرت ہی تو مضمون کو گھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہی یہ کسقدر خلافِ عقل اعتراض ہی۔ آدمی کو جوشِ تعصّب میں اسقدر بھی متوالا اور مدہوش نہ ہو جانا چاہیے کہ معمولی باتیں بھی ذہن میں نہ آئیں۔ کیا شہرت کوئی راہبر ہوتی ہی کہ صاحبِ شہرت کے مکان کا نشان دیتی پھرتی ہے۔

مثلاً آپ ایسے مشہور و معروف شخص ہیں کہ ہندوستان میں کوئی پڑھا لکھا انسان نہوگا جو آپ کو نہ جانتا ہو پس اگر آپ کی شہرت کو سنکر کوئی مدراس کا باشندہ لکھنؤ میں آپ سے ملنے آئے تو اُسکو آپ کا درِ دولت پوچھنے کی ضرورت ہوگی یا نہیں - یا محض شہرت کوئی مجسّم انسان بنکر آپ کے مکان تک پہونچا دیگی - شاعر کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا پر فقط میری ہی شہرت ہے - اس لیے جب مضامین زمین پر آتے ہیں تو شہرت کی وجہ سے اُن کو میرے آستانہ پر پہونچنے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ پتہ پوچھ کر مشرّف بزیارت ہوتے ہیں اور چونکہ مضامین نئے نئے ہوتے ہیں اسلیے ہر نئے مضمون کو اسی قسم کی تلاش کرنی پڑتی ہے - اس معمولی بات میں ایسی کیا باریکی تھی جو آپ کی سمجھ میں نہ آئی - یہ ہم مانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے اشعار کی لطافت سمجھنے کے واسطے قدرت نے آپ کا دماغ نہیں بنایا لیکن کیا ایسی معمولی باتیں بھی آپ کی سمجھ سے باہر ہوگئیں -

دیوان اعتراض

ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی	ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
ہر بحر میں ہے بحرِ طبیعت کی روانی	ہے زورِ سخن شور پہ موجوں کی زبانی

قطرہ سے مگر بحث میں میں صرف نہیں ہوں
دریا ہوں سخن کا میں تنک ظرف نہیں ہوں

اعتراض - تیسرے مصرع کا مطلب مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے، مقصد یہ ہے کہ زورِ سخن شور پر ہے لیکن اس بات کو میں نہیں کہتا بلکہ موج کی زبان کہتی ہے - بحث میں صرف ہونا کونسا محاورہ ہے - ٹیپ کے دوسرے مصرع میں "میں" کا لفظ محض فضول ہے - پہلے مصرع میں میں کا لفظ آچکا ہے -

جواب

جواب - تیسرے اور چوتھے مصرع کا مطلب یہ ہی کہ میری بحرِ طبیعت کی روانی ہر بحر میں ہی اور اُس بحر کی ہر موج ہمہ تن زبان ہو کر بیان کر رہی ہی کہ بحرِ سخن زور شور پر ہے صرف بمعنی مصروف اُردو کے روزمرہ میں مستعمل ہی - میر ضمیر[1] صاحب لکھنوی فرماتے ہیں ع - خدمت میں صرف رہتے ہیں ہر شام و ہر سحر (یعنی مصروف رہتے ہیں -) میں کا لفظ اگر یہاں نہ ہوتا تو بھی معنی میں خلل نہ آسکتا تھا اور اگر حذف نہیں کیا تو بھی کوئی خرابی نہیں ہے - اصل میں وزنِ شعر کی ضرورت سے شاعر کو زائد اور غیر ضروری الفاظ بھی لانے پڑتے ہیں - جیسے میر انیس مرحوم فرماتے ہیں ؎

ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں	لو آؤ کہ میں اب تو نہ غصّے نہ خفا ہوں

دیکھیے ٹیپ کے دوسرے مصرع میں بھی میں کا لفظ ہی حالانکہ پہلے مصرع میں بھی میں کا لفظ آچکا ہی - دیگر ؎

عشقِ رخسار میں رُتبہ ترا گھٹ جائیگا	منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائیگا

دوسرے مصرع میں ترا کا لفظ زائد ہی اسی طرح اور بھی بہت سی اس قسم کی مثالیں میر صاحب اور مرزا صاحب اور تمام شعرا کے یہاں مل سکتی ہیں -

کیا یہاں اعتراض

خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے	جھک کر شہ فا اور نجبا ملتے ہیں سب سے
نخوت کے معانی ہیں الگ لفظوں کے لب سے	جس طرح سے بدصل جدا نیک نسب سے

دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانندِ غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

اعتراض - پہلے مصرع میں انکساری اور خاکساری کے بجائے ادب کہا ہی

[1] میر ضمیر ۱/۳۵

حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہی۔ تیسرے مصرع کی ترکیب اور لفظ کے لب کا استعارہ سابق و لاحق کی سادگی و صفائی سے نہایت بیگانہ ہی۔

جواب

جواب ۔ ادب ایک جامع لفظ ہی جس میں تمام محاسنِ اخلاق مع خاکساری اور فروتنی کے شامل ہیں۔ منتہی الارب میں ہی۔ ادب نگاہداشت حدِ ہر چیز۔ منتخب اللغات میں ہی۔ ادب طورِ پسندیدہ و نگاہداشت حدِ ہر چیزے۔

پس ادب کا لفظ بھی اُسی معنی میں سمجھنا چاہیے۔ مصنّف نے افراطِ ادب فرمایا ہی جو عین انکساری ہی بلکہ انکساری و خاکساری دونوں سے یہ لفظ بہتر ہی۔ بند کے چھوں مصرعے ایک ہی حالت اور ایک ہی انداز کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں دیکھے گئے۔ یہ عجب مشکل ہی کہ مولف کی راے میں اگر آسان اور سلیس ہوں تو چھوں مصرع آسان ہوں اور مشکل و دقیق ہوں تو چھوں مصرعے مشکل ہی ہوں

بارہواں اعتراض

شیریں سخنی کا ہنر اکبر سے لیا ہے	اس ذرہ میں سب مہرِ حسینی کی ضیا ہے

بے مہریِ افلاک سے گو خاک بسر ہوں
ہاں عیب بڑا یہ ہے کہ میں اہلِ ہنر ہوں

اعتراض ۔ گو خاک بسر ہوں کا جواب، ہاں عیب بڑا یہ ہی کسقدر بے جوڑ ہی میں کا لفظ بالکل حشو ہی۔

جواب

جواب ۔ ٹیپ کے پہلے مصرع میں گو کا لفظ غلط ہی۔ کاتبوں کی غلطی سے کیوں کا گو ہو گیا ہی۔ چنانچہ میرے پاس جو قلمی مرثیہ ہی اُس میں "کیوں خاک بسر ہوں" لکھا ہوا ہی۔ پس اصل میں یہ شعر اس طرح پر ہی ؎

بے مہریِ افلاک سے کیوں خاک بسر ہوں	ہاں عیب بڑا یہ ہی کہ میں اہلِ ہنر ہوں

اب مطلب بالکل صاف ہی۔ شاعر کہتا ہی کہ حضرت علی اکبرؑ علیہ السّلام نہایت شیریں سخن تھے پس میں نے شیریں سخنی کا ہنر اُنھیں سے لیا ہی، اور اس ذرّہ میں تمام مہرِ حسینیؑ (حضرت علی اکبرؑ) کی روشنی ہی۔ لیکن (باوجود اس ہنر کے بھی) افلاک کی بے مہری سے کیوں خاک بسر ہوں؟ اس استفہام کا جواب شاعر خود دوسرے مصرع میں دیتا ہے کہ یہ خاک بسری اسوجہ سے ہے کہ مجھ میں اہلِ ہنر ہونے کا عیب ہے۔ اور اہلِ ہنر ہمیشہ مبتلائے مصائب و آلام رہا کرتے ہیں۔ رہا میں کا حشو یہ آپ کی سمجھ کی غلطی ہے ورنہ میں کا لفظ بالکل حشو نہیں بلکہ وہ فاعل ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ میں موجود نہیں کہ دوسرے مصرع کے میں کو حشو سمجھا جائے۔ دونوں مصرعوں میں سے ایک مصرع میں میں کا ہونا بہت ضروری ہے بالکل اسی قسم کی ٹیپ میر صاحب مرحوم کی لکھتا ہوں ؎

رُلواؤں گا لحد میں جنابِ بتولؑ کو	پیاسا کرونگا ذبح میں سبطِ رسولؐ کو

کیا اس بیت میں بھی آپ میں کے لفظ کو حشو فرمائینگے۔ ہرگز نہیں یہاں بھی وہ فاعل ہی۔ میر صاحب مغفور کا ایک دوسرا شعر ہی ؎

میں اپنے ساتھ ساتھ تجھے لے کے جاؤنگا	تیری خطا حسینؑ سے میں بخشواؤنگا

بیہوش ہے بجلی پہ سمند اُن کا ہی ہُشیار	خوابیدہ ہیں سب طالعِ عباسؑ ہے بیدار
پوشیدہ ہی خورشید علم اُن کا نمودار	بے نور ہے مُنہ چاند کا رُخ اُنکا ضیابار

سب جزو ہیں کُل رُتبہ میں کہلاتے ہیں عباسؑ	
کونین پیادہ ہی سوار آتے ہیں عباسؑ	

اعتراض - یہ بند اوپر کے بند سے دفعۃً اسقدر بے تعلّق ہوگیا ہی کہ مطلب سمجھنا

مشکل ہی۔ اُن کا مشار الیہ حضرت عبّاسؑ ہیں لیکن چونکہ حضرت عبّاسؑ کا ذکر پہلے بندوں میں آیا تھا۔ جس سے تین بندوں کا فاصلہ ہے، اسلیے ذہن اسطرف جلدی منتقل نہیں ہوتا۔ مضمون کی بے ربطی کی یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف تو ہل چل کی وجہ سے بجلی کو بیہوش قرار دیا ہی۔ دوسری طرف فرماتے ہیں کہ سب خوابیدہ ہیں۔ ٹیپ کی بندش کی سُستی خود ظاہر ہے۔

جواب

جواب ۔ واقعی یہ مرزا صاحب کی کرامت ہے کہ اُن پر بیجا اعتراض کرنے سے آپ کا ذہن اسقدر مختل ہوگیا ہی کہ جو اعتراض کرتے ہیں وہ مہمل اور بے سروپا ہوتا ہے جب تمام مرثیہ حضرت عبّاسؑ کے حال میں ہے تو باوجود تین بندوں کے فاصلے کے آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ "اُن" کا مشار الیہ حضرت عبّاسؑ ہیں۔ کم سے کم آپ کے ذہنِ ثاقب میں اسقدر جودت تو ضرور ہونی چاہیے کہ ایسی معمولی باتونکی جانب جلد منتقل ہوجائے۔ ورنہ مرزا صاحب نے کچھ اس بات کا ٹھیکہ نہیں لیا ہی کہ آپ ایسے عالی فہم لوگ بھی اُن کا کلام سمجھیں۔ اسکے علاوہ ممکن ہے کہ پہلے دو مصرعوں میں اُلٹ پھیر ہوگیا ہو اور اصل میں اس طرح پر ہوں۔

خوابیدہ ہیں سب طالعِ عبّاسؑ ہی بیدار	بیہوش ہے بجلی پہ سمند اُن کا ہی ہُشیار

اب اُن کا مشار الیہ حضرت عبّاسؑ ہوگئے۔ لیکن اگر بحیثیتِ موجودہ بھی دیکھا جاوے تو بھی کچھ عیب نہیں۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ یہ مرثیہ حضرت عبّاسؑ کے حال میں ہی۔ دوسرے مصرع میں حضرت عبّاسؑ کا نام موجود ہے اور اضمار قبل الذکر ممنوع نہیں۔ فارسی اُردو میں برابر اس کی مثالیں موجود ہیں۔

جس امر کو آپ نے بے ربطی قرار دیا ہے وہ غلط ہے۔ بجلی کے بیہوش ہونے اور سب کے خوابیدہ ہونے کو آپ باہم ملائے کیوں دیتے ہیں۔ ہر مضمون علیحدہ علیحدہ مصرعوں سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے مصرع کا یہ مطلب ہے کہ رعب داب کی وجہ سے بجلی بیہوش ہے حضرت عباسؑ کا طالع بیدار ہے۔ اسکے سوا سب خوابیدہ ہیں۔ خورشید پوشیدہ ہے مگر اُنکا علم نمودار ہے۔ چاند بے نور ہے۔ مگر ان کا رخ، روشن و منور ہے۔ غرض ہر مصرع اپنے اپنے الگ الگ معانی رکھتا ہے اور ان میں جو محاسن ہیں وہ قدر شناسانِ سخن پر مخفی نہیں۔

تعقید قابل مولف کی رائے میں مرزا صاحب کے کلام میں فصاحت نہونے کی تیسری وجہ تعقید ہے۔ اس بحث میں اُنھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں جو مثالیں لکھی ہیں وہ نہایت مضحکہ خیز ہیں۔ ان اشعار میں اکثر الفاظ یا تو کتابت کی غلطی کی وجہ سے بدل گئے ہیں۔ یا مولف نے قصداً اُن کو مسخ کر دیا ہے۔ مثلاً مرزا صاحب کا مصرع ہے۔

(۱) ع۔ لوحِ جبیں ہے مشرقِ خورشید ہر امید۔ مولوی شبلی صاحب نے اُسکی جگہ لکھا ہے ع نامِ جبیں ہے مشرقِ خورشیدِ ہر امید۔ گویا مصرع کو بالکل بے معنی بنا دیا گیا۔

(۲) پھر مرزا صاحب کا شعر ہے ؎

بینی جبین و لب سے حسین و جلیل ہے	سر پر ہے عرش زیرِ قدم سلسبیل ہے

مولف نے اس شعر کو اس طرح بے معنی بنانے کی کوشش کی ہے ؎ بینی جبین و لب سے حسینؑ و خلیلؑ ہے۔ سر پر ہے عرش زیرِ قدم سلسبیل ہے۔

(۳) مرزا صاحب کا مصرع ہے۔ ع۔ مانندِ میم مرگ میانِ کمر گئی ؎ مولوی شبلی اسکو مسخ فرماتے ہیں ع مانندِ سیم مرگ میانِ کمر گئی۔ سیم مرگ بالکل مہمل لفظ ہے۔ آپ کو

؎ جلد ۲ صفحہ ۹۲۔

مرزا صاحب کی طرف سے اسقدر بے اعتقادی تو نہونا چاہیے۔ اگر آپ کے اعتقاد میں وہ ایک فصیح البیان شاعر نہ تھے تو کم سے کم پڑھے لکھے تو ضرور ہونگے، پس سیم مرگ کس طرح اُنکے قلم سے نکل سکتا ہی۔ لیکن جب آپ کے خیال میں میر صاحب کو نین کا عالی جیسا مہمل لفظ لکھ سکتے تھے، تو مرزا صاحب پر تو بایں بے اعتقادی جو کچھ بھی تہمت لگائی جائے کم ہے۔ اس سے مرزا صاحب کی مسلّمہ قابلیت تو مطلق کم نہ ہوئی البتہ ناظرین کی نگاہوں میں آپ کی سخن فہمی کی قلعی کھل گئی کہ الفاظ کو صحیح پڑھنے کی بھی قابلیت نہیں۔ اور اگر آپ نے قصداً ایسا کیا ہے تو اس سے بھی زیادہ ندامت کی بات ہی

ہم اس عنوان کے مہملات کا جواب بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف یہ چند نظیریں اسوجہ سے لکھدی گئیں کہ جس طرح ان اشعار کے الفاظ کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اسی طرح ممکن ہی کہ باقی اشعار پر بھی محرّفین کی عنایت ہوئی ہو اور الفاظ میں تغیّر و تبدّل کر دیا گیا ہو۔

استعارات و تشبیہات

استعارات و تشبیہات

قابل مولف لکھتے ہیں کہ حقیقت میں مرزا صاحب ایسی عجیب اور نادر تشبیہات و استعارات پیدا کرتے ہیں جنکی طرف کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا لیکن اس زور میں وہ اکثر اسقدر بلند اُڑتے ہیں کہ بالکل غائب ہوجاتے ہیں۔ اسکے بعد چند اشعار کا انتخاب کیا ہے جو اُن کو ناپسند ہیں کیونکہ اُن کا سمجھنا اُن کی استعداد سے باہر ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مرزا صاحب کے کلام میں ہر قسم کے نمونے موجود ہیں، جو ذکی الطبع اور صاحب طبع رسا ہیں وہ ان دقیق مضامین کا لطف اُٹھاتے ہیں اور جن کی لیاقت محدود ہے وہ صاف اور سادہ اشعار سے محظوظ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم مناسب موقع پر اس قسم کے اشعار لکھ چکے ہیں۔ جن میں فصاحت و سلاست۔ روانی و برجستگی پورے طور پر موجود ہے اور جو مولف کی سمجھ میں بھی بآسانی آسکتے ہیں۔ ناظرین بھی اُن مواقع پر اس قسم کے اشعار سے محظوظ ہوں۔

مضمون بندی و خیال آفرینی

مضمون بندی و خیال آفرینی

اس موقع پر مولف چند منٹ تک منصف مزاج بنکر کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کی قوتِ متخیلہ زبردست ہے اور خیال آفرینی۔ جدتِ استعارات۔ اختراعِ تشبیہات میں اُن کا جواب نہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ہم اُن کی ہر قسم کی عمدہ مضمون

آفرینی کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ اور اُن کی بہت داد دی ہے۔ جسکا ہم بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور ہر قسم کے اشعار مختلف عنوانات کے تحت میں ہم پیچھے لکھ آئے ہیں جو ناظرین خصوصاً مولف کے واسطے باعثِ تفننِ طبع ہوں گے۔

بلاغت

بلاغت کے متعلق اعتراضات

اس موقع پر مولف لکھتے ہیں کہ یہ وہ چیز ہی جہاں انیس اور دبیر کی شاعری کی سرحدیں بالکل الگ ہو جاتی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب کی شاعری میں بالفرض گو اور تمام اوصاف پائے جاتے ہوں۔ لیکن بلاغت کا تو شائبہ نہیں پایا جاتا وہ کسی مضمون کو مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے" افسوس ہی کہ مولوی صاحب نے ابتک جسقدر بے دلیل دعوے فرمائے ہیں۔ اُن میں سے کوئی معیارِ صداقت پر ٹھیک نہیں اُترا۔ وہ طرح طرح سے کہیں کسی دھوکہ سے اور کہیں کسی فریب سے چاہتے ہیں کہ مرزا صاحب کے شمعِ کمال کی روشنی کو چھپا دیں۔ مگر ؎

چراغے را کہ ایزد برفروزد　　کسے گر پف زند ریشش بسوزد

کا مضمون ہو جاتا ہے۔ اب ہم نمبروار اُن کے لاطائل اعتراضات کا جواب دیتے ہیں

پہلا اعتراض

مثال ۱۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین علیہ السّلام کی شہادت پر حضرت شہربانو کا جو نوحہ لکھا ہی اُس میں لکھتے ہیں۔

تم جانو جہاں سے شہِ عالی کو لے آؤ	اکبرؑ سے میں گذری مرے والی کو لے آؤ

اعتراض (۱) "تم جانو جہاں سے" مبتذل محاورہ ہی (۲) یہ خلاف مقتضائے حال ہی کہ کوئی شریف عورت یہ کہے کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری، میرے شوہر کو جہاں سے ممکن ہو پیدا کرو۔

جواب

جواب۔ "تم جانو جہاں سے" اہلِ زبان کا محاورہ ہی۔ محاورہ شناسی مرزا دبیر

سے زیادہ اور کس شخص کو آسکتی ہے۔ رہا حضرت بانوؑ کا یہ کہنا کہ میں اپنے بیٹے سے درگذری میرے شوہر کو لے آؤ۔ ہرگز خلاف مقتضائے حال نہیں۔ اہلبیت علیہم السّلام کو حضرت امام حسینؑ کی زندگی اسقدر عزیز تھی کہ سب نے اپنے اپنے فرزندوں کو امامِ ہمام کے قدموں پر نثار کر دیا۔ پس حضرتِ بانوؑ کا یہ کہنا کہ مجکو اپنے بیٹے سے زیادہ اپنے عالی قدر شوہر کی زندگی عزیز ہے۔ بالکل مقتضائے حال کے مطابق اور اُن کی دینداری و وفاشعاری کا سچّا نمونہ ہے۔ حضرت بانوؑ کا اس موقع پر ایسا کہنا صرف اسی لحاظ سے نہ تھا کہ امام حسینؑ اُنکے شوہر تھے بلکہ وہ اُن کے امام اور دینی پیشوا بھی تھے۔

دوسرا اعتراض

مثال ۲۔

ناگہاں بالی سکینہؑ نے مچل کر یہ کہا
میرے کُرتہ کا گریباں بھی کرو چاک چچا
خوب ملبوس ہے یہ پہنیں گے ہم بھی ایسا
روٹھ جاؤنگی نہ مانوگے جو میرا کہنا

آپ جب خیمہ میں آئینگے تو چھپ جاؤنگی
پھر مجھے گود میں لوگے تو نہ میں آؤنگی

روئے نادان کی تقریر پہ عباسؑ کمال
اور کہا دل سے کہ اسکا بھی کرو ردّ سوال
بے پدر ہوگی کوئی آن میں نیک خصال
چاک اُسکا بھی گریباں کیا با حُزن و ملال

پیار جو آگیا بنتِ شہِ دیں کے اوپر
بوسے دیدے کے ملی خاک جبیں کے اوپر

اعتراض۔ حضرت عباسؑ کو امام علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبت تھی اُسکے لحاظ سے یہ امر نہایت خلافِ عقل اور خلافِ عادت ہے کہ وہ امام حسینؑ کو قبل از وقت

شہید فرض کریں اور اس بنا پر اُن کے بچے کو یتیم فرض کر کے اُس کا گریبان چاک کر دیں

جواب

جواب - حضرت عباسؑ نے جناب سکینہؑ کی ہٹ اور بچپنے کی ضد کے خیال سے اگر ایسا کیا ہو تو اس میں کچھ قباحت نہیں پائی جاتی - اور اگر حضرت عباسؑ نے ایسا سمجھا ہو کہ بعد عصر یہی یتیم ہو جائیگی - جیسا کہ اس قیامت خیز معرکہ کا بہت مدت سے علم تھا - تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا - ایک موقع پر جناب میر صاحب اعلی اللہ مقامہ نے بھی اس قسم کا ایک واقعہ نظم فرمایا ہے - اور ہماری رائے میں وہ بھی صحیح اور درست ہے - یعنی جب اعدائے دیں نے دریا کے کنارے سے خیام اہل بیتؑ کو ہٹانا چاہا اور حضرت عباسؑ سے رد و کد ہو گئی تو جناب زینبؑ نے فرمایا کہ عباسؑ سے کہدو کہ نہر کو چھوڑ کر چلے آئیں - میں ہرگز ساحل پر نہ اُتروں گی - اسکے بعد میر صاحب نے حضرت زینبؑ کی زبان سے فرمایا ہے ؎

میر صاحب کے کلام سے نظم

یاں آئے گی احمدؐ کے سفینے پہ تباہی	تقدیر نے بربادیِ سادات ہے چاہی
ہر سمت سے اُمڈے چلے آتے ہیں سپاہی	ہے ہے نہ بچے گا پسرِ شیرِ الٰہی

روشن ہے کہ شبیرؑ چراغِ سحری ہیں
اماں مجھے اس دن کی خبر دے کے مری ہیں[۳]

دیکھو حضرت عباسؑ نے تو جو کچھ بھی خیال کیا وہ اپنے دل ہی میں خیال کیا لیکن حضرت زینبؑ تو اپنے خیال کو صاف صاف علانیہ ظاہر کرتی ہیں باوجودیکہ مردوں کی بہ نسبت عورتیں فطرتاً وہم پرست ہوتی ہیں - پس کیا غلطی سے آپ میر صاحب پر بھی اعتراض کرینگے کہ حضرت زینبؑ کی محبت سے بعید ہے کہ وہ امام حسینؑ کو

۳ جلد سوم صفحہ ۵ -

قبل از وقت شہید فرض کرلیں۔ حالانکہ میر صاحب مرحوم فطرت کے بہت بڑے نکتہ داں تھے۔ پس دونوں صاحبوں نے جو واقعہ نظم فرمایا ہی اُسکا مضمون قریب قریب یکساں ہے۔ ہماری رائے میں دونوں بزرگوں نے بہت درست اور صحیح فرمایا ہی۔

ایک دوسرے موقع پر شبِ عاشور حضرت زینبؑ امام حسینؑ سے فرماتی ہیں ؎

دوسری نظیر

آتا ہے سکینہؑ کی یتیمی کا مجھے دھیان	ہر وقت بھرا گھر نظر آجاتا ہے ویران

ایک دوسرے مقام پر حضرت زینبؑ اپنے صاحبزادوں سے فرماتی ہیں ؎

تیسری نظیر

اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال	تم ہوگئے تا بہ عصر نہ عباسؑ خوشخصال
اِس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال	مجکو یقیں نہیں کہ بچے فاطمہؑ کا لال

تیسرا اعتراض

مثال ۳۔

یہ کہتی تھی کہ آئی قریں بنتِ مرتضےٰؑ	تسلیم کرکے بانوؑ نے سر کو جھکا لیا
زینبؑ پکاری بیٹھو ادب میرا ہو چکا	جس کی نہ بات پوچھیے تعظیم اُس کی کیا

سب جانتے ہیں بنتِ جنابِ امیرؑ ہوں
گھر میں تمہارے رہتی ہوں اس سے حقیر ہوں

اعتراض - یہ خیال کہ چونکہ میں اپنا گھر چھوڑ کر تمہارے گھر میں رہتی ہوں اسلیے تم لوگ مجکو حقیر سمجھتے ہو نہایت پست اور مبتذل خیال ہی جو ہرگز حضرت زینبؑ کی متانت اور وقار کے شایاں نہیں۔

جواب

جواب - اہلِ حرم جناب زینبؑ کا بہت بڑا ادب کرتے تھے پس یہ فقرہ

طنز یہ ہی نہ حقیقۃً۔ حضرت زینبؑ کو اس بات کا صدمہ تھا کہ مجھ سے پوچھے بغیر جناب بانوؑ نے علی اکبرؑ کو کیوں رخصتِ میدانِ جنگ دیدی، اسی غصہ میں انھوں نے کہدیا کہ شاید تم لوگ مجکو حقیر سمجھتے ہو۔ اس قسم کے فقرات روزمرہ مستوراتِ ہند کی معمولی بول چال میں داخل ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ الفاظ ہرگز پست و مبتذل نہیں اور نہ حضرت زینبؑ کی متانت و وقار کے خلاف ہیں۔

مثال ۴۔

محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا	نانا ہوں میں حسین علیہ السّلام کا

اعتراض۔ یہ شعر جنابِ رسولِ خدا کی زبان سے ادا کیا ہی۔ لیکن مرزا صاحب کو یہ خیال نہ رہا کہ کیا آنحضرت بھی امام حسین علیہ السّلام کا نام علیہ السّلام کہہ کر لیتے تھے۔

جواب۔ یہ امر تحقیق ہوگیا ہی کہ یہ شعر مرزا صاحب کا نہیں ہی، الحاقی ہے۔ مرزا صاحب کی جلدوں میں اسکا پتہ نہیں ہے۔ اسلیے ہم کو اسکے جواب دینے کی کچھ ضرورت نہیں۔

مثال ۵۔

یہ بات سُن کے بڑی نے گھونگٹ اُلٹ دیا	عباسؑ کو حسینؑ کو اکبرؑ کو دی صدا
صدقے میں تم پہ یاں سے سرک جاؤ اِک ذرا	تم سب کے آگے روتے ہوئے آئے گی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دلِ پاش پاش پر
جی بھر کے رولے یہ بنے قاسمؑ کی لاش پر

سرکے وہاں سے اکبرؑ و عباسؑ شاہِ دیں	لاشے کے گرد پھرنے لگی وہ دُلہن حزیں

زینبؑ سے پوچھنے یہ لگی پھر وہ مہ جبیں	اب اختیار دل پہ مرے مطلقاً نہیں

نو شاہ ایک رات کے جو قتل ہوتے ہیں
بتلاؤ اے پھوپی انھیں کیا کہہ کے روتے ہیں

اعتراض ۔ مرزا صاحب اور تمام مرثیہ گویوں نے اہلِ حرم کی عادات شرفائے ہند کی مستورات کے مطابق فرض کی ہیں ۔ اس بنا پر کبرؑا کا اپنے باپ وغیرہ سے یہ کہنا کہ تم لوگ یہاں سے سرک جاؤ میں اپنے شوہر پر نوحہ کرنا چاہتی ہوں کسقدر بے حجابی اور بے شرمی ہے ۔

جواب

جواب ۔ پہلے بند کا مہمل مضمون خود بتا رہا ہے کہ اُس میں تحریف ہو گئی ہے ۔ چنانچہ "یہ" کا اسم اشارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرت کبرؑا کا مقولہ نہیں ہو سکتا بلکہ کسی دوسرے کا قول ہے ، کیونکہ اگر اسکو حضرت کبرؑا کا مقولہ فرض کیا جائے تو یہ مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا ع جی بھر کے رولوں میں بنے قاسمؑ کی لاش پر اگر کہا جائے کہ یہ مصرع حضرت کبرؑا کا قول ہے اور "یہ" کا مشار الیہ دل ہے ۔ یعنی "یہ دل جی بھر کے روئے" تو بھی مضمون خبط ہوا جاتا ہے ، کیونکہ دل کی طرف رونے کی نسبت نہیں کی جاتی ہے ۔ بہر حال یہ بند اس طرح پر ہے ؎

یہ بات سُنکے بنتی نے گھونگٹ اُلٹ دیا عباسؑ کو حسینؑ کو بانوؑ نے دی صدا الخ

ہمارے قول کی تصدیق اس سے پہلے بند کے مضمون پر غور کرنے سے اچھی طرح ہو جاتی ہے ، جو مولف نے کسی خاص غرض سے قصداً چھپا ڈالا ہے ۔ اب ہم دونوں بندوں کو مسلسل لکھتے ہیں ؎

ناگاہ کی یہ فاطمہ کبرؑا نے گفتگو	لوگو ! کوئی ذرا مرے والی سے پوچھ لو
گھونگٹ میں اُلٹوں بال میں کھولوں ، جو تم کہو	ماں بولی اب نہ شرم کرو سر کو کھولدو

سر ننگے تم کو جانا ہے بلوائے عام میں
چھینے گا شمر اوڑھنی آکر خیام میں

یہ بات سُنکے بڑی نے گھونگٹ اُلٹ دیا
صدقے میں تم پہ یاں سے سرک جاؤ اک ذرا

عباسؑ کو حسینؑ کو بانوؑ نے دی صدا
تم سب کے آگے روتے ہوئے آئے گی حیا

ماتم کا ہے ہجوم دلِ پاش پاش پر
جی بھر کے رولے یہ بنے قاسمؑ کی لاش پر

ایک اور اعتراض

دونوں بندوں کے مفہوم پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ یہ حضرت بانوؑ کا مقولہ ہی نہ حضرت کبرؑا کا۔ پھر مولف لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے اس واقعہ کو ایک اور مرثیہ میں لکھا ہے اور وہاں توحد کر دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا
ہم کچھ کہیں جو مانیے اے شاہِ کربلا

کبرؑا نے ہاتھ باندھ کے تب شاہ سے کہا
احسان ہوگا لاش کو رکھدیجیے ذرا

بالیں پہ بیٹھیں سر پہ ذرا خاک ڈال لیں
ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں

جواب

جواب - یہ بند مرزا صاحب کے اُس مرثیہ میں دیکھے جاتے ہیں جسکا مطلع ہی - ع - خورشید کا طلوع ہے برجِ خیام سے - لیکن اصل مرثیہ ۶۲ بند پر ختم ہوگیا ہی - اور سات بند جن میں کا پہلا بند اس مصرع سے شروع ہوتا ہی - ع ناگاہ شہ نے لاش اُٹھائی بصد بکا - ملحقات سے ہی - نہیں معلوم یہ بند کس شخص کے اس میں ملحق ہوکر اہلِ مطبع کی غفلت سے جلد میں طبع ہوگئے ہیں - حقیقت میں یہ بند نہایت مہمل اور قابلِ اعتراض ہی - اور اسکا مصنف ایسا شخص معلوم ہوتا ہی جو مبتذل خیالات

اور محدود اور پست قابلیت رکھنے کے علاوہ شرفا کے عادات و اطوار سے بالکل نابلد ہی۔ شاعری کی اصلی بنیاد یہ ہی کہ قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی قوتِ ممیزہ کی محکوم اور مطیع رہے اور خیالات حقیقتِ واقعیہ و اصلیہ پر مبنی ہوں نہ یہ کہ ذہن نے جو کچھ اختراع کیا اور طبیعت میں جو بے سروپا۔ ناممکن۔ اور فوق العادت خیالات پیدا ہو گئے اُن کو نظم کا لباس پہنا کر لے آئے۔ پس ان مہمل اشعار کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرنا نہایت جرات۔ بیباکی اور سوء ادبی ہے۔

مثال ۶۔

جھگڑا اعتراض

کہا سجّادؑ سے کبرؑا نے یہ اُسدم رو رو	بھائی صاحب مرے دولہ کو بھی اب دفن کرو
تا مجاور میں بنوں کھول کے اپنے سر کو	کہا کبرؑا سے یہ سجّادؑ حزیں نے کہ چلو

ٹکڑے لاشوں کے بہم بادلِ غمناک کریں
قاسمؑ ابنِ حسنؑ کو بھی تہِ خاک کریں

اعتراض ۔ ایک رات کی بیاہی عورت کا اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے دولہ کو بھی دفن کرو کسقدر خلافِ عادت ہی۔

جواب

جواب ۔ شاید یہ امر ہندوستان کی عورتوں کے مراسم کے خلاف ہو۔ اور ہندوستان کی عورتوں کے رسوم کے خلاف تو یہ بھی ہی کہ ایک رات کی بیاہی اپنے شوہر کی لاش پر اپنے بزرگوں کے سامنے بین کرے جسکو میر صاحب اور مرزا صاحب اور تمام مرثیہ گویوں نے نظم کیا ہی، لیکن رسومِ نسوانِ عرب کے لحاظ سے خلاف نہیں ہے اسی طرح حضرت کبرؑا کا اپنے بھائی سے یہ کہنا کہ میرے شوہر کو بھی دفن کر دو۔ رسومِ عرب کے مطابق ہرگز خلافِ عادت نہیں۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ مرثیوں میں کہیں مراسمِ ہند

اور کہیں مراسم عرب کے مطابق تخیل ہوئی ہے۔ ہر جگہ کسی مرثیہ گو نے ایک ہی التزام نہیں رکھا۔

مثال ۷۔

ساتواں اعتراض

زینبؑ نے روکے بانوئے مغموم سے کہا
اور مر گئی تو خیر جو اللہ کی رضا

بے آس ہو نہ بھابی ہی غش میں یہ مہ لقا
اب اسکے رفع غش کی یہ اسوقت ہے دوا

ہی عاشقِ حسینؑ یہ پیاری حسینؑ کی
اب غل کرو کہ آئی سواری حسینؑ کی

اعتراض ۔ تسکین اور تسلّی دینے میں یہ کہنا کہ خیر مر گئی تو کیا کروگی جو اللہ کی رضا۔ کسقدر ناموزوں اور خلافِ آدمیت ہے۔

جواب

جواب ۔ حضرت زینبؑ کو ابتدا ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ سکینہؑ نے وفات پائی۔ لیکن اس جانکاہ حادثہ کی فوراً حضرت بانوؑ کو اطلاع دینا نامناسب اور خلافِ مصلحت تھا۔ اسلیے پہلے تو ماں کے دل کو اس طرح سمجھایا کہ میرے خیال میں غالباً سکینہؑ کو غش آگیا ہی۔ لیکن اگر یہ غشی نہو اور اس لاڈلی نے انتقال کیا ہی تو صبر و شکر کرکے رضاے خدا پر سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔ نہیں معلوم اس میں کیا امر ناموزوں اور خلاف آدمیت ہے۔ حاسد کی نگاہ میں اچھی سے اچھی چیز بھی ناموزوں معلوم ہوتی ہی۔

مرزا صاحب پر جو مولّف نے اعتراضات کیے ہیں کہ وہ کسی مضمون کو مقتضائے حال کے موافق نہیں لکھ سکتے اور اس کی یہ چند مثالیں دی ہیں اُن کا جواب تو ہم مفصّل طور پر لکھ چکے۔ اسکے بعد شاید یہ کہنا بے محل نہو گا کہ اگر ان کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی معمولی فروگذاشتوں سے کسی کا کلام خالی نہیں ہو سکتا۔

معترض نگاہیں اچھے سے اچھے شاعر کے کلام میں بھی ایسی دو چار مثالیں تلاش کر سکتی ہیں۔ مولف نے مرزا صاحب کے وسیع ذخیرۂ کلام سے یہ سات مثالیں بڑی توجہ سے تلاش کی ہیں۔ لیکن اگر ایسی ہی جانفشانی اور چھان بین کیجائے تو شاید میر صاحب مرحوم کا کلام بھی ان سے خالی نہوگا۔ چنانچہ اس قسم کی چند مثالیں میر صاحب کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں۔ ان مثالوں کے تحریر کرنے سے اسکے سوا ہرگز کچھ مطلب نہیں ہے کہ جب میر صاحب جیسے فصیح البیان اور فطرت کے نکتہ شناس شاعر نے ان باتوں کو جائز قرار دیا ہے تو مرزا صاحب کو بھی معذور سمجھ لینا چاہیے اور مان لینا چاہیے کہ یہ مسامحات ہرگز قابلِ گرفت اور لائقِ اعتراض نہیں۔

میر انیس کے کلام سے اسی قسم کی مثالیں بطور نظیر

مثال ۱۔

پہلی مثال

ناگہ سُنا جو زوجۂ عباسؑ نے یہ حال	مارے خوشی کے ہوگیا چہرہ کا رنگ لال
ہمراہ لے کے بیٹے کو اپنے وہ خوشخصال	آئی حضورِ سرورِ ذی قدر و ذی کمال

پہلے تو بڑھ کے شاہِ امم کی بلائیں لیں
پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کے عَلَم کی بلائیں لیں

جُھک کر قدم پہ شہ کے یہ بولی وہ خوش سیر	کونین میں کیا مرے والی کو نامور[1]

یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ میر صاحب اور تمام مرثیہ گویوں نے اہلِ حرم کے عادات اور مراسم اکثر ہندوستان کے شرفا کی مستورات کے مطابق فرض کیے ہیں۔ چنانچہ عروسی۔ شادی اور موت کے متعلق جس قسم کے مراسم اور عادات یہاں مروج ہیں وہی تمام مرثیوں میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی شریف عورتیں اپنے

[1] جلد اوّل صفحہ ۱۵۱۔

شوہر کے بڑے بھائی سے ہمیشہ پردہ کرتی ہیں۔ گفتگو تو درکنار اُن کے سامنے چلنا پھرنا بھی معیوب سمجھتی ہیں۔ اس بنا پر زوجۂ حضرت عباسؑ کا امام حسینؑ کی بلائیں لینا اور یہ کہنا کہ آپ نے میرے شوہر کو علم دیکر سرفراز کیا۔ رسومِ عرب کے مطابق تو بہت صحیح ہی لیکن رسم و رواجِ ہند کے خلاف معلوم ہوتا ہی۔

مثال ۲۔

دوسری مثال

کھولو اسے کنگنے سے بس اب ہاتھ اُٹھایا	کیوں ہائے یہ کنگنا مجھے اماں نے پہنایا
بیٹی کو رنڈاپے کی مصیبت میں پھنسایا	کیا ان کا بگاڑا جو دُلہن مجھ کو بنایا[1]

ان اشعار میں ظاہر کیا ہی کہ جب جناب قاسمؑ نے رزمگاہ کو جانا چاہا تو حضرت کبرٰاؑ کو نہایت قلق ہوا۔ اور آنکھوں کو رنڈاپے کا سامان نظر آگیا۔ اسی تشویش میں وہ حضرت سکینہؑ سے کہتی ہیں کہ افسوس یہ کنگنا مجھے اماں نے کیوں پہنایا اور میں کیوں دُلہن بنی تھی۔ اس مقصد کے اظہار کے واسطے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہی وہ کسیقدر رسومِ ہند کے خلاف ہی۔ یہ خیال کہ ماں نے اپنی بیٹی کو رنڈاپے کی آفت میں مبتلا کر دیا اور میں نے اماں کا کیا بگاڑا تھا جو اُنھوں نے مجکو دُلہن بنا کر دیدہ و دانستہ ایک جانفرسا مصیبت میں پھنسا دیا، حضرت کبرٰاؑ کی زبان سے اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ شرفا کی لڑکیوں سے بعید ہی کہ وہ اپنی شادی بیاہ کے معاملات میں اپنے والدین کو ملزم ٹھہرا کر ایسے طعنے دیں۔

مثال ۳۔

تیسری مثال

یہ سُنتے ہی اُس پیاسی میں اک جان سے آئی	فضہ گئی اور دوڑ کے مشکیزے کو لائی
یوں کہنے لگی رو کے وہ شبیرؑ کی جائی	میں رن میں چلی آؤں گی گر دیر لگائی

[1] ۱/۸

جلد آؤنگا دریا سے، یہ فرما کے سدھارو
جاتے ہو تو آنے کی قسم کھا کے سدھارو

عباسؑ نے کی عرض کہ دریا نہیں کچھ دور
مشکیزہ بھرا۔ اور پھرے خرم و مسرور
اور آگے مری جان جو اللہ کو منظور
مانع ہوئی آنے میں اگر موت تو مجبور

تقدیر سے کیا زور ہے سقائے حرم کا
وعدہ کریں کیونکر کہ بھروسا نہیں دم کا

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم سن۔ ستم زدہ۔ پیاس کی ماری بچی سے جسکا کثرتِ عطش سے ہونٹوں پر دم آ رہا ہے اور جسکو تسکین اور تشفّی کی سخت ضرورت ہے، یکبارگی یہ کہدینا کہ مشکیزہ تو لیے جاتے ہیں لیکن اگر موت آگئی تو مجبوری ہے۔ یا تقدیر سے ہمارا کیا زور ہے۔ یا پانی لانے کا ہم وعدہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ مناسب نہیں۔ حضرت عباسؑ کو جناب سکینہؑ سے جو دلی محبت تھی اور جسکا اظہار ہر جگہ میر صاحب نے بھی کیا ہے۔ اُس کے لحاظ سے یہ کیقدر مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پیاری بھتیجی کا دل توڑ دیں۔ اور اُن کی امیدِ موہوم کا جو قدرے باعثِ تسکین تھی، اس طرح کے مایوسانہ کلمات سے خاتمہ کر دیں۔ باوجودیکہ بعض مرثیوں میں میر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عباسؑ جناب سکینہؑ کی دلشکنی کی خاطر خود قسم کھانے پر آمادہ ہیں کہ ہم ضرور تمھارے واسطے پانی لائیں گے۔ چنانچہ ایک موقع پر لکھا ہے ؎

بے مشک بھرے نہر سے آئیں تو قسم لو
دریا سے ہم آگے کہیں جائیں تو قسم لو

مثال ۴۔

بھائی کو وہ پیارے ہیں انھیں بھائی ہے پیارا
عاشق کہیں معشوق سے کرتے ہیں کنارا

یہ ننگ علمدار کو ہوگا نہ گوارا
قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارا

لیکن فلک اس طرح سے گرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر
اسکا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر
رخ زرد تھا دل کانپتا تھا سینہ کے اندر
دھڑکا تھا کہ اب کیا کہینگے آن کے سرور

یارب نہ سُنوں میں کہ جُدا ہوگئے عبّاسؑ
یہ غُل ہو کہ بھائی پہ فدا ہوگئے عبّاسؑ

دشمنوں نے یہ جھوٹی خبر اُڑادی تھی کہ عبّاسؑ امام حسینؑ کو چھوڑ کر ہم سے مل گئے۔ اس خبر کو سُنکر زوجۂ حضرت عبّاسؑ کو نہایت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُسی حالت میں اُن کی زبانی یہ اشعار میر صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ حضرت عبّاسؑ کو امام علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبّت تھی جسکا اظہار تمام مرثیہ گویوں نے کیا ہے اُس کے لحاظ سے یہ امر قدرے خلاف واقعہ ہے کہ خود حضرت عبّاسؑ کی بیوی اپنے شوہر کی وفاداری کی جانب سے مشتبہ ہو کر یہ کہنے لگیں۔

ع۔ قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارا

ع۔ دھڑکا تھا کہ اب کیا کہیں گے آن کے سرور

ع۔ یارب نہ سُنوں میں کہ جُدا ہوگئے عبّاسؑ

ان اشعار کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبّاسؑ کی زوجہ متردّد ہیں کہ کہیں میں یہ نہ سُنوں کہ عبّاسؑ جُدا ہوگئے۔ حالانکہ اُن کا اعتقاد اور یقین

ایسا مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیے کہ کسی فقرے سے اس خبر کی صداقت کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ حتیٰ کہ بہ فرضِ محال بھی اسکو ماننے پر طیّار نہ ہوں۔

اسی طرح مرزا صاحب اور میر صاحب اور تمام مرثیہ گویوں کے کلام میں اس قسم کے مضامین مِل سکتے ہیں۔ پس مرثیوں کے مختلف مضامین اور گوناگوں واقعات پر لحاظ کرکے مرثیہ گویوں کو اس امر میں معذور اور مجبور سمجھنا چاہیے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے

اور اشعار

میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے اور اشعار

متحد المضمون مرثیے

اس موقع پر مولف لکھتے ہیں کہ "میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کا صحیح تر اور آسان طریقہ یہ ہی کہ دونوں صاحبوں کے ہم مضمون مرثیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ چونکہ مرثیے کا موضوع صرف چند معیّن واقعات ہیں اسلیے اگرچہ دونوں صاحبوں کا اندازِ شاعری بالکل الگ الگ ہی، تاہم واقعات اور مضامین میں ہر جگہ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اسکے ساتھ یہ بھی نظر آجاتا ہی کہ دونوں حریفوں نے اکثر مرثیے۔ اور بند۔ اور متفرق اشعار ایک دوسرے کے مقابلے میں لکھے ہیں۔ یہانتک کہ بعض بعض بندوں میں مضمون، ردیف، اور قافیے تک مشترک ہیں" آخر میں پھر افسوس کرتے ہیں کہ "ان موقعوں پر یہ پتہ نہ چل سکا کہ ابتدا کس نے کی اور جواب کس نے لکھا" لیکن اسکے بعد پھر رگِ تعصّب متحرک ہوتی ہی اور لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب ہی زیادہ تر مقابلہ کا قصد کرتے تھے اور اس کی دلیل میر صاحب کے اُنھیں چند فخریہ اشعار کو قرار دیتے ہیں جو بار بار لکھ چکے ہیں۔ یعنی

ع۔ لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار

یا۔ ممکن نہیں دزدانِ مضامیں سے نجات

اگر اسی قسم کے اشعار پر اس قضیہ کا فیصلہ منحصر ہی تو ایسے اشعار مرزا صاحب کے

کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں		اُن مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے
	یا	
ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی		ہاں قلزمِ شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی

بہرحال اس بحث کو ہم گذشتہ اوراق میں صفحہ ۲۴ پر مفصّل طور پر لکھ چکے ہیں وہاں اس دلچسپ قضیہ کو دیکھنا چاہیے۔

اب مولف متحد المضمون مرثیے اور اشعار درج کرتے ہیں۔ اس موقع پر ہم کو جواب دینے کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہر شاعر کا کلام مختلف مدارج کا ہوا کرتا ہی، اسلیے ایک شاعر کا عمدہ کلام انتخاب کرنا اور اُسکے مقابلہ میں دوسرے شاعر کا سُست اور معمولی کلام پیش کر دینا کوئی ناممکن بات نہیں ہے مولف نے جو اس ترکیب سے میر صاحب کو فضیلت دی ہی۔ اسی طرح دوسرا شخص شاید مرزا صاحب کو بھی ترجیح دے سکے۔ ہمارے اعتقاد میں میر صاحب اور مرزا صاحب مرثیہ گوئی میں وحیدِ عصر اور ایک کا ایک جواب تھے۔ اور دونوں صاحب اس فن میں یکتا اور بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہی کہ کسی شاعر کا کلام بلحاظِ بندش و برجستگی و صفائی ایک پایہ کا نہیں ہوتا، میر صاحب اور مرزا صاحب بھی اس کلّیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ ان صاحبوں کے کلام میں بھی دو درجے نظر آتے ہیں (۱) یہ کہ کسی مضمون اور مطلب کو میر صاحب نے اعلیٰ درجہ پر ادا کیا ہی اسلیے وہ مرزا صاحب سے بڑھ گئے ہیں (۲) یہ کہ کسی خاص مضمون کو مرزا صاحب صفائی اور برجستگی سے لکھ گئے ہیں، اس لیے ایسے موقعوں پر اُن کو ترجیح دیجا سکتی ہی۔

کسی مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب کی فوقیت

امر اوّل یعنی جہاں کسی مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب مرحوم کا کلام بڑھ گیا ہے، اُسکو مولف نے اپنی کتاب میں ظاہر کیا ہی اور اپنی رائے کے مطابق وجوہِ ترجیح بھی ظاہر کر دیئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر میر صاحب کے کلام کو نہایت ترجیح حاصل ہی، لیکن مولف مذاقِ سلیم کی کمی کی وجہ سے اُن مقامات کا انتخاب کرنے سے عاجز رہے۔ کاش ہم کو فرصت ہوتی تو اس قسم کا میر صاحب کا نفیس اور لاجواب کلام دکھا کر ظاہر کر دیتے کہ انتخاب اسکا نام ہے۔ دونوں صاحبوں کا مشترک مضامین کا کلام انتخاب کرنے کے موقع پر مولف نے نہ صرف مرزا صاحب پر ظلم کیا ہے بلکہ وہ میر صاحب کی بھی کما حقّہ خدمت نہ کر سکے۔ مرثیوں کے دیکھنے پر بہت سے مقامات ایسے مِل سکتے ہیں جہاں کسی مضمون کے ادا کرنے میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر فوق حاصل ہے۔ اگر مولف ذوقِ سلیم سے کام لیکر اُن مقامات کو صحیح طور پر لکھدیتے تو ہم بسر و چشم تسلیم کر لیتے اور جواب دینے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ لیکن اُنھوں نے جو اس غرض کے واسطے یہاں میر صاحب اور مرزا صاحب کا کلام مقابلے میں انتخاب کیا ہی اُس میں ہم کو گونہ اختلاف ہی، خاصکر اسوجہ سے کہ اُنھوں نے تعصّب کی وجہ سے مرزا صاحب کے کلام پر غلط اور بیجا اعتراضات کیے ہیں اور بعض مقامات پر شرمناک تحریف کر گئے ہیں۔ اُن کی اسی ہٹ دھرمی نے ہم کو آمادہ کیا کہ اس مقام پر بھی اُن کی قابلیت اور انصاف کی قلعی کھول کر ناظرین کو اس بات کے جانچنے کا موقع دیں کہ قابل مولف نے اس کتاب کے لکھنے میں کہانتک دیانت و انصاف سے کام لیا ہے۔ اور وہ ایک شخص کا جامہ پہن کر یک طرفہ کارروائی کرتے وقت کیسے بیخود اور متوالے ہو جاتے ہیں۔ اب ہم اُن مقامات پر بحث کرتے ہیں جہاں کسی

مضمون کے ادا کرنے میں مولف نے اپنے مذاق کے مطابق میر صاحب کو فوقیت دی ہے لیکن وجوہِ ترجیح بیان کرنے میں ناکام رہ کر ہر مقام پر متعدد غلطیاں کی ہیں۔

پردے کا اہتمام

میر انیس

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہِ ابرار
روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فرّاشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

باہر حرم آتے ہیں رسولؐ دوسرا کے
شقّہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے
آتا ہو ادھر جو وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے

مریمؑ سے سوا حق نے شرف انکو دیئے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

مرزا دبیر

درباں عصا اُٹھا کے بڑھے جانبِ یسار
دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار
آئے ادھر نہ اب، نہ کوئی جائے زینہار

آوازِ غیر سُنکے وہ اندیشہ کرتی ہیں
آہستہ بولو دخترِ زہراؑ اُترتی ہیں

عفّت کے جتنے مرتبے خیر النسا نے پائے
وہ ماں کے بعد دخترِ مشکل کشاؑ نے پائے
ہاں ہاں مسافرو نہ کوئی غل مچانے پائے
ناقے پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حُسنِ ادب یہی ہے کہ حق کو پسند ہو
وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو

اعتراض

اعتراض (۱) میر صاحب نے پردے کے اہتمام اور لوگوں کے ہٹانے اور روکنے کو حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہی جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کے علاوہ، اصلی واقعہ کی مطابقت ہوتی ہے، کیونکہ تمام معزز خاندانوں میں پردے کا اہتمام خود خاندان کے ممبر کیا کرتے ہیں۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب نے یہ کام بالکل دربانوں، نقیبوں، اور لونڈیوں کے سپرد کر دیا ہی، جس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہی کہ یا تو گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں، یا تھا تو اُسکو عورتوں کی چنداں پروا نہ تھی۔ (۲) پردے کے اہتمام میں نقیبوں کا کیا کام ہی۔ (۳) لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہی کہ ادب و شایستگی نہیں پائی جاتی۔

جواب

جواب (۱) جس طرح میر صاحب نے پردے کے اہتمام کو خاندان کے ممبروں کے سپرد کیا ہی، اسی طرح کا التزام مرزا صاحب نے بھی رکھا ہی۔ میر صاحب نے پردے کا اہتمام حضرت عباسؑ کی طرف منسوب کیا ہی تو مرزا صاحب نے یہ اہتمام خود حضرت امام حسینؑ۔ جناب عباسؑ۔ جناب اکبرؑ۔ جناب قاسمؑ۔ چاروں کی جانب منسوب کیا ہی، جس سے حضرت زینبؑ کی عظمت و شان کا اور بھی زیادہ اظہار ہوتا ہی۔ مگر افسوس ہی کہ مولف نے اپنی قدیمی حق پوشی و ضمیر فروشی کا نمونہ دکھا کر وہ بند بددیانتی سے بالکل اُڑا دیا ہے۔ اب ہم اُس بند کو لکھتے ہیں ؎

آوازِ دورباش کا ناگاہ غل اُٹھا
اور خیموں میں اُترنے لگی آلِ مصطفےٰ

ڈیوڑھی سے پر کجاوۂ زینبؑ جہاں ملا
خود اہتمام کرنے لگے شاہِ کربلا

مولف کی بیجا کارروائی کی دوسری مثال

روکی قنات اکبرؑ و قاسمؑ نے آن کر عباسؑ گرد پھرنے لگے نیزہ تان کر	

اسکے بعد وہی دونوں بند ہیں جو مولف نے درج کیے ہیں۔ ناظرین اس موقع پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولوی شبلی صاحب کے دل میں مرزا صاحب کی جانب سے کسقدر کاوش ہے کہ اعتراض کرنے کی غرض سے وہ قابل شرم کارروائی کی جو اُن کی شان سے نہایت بعید ہے۔ چونکہ مرزا صاحب کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے اسلیے مولف کوئی سچا نقص تلاش نہ کر سکے اور مجبوراً اس قسم کی دھوکہ دہی سے کام لینا پڑا۔ حقیقت میں مرزا دبیر پر غلط اور بے سروپا اعتراض اس سے بہتر پیرایہ میں نہیں ہو سکتا تھا جو آپ نے اختیار کیا ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

ایک دوسرے موقع پر مرزا صاحب نے پردے کا اہتمام اس طرح نظم کیا ہے ؎

سوار کرنے کو خواہر کے آئے شاہِ ہدا بغل میں ہاتھ دیئے باؤنے بلطف و عطا	قناتیں روک کے عباسؑ نے کیا پردا علیؑ کی بیٹی کو اس شان سے سوار کیا[1]

دیکھیے اس موقع پر بھی خاندان کے ممبروں نے پردہ کا اہتمام کیا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے ؎

یہ سُن کے اُٹھا حیدرِ کرّار کا پیارا عباسؑ نے پردا کیا اکبرؑ نے اُتارا	سامان اُترنے کا مہیا کیا سارا شہ بولے بہن حال تو ظاہر ہے ہمارا[2]

(۲) مرزا صاحب نے جو لکھا ہے۔ ع۔ دہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار۔ ع آ آ کے در پہ لونڈیاں چلائیں بار بار۔ اسپر آپ لکھتے ہیں کہ پردے کے اہتمام میں نقیبوں کا

[1] جلد ۷ صفحہ ۱۵۔ [2] جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۶۔

کیا کام ہی۔ لونڈیوں کے غل مچانے سے ثابت ہوتا ہی کہ ادب اور شائستگی نہیں پائی جاتی۔ اسکا جواب یہی ہی کہ بطور نظیر میر صاحب مرحوم کے اشعار پیش کر دیئے جائیں، میر انیس فرماتے ہیں ؎

ہر محل و ہودج پہ گھٹاٹوپ پڑے ہیں	پردے کی قناتیں لیے فرّاش کھڑے ہیں
فرّاشوں کو عبّاسؑ پکارے یہ بتکرار	پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار

دیکھو میر صاحب مرحوم نے تو پردہ کرنے کا اہتمام اسلیے فرّاشوں کے سپرد کیا ہی کہ پردے کی قناتوں کی درستی اور فرش و فروش کے انتظام کا اُن سے خاص تعلّق ہی اور مرزا صاحب نے پردے کے متعلق لوگوں کی آمد و رفت روکنے اور اُن کو ہٹانے بچانے کا کام نقیبوں سے لیا ہی کیونکہ اُمرا کے ہاں یہی کام نقیبوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔

لونڈیوں کے چلّانے کا جواب یہ ہی کہ میر انیس صاحب بھی فرماتے ہیں۔ ع

چلّاتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار۔ مولوی شبلی صاحب غور فرمائیں کہ اب ان دونوں مصرعوں میں کیا فرق باقی رہا۔

دبیر	آ آ کے در پہ لونڈیاں چلّائیں بار بار	انیس	چلّاتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار

تعجّب ہی کہ دربانوں کا کرخت اور سخت صداؤں سے چلّانا تو آپ کو مرغوب ہوا لیکن بیچاری لونڈیوں کی نرم اور رسیلی آواز آپکے کانوں کو ایسی ناگوار معلوم ہوئی۔ عورتوں کے پردے کے اہتمام میں بہ نسبت دربانوں کے غل مچانے کے لونڈیوں کا چلّانا حق بجانب ہے۔

مرزا صاحب کے اشعار کی خاص بلاغتیں

مرزا صاحب کے اشعار کی خاص بلاغتیں

صفائی اور روانیِ کلام کے علاوہ میر صاحب نے بھی درحقیقت پردے کا اہتمام خوب نظم فرمایا ہی، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس موقع پر مرزا صاحب کے اشعار میں بلاغت کے چند جدید نکات نظر آتے ہیں۔

اول

(۱) یہ کہ میر صاحب اعلی اللہ مقامہ نے پردے کا اہتمام صرف حضرت عباسؑ کے سپرد کیا ہی، بخلاف اسکے مرزا صاحب نے یہ اہتمام خود حضرت امامِ ہمام۔ اور خاندان کے تمام ممبروں کی طرف منسوب کیا ہی جس سے اہلِ حرم کی عظمت و شان کا اور بھی زیادہ اظہار ہوتا ہی۔ گویا خاندان کا ہر ممبر اس ضروری اہتمام میں سرگرم تھا۔ (۲) میر صاحب نے اظہار فرمایا ہی کہ حضرت عباسؑ کے علاوہ جو کام کرنے والے ملازم تھے وہ سب مرد تھے لیکن مرزا صاحب نے لکھا ہی کہ مردوں کے علاوہ لونڈیاں بھی پردے کے اہتمام میں مصروف تھیں جو اس موقع کے واسطے مردوں سے زیادہ موزوں اور مناسب ہوتی ہیں (۳) میر صاحب مرحوم نے فقط اسی امر کا انتظام کیا ہی کہ کوئی غیر مرد اُدھر سے گذرنے نہ پائے تاکہ اہلِ حرم پر نامحرم کی نظر نہ پڑے۔ لیکن مرزا صاحب نے علاوہ اس معمولی اہتمام کے اس امر کا بھی انتظام کیا ہی کہ نامحرم بہ آواز بلند کلام بھی نہ کرنے پائیں تاکہ عصمت مآب اہلِ بیتؑ نبوی کے کانوں میں غیر مرد کی آواز بھی نہ آنے پائے جو پردے کے اہتمام میں انتہا درجہ کا احتیاط، اور ایسے عالی منزلت خاندان کی عظمت و شان کے لائق و شایاں ہی۔ دیکھو اس مصرع میں اہلِ بیتؑ نبوی کی عصمت۔ و تقدس۔ و جلال

دوم

سوم

کی کیسی موثر تصویر کھینچ دی ہے۔ ع۔ آہستہ بولو دختر زہرا اُترتی ہیں۔ (۴) میر صاحب نے فقط ناقہ پر گذرنے والوں کی بندش کی ہے، لیکن مرزا صاحب نے میر صاحب کی طرح ناقہ والوں کی ممانعت کے علاوہ اس مصرع میں پردہ کے اہتمام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ع وہ بیٹھ جائے جسکا کہ قامت بلند ہو۔

حضرت صغریٰ کی آزردگی

صغریٰ کی آزردگی

صغرا نے کہا صاحبو کیا کرتے ہو گفتار	اک بات پکڑ لی کہ یہ بیمار ہے بیمار
شاید کہ سفر ہی میں شفا دے مجھے غفار	یاں کون خبر لے گا مری یہ در و دیوار

مرزا صاحب

اتنی بھی تو طاقت نہیں جو اُٹھ کے کھڑی ہوں
اے لوگو میں کیا آپ سے بیمار پڑی ہوں

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ تمام اہلِ حرم کو ساتھ لیے جاتے ہیں اور حضرت صغرا کو بوجہ علالت چھوڑے جاتے ہیں اسپر وہ گریہ وزاری کرتی ہیں حضرتؑ اور گھر کی عورتیں سمجھاتی ہیں کہ تم بیمار ہو مصائبِ سفر برداشت نہیں کر سکتی ہو۔ صغرا جواب دیتی ہیں اسی مضمون کو میر انیس صاحب ادا کرتے ہیں ؎

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوتا نہیں بیمار	ہے کونسی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
زندہ ہوں پہ مُردہ کی طرح ہو گئی دشوار	کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اسکا
وہ آنکھ چُرا لیتا ہے مُنہ تکتی ہوں جسکا

اعتراض

اعتراض ۔ مرزا صاحب نے بھی عمدگی سے اس واقعہ کو ادا کیا ہے لیکن میر صاحب کے طرزِ بیان میں جو حسرت رنج اور بیکسی ہے وہ مرزا صاحب کے ہاں نہیں۔

(۱) "اک بات پکڑلی" عامیانہ اور سوقیانہ طرزِ گفتگو ہی (۲) ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں (۳) یہ کہنا کہ مجکو اُٹھنے کی بھی طاقت نہیں صغرا کی خواہش پر ناکامی کا اثر پیدا کرتا ہی کیونکہ جب اُٹھنے کی طاقت نہیں تو وہ سفر کیونکر کر سکتی ہیں۔ اسی بنا پر میر انیس نے جہاں یہ واقعہ باندھا ہی صغریٰ کی زبان سے کہا ہی ؎

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت	تپ کی بھی ہی شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت	پانی کی بھی خواہش ہی غذا کی بھی ہی رغبت

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہی
اب تو مرے مُنہ کا بھی مزہ تلخ نہیں ہی

دیکھو حضرت صغریٰ کس کس طرح سے بیماری کی تخفیف اور قریب الصحۃ ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

جواب

جواب۔ (۱) اک بات پکڑلی۔ اہلِ زبان کا محاورہ ہی۔ اور لکھنؤ وغیرہ میں مستعمل ہی پس اہلِ زبان کے محاورات پر اعتراض کرنا آپ کا کام نہیں (۲) ٹیپ کا پہلا مصرع تو چوتھے مصرع کے متعلق ہی۔ یعنی یہاں کیا در و دیوار میری خبر لینگے مجکو اتنی بھی تو طاقت نہیں کہ اُٹھ کر کھڑی ہو جاؤں ایسی حالت میں مجکو کسی خبر لینے اور تیمارداری کرنے والے کی کسقدر ضرورت ہی۔ اور ٹیپ کا دوسرا مصرع، بند کے دوسرے مصرع کا جواب ہے، یعنی تم نے جو اک بات پکڑلی کہ یہ تو بیمار ہی تو کیا میں آپ سے بیمار پڑی ہوں جو تم لوگوں کو اسقدر نفرت اور بیزاری ہی (۳) اعتراض سوم کا جواب یہ ہی کہ دونوں صاحبوں نے حضرت صغریٰ کے مطلب و مقصد، اور اظہارِ خیالات کا الگ الگ انداز رکھا ہی۔ میر صاحب کا پیرایہ یہ ہے کہ حضرت صغرا مرض کی تخفیف اور اپنے قریب الصحۃ ہونے کا یقین دلاتی

ہیں تاکہ اُن کو ہمراہ لے جانے میں جو عذر مانع ہے وہ جاتا رہے اور حضرت امام علیہ السّلام اُن کو ساتھ لے جانے پر رضامند ہو جائیں۔ اس مطلب کو اُنھوں نے حقیقت میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے یہ انداز رکھا ہی کہ حضرت صغریٰ نے اپنے آپ کو مریض اور علیل، بلکہ قریبِ مرگ ثابت کریں تاکہ والدین کو یہ خیال ہو کہ اس حالت میں ایسی مریضہ کو تنہا چھوڑ دینا بالکل نامناسب ہے۔ کیونکہ جس مریضہ کو اُٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہو اُسکو ایک ہمدرد تیمار دار کی سخت حاجت ہے، اور وہ سوا ماں باپ کے اور کون ہو سکتا ہی، اسلیے یا تو بزرگوں میں سے کوئی ٹھہر جائیں یا بیمار کو اپنے ساتھ لے جائیں مرزا صاحب نے اس بیان کے متعلق اپنے ہر مرثیہ میں یہی پہلو مدِّ نظر رکھا ہی۔ چنانچہ اسی بنا پر ایک دوسرے مرثیے میں جہاں یہ واقعہ باندھا ہے۔ حضرت صغریٰ کی زبان سے کہا ہے۔ ؎

یک بیک میرے مقدّر کا بگڑنا دیکھو سانس کا بات کے کہنے میں اُکھڑنا دیکھو	پاؤں پڑتی ہوں، مرا پاؤں رگڑنا دیکھو حال یہ، اُس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو

غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہی بیٹی کو اسوقت میں بابا چھوڑیں

ہمارا خیال اس بند میں اَور زیادہ صاف ہو جاتا ہی ؎

ہوش میں آئی جو صغرا تو کیا شہ نے سوال بولی وہ میں بھی تو بابا یہی کرتی ہوں سوال	اس نقاہت پہ مری جان سفر کا ہی خیال چھوڑ و تنہا اُسے تم گھر میں، ہو جسکا یہ حال

بعد اگر آپ کے جانے کے غش آتا مجکو
کون اس پیار سے گودی میں اُٹھاتا مجکو

دیکھو حضرت **صغرؑ** کس کس طرح اپنی نازک حالت یاد دلاکر التجا کرتی ہیں کہ ایسے مریضوں کو تنہا چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

حقیقت میں دونوں صاحبوں نے اپنے اپنے انداز کو خوب نباہا ہے۔ تعجب ہے کہ مولف کی نارسا طبیعت اس نکتہ کو نہ پہونچی کہ دونوں صاحبوں کی غرض و غایت جدا جدا ہے وہ دو متضاد اور باہمدگر مختلف خیالات کو ملاکر دونوں میں باہم مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس! ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اصغرؑ سے خطاب

حضرت اصغرؑ سے خطاب

دبیر

پھر ہاتوں پہ **اصغرؑ** کو رکھا کرکے یہ زاری
ماں نے کہا لو گود میں آتے ہیں یہ واری

لٹکا دیئے ہاتھ اُسنے ہمک کر کئی باری
اصغرؑ کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری

پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لوں
آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

انیس

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ و زاری
وہ کانپتے ہاتوں کو اُٹھا کر یہ پکاری

اصغرؑ مرا روتا ہے صدا اُس کے تمہاری
آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغرؑ مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پہ وہ سخن لا نہیں سکتی

تپ ہے، تمہیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

اعتراض

اعتراض (۱) **صغرا** کا وقتِ رخصت **علی اصغر** کو حسرت اور پیار سے دیکھنا نہایت درد انگیز سماں ہے مگر مرزا صاحب ایسے درد انگیز واقعہ کو بھی تاثیر کا رنگ نہ دے سکے۔ دیکھو میر صاحب اسی بات کو کس لہجہ سے ادا کرتے ہیں (۲) اسکا نہایت درد انگیز پہلو **صغرا** کا خود **اصغر** سے مخاطب ہونا اور جوشِ محبت میں چھ مہینے کے بچے سے اپنا دردِ دل کہنا تھا۔ مرزا صاحب صرف یہ کہہ کر رہ گئے۔ ع۔ آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں میر صاحب نے پورا دردِ دل کہا (۳) مرزا صاحب کے اس مصرع۔ ع۔ **اصغر** کی طرف ہاتھ اُٹھا کر وہ پکاری۔ اور میر صاحب کے اس مصرع۔ ع۔ وہ کانپتے ہاتوں کو اُٹھا کر یہ پکاری میں کوئی نسبت نہیں۔ میر صاحب کے ہاں ہات کے ساتھ کانپنے کی قید نے کسقدر بلاغت پیدا کر دی ہے (۴) ذیل کے دونوں مصرعوں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ع آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری۔ ع۔ آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں۔ (۵) چھوٹا مسافر مرزا صاحب کا ایجاد ہے۔

جواب

جواب۔ (۱) مرزا صاحب اس درد انگیز واقعہ کو تاثیر کا رنگ دے سکے یا نہیں یہ آپ کا دعوے بے دلیل ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کا ہر قسم کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اوّل تو آپ اُن کا بہتر کلام انتخاب ہی نہیں کرتے اور اگر کبھی بھول کر انتخاب کر لیتے ہیں تو بوجہ تعصب وہ موثر کلام آپکے دل میں اثر نہیں کرتا اس میں مرزا صاحب کے کلام کا کیا قصور ہے (۲) اس مرثیہ میں واقعی مرزا صاحب نے جناب **صغریٰ** کی جانب سے حضرت **اصغر** کی طرف مخاطب ہو کر دو ایک ہی بند لکھے ہیں۔ یہ آپ کے انتخاب کا قصور ہے کہ دوسرے مرثیوں کی طرف سے آپ کی حاسد نگاہ خیرگی کر گئی ورنہ اگر آپ چاہتے تو ایسے بند بھی مل جاتے جن میں پورے

دردِ دل کا اظہار کیا گیا ہے۔ دیکھیے مرزا صاحب ایک دوسرے مرثیہ میں پورا دردِ دل لکھتے ہیں اور کس موثر طریقہ سے ؎

صغرا نے اِدھر اور اُدھر یاس سے دیکھا
پھر جھولے سے اصغر کو اُٹھا لائی وہ دُکھیا

کہنے لگی تم میری سفارش کرو بھیا
سب کنبہ ہے بابا کی طرف اور میں تنہا

صغرا کو تو سمجھاتے ہیں بابا کی طرف سے
کچھ باپ سے کہتے نہیں صغرا کی طرف سے

تم اپنی زباں کھولو سفارش میں ہماری
ہونٹوں کو ہلا کر یہ اشارہ کرو واری

صغرا کو نہ چھوڑو، یہ بہن ہے مجھے پیاری
اصغر! میں بڑی چاہنے والی ہوں تمہاری

اس تپ میں بھی جب ہوش میں آجاتی ہوں واری
ڈوری ترے جھولے کی ہلا جاتی ہوں واری

دوسرے مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

ماں کی آغوش میں واں پی رہا تھا دودھ صغیر
سُن کے بیمار کی آواز وہ ہمکار و کر

کی ہر اک سمت کو الفت بھری آنکھوں سے نظر
کہا صغرا نے ادھر دیکھو کھڑی ہوں میں اِدھر

سہمے سہمے ہوئے کچھ تم نگراں ہوتے ہو
سرمہ آنکھوں سے بہا جاتا ہے کیوں روتے ہو

الوداع اے مرے ننھے[1] سے مسافر ناداں
الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قرباں

آج ہی منہ پہ ہیں پردیسیوں کے سارے نشاں
مسکرانا نہ اشارہ نہ ہمکنا اس آں

میرے بھولے مرے پیارے مرے کمسن بھائی

[1] دیکھیے اس مرثیہ میں مرزا صاحب نے بھی "ننھے مسافر" باندھا ہے۔ اب تو آپ کو صبر آیا۔

گھٹنوؤں بھی نہ چلے گھر میں تم اک دن بھائی

چشمِ بد دُور جب ان آنکھوں کا آئیگا خیال
آنکھیں رو رو کے شب و روز کرونگی میں لال

دل پہ لہرائینگے جب دم یہ جھنڈولے ترے بال
نہیں بالوں کی طرح ہوگا پریشاں مرا حال

چوسنے پر ان انگوٹھوں کے ہو قرباں صغرا
اب رہیگی یہاں انگشت بدنداں صغرا

ایک اک دم میں ترے لاکھ دم اے نورِ نگاہ
مصطفےٰ تیرے نگہبان، علیؑ پشت و پناہ

صد وسی سال ترے سر پہ سلامت رہیں شاہ
باپ کے سائے میں پروان چڑھائے اللہ

تپ میں ہوں اسلیے گودی میں نہیں لیتی ہوں
ضامنی میں تمھیں اللہ کی میں دیتی ہوں

اگر آپ منصف مزاج ہیں تو خیال کر سکتے ہیں کہ مرزا صاحب نے جس طریقہ سے پورا دردِ دل کہا ہی وہ بھی میر صاحب کے اشعار کے دردِ دل کی طرح موثر اور دلنشین ہے۔ تعجب ہے کہ ایسے نادر اور درد انگیز اشعار سے آپ کیونکر بے خبر رہے۔ یا کسی غرضِ خاص سے قصداً بے خبر بنے رہے۔ ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کارروائیاں ایک منصف مزاج مورّخ کی شان سے بعید ہیں۔

(۳) حقیقت میں میر صاحب کے مصرع میں ہاتھ کے ساتھ کانپنے کی قید بہت خوب ہی۔ ہم بھی اس کی داد دیتے ہیں۔ اس لفظ نے مصرع کو نہایت دردناک۔ پُرتاثیر اور بلیغ بنا دیا ہے (۴) جن دو مصرعوں میں آپ نے زمین و آسمان کا فرق بتایا ہی اُس میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ غور سے دیکھیے مرزا صاحب کے ہاں "چھاتی سے لگالوں" کے درد انگیز فقرہ نے مصرع کو کیا موثر اور دلنشین بنا دیا ہی (۵) یہ سچ ہی کہ مرزا صاحب کا "چھوٹا مسافر"

میر صاحب کے "ننھے مسافر" سے کسیقدر کم رتبہ کا لفظ ہی لیکن یہ لفظ مرزا صاحب کا ایجاد نہیں بلکہ اہل زبان کا مستند لفظ ہے۔

منشی دلگیر لکھنوی فرماتے ہیں ؎

بھیجا ہی مجھے بانو نے اصغر کی طرف کو	یہ چھوٹا مسافر گیا کوثر کی طرف کو[۱]

ایک مصرع یہ بھی میر صاحب کے خاندان میں سے کسی صاحب کا یاد پڑتا ہی۔

ع اس چھوٹے مسافر کی مدد کیجیو بابا۔

چھوٹا میہمان۔ اور چھوٹا سید۔ میر صاحب مرحوم نے بھی نظم فرمایا ہے۔

ع۔ چھوٹے سے میہمان کی خاطر ضرور ہی[۲] ع یہ چھوٹا سا سید بھی ہے مہمان تمہارا[۳]

اگر چھوٹا مسافر مرزا صاحب ہی کا ایجاد ہو تو اس میں قباحت کیا ہی۔

مرزا صاحب کے اشعار کی خاص بلاغتیں

مولف نے تو مرزا صاحب کے بند پر بیجا نکتہ چینیاں کی ہیں لیکن غور کیا جائے تو اس واقعہ کے متعلق مرزا صاحب کے اُس بند میں جو اُنھوں نے منتخب کیا ہی اور اُن بندوں میں جو ہم نے لکھے ہیں بہت سے دلچسپ اور پُر لطف نکات پائے جاتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اس واقعہ کا ایک درد انگیز پہلو یہ بھی ہی کہ علی اصغر کی جانب سے کسی طفلانہ محبت آمیز حرکت کا اظہار ہو جیسا کہ اکثر ناسمجھ بچے اُن عزیزوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں جنسے کچھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اس کی پوری تصویر کھینچدی ہی اور کس موثر اور حسرت خیز طریقہ سے ع لٹکا دیئے ہاتھ اُس نے ہمک کر کئی باری "ہمک کر"

منشی دلگیر ۵/۳۹ [۲] ۱/۱۰۹ [۳] ۴/۵۲

کا لفظ اور بھی زیادہ تیر و نشتر ہی۔ یا مثلاً یہ شعر ؎

سُنکے بیمار کی آواز وہ ہمکا رو کر	کی ہر اک سمت کو الفت بھری آنکھونسے نظر

(۲) اس سے بھی زیادہ درد انگیز پہلو چھوٹے بچّے سے محبت کے ساتھ ملنا اور آخری وداع ہونا تھا۔ میر صاحب کے ہاں اس مضمون کے متعلّق صرف یہ بیان ہی کہ ع
آ آمرے ننھے سے مسافر ترے واری۔ مرزا صاحب نے رخصت کا درد انگیز مضمون پورے طور پر ادا کیا کہ اے مرے چھوٹے مسافر آ تجھے چھاتی سے لگا لوں۔ نہیں معلوم اسکے بعد پھر تجھ سے ملنا بھی ہو یا نہو۔ ٹیپ کے دونوں مصرعوں کے طرزِ بیان میں جو درد انگیز سماں ہی اُسکو ناظرین خود محسوس کر سکتے ہیں ؎

پھر جیتی ملوں یا نہ ملوں تجھ سے بلا لوں	آ چھوٹے مسافر تجھے چھاتی سے لگا لوں

یا مثلاً یہ اشعار ؎

الوداع اے مرے ننھے سے مسافر نادان	الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قربان
آج ہی منہ پہ ہیں پردیسیونکے سارے نشان	مسکرانا نہ اشارہ نہ ہمکنا اس آن

(۳) میر صاحب نے ظاہر فرمایا ہی کہ حضرت صغرا، جناب علی اصغر سے خطاب کرکے کہتی ہیں کہ اسوقت میرا کوئی مددگار نہیں ہی ایک تم ہو لیکن افسوس ہی کہ تم کو بولنے کی طاقت نہیں۔ تمام لوگوں سے مایوس ہو کر ایک بچّہ کا سہارا ڈھونڈنا اور پھر یہ خیال کہ وہ بولنے کے قابل نہیں، انتہا درجہ کی حسرت اور ناکامی کی تصویر ہی اور یہ طرزِ کلام بجائے خود نہایت پُر تاثیر اور لاجواب ہے؛ لیکن مرزا صاحب نے ہجومِ یاس و اضطراب میں محویت و استغراق کی نہایت بے مثال تصویر کھینچ دی ہی۔ میر صاحب کے مصرع میں حضرت صغرا، علی اصغر کو بے زبان محسوس کرکے مایوس ہو جاتی ہیں لیکن

مرزا صاحب نے بیان کیا ہی کہ حضرت صغرا باوجودیکہ ایک بے زبان بچہ سے کلام کر رہی ہیں لیکن ہجوم یاس کی محویت میں اُن کو یہ بھی خیال نہیں کہ میرا مخاطب کون ہے اور اُسکو کلام کرنے کی طاقت بھی ہی یا نہیں۔ کبھی کہتی ہیں کہ تم میری سفارش میں زبان کھولو۔ کبھی اپنی خدمات یاد دلا کر کہتی ہیں کہ ہونٹوں ہی کو ہلا کر کچھ اشارہ کر دو جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریشانی اور مصیبت نے حواس کو اسقدر مختل کر دیا ہی کہ اُن کو مطلق خیال نہیں رہا کہ علی اصغر کلام کرنے یا کسی قسم کا اشارہ کرنے سے بالکل معذور ہیں۔ درحقیقت یہ ناکامی کی بدحواسی کا نہایت سچا اور اصلی مرقع ہی کیونکہ ایسے انتشار اور اپنی موہوم کامیابی کی دُھن میں ہمیشہ انسان سے ایسی ہی خلافِ عقل باتیں ظہور میں آیا کرتی ہیں۔

ادنیٰ اور اعلیٰ کا مقابلہ

ادنیٰ اور اعلیٰ کا مقابلہ

میر انیس

کچھ خارِ مغیلاں گُلِ تر ہو نہیں سکتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں سکتا
ہر قطرۂ ناچیز گُہر ہو نہیں سکتا
مِس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں سکتا

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

مرزا دبیر

ساماں سے کوئی صاحبِ ایماں نہیں ہوتا
ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا
آئینہ گر اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا

لاکھ اوج ہو پشّہ کا ہما ہو نہیں سکتا
بت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں سکتا

اسکے علاوہ مرزا صاحب کے تین بند اور بھی درج ہیں۔

اعتراض

اعتراض۔ میر انیس کا مشہور بند ہی۔ مرزا صاحب نے اسکے جواب میں بڑی کوشش

کی مختلف بحریں اختیار کیں بہت سی نئی نئی تشبیہیں ڈھونڈیں لیکن وہ بات پیدا نہو سکی ایک بند میں جو تشبیہات لکھی ہیں وہ کافی نہوئیں تو ایک مرثیہ میں بہت سی تشبیہیں جمع کیں۔

جواب

جواب ۔ ایک شاعر نے ایک مضمون کو ایک بند میں لکھا ہی مگر دوسرا شاعر جس کی روانی طبع کا سمندر کنارہ نہیں رکھتا اُس مضمون کو مختلف پیرایوں سے پانچ چھ بندوں میں لکھتا ہی، لیکن باوجود اس محنت و کاوش کے، داد و تحسین کے عوض ایک متعصب مولف کے اعتراضات کا نشانہ بنتا ہی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ مولف اس موقع پر کیا اعتراض سوچینگے کیونکہ یہ تو ایک تعریف کی بات ہی کہ ایک ہی مضمون کو کئی بندوں میں لکھا۔ مگر حاسد اور متعصب طبیعت بھی بُری ہوتی ہی۔ اچھی بات کو بھی بُری سمجھ لیا۔ یعنی میر صاحب نے ایک بند لکھا اور مرزا صاحب نے تین، تو مولف کی رائے میں اسکی یہ وجہ نہیں ہی کہ مرزا صاحب نے اپنی بلندیِ فکر اور جولانیِ طبع سے اس مضمون میں نئی نئی باتیں اختراع کیں بلکہ یہ سبب ہے کہ یہ تشبیہات کافی نہوئیں تو بہت سی تشبیہیں جمع کردیں۔ بیشک ایک متعصب شخص ایسا ہی کہہ سکتا ہی اور اسکو ایسا ہی کہنا چاہیے، لیکن ایک منصف مزاج اور غیر متعصب انسان یہ کہے گا کہ دیکھو مرزا صاحب سے بلند خیال شاعر نے جن کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے کسقدر زیادہ تشبیہات پیدا کیں اور ایک ہی مضمون کو کس طرح نئے نئے پیرایوں میں ادا کیا۔

قید خانے کے واقعات

قید خانے کے واقعات | قید خانے کا حال اور ہند کے آنے کا واقعہ دونوں صاحبوں نے نظم کیا ہی، چنانچہ مولف نے دونوں صاحبوں کے کلام سے ان حالات کے اشعار کا بھی موازنہ کیا ہی۔ لیکن یہاں بھی اُسی قدیمی عادت سے کام لینا پڑا ہی کہ میر صاحب کے

ایک مشہور مرثیے کے بند لکھے ہیں اور مرزا صاحب کے ایک معمولی مرثیے سے جو صرف ۳۶ بندوں کا ہی چند اشعار درج کر کے موازنہ کیا ہی۔ یہ واضح ہے کہ مرزا صاحب کے جتنے چھوٹے چھوٹے مرثیے ہند۔ شیریں۔ اور حضرت صغرا کے حال میں ہیں وہ سب ابتدائے مشق کے ہیں۔ انکے سوا اور جو مختصر مختصر مرثیے ہیں وہ بھی اگلے زمانے کے ہیں جو بہ عجلت سوز خوانوں کے واسطے کہہ دیئے گئے ہیں۔ ہم مرزا صاحب کے ایک دوسرے مرثیے سے جسکا مطلع ہے۔ ع۔ جب طے سفرِ شام ہوا ماہِ صفر میں۔ چند اشعار لکھ کر موازنہ کرتے ہیں۔

انیس	سمجھے شکستگیِ خرابہ کا کیا بیاں وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں	ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں وہ شب کہ الحذر وہ سیاہی کہ الاماں
	ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا	
دبیر	کیا شام کے زنداں کی سیاہی کروں تحریر غش ہو گئے ڈر کر حرمِ صاحبِ تطہیر	گویا تھا وہ قلبِ سیہِ لشکرِ بے پیر تغیر تو تھا حال ہوا اور بھی تغیر
	ہر صبح اسیروں کے لیے قہر و غضب تھی ہر شب حرمِ شہ کے لیے حشر کی شب تھی	
انیس	نکلی حرم سرا سے یہ کہہ کر وہ خوش سیر پہونچی جناب حضرتِ زینب کو یہ خبر	تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگی سر کو پیٹ کر
	اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے ہی ہی کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے	

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہرِ امام
غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام
لوگو! بتا نہ دیجو کہیں اُسکو میرا نام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینبؑ کدھر گئی
کہدیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

دبیر

یہ ذکر تھا ناموسِ پیمبرؐ میں ابھی آہ
جو مشعلوں کی روشنی در پر ہوئی ناگاہ
اور شور ہوا اے حرمِ سیدِ ذیجاہ
ہند آتی ہے آگاہ ہو۔ آگاہ ہو آگاہ
آداب سے مجرے کو چلو باندھ کے صف کو
آمد زنِ حاکم کی ہے زنداں کی طرف کو

ہوش اُڑ گئے زینبؑ کے پکاری میں کروں کیا
لو آتی ہے یاں ہند چھپوں جا کے میں کسجا
پہلے مرے بھائی سے بھی عقد اسکا ہوا تھا
یہ ہند وہی ہے جو مجھے کرتی تھی مجرا
میں خاک نشیں آج ہوں وہ تخت نشیں ہے
مُنہ کس سے چھپاؤں کہ ردا بھی تو نہیں ہے

انیس

یہ سُنکے ہند رونے لگی تب باشک و آہ
پھر مڑ کے روئے حضرتِ زینبؑ پہ کی نگاہ
مُنہ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ
بیساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الہ
ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینبؑ تمھیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

دبیر

پھر ہند نے زینبؑ سے کہا ہو کے پریشان
کچھ آپ کی آواز سے واقف ہیں مرے کان
پیدا ہے تری شان سے سیدانیوں کی شان
زینبؑ کی شبیہ آنکھ تلے پھر گئی اس آن
چہرے پہ عجب نور ہے گو خاک نشیں ہو

کیونکر کہوں تم فاطمہؑ کی کوئی نہیں ہو

علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگنا

خدا کا شکر ہی کہ اس موقع پر مولف مرزا صاحب کے معاملہ میں انصاف سے کام لیکر لکھتے ہیں کہ "میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ میں عموماً میر انیس کی ترجیح ثابت ہوگی لیکن ہر کلیہ میں مستثنےٰ ہوتا ہی چنانچہ مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہی اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آجتک نہو سکا" نہیں معلوم اسوقت مولّف کے جسم میں کس منصف مزاج کی روح حلول کر گئی تھی کہ یہ سچّے فقرے زبان اور قلم سے نکل گئے، حالانکہ اُن سے امید تو یہ تھی کہ اس معاملہ میں بھی اُسی قدیمی تعصّب سے جو اُن کی فطرت میں داخل ہی، کام لیکر جلے ہوئے فقرے لکھ جاتے۔ لیکن بقول اُنکے یہ بالکل سچ ہی کہ ہر کلیہ میں مستثنےٰ ہوتا ہے پس یہ کیا ضرور ہی کہ ایک متعصّب اور غیر منصف مزاج شخص ہر وقت غیر منصف ہی بنا رہے بہرحال ہم اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس مضمون کو اس مصرع پر ختم کرتے ہیں۔ ع

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است۔

کسی مضمون کے ادا کرنے میں مرزا صاحب کی فوقیت

امر دوم - یعنی جہاں کسی مضمون کے ادا کرنے میں مرزا صاحب کو فوقیت دی جاسکتی ہی۔ چونکہ ہر شاعر کے کلام میں ادنیٰ و اعلیٰ مختلف قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں اسلیے جہاں بعض مطالب کے ادا کرنے میں میر صاحب کو فوق حاصل ہی اسی طرح بعض مقامات ایسے بھی مل سکتے ہیں جہاں مرزا صاحب کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس جگہ اُن مقامات کو درج کرتے ہیں جہاں مرزا صاحب کا کلام بلند اور شاندار ہو گیا ہے۔

حضرت زینبؑ کے بین بیٹوں کی لاش پر

میر انیس	ٹوکے کوئی رستے میں تو ڈریو نہ مری جان اقرار نبوت میں فصاحت کا رہے دھیان	ہاں کلمۂ توحید پڑھے جائیو ہر آن دلبند ہو تم تین امامونکے میں قربان
	کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابنِ ولی کے ہم آتے ہیں لشکر سے حسینؑ ابنِ علیؑ کے	
مرزا دبیر	پہنچے درِ بہشت پہ گر خازنِ جناں ہاں افصح العرب کے نواسو نثار ماں	تم کون ہو، کہاں سے ہو اہی گذر یہاں اُسدم کہیں نہ پیاس سے لکنت کرے زباں
	کہنا، کہ ہم شبیہ پیمبرؐ کے بھائی ہیں شبیرؑ کے غلام ہیں، اور کربلائی ہیں	

اصل مضمون یہ ہی کہ حضرت زینبؑ اپنے صاحبزادوں کی لاش پر بین کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ سفرِ آخرت میں اگر روک ٹوک ہو تو گفتگو میں بند نہونا۔

میر انیس صاحب کے اشعار میں بھی صفائی اور شستگی اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی ہے لیکن غور کرنے سے مرزا دبیر صاحب کے اشعار میں چند لطافتیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں

(۱) مرزا صاحب کے کلام میں کچھ ایجاز و اختصار پایا جاتا ہی۔ یعنی میر صاحب مرحوم جس بات کو پورے دو مصرعوں میں ادا فرماتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اُسکو صرف دو دو لفظوں میں بیان کر دیا ہی۔ مثلاً

(میر صاحب) کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابنِ ولی کے (مرزا صاحب) شبیرؑ کے غلام ہیں،
(میر صاحب) ہم آتے ہیں لشکر سے حسینؑ ابنِ علیؑ کے۔
(مرزا صاحب) کربلائی ہیں۔

اس فصاحت آمیز اختصار کے علاوہ لطافتِ معنوی بھی پائی جاتی ہے مثلاً (۲) میر صاحب مرحوم کے مصرع میں "ملازم" کا لفظ ہے اور مرزا صاحب نے اُس کے عوض "غلام" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ شاید زیادہ موزوں نرم اور کثیر الاستعمال ہے کیونکہ یہی لفظ مراثی میں مستعمل و متداول ہے۔ حضرت عباسؑ، اور جناب امام حسین علیہ السّلام کے تمام اعزّا و اقربا نیازمندی ظاہر کرتے وقت اپنے کو حضرت کا غلام کہا کرتے تھے، ملازم کا لفظ مرثیوں میں نظر نہیں آتا اسلیے بادی النظر میں کسیقدر اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہوتا ہے (۳) اسکے سوا "کربلائی ہیں" کے الفاظ میں جو لطف حُسن اور موزونی پائی جاتی ہے وہ اس پورے مصرع میں نہیں نکلتی ع۔ ہم آتے ہیں لشکر سے حسینؑ ابنِ علیؑ کے۔ (۴) میر صاحب نے فرمایا ہے ع دلبند ہو تم تین اماموں کے مری جان۔ اسکے ہم مضمون مرزا صاحب کا جو مصرع ہے اُس میں حُسنِ بندش۔ صفائی۔ بے ساختگی۔ اور الفاظ کی نشست بہت خوب ہے ع ہاں فصح العرب کے نواسو نشارماں۔ (۵) میر صاحب نے لکھا ہے کہ کہیں ڈر کے سبب جواب دینے سے رُک نہ جانا۔ لیکن مرزا صاحب نے زبان رُکنے کی وجہ کو پیاس کی جانب منسوب کیا ہے جس میں علاوہ بلاغتِ معنوی کے ایک درد انگیز۔ اور رقّت خیز اشارہ پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں گفتگو میں نہ رُک جانے کی وجہ افصح العرب کا نواسا ہونا، بہ نسبت تین اماموں کے دلبند ہونے کے زیادہ موزوں ہے۔

ایک غلط خبر کی تردید

دبیر	بالائے زمیں بیٹھ گئے سیدِ ابرار شکوہ کوئی عباسؑ کا کیجو نہ خبردار	تھیں جمع جو سب بیبیاں کی اُنسے یہ گفتار عباسؑ مرا اور مری جان کا ہے مختار

مجھ سے نہ بُرائی مرا محبوب کرے گا
جو حق میں کریگا وہ مرے خوب کرے گا

یہ سُنتے ہی دل زوجۂ عبّاسؑ کا تڑپا
شرمائی ہوئی شہ کے قریں آئی وہ دُکھیا
اور بولی کہ اے وارثِ ذریّتِ زہراؑ
یہ بات نہ تم اپنی زباں سے کہو آقا

والی مرا قربانِ امامِ دو جہاں ہو
فرزند مرا آپ کے سائے میں جواں ہو

خاطر سے علمدار کی کہتی نہیں یہ بات
فرماؤ تو فرزند کے سر پر میں کھوں ہات
وارث مرا بچپن سے شہِ پاک کے ہی سات
حضرت کی غلامی ہی لُسے فخر و مباہات

والی مرا پھرنے کا نہیں تم سے بلا لوں
اس بات پہ جیسی کہو سوگند میں کھا لوں

انیس

چپکے سے سکینہؑ نے کہا جب یہ بصد یاس
غرقِ عرقِ شرم ہوئی زوجۂ عبّاسؑ
گھبرائی ہوئی خیمہ کی ڈیوڑھی کے گئی پاس
پھر سوچ کے کہتی تھی کہ بیجا ہی یہ وسواس

قوتِ شہِ والا کی اُنھیں سے تو فقط ہے
عبّاسؑ پھرے شہ سے!! نہ مانونگی غلط ہے

بھائی کو وہ پیارے ہیں اُنھیں بھائی ہی پیارا
عاشق کہیں معشوق سے کرتے ہیں کنارا
یہ ننگ علمدار کو ہوگا نہ گوارا
قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارا

لیکن فلک اس طرح سے گرتے نہیں دیکھا
بھائی کو کبھی بھائی سے پھرتے نہیں دیکھا

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ و مضطر
اسکا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر

رخ زرد تھا دل کانپتا تھا سینہ کے اندر | دھڑکا تھا کہ اب کیا کہیں گے آنکے سرور

یارب نہ سنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ
یہ غل ہو کہ بھائی پہ فدا ہو گئے عباسؑ

دشمنوں نے یہ خبر اُڑا دی تھی کہ حضرت عباسؑ ہماری طرف آ گئے اُسوقت حضرت عباسؑ کی زوجہ پر اس خبر کا جو اثر ہوا اور جو گفتگو اُنھوں نے کی اُسکا سماں دونوں بزرگوں نے باندھا ہی۔ لیکن مرزا صاحب کے اشعار میں مقتضائے حال کی مطابقت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اُنکے اشعار پر غور کرو۔ حضرت عباسؑ کی زوجہ کو اپنے شوہر کی وفاداری کا کیسا مستحکم یقین ہی کہ کسی لفظ کسی فقرہ سے بطورِ فرضِ محال بھی شک و شبہ کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ حتّٰی کہ وہ اس خبر کے غلط ثابت کرنیکے واسطے قسم کھانے پر آمادہ ہیں۔ اور حقیقت میں یہ امر اصلی واقعہ کے مطابق بھی ہے، کیونکہ حضرت عباسؑ کو امام حسینؑ علیہ السّلام سے جو عشقیہ محبت تھی اُسکے لحاظ سے خود معلوم ہوتا ہی کہ کسی کو بھی اس خبر کے غلط ہونے میں شک نہ کرنا چاہیے۔ بخلاف اس کے میر صاحب مرحوم نے حضرت عباسؑ کی زوجہ کی جو کچھ حالت لکھی ہی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے شوہر کی وفاداری کی جانب سے مشتبہ ہو کر خیمہ کی ڈیوڑھی پر چلی گئیں اور پھر یہ کہتی ہیں کہ اگرچہ یہ ننگ علمدار کو گوارا نہیں ہو سکتا لیکن ع۔ قسمت ہی اُلٹ جائے تو اسکا نہیں چارہ۔ ع۔ دھڑکا تھا کہ اب کیا کہینگے آنکے سرور۔ ع۔ یارب نہ سنوں میں کہ جدا ہو گئے عباسؑ۔ حالانکہ اُن کا یقین ایسا مضبوط ہونا چاہیے کہ کسی طرح بھی اس جھوٹی خبر کے مان لینے پر آمادہ نہ ہوں اور اُن کے الفاظ ایسے ہوں جن سے اُن کے شوہر کی وفاداری کی نسبت شک کا

احتمال بھی پیدا نہ ہو سکے۔

مرزا صاحب نے ایک دوسرے مرثیہ میں بھی اس واقعہ کو نظم کیا ہے، وہاں بھی یہی پہلو مدِ نظر رکھا ہے چنانچہ اُس موقع پر حضرت عباسؑ کی زوجہ فرماتی ہیں ؎

تم مصحفِ ناطق ہو ہر اک اس سے ہے آگاہ
سر آپ کا قرآں کی جگہ ہے مجھے یا شاہ
اس سر کی قسم جھوٹ نہ میں بولونگی واللہ
شوہر مرا دل سے ہے غلامِ شہِ ذیجاہ
شق ہوگی زمیں یا کہ فلک اُس پہ گرے گا
عباسؑ نہ حضرت کی غلامی سے پھرے گا

پیارے نہیں اکبرؑ سے مجھے اپنے یہ دلدار
مجکو اُسی غازی کی قسم اے شہِ ابرار
اُس شب کو یہی مجھ سے تھی عباسؑ کی گفتار
کل شہ کی غلامی سے ادا ہوگا علمدار
یہ کہہ کے ہمیں روئے گا سردار ہمارا
عباسؑ ساتھا کوئی نہ غمخوار ہمارا

جناب امیرؑ بیٹوں سے اپنے قاتل کی سفارش فرماتے ہیں

انیس: یہ چاہتا ہے بند سے رسّی کے رہا ہوں — تم کھولدو ہاتھ اسکے کہ میں عقدہ کشا ہوں

دبیر: ہاتھ اسکے دونوں کھولدو حاجت روا ہو تم — مشکل کشا کے بیٹے ہو مشکل کشا ہو تم

اصل مضمون یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام بیٹوں سے اپنے قاتل کے ہاتھ کھولدینے کی سفارش کرتے ہیں۔ اسکا پیرایہ دونوں صاحبوں نے دو طرح پر رکھا ہے میر صاحب مرحوم جناب امیرؑ کی زبانی لکھتے ہیں کہ چونکہ میں مشکل کشا ہوں اسلیے تم قاتل کے ہاتھ کھولدو۔ لیکن مرزا صاحب کے اشعار میں ایک نہایت لطیف پیرایہ میں سفارش کا اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی جناب امیرؑ کسی عالی ظرفی اور دینداری کی صفت کو،

جو دشمن پر عفو و ترحّم کا باعث ہو اپنی جانب نہیں بلکہ بیٹوں کی طرف منسوب کر کے طالبِ رحم ہوتے ہیں یعنی چونکہ تم خلق کے حاجت روا ہو خود بھی مشکلکشا ہو اور مشکل کشا کے فرزند بھی ہو، اسلیے تمہاری عالی ظرفی کا مقتضےٰ یہ ہی کہ قاتل کے ہاتھ کھولکر اُس کی خطا معاف کر دو۔ میر صاحب کے اس فقرہ میں کہ "میں عقدہ کشا ہوں" اور مرزا صاحب کے اس جملہ میں کہ "تم مشکل کشا کے بیٹے ہو" بات قریب قریب ایک ہی ہی، لیکن طرزِ ادا اور لفظوں کے اُلٹ پھیر نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہی۔ علاوہ بریں میر صاحب اعلی اللہ مقامہ نے تمام مضمون کو دوسرے مصرع میں ادا کیا ہی اسلیے پہلا مصرع کچھ بیکار سا ہو گیا ہی، لیکن مرزا صاحب نے اُسی مضمون کو دونوں مصرعوں میں اس طرح تقسیم کر دیا ہی کہ دونوں مصرعے موزوں۔ باکار اور پُر لطف معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں پہونچکر حضرت مسلمؑ کی خبر معلوم کرنے کے واسطے متفکر بیٹھے ہیں

میر انیس

اُس روز تھے مغموم بہت حضرت شبیرؑ
خاموش تھے خویش و رفقا صورتِ تصویر

ہر سو نگراں تھے، مگر افسردہ و دلگیر
تھا دھیان خبر پوچھوں جو آئے کوئی رہگیر

رخساروں پہ آنکھوں سے کبھی اشک رواں تھے
لب پر کبھی دنیا کی مذمت کے بیاں تھے

مرزا دبیر

کرسی پہ مگر بیٹھے تھے یوں سبطِ پیمبرؐ
حیران و پریشان و سراسیمہ و مضطر

تھی نوک تو تیغِ شہِ مرداں کی زمیں پر
اور قبضۂ شمشیر پہ تھا دستِ مطہر

تشویش سے قبضہ پہ جھکائے ہوئے سر کو
اور دیکھنا گھبرا کے ادھر اور اُدھر کو

اسی مرثیہ میں اس مضمون کا ایک اور بند ؎

اُس دن تھا عجب حال دلِ سیدِ ابرار
درد اُٹھتا تھا رہ رہ کے کلیجے میں ہر اک بار
مسلم کی اُنھیں یاد تھی اور چشم تھی خونبار
نے خیمے میں آئے، نہ سکینہ کو کیا پیار
تھی یاد نہ صغرا کی بھی زہرا کے خلف کو
پر اشک بھری آنکھیں تھیں کوفے کی طرف کو

حضرت امام حسینؑ میدان کربلا میں تشریف لائے ہیں۔ حضرت مسلمؑ کی کچھ خبر معلوم نہیں ہوئی۔ آپ کسی آنے جانے والے سے اُنکے حالات معلوم کرنے کے واسطے کرسی پر متفکر بیٹھے ہوئے ہیں، اُسوقت امام علیہ السلام کے تردّد۔ واضطراب وپریشانی کی تصویر دونوں صاحبوں نے کھینچی ہے۔ مرزا صاحب کی اس ٹیپ میں ؎

تشویش سے قبضہ پہ جھکائے ہوئے سر کو اور دیکھنا گھبرا کے ادھر اور اُدھر کو

واقعہ کی کیسی سچی تصویر کھنچی ہوئی ہے اور حُسن بلاغت کی کیسی اچھی مثال ہے۔

حضرت علی اصغرؑ کے لیے پانی مانگنا

اس واقعہ میں بلاغت کا اقتضا یہ ہے کہ امام حسینؑ جیسے غیور اور باحمیّت بزرگ کا طرزِ عمل یہ ہو کہ وہ اعدا سے اپنی طرف سے کسی قسم کا سوال نہ کریں بلکہ جو کچھ کہیں بچے کی جانب سے کہیں۔ دوسرا دردانگیز پہلو یہ ہے کہ حضرت علی اصغرؑ کی طرف سے بھی پانی مانگنے کی عوض پہلے خود اُن کا حالِ زار ہی دکھایا جائے کیونکہ یہ انداز بجائے خود نہایت پُرحسرت اور ایک سنگدل انسان کے دل میں بھی اثر کر جانے والا ہے

یہ عمل بھی کافی نہو اور بچے کی طرف سے سوال ہی کرنا پڑے تو سوال صاف صاف الفاظ میں نہو بلکہ اُس کے الفاظ ایسے موزوں اور بچے ہوئے ہوں جنسے مطلب تو ظاہر ہو جائے لیکن کسی طرح مذمتِ سوال کا پہلو پیدا نہ ہونے پائے۔ دونوں صاحبوں نے ان تمام پہلوؤں کو جس طرح نباہا ہی اور اس واقعہ میں درد انگیزی پیدا کرنے میں جو بلاغت ظاہر کی ہی اُنکے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ مقابلہ کرنے سے دونوں حریفوں کے مدارج کلام کا پورا پورا اندازہ ہو جائیگا۔

میر انیس

بولے دکھا کے بچے کو شاہِ فلک سریر
پانی ملا ہی کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر

مرتا ہی پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہماں ہی کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اسکا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

برپا ہی اہلِ بیت محمدؐ میں شور و شین
آنکھیں پھرائے دیتا ہی اب تو یہ نورِ عین

در پر پھوپھی بلکتی ہی ماں کر رہی ہی بین
لایا ہی اس عطش میں ترے پاس اب حسینؑ

تجکو قسم ہے روح رسالت مآبؐ کی
ٹپکا دے اسکے حلق میں اک بوند آب کی

دیگر

فرما کے یہ آئے صفِ اعدا کے برابر
مظلوم ہی معصوم ہی پیاسا ہے یہ دلبر

اک اک سے کہا ہاتھوں پہ بچے کو اُٹھا کر
نے دودھ میسّر ہے نہ پانی ہے میسّر

راضی ہوں میں تیغوں سے لہو میرا بہا دو
پر تھوڑا سا پانی اسے دریا سے پلا دو

بے آبی سے یہ پھول سا کملاتا ہے یارو
معصوم پہ کافر بھی ترس کھاتا ہے یارو

گھبرائے میں ہر دم اسے غش آتا ہے یارو
بچہ مرا ہاتھوں سے مرے جاتا ہے یارو

پانی کے نہ دینے کا سزاوار تو میں ہوں
تقصیر ہے کیا اس کی گنہگار تو میں ہوں

راضی ہوں میں قیمت ہے جو منظور تو زر لو
اک چلو سے خالی ہو اگر نہر تو بھر لو

تم پانی کے قطرے کے عوض مجھ سے گہر لو
پانی دو اسے اور چمنِ خلد میں گھر لو

احساں کو نہ بھولے گا یہ حیدرؑ کا ہے پوتا
فرزند مرا ساقیِ کوثر کا ہے پوتا

اعدا کے قریں سر کو جھکائے ہوئے آئے
معصوم کو چھاتی سے لگائے ہوئے آئے

آنسو رخِ انور پہ بہائے ہوئے آئے
اصغر کو ردا اپنی اڑھائے ہوئے آئے

روتے تھے یہ صدمہ تھا شہِ جن و ملک کو
اصغر کو کبھی دیکھتے تھے گاہ فلک کو

کچھ سوچ کے دامن رخِ انور سے اٹھایا
پھر صاحبِ اولاد کو رو کر یہ سنایا

گویا کہ قمر ابر سے باہر نکل آیا
دو روز سے پانی نہیں اس لال نے پایا

حاضر ہوں میں خنجر مری گردن سے ملا دو
پر تھوڑا سا پانی مرے بچے کو پلا دو

مرزا دبیر

بھائی کے غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر
ناگاہ رن میں قتل ہوا نوجوان پسر
اکبرؑ کے بعد شہ کو ملا وقفہ اسقدر
پُرسا کھڑے کھڑے دیا بانوؑ کو آن کر

روتے ہی آئے روتے ہی رن کو چلے گئے
اکبرؑ کی لاش رکھ گئے اصغرؑ کو لے گئے

آئے جو شاہ متصل لشکر جفا
چادر اُٹھا کے حال دکھایا صغیر کا
آنکھوں کے حلقے خشک دہاں چھوٹا سا گلا
چاہا کہ پانی مانگیں مگر آگئی حیا

مشکل سے اتنی بات کہی درد و یاس سے
یارو قریبِ مرگ یہ بچہ ہے پیاس سے

حاجت جو لیکے جاتا ہے کوئی کسی کے پاس
اہلِ مروّت اُسکو نہیں پھیرتے اُداس
اس دودھ پیتے بچے کا لازم ہے تم کو پاس
حاجت فقط یہی ہے بجھاؤ تم اس کی پیاس

منصف سے اہلِ درد سے میرا سوال ہے
کیا اتنے سن کے بچے کا بھی خوں حلال ہے

دیگر

اصغرؑ کو لیے ہاتھ پہ زہرا کا وہ جایا
خیمے سے قریبِ صفِ کفّار جو آیا
منّت سے سماجت سے یہ اعدا کو سُنایا
پوتا یہ سخی کا غرض اک اپنی ہے لایا

کہتا ہے اشارے سے کہ سیّد کا پسر ہوں
مہمان ہوں نادان ہوں اور تشنہ جگر ہوں

دیگر

پہونچے قریبِ فوج تو گھبرا کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرّا کے رہ گئے

چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہمکو لائے ہیں
اصغرؑ تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

یہ کون بے زباں ہے، تمہیں کچھ خیال ہے
لو مان لو تمہیں قسمِ ذوالجلال ہے

درِ نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علیؑ کا تم سے طلبگارِ آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
باقی رہے نہ بات کوئی اے مرے پسر

رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر

پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نورِ عین نے
تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حضرت زینبؑ اپنے بیٹوں کے دل سے علم نہ ملنے کی آزردگی رفع کرتی ہیں۔

میر انیس

اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
اس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال

تم ہوگے تا بہ عصر نہ عباسؑ خوشخصال
مجکو یقیں نہیں کہ بچے فاطمہؑ کا لال

پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے

رہجاؤنگی میں قید میں جانے کے واسطے

مرزا دبیر

کِسدن کے واسطے طلبِ رایتِ ظفر
یہ دوپہر رُلائے گی زینبؑ کو عمر بھر

واری بہت جیوگے جواب تم تو دوپہر
دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہے سفر

گھر سے تمھیں حسینؑ کے صدقے کو لائی ہوں
میں بے نشان ہونے کو یثرب سے آئی ہوں

صفائی اور حُسنِ بندش میں دونوں کلام ایک پایہ رکھتے ہیں لیکن بحیثیتِ معنی مرزا صاحب نے بلاغت کا بہت لطیف پہلو رکھا ہی، میر صاحب کے اشعار میں حضرت زینبؑ نے صاف صاف کھُلے ہوئے الفاظ میں اپنے صاحبزادوں، اور حضرت عباسؑ اور سب سے زیادہ یہ کہ خود امام حسینؑ کی شہادت کا حال بیان کر دیا، جو بظاہر عورتوں کی توہم پرست طبیعت سے عموماً، اور حضرت زینبؑ کی بے مثال محبت سے خصوصاً بعید معلوم ہوتا ہی۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب کے اشعار میں حضرت زینبؑ اسی مطلب کو صاف صاف الفاظ میں نہیں بلکہ اشارۃً و کنایۃً ادا فرماتی ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے صاحبزادوں کی شہادت کا تو کھُلے الفاظ میں اظہار کر دیا، ع واری بہت جیوگے جواب تم تو دوپہر، کیونکہ اُن کو حصولِ شہادت پر آمادہ کرنا تھا۔ لیکن باقی مطلب اور مضمون کو پوشیدہ اور چھُپے ہوئے الفاظ میں بیان کرتی ہیں مثلاً ع یہ دوپہر رُلائیگی زینبؑ کو عمر بھر۔ اس میں امام حسینؑ کی شہادت اور اپنی تمام عمر تک سوگواری کا اشارہ ہی۔ اور ع دنیا سے آج فوجِ حسینیؑ کا ہی سفر۔ اس میں کنایۃً ظاہر کیا ہی کہ آج سب کُنبہ کا خاتمہ ہی۔ کیونکہ تمام لشکر کے قتل ہو جانے کے بعد

سردار کی شہادت لازمی ہی۔ سب باتوں کا درپردہ اظہار بھی کر دیا۔ لیکن کسی بات کو صاف صاف زبان سے نہ کہا۔ علاوہ بریں یہ دونوں مصرعے ع اک دو پہر کیواسطے ناحق یہ قیل وقال۔ اور ع کسدن کے واسطے طلب رایت ظفر" بالکل ہم مضمون ہیں لیکن ان میں جو فرق ہی وہ اہل مذاق محسوس کر سکتے ہیں "کسدن کیواسطے" بہت اچھا محاورہ اور روزمرّہ ہی۔ اسکے سوا ٹیپ میں اُن کی شہادت کا بھی اشارہ کر دیا یعنی اب بجائے اسکے کہ علم اور منصب کی تمنا کرو۔ تم کو اپنی شہادت کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ میں تمہیں گھر سے امام حسینؑ کے صدقے کے واسطے لائی ہوں۔

متحد المضمون اشعار

متحد المضمون اشعار | اس میں شک نہیں کہ دو شعروں کا جب مقابلہ کیا جائے تو ایک کو ضرور فوقیت ہوتی ہی، کیونکہ یہ بالکل ناممکن ہی کہ ایک اُستاد اُسی بات کو جو دوسرا اُستاد لکھ چکا ہی بلا کسی قسم کی ترقّی کے اپنے کلام میں لائے۔ لیکن مقابلہ کرتے وقت اس بات کا معلوم ہونا دشوار ہی کہ دونوں میں سے ایجاد کا فخر کس کو اور ترقی دینے کا شرف کس کو حاصل ہی۔ بہرحال دونوں میں سے کوئی بھی موجد اور کوئی بھی ترقی دینے والا ہو دونوں مستحق داد و تحسین ہیں۔

متحد المضمون اشعار کے موقع پر بھی وہی دونوں مدارج قائم ہو سکتے ہیں۔ اوّل جہاں میر صاحب کو فوقیت ہے۔ دوسرے وہ مقامات جہاں مرزا صاحب کو ترجیح ہے۔

اس موقع پر ہم مولوی شبلی صاحب سے اسقدر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے جو موازنہ لکھتے وقت مرزا دبیر۔ اور میر انیس کے لاکھوں اشعار دیکھ ڈالے تو کہیں دو چار مقامات پر ایسے ہم مضمون اشعار بھی نظر سے گذرے جہاں بیچارے

مرزا صاحب کو ترجیح دیجا سکے ۔ موازنہ کرنے کے یہ تو معنی نہیں ہیں کہ ہر موقع پر یک طرفہ کارروائی کیجائے ۔ آپ کی طرح اَور لوگوں نے بھی مختلف شعرا کے محاسنِ سخن پر کتابیں لکھی ہیں اور اسی طرح آپ کی مانند اُنھوں نے بھی اپنے ممدوح کے کلام کا دوسرے شعرا کے کلام سے مقابلہ کیا ہی ۔ پس جہاں دوسرے شعرا کا کلام فوق لے گیا ہے اُنھوں نے منصفانہ طور پر صاف ظاہر کر دیا ہی کہ اس موقع پر فلاں شاعر کا بیان ہمارے ممدوح کے کلام سے زیادہ بلیغ اور زیادہ دلکش واقع ہوا ہی ۔ بغیر اسقدر انصاف پسندی اور حق گوئی کے موازنہ کا لطف نہیں اور وہ موازنہ نہیں بلکہ اُسکو مناظرہ و مجادلہ کہنا چاہیے ۔

(۱) متحد المضمون اشعار میں میر انیس کی ترجیح

متحد المضمون اشعار میں میر انیس کی ترجیح

حقیقت میں بعض مقامات پر میر صاحب کے اشعار بہت بڑھ گئے ہیں اور اس قسم کے اشعار ہزاروں مِل سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم بوجہ عدیم الفرصتی اس خدمت کے انجام دینے سے معذور ہیں۔ لیکن مولّف نے میر صاحب کی ترجیح کے اشعار جو اس مقام پر لکھے ہیں اس میں ہم کو کلام ہے۔ اور اسکا سبب قابل مولّف کے ذوقِ سلیم کی کمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہم اُن کے موازنہ کی حقیقت ظاہر کیے دیتے ہیں ؎

پہلا موازنہ

دبیر	مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب		ہوتی تھیں سیخِ موج پہ مرغابیاں کباب
انیس	پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی		ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

اعتراض

اعتراض مضمون مشترک یہ ہے کہ گرمی کی شدّت یہ تھی کہ موج سیخ بن گئی تھی اور جب کوئی جانور اس کے پاس جاتا تھا تو جل کر کباب ہو جاتا تھا۔ بندش اور الفاظ کی نشست میں جو فرق ہے وہ خود ظاہر ہے لیکن معنوی حیثیت سے بھی میر انیس کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ میر انیس کے ہاں گرمی کا مبالغہ جو شعر کی جان ہے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی مچھلی سیخِ موج تک آنے کے ساتھ ہی فوراً کباب ہو جاتی تھی۔ مرزا صاحب کے ہاں یہ بات نہیں وہ کہتے ہیں کہ موج کی سیخ پر مرغابیوں کا کباب لگایا جاتا تھا۔ اس سے فوراً کباب ہو جانیکا خیال نہیں پیدا ہوتا۔

جواب

جواب۔ مرزا صاحب کا بھی وہی مطلب ہے جو میر صاحب کے مصرع سے پیدا ہوتا ہے یعنی سیخِ موج پر مرغابیاں کباب ہوتی تھیں۔ یعنی ہو جاتی تھیں۔ اگر غور سے دیکھیے تو مرزا صاحب کے مصرع میں بھی فوراً کباب ہو جانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کے ہاں علاوہ سیخ موج کی تشبیہ کے دوسری تشبیہ اور بھی ہے۔ کہ پانی میں گرمی کی شدت سے ہر حباب بھی تنور بنا ہوا تھا۔ اسکے علاوہ مرزا صاحب نے کُل دریا کا شدتِ حرارت سے گرم ہونا ظاہر کیا ہے، اور میر صاحب نے فقط سیخ موج کی حرارت کا اظہار فرمایا ہے کیونکہ اگر کُل پانی آگ ہوتا تو مچھلی پانی کے اندر بھی جل سکتی ہے۔ سیخِ موج تک آنے پر کباب ہو جانے کی کیا خصوصیت ہے۔

دوسرا موازنہ

دبیر	چاہوں تو بیٹھے بیٹھے اک اُنگلی سے زمین پر		گردوں کی ڈھال چیر کے رکھدوں زمین پر
انیس	طاقت اگر دکھاؤں رسالہ جناب کی		رکھدوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

اعتراض

اعتراض۔ مرزا صاحب کا پہلا مصرع نہایت بدترکیب ہے۔ اسکے علاوہ ایک اُنگلی سے چیرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کھونچا دینا ہوتا ہے۔ ڈھال کی تشبیہ آفتاب سے بہ نسبت آسمان کے زیادہ موزوں ہے۔

جواب

جواب۔ ایک اُنگلی سے چیرنا ناممکن نہیں ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت ہر صفت و شان میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ ڈھال کی تشبیہ آسمان سے زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ آسمان علاوہ مدوّر ہونے کے بیچ میں خلو رکھتا ہے اور ڈھال کی بھی یہی شکل و صورت ہوتی ہے۔

بقیہ موازنہ

دبیر	وہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کی مانند	تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کی مانند
انیس	چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر	

اعتراض

اعتراض ۔ میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہی ان الفاظ سے "کانپتے تھے" جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے وہ "رعشہ" کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی ۔ سب سے بڑھکر یہ کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو ۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی ۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی کی حالت میں کانپتے ہیں ۔ اسکے ساتھ چونکہ چلنے کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے ۔ اس لیے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے ۔ سب سے بڑھکر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہی ۔ اس لیے اسکو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا ۔ نہایت لطیف حسن التعلیل ہی ۔ بخلاف اسکے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا ۔ اسلیے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا ۔

جواب

جواب ۔ ہماری رائے میں ان الفاظ میں کہ "کانپتے تھے" اور "رعشہ تھا" کچھ زیادہ تفاوت اور بُعد نہیں ہی ۔ رہا یہ اعتراض کہ جب تک چلنے کی قید مذکور نہ ہو ۔ پوری تشبیہ نہیں ہوتی ۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں، غلط ہے ۔ گو میر صاحب کے مصرع میں چلنے کے لفظ نے ایک لطف پیدا کر دیا ہی لیکن اگر یہ نہو تو بھی کچھ ہرج نہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہی ۔ چنانچہ میر صاحب مرحوم نے جو مولوی شبلی صاحب سے بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے نکتہ داں تھے، اپنے کلام میں اس موقع پر تو نیزہ کے ساتھ چلنے کا لفظ لکھا ہے ۔

مگر ایک دوسرے موقع پر اُنھوں نے بھی مرزا صاحب کی طرح اس قید کا کچھ لحاظ نہیں کیا چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

اللہ رے رعبِ نعرۂ مولائے خوشخصال	لرزاں تھیں برچھیاں قدمِ پیر کی مثال[1]

دیکھیے۔ مولوی صاحب! یہاں میر صاحب نے بھی چلنے کا لفظ نہیں لکھا علاوہ بریں مرزا صاحب نے تو ایک خاص لفظ رعشہ لکھا ہے اور رعشہ ہر وقت رہا کرتا ہے خواہ آدمی چلے خواہ بیٹھا رہے۔ لہٰذا اسکے واسطے چلنے نہ چلنے کی قید کی ضرورت نہیں جیسا کہ ہم میر صاحب کے کلام سے سند دیتے ہیں۔

ع۔ تھا ہاتھ میں نیزوں کے بھی رعشہ صفتِ پیر[2]

دیکھیے اس موقع پر مرزا صاحب کی طرح میر صاحب کے مصرع میں بھی رعشہ کیواسطے چلنے کا لفظ مذکور نہیں۔ اور یہ مصرع بعینہٖ مرزا صاحب کے مصرع سے ملتا ہوا ہے۔

دبیر۔ چلائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں	
انیس۔ ہوگیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش	

اعتراض۔ جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلا کر الاماں کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے گو تشبیہ صحیح ہے۔ لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اسقدر غالب ہوا کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہوگیا۔ رعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے۔ اور چونکہ جلاجل

[1] ج ۵ ص ۹۰ [2] ج ۲ ص ۳۱۲

کے دونوں حصّے جب مِل جاتے ہیں تو پھر جب تک جُدا نہ ہوں آواز نہیں دے سکتے اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چُپ ہو گیا۔

۶۰ ب جواب۔ جلاجِل کے دونوں حصّے جو بجانے میں مِل جاتے ہیں اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہی۔ میر صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ جلاجل رعب اور خوف کے سبب سے ہاتھ جوڑ کر چُپ ہو گیا۔ یہ تشبیہ بہت صحیح اور درست ہے۔ مرزا صاحب کا یہ مطلب ہی کہ امام حسینؑ پر جور و جفا دیکھ کر جلاجل کو ایسا صدمہ اور افسوس ہوا کہ ہاتھ مل مل کر الاماں الاماں پکارنے لگا۔ کسی شخص کی بیکسی اور مصیبت پر تاسّف کرنے کے لیے ہاتھ ملنا اکثر ہوتا ہی، اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصّے جب مِل جاتے ہیں تو فوراً آواز دیتے ہیں اسلیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ مل کر الاماں الاماں کی آواز سے چلّاتا تھا۔ یہاں الاماں۔ اماں مانگنے اور جاں بخشی چاہنے کے معنی میں نہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہوئے ہیں اور اسی بنا پر کہتے ہیں کہ "چلّانے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلّق نہیں" اور یہ کہ "ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی" یہ الاماں اس معنی میں ہی جیسا کہتے ہیں کہ افسوس صد افسوس حیف صد حیف الاماں الاماں اس شخص پر کیسا ظلم ہو رہا ہی۔ یعنی جلاجل ہاتھ ملکر ایسا کہتا تھا۔ اس بند کے چاروں مصرعے یہ ہیں جنسے مطلب صاف معلوم ہو جائیگا۔

ناگہ عمر کے قصد پہ قرنا نے کی فغاں	بیداد کی گواہی کو ہر سو اُٹھے نشاں
چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں	نقّارے سینے پیٹتے آگے ہوئے رواں

مرزا صاحب کا یہ مصرع۔ چلّائے ہاتھ مل کے جلاجل کہ الاماں۔ میر صاحب کے اُس مصرع کے بالکل ہم مضمون ہے جو اُنھوں نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا ہے

ع۔ تھرّا کے جھانجھ بھی کفِ افسوس ملتے تھے[1]۔ صرف فرق یہ ہے کہ میر صاحب نے افسوس کا لفظ لکھا ہے اور مرزا صاحب نے اسی معنی میں الاماں کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اب ہم اس بات کی نظیریں دیتے ہیں کہ الاماں کا لفظ افسوس اور تاسّف کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ میر انیس فرماتے ہیں ؎

عرش تھرّاتا تھا جب فاطمہؑ چلّاتی تھی		الاماں کی مرے خنجر سے صدا آتی تھی[2]

پھر فرماتے ہیں ؎

نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بیبیاں		تھا خانۂ علیؑ میں تلاطم کہ الاماں[3]

میر نفیس صاحب۔ ع۔ برپا ہوا حرم میں تلاطم کہ الاماں[4]

میر تعشق لکھنوی۔ ع۔ ہونا وہ شام کا وہ اُداسی کہ الاماں[5]

ملّا عبدالکریم خراسانی در مثنوی نان و سرکہ ؎

ایں ہمہ ظلم و ستم بر بندگاں		الاماں از ظلمِ ایشاں الاماں[6]

دبیر	یوں جسمِ رعشہ دار سے جانیں ہوئیں رواں		جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں
انیس	یوں روح کے طائر تنِ سر چھوڑ کے بھاگے		جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

پہلا جواب

اعتراض

اعتراض۔ اصل مضمون یہ ہے کہ روحیں جسم سے اس طرح بھاگ گئیں جس طرح بھونچال میں کوئی گھر چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔ مرزا صاحب کے شعر میں صاحبِ مکان

[1] ۳/۱۶۴ [2] ۴/۲۲ [3] ۱/۳۶۲ [4] جلد میر نفیس ص۳ [5] ۳/۱۵۵ [6] نان و سرکہ صفحہ ۲۰

کی تخصیص بیکار ہے۔ زلزلہ جب آتا ہے تو صاحب مکان کی کوئی تخصیص نہیں ہر شخص مکان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔ جسمِ رعشہ دار کی ترکیب نامانوس ہی اور اس قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صرف اُن لوگوں کی روحیں نکلیں جنکے جسم رعشہ دار تھے

جواب۔ مرزا صاحب کا یہ مصرع ایک مقام پر اس طرح چھپا ہی۔ ع

جس طرح بھاگیں زلزلے میں چھوڑ کر مکاں[1]۔ اس صورت میں صاحبِ مکان کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر ہم اس مصرع کو اُسی طرح مان لیں جس طرح آپنے لکھا ہے اور جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر مرزا صاحب کی پہلی جلد میں چھپا ہوا ہی، تو بھی شعر بہت موزوں اور بامعنی ہے۔ صرف سمجھ اور عدم توجہی کا قصور ہے صاحبِ مکان کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص زلزلے کے وقت مکان کے اندر موجود ہو۔ صاحبِ مکان سے مراد مالکِ مکان نہیں ہے جیسا کہ جناب نے سمجھ رکھا ہی مطلب یہ ہے کہ رعشہ دار جسموں سے روحیں اس طرح بھاگ گئیں جسطرح زلزلہ کیوقت مکان والے اپنے مکان کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ جسمِ رعشہ دار سے یہ مطلب ہے کہ اس خوف وہراس کے وقت کوئی شخص نہ تھا جسکا جسم رعشہ دار نہو، اسلیے گویا ہر شخص کے جسم سے روح پرواز کرگئی۔ دونوں صاحبوں نے جسم کو زلزلہ والے مکان سے تشبیہ دی ہی لیکن جبتک جسم میں حرکت اور جنبش کا ثبوت نہو کامل تشبیہ نہیں ہوتی، مرزا صاحب کے مصرع میں رعشہ دار کی قید نے جسم کی تشبیہ اُس مکان سے ثابت کردی جو زلزلہ سے متحرک اور متزلزل ہو رہا ہو۔

ان کے علاوہ مولف نے دونوں صاحبوں کے اور بھی چار پانچ ہم مضمون

[1] جلد ۸۔ صفحہ ۲۱۱۔

اشعار لکھ کر اپنی سمجھ اور لیاقت کے موافق رائے زنی کی ہے اُن پر کچھ لکھنا غیر ضروری سمجھ کر ترک کرتے ہیں۔ آخر میں میر صاحب اور مرزا صاحب کے چند مختلف اشعار لکھ دیئے ہیں اور کچھ رائے زنی نہیں کی۔

مرزا دبیر کی ترجیح

(۲) متحد المضمون اشعار میں مرزا دبیر کی ترجیح

ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ دو شاعروں کے مختلف اشعار جا بجا سے منتخب کر کے کسی شاعر کی ترجیح کا مسئلہ طے کرنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ایک شاعر کے اعلیٰ درجہ کے اشعار اور دوسرے کے معمولی اشعار مل جانا ناممکن نہیں ہے۔ جس طرح بعض اشعار میں میر صاحب مرحوم کو فوق حاصل ہے اسی طرح اگر تلاش اور جستجو کی جائے تو بعض اشعار میں مرزا صاحب کو فضیلت ہو سکتی ہے۔ مثلاً

پہلا موازنہ

میر انیس	لو آفتاب خانۂ زیں میں ہے جلوہ گر
مرزا دبیر	لو برجِ زیں کو غیرتِ برجِ قمر کیا

دونوں صاحبوں نے حضرت امام حسینؑ کے جسم مبارک کو آفتاب و قمر سے تشبیہ دی ہے۔ اس لحاظ سے آفتاب و قمر کا قیامگاہ برجِ زین بہ نسبت خانۂ زین کے زیادہ موزوں ہے۔

دوسرا موازنہ

میر انیس	کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطّور انا الطّور
مرزا دبیر	ہر کوہ کی آواز انا الطّور انا الطّور

مرزا صاحب کا مصرع زیادہ بامعنی اور مضمون خیز واقع ہوا ہے کیونکہ پہاڑوں سے

صداؤں کا نکلنا مشہور و معروف ہے لیکن گیتی آواز نہیں دیا کرتی۔ علاوہ بریں کوہ اور طور میں جو مناسبت ہے وہ گیتی اور طور میں نہیں پائی جاتی، پس کوہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں طور ہوں نہ گیتی۔

تیسرا موازنہ

میر انیس

قبضہ تو رہا دستِ جنابِ شہِ دیں میں	اور تا سرِ دُنبالہ در آئی وہ زمیں میں

مرزا دبیر

قبضہ تو رہا تیغ کا دستِ شہِ دیں میں	پھل جا کے لگا شاخِ سرِ گاؤ زمیں میں

میر صاحب کے پہلے مصرع میں جناب کا لفظ زائد اور "جنابِ شہِ دیں" کی ترکیب قدرے غیر مانوس ہے۔ مرزا صاحب کا پہلا مصرع صاف اور شستہ ہے۔ اس کے سوا مرزا صاحب کے دوسرے مصرع میں پھل شاخ میں جا کر لگنے کی رعایت نے کیسی لطیف صنعتِ ایہام پیدا کر دی ہے۔

چوتھا موازنہ

میر انیس

اُلٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا	جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

مرزا دبیر

گردوں گرے، چڑھائیں اگر آستین کو	ہم آستیں کی طرح اُلٹ دیں زمین کو

میر صاحب مرحوم کے شعر میں "اس طرح اُلٹوں" کا جواب "جس طرح ٹوٹ جاتا ہے" کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یا تو یوں ہونا چاہیے کہ اس طرح اُلٹوں جس طرح اُلٹ جاتا ہے یا اس طرح توڑوں جس طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ آسمان کے اُلٹ جانے اور حباب کے ٹوٹ جانے میں کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے۔

مرزا صاحب کا شعر زیادہ موزوں اور مطلب خیز ہی۔ یعنی اگر آستین چڑھاؤں تو ہیبت سے آسمان گر پڑیں۔ اور زمین کو اس آسانی سے اُلٹ دوں جس طرح آستین کو اُلٹ دیتے ہیں۔ علاوہ بریں مرزا صاحب کے شعر میں مضمون بھی زیادہ ہی۔ میر صاحب نے آسمان کے اُلٹنے کو ایک پورے شعر میں ادا کیا ہے، مگر مرزا صاحب نے آسمان کے گرنے اور زمین کے اُلٹنے، دونوں باتوں کو ایک ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے، اور پھر ایک ہی لفظ (آستین) سے دونوں مطلب نکال لیے ہیں۔

انیس	مجلس میں ریا سے جو کہ روتے ہیں انیس		اشک اُنکے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں
دبیر	یاں اشکِ ریائی کا بھی ہی مول بہشت		موتی سچّے ہیں جوہری جھوٹے ہیں
انیس	پرتو ہے یہ رخِ خلفِ بوترابؑ کا		دیکھو اُلٹ گیا ہے ورق آفتاب کا
دبیر	دیکھا گیا نہ جلوۂ روئے جناب کو		عینک کی احتیاج ہوئی آفتاب کو
انیس	خندق کے بھی رہنے نہ دیا غار میں لاشہ		رسّی سے پھرے کھینچتے بازار میں لاشہ
دبیر	پہلے اُسے دربارِ ستمگار میں لائے		پھر کھینچتے ہر کوچہ و بازار میں لائے
انیس	سینے پہ مرے زانوئے قاتل نہ گراں ہو		خنجر کے تلے نام ترا وردِ زباں ہو
دبیر	حلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلّاد رہے		لب پہ ہو نام ترا، دل میں تری یاد رہے
انیس	گو خاک پہ بیٹھی ہو مگر نورِ خدا ہو		کس طرح کہوں فاطمہ زہرا سے جدا ہو
دبیر	چہرے پہ عجب نور ہی گو خاک نشیں ہو		کیونکر کہوں تم فاطمہؑ کی کوئی نہیں ہو

انیس | پہونچے نہ صبا اُسکے کبھی گرد کے دُنبال
دبیر | جولاں جو ہوا پیکِ صبا رہ گیا پیچھے

انیس | دو اُنگلی سے حلقہ درِ خیبر کا جو کھینچا
دبیر | دو اُنگلیوں سے قلع کیا قلعۂ خیبر

انیس | بیٹھے سرِ رہ کُرسی پہ خیمے سے نکل کر
دبیر | جلوہ کیا کُرسی پہ شہِ عرش نشیں نے

انیس | سائل کو کسنے دی ہے انگوٹھی نماز میں

دبیر	کی جس سخی نے جو در رکوع و سجود میں	دیگر	انگشتری گدا کو عطا کی رکوع میں

الحمدُ للہ علی الاتمام والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ رسولہ محمّدٍ و آلہ الکرام
وتقبّل اللہ ھذا الکتاب من عبدہ المستھام وجعلہ مقبولاً للانام،

ایں نگارین نگار رشکِ نگار — کہ سوادش خوش از بیاضِ چمن
از قبولِ نگار خانۂ فیض — باد مقبولِ مقبلانِ سخن

تمت الخیر